ہمارے جوش صاحب

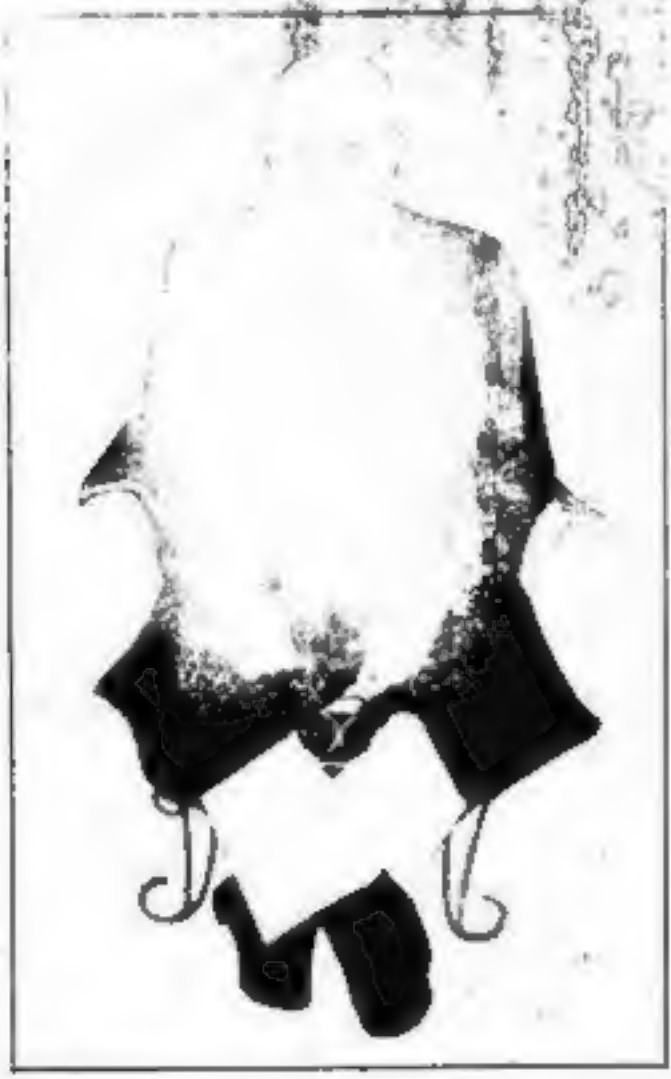

خورشید علی خاں

ذیشان کتاب گھر

ہمارے جوش صاحب

خورشید علی خاں

ذیشان کتاب گھر

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

نام کتاب	:	ہمارے جوش صاحب
مصنف	:	خورشید علی خاں
ناشر	:	ذیشان کتاب گھر
کمپوزنگ	:	آئی جے ایس کمپیوٹرز
سال اشاعت	:	جنوری ۱۹۹۶ء
طباعت	:	ماس پرنٹرز۔ کراچی
قیمت	:	۲۵۰ روپے
	بیرون ملک :	۲۰ درہم / ریال
		۱۵ ڈالر

تقسیم کنندگان:

- خورشید علی خاں — بی۔۸۰ بلاک اے شمالی ناظم آباد، کراچی۔ فون ۶۶۳۰۳۶
- ذیشان کتاب گھر — بی۔۱۰ بلاک این۔ شمالی ناظم آباد، کراچی۔ فون ۶۶۳۰۶۶
- ادبی دائرہ کراچی — بی۔۲۳۹ سیکٹر ۱۱۔اے جمال تو کراچی، فون۔ فون ۶۹۹۵۵۲۸
- دبئی، امارات میں ہمارے جوش صاحب کا حق اشاعت و تقسیم کمپنی پرویز علی خاں صاحب کے پاس ہے۔ پوسٹ بکس ۲۹۹۰۔ فون ۲۸۲۲۳۰
- ہندوستان میں ہمارے جوش صاحب کا حق اشاعت شوکت اعظمی صاحب کے پاس ہے۔ ۲۵۔ جان کی کٹیر، جوگیشوری، بمبئی، بھارت۔ فون ۶۳۲۶۸۲

آیاتِ "صفات" کی تلاوت نہ کرو
جویندگیٔ "ذات" میں غفلت نہ کرو
لفظِ "اللہ" پردہ ہے، جلوہ نہیں
اس حرفِ خلافی پہ قناعت نہ کرو

نعمت اللہ خان مرحوم

اِنتساب

اپنے پیارے بھائی نعمت اللہ خان مرحوم کے نام

جس کے وجود کی خوشبو آج بھی میرے لیے

حرارتِ حیات ہے۔ جس کی فکر و خیالات

کی بلندی اور عظمت کے حضرت جوش ملیح آبادی

بھی معترف و مدّاح تھے۔

علّت کا، نہ معلول و قضا کا منکر
حاشا، نہ خبر، نہ مبتدا کا منکر
یاروں نے تشخّص کا، تراشا ہے جو بُت
الحاد ہے صرف اُس خدا کا منکر

اِس دُھن میں کہ دِل عقل کے شیدا ہو جائیں
آفاق کے اَسرار ہُویدا ہو جائیں
مُدّت سے گُزار رہا ہوں تخمِ اَفکار
شاید کہ نئے دَرَخت پَیدا ہو جائیں

اے نوحِ بشر، عقدہ کشائے فردا
اے مشعلِ محرابِ سرائے فردا
ہاں جلد قدم اٹھا سوئے منزلِ "کُن"
اے بندۂ امروز و خدائے فردا

فہرست مضامین

گردشِ حوالِ واعلی	۱۷
مقدمہ از ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۲۱
ہمارے جوش صاحب اور غیب مرادآبادی	۳۱
حرفے چند از مشفق خواجہ	۳۷
جوش شناسی کا نیا زاویہ از پروفیسر سحر انصاری	۴۱
دیباچہ	۴۷
حرفِ آغاز	۷۷
جوش صاحب سے تعارف	۷۸
سے حاد جوش	۷۹
جوش صاحب کا حلقۂ احباب	۸۲
جوش صاحب کا مذاق	۸۶
اشرف جہاں (بیگم جوش)	۸۹
بابا ذہین شاہ تاجی	۹۲
یادوں کی برات کی طباعت	۹۵
۱۹۷۰ء کے واقعات	
جوش صاحب کی پاکستان آمد	۹۷
یادوں کی برات	۹۹
مذہبی فکر کا ارتقا	۱۰۱
تصورِ بلا	۱۰۱
حرفِ آخر	۱۱۲
تخلیق سے پیشتر	۱۱۷
عدم سے وجود کی جانب	۱۱۹
حد کی پہلی آواز	۱۱۹
خلقت کے ایک مدت دراز کے بعد	۱۲۰
خاک کی تمنا	۱۲۱
ارادۂ تخلیقِ انسان	۱۲۲
فرشتوں کا اعتراض	۱۲۲
معترض فرشتوں کو خدا کا جواب	۱۲۳
آدم کا نزول	۱۲۶
آدم	۱۲۷
حوا	۱۲۹
سرنگ جوش (ابلیس) کی ترغیب	۱۳۱

آدم کا پہلا ترانہ ۱۳۲
حوّا کا جواب ۱۳۳
حوروں کا ترانۂ مبارکباد ۱۳۳
آدم ۱۳۳
معترض فرشتوں کی یاددہانی ۱۳۷
ارتقا ۱۴۲
ارتقا کا اعلان ۱۴۸
۱۹۷۱ء کے واقعات ۱۵۴
پرویز علی خاں کی کامیابی کی پارٹی ۱۵۴
ہچکیوں کا قہقہہ ۱۵۵
گل بدنی ۱۵۸
نعمت اللہ خان ہسپتال میں ۱۶۲
موجد و مفکر ۱۶۵
مرزا عالمگیر قدر ۱۷۵
ایرانی دوشیزہ سے ملاقات ۱۷۶
۱۹۷۲ء کے واقعات ۱۷۹
سلامت علی خان ۱۸۰
ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب ۱۸۱
تلاشی ۱۸۵
میر رسول بخش تالپور ۱۸۶
جوش صاحب اور پابندیٔ وقت ۱۸۸
محسن صاحب اعظم گڑھی ۱۸۹
اردو و سندھی تنازعہ ۱۹۱
آگئی جوانی ۱۹۵
بابا صاحب اور منصور حلاج ۱۹۶
میت العزیز فضل احمد کریم فضلی ۲۰۰
سرکاری وظیفہ کی درخواست ۲۰۲
آغا حسن عابدی صاحب ۲۰۳
اسلام آباد میں ملازمت کی کوشش ۲۰۷
ہاشمی صاحب کا خاندان ۲۱۱
بھنبھور کی سیر ۲۱۲
سمندر کی سیر ۲۱۴
راہ طرب ۲۱۵
میر رسول بخش تالپور گورنر سندھ ۲۱۶
مولانا کوثر نیازی سے ملاقات ۲۱۷
نظریۂ جبر و قدر ۲۱۹
سزا و جزا کا تصور ۲۲۲
جوش صاحب کے ساتھ پنڈی کا سفر ۲۲۷
کلام خاں صاحب ۲۲۷
جوش صاحب کا تقرر بحیثیت نگران مخطوطات پاکستان ۲۲۸
بھٹو صاحب نے جوش صاحب کو مدعو کیا ۲۳۱
لاہور میں قتلہ آخر الزماں سے ملاقات ۲۳۲
شوکت حسین رضوی صاحب کے گھر دعوت ۲۴۱
چھانگا مانگا کی سیر ۲۴۲
حفیظ اللہ خان صاحب کے گھر جوش صاحب کی دعوت ۲۴۷

آج کی رات	۲۴۹
لاہور سے پنڈی واپسی	۲۵۱
حکیم نصیر الدین صاحب	۲۵۴
رسول بخش تالپور گورنر سندھ سے ملاقات	۲۵۴
عزیز الرحمٰن خان صاحب نے جوش صاحب کے لئے اسلام آباد میں مکان کا بندوبست کر دیا	۲۵۵
بابا دین شاہ تاجی۔ تعدد شخصیت	۲۶۱
عزیز الرحمٰن خان	۲۶۳
اشفاق الرحمٰن خان	۲۶۵
جوش صاحب کے لئے اسلام آباد میں مکان کا بندوبست	۲۶۶
بیمٹ آباد کی سیر	۲۶۶
اسلام آباد واپسی	۲۶۹
گل کچھار	۲۷۰
جوش صاحب کا پہلا خط مورخہ ۳۱-۸-۷۲ء	۲۷
میرا جواب۔ ۳-۸-۷۲ء	۲۷۱
جوش صاحب کا خط مورخہ ۲۳-۹-۷۲ء	۲۷۶
نعمت اللہ خاں کا انتقال	۲۷۹
جوش صاحب کا خط مورخہ ۲۲-۱۱-۷۲ء	۲۸۱
جوش صاحب کا خط بابا صاحب کے نام مورخہ ۲۶-۱۱-۷۲ء	۲۸
تغیر باعث، بابا صاحب کے خیالات	۲۸۴
پروفیسر احمد علی صاحب	۲۸۷
۱۹۷۳ء کے واقعات	۲۸۹
جوش صاحب کا خط ۱-۲-۷۳ء	۲۸۹
جوش صاحب کی کراچی آمد اور گورنر ہاؤس میں قیام۔	۲۹۰
"فشار و دلگیری"	۲۹۵
"دو شعلوں کے درمیان"	۲۹۶
مکالمہ امین شبیر حسن خاں آفریدی اور جوش ملیح آبادی	۳۰۱
میر رسول بخش تالپور کا استعفیٰ	۳۰۷
عاصب لائبریری	۳۰۹
کراچی یونیورسٹی کا مشاعرہ	۳۱۱
جوش صاحب کا خط ۱-۸-۷۳ء	۳۱۴
جوش صاحب کا خط ۱۷-۸-۷۳ء	۳۱۵
تارۂ شکر	۳۱۶
میرا جواب مورخہ ۱۲-۱۰-۷۳ء	۳۱۸
جوش صاحب کا خط مورخہ ۳-۱۱-۷۳ء	۳۱۹
جوش صاحب کا خط اکادمی آف لیٹرز کے متعلق مورخہ ۱۲-۱-۷۳ء	۳۲۱
اکادمی کا دستور۔ میرا جواب	۳۲۳
۱۹۷۴ء کے واقعات	۳۳۱
جوش صاحب کی کراچی آمد ۲۸-۲-۷۴ء	۳۳۱
"نظم دیر سے بیدار ہونے پر"	۳۳۲
گریۂ سحر گاہی	۳۳۳

بیگم کرنل نذیر کے گھر دعوت	۳۳۶
جوش صاحب کا کینٹ پبلک اسکول کی طالبات سے خطاب۔	۳۳۷
جوش صاحب کا خط مورخہ ۲۳-۴-۷۴ء	۳۳۹
"مامن" میں جوش صاحب کا قیام	۳۴۱
نظم "اور اس کے باوجود"	۳۴۳
مسدس "زندگی اور موت"	۳۴۹
مرثیے کے موضوع پر گفتگو	۳۵۰
شبیر بابو صاحب کے گھر شبیر حسن خاں کی دعوت	۳۵۹
نظم "مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے"	۳۶۰
جوش صاحب کے خطوط ۲۰-۵-۷۴ء	۳۶۴
جوش صاحب کا خط ۶-۷-۷۴ء	۳۶۷
جوش صاحب کا خط	۳۶۷
جوش صاحب کی کراچی آمد ۱۳-۸-۷۴ء	۳۶۸
فرح عزائم صاحب	۳۶۸
جوش صاحب کی دعوتیں	۳۷۰
ڈاکٹر جالینوس کے گھر دعوت	۳۷۱
کسٹم کلب کا مشاعرہ	۳۷۶
جوش صاحب کی لاہور روانگی۔	۳۷۸
الاذ صاحب کی نظموں کا منظوم ترجمہ	۳۷۹
جوش صاحب کا خط ۷-۹-۷۴ء	۳۸۳
جوش صاحب کا خط ۱-۱۰-۷۴ء	۳۸۵
میری انگلینڈ روانگی	۳۸۶
جوش صاحب کا خط ۲۷-۱۱-۷۴ء	۳۸۷
نووارد کی بدحواسیاں	۳۸۷
انگریز قوم کا کردار	۳۹۰
وں کا دورہ	۳۹۲
لندن کا ہسپتال	۳۹۲
بابے زرسول کا کچھ بیان ہو جائے	۳۹۴
جوش صاحب کا خط ۲۳-۱۲-۷۴ء	۳۹۶
جوش صاحب کا خط ۴-۱-۷۵ء	۳۹۷
پروفیسر رالف رسل سے ملاقات	۳۹۸
۱۹۷۵ء کے واقعات	۴۰۲
میری پاکستان واپسی	۴۰۲
سکھر میں کل پاکستان مشاعرہ	
یاد ستم بخیر ہم بھی اک عمر چکاں تھے	۴۰۳
کراچی واپسی ۱۴-۴-۷۵ء	۴۱۸
بابا صاحب کی باتیں لا الہ الا اللہ	۴۱۹
بابا تاج الدین ناگپور والے	۴۲۱
کلیفے کی غلطی	۴۲۱
یہ جائے سلامت	۴۲۲
ڈیرہ غازی خان کا مشاعرہ	۴۲۴
لاہور کا سفر	۴۲۶
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات	۴۲۶
فردوس دوزخ نصیب نظم	۴۲۹

جوش صاحب کی شاعری کا مقابلہ ان کی محبوبہ سے	۴۳۰
"تجھے ملا ہوں ہو رہا آنکھیں لڑانا بھی نہیں آتا"	۴۳۴
جوش صاحب کے ساتھ اسلام آباد کا سفر	۴۳۶
اسلام آباد میں جوش صاحب کے احباب	۴۳۷
کیا جوش صاحب خدا کے قائل نہیں ہیں؟	۴۳۸
"دیکھو تو کوئی جوش پہ کیا باتیں ہے مدح"	۴۴۱
"برسات ہے برسات"	۴۴۳
"حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد"	۴۴۵
سمن اور جوش صاحب کی کراچی آمد	۴۵۰
عبدالحق صاحب کے گھر دعوت، اور تحقیقِ کائنات پر گفتگو	۴۵۸
مشتاق احمد یوسفی صاحب کے گھر	
جوش صاحب کی دعوت	۴۶۰
بعض کی رفعت اور	۴۶۳
باباصاحب اور تصورِ خدا	۴۶۴
بجرے کا تعاقب	۴۶۷
جوش صاحب کی کلیرنگ ہیڈ فارورڈنگ ایجنسی	۴۷۱
"ردائے حماقت" نظم	۴۷۲
جوش صاحب کی اسلام آباد روانگی	۴۷۴
جوش صاحب کا خط	۴۷۴
جوش صاحب کا خط ۲۱-۸-۷۵ء	۴۷۵
جوش صاحب کا خط ۱۲-۱۰-۷۵ء	۴۷۷
۲۷ اکتوبر ۷۵ء کو جوش صاحب کی کراچی آمد	۴۷۹
راجب صاحب کی پیشین گوئی	۴۸۰
نسائی ذات اور شخصیت	۴۸۲
عقیدہ پرستی	۴۸۴
۱۹۷۶ء کے واقعات	۴۸۸
سلیمہ سلامت	۴۸۸
بیگم جوش کا انتقال	۴۹۱
احدیت، واحدیت، اور محمدؐ	۴۹۴
سوز حساس صاحب کے گھر دعوت	۴۹۷
حق و باطل کے استعارے کربلا اور قرآن کی روشنی میں	۴۹۸
قتلۂ خانقاہ سے ملاقات	۵۰۲
برکرم سے خطاب	۵۰۳
بلیارک کی ایک شام	۵۰۴
علامہ رضی جعفری	۵۰۷
نظریۂ اضافت	۵۰۸
اسرارِ خودی یا "میں" کا تصور	۵۱۱
رموزِ بے خودی	۵۱۷
ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر دعوت	۵۱۸
جوش صاحب کی اسلام آباد روانگی	۵۲۰
جوش صاحب کی کراچی واپسی	۵۲۰
لاہور سے ٹی وی	۵۲۰

جوش صاحب کے ساتھ لاہور کا سفر ۵۲۴
پاکستان کی سیاسی قیادت کے متعلق
جوش صاحب کے خیالات ۵۲۵
محترمہ عصمت چغتائی صاحب کی ملاقات ۵۲۶
"تیزہ نگاہی" نظم ۵۲۸
رسالپور اکیڈمی ۵۳۰
سائمہ قریشی ..... تلمیس شعری ۵۳۲
دیوی پری نظر کی حسول کھرے ۵۳۵
دامن عید پر خون کے آنسو ۵۳۶
حسن اور شاعر ۵۳۹
کبھی پہلے نہ تھی ۵۴۱
۱۹۷۷ء کے واقعات ۵۴۲
مسعود علی خاں کا انتقال ۵۴۲
سوالستان ۵۴۳
احمر حسن صاحب کی کراچی آمد ۵۴۴
۱۹۷۸ء کے واقعات ۵۴۷
جوش صاحب کی خواہش کہ
"میں ان پر کتاب لکھوں" ۵۴۸
مشتاق احمد یوسفی صاحب سے ملاقات ۵۴۹
حکیم سید مدنی شاہ صاحب ۵۵۰
جوش صاحب کا خط حکیم صاحب
کے کلام کے متعلق ۵۵۱
لاہور میں نفسیات پر سیمینار ۵۵۲
دہشت گردی مرگ" نظم ۵۵۶
اسلام آباد کا سفر ۵۵۷
ریڈیو پاکستان نے جوش صاحب کا
انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ۵۶۱
جوش صاحب کے انٹرویو کا پس منظر ۵۶۵
جوش صاحب کی سیاسی بصیرت ۵۶۶
انٹرویو کا ردِ عمل حکومتی
حلقوں میں ۵۷۲
صحافتی حلقوں میں ۵۷۳
۱۹۷۹ء کے واقعات ۵۷۳
کراچی پریس کلب کی رکنیت ۵۷۴
منور عباس صاحب کے گھر
شعری نشست۔ نظم "الا اللہ" ۵۷۸
خاتون بادہ نوش ۵۷۹
۱۹۸۱ء کے واقعات ۵۸۱
جوش صاحب کے آخری ایام ۵۸۱
سفر آخرت ۵۸۲
۱۹۸۲ء کے واقعات ۵۸۴
سن رحلت ۵۸۴
تاریخ وفات ۵۸۴
جوش لافانی ہے ۵۸۴
کتبۂ لوح مزار ۵۸۶

مرگ جوشش پر		جوش کی وفات پر از پروفیسر منظور حسین شور	۵۸۹
مرثیہ جوشش		سنگرانِ جوشش سے	
از کنور مہندر سنگھ بیدی	۵۸۷	از پروفیسر منظور حسین شور	۵۹۱

بے جان ہوتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

گزارش احوال واقعی

ہمارے جوش صاحب، حضرت جوشؔ ملیح آبادی سے میری بارہ سالہ دوستی کے واقعات کی روداد ہے، جو میں نے زیادہ تر اپنی ڈائریوں سے اور کچھ جوش صاحب کی تحریروں اور کتابوں سے اور کچھ آڈیو کیسٹس اور کچھ پے حافظے سے مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں واقعات اسی ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں جس ترتیب سے وہ پیش آئے۔ اسی لیے سال بھر ایک ہی مضمون مختلف انداز میں مختلف مقامات پر ملے گا۔ وہ خواہ خدا کا تصور ہو یا جبر و قدر کا مسئلہ۔ مرائی اور مسدس کی بحث ہو یا اسرار خودی اور رموز بے خودی کے مسائل سی طرح سائنس، فلسفہ، السیات، نفسیات، ادب، شاعری، فرض کوئی فکری، جذباتی، اخلاقی، روحانی، مابعد الطبیعیاتی یا روحانی موضوع ایسا نہ تھا جو ہماری محفلوں میں زیر بحث نہ آتا ہو اور جس پر جوش صاحب یا اس وقت کی محفل کے شرکا میں سے کوئی صاحب اپنی رائے کا اظہار نہ کرتے ہوں یہ تمام مسائل اسی محفل کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں جن میں شرکائے محفل نے اظہار خیال کیا۔ یہ انداز بیان کسی سوچی سمجھی تکنیک کے تحت اختیار نہیں کیا گیا بلکہ جو واقعہ جس طرح پیش آیا اپنی ڈائری کو سامنے رکھ کر بیان کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات جس کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ جوش صاحب کے ساتھ میرا حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ اس لیے ہماری محفلوں میں بار بار صرف چند حضرات ہی کے نام ملیں گے اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ جوش صاحب کی ملاقات صرف اسی احباب تک محدود تھی۔ جوش صاحب، بقول کثیر الاحباب انسان تھے۔ ان کے دوستوں اور پرستاروں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ جس محفل میں

بانٹتے ہر مکتب فکر و خیال کے لوگ ان کو گھیر لیتے۔ ان تمام اصحاب کا ذکر مجھ جیسے گوشہ نشین آدمی کے لیے ممکن نہ تھا۔ بلکہ ان محفلوں میں بھی جن میں خود میں شریک تھا صرف چند احباب ہی کے نام میرے حافظے میں محفوظ رہ سکے حالانکہ ان میں بہت سے اہم لوگ شریک ہوتے تھے۔

جوش صاحب کی حسن خوئی نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ ان کی صاف گوئی تھی۔ جوش صاحب آمنہ کی طرح شفاف شخصیت کے حامل تھے وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کسی قسم کے تحفظات کے قائل نہیں تھے۔ آپ ان سے ہر موضوع پر بلا تکلف گفتگو کر سکتے تھے۔ صرف ایک موضوع ایسا تھا جس میں اکثر شاعرانہ اغماض طراری سے کام لیتے تھے اور وہ تھے ان کے معاشقے۔ اس معاملے میں وہ اپنی بیگم کے سامنے جھوٹی قسمیں بھی کھا سکتے تھے اور اپنی محبوبہ کی عرفیت کی پردہ پوشی میں بڑے بڑے افسانہ نگاروں کو مات دے سکتے تھے۔

جوش صاحب کے دوستوں میں ایک بہت ہی محدود حلقہ ایسا تھا جو ان کی خلوت و جلوت کا محرم راز تھا۔ ان کی زندگی کے آخری بارہ سالوں میں اس خوش قسمت حلقے کا ایک رکن میں بھی تھا بلکہ شاید دوسروں کے مقابلے میں مجھے زیادہ قرب اس لیے بھی حاصل تھا کہ میں فکری اور علمی موضوعات میں بہت حد تک ان کا ہم خیال تھا۔ ہماری ذہنی ہم آہنگی کا یہ عالم تھا کہ کثیر محفلوں میں بعض علمی موضوعات پر گفتگو کے دوران بعض احباب کے سوالات پر جوش صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ میں ان کا جواب دوں اور وہ میرے جوابات کی تائید فرماتے تھے۔ اسی لیے جوش صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تھا کہ ان کی فکر اور خیالات کے متعلق ان کے احباب میں صرف مجھی کو یہ حق حاصل ہے کہ میں ان پر ایک کتاب لکھوں۔ یہ کتاب بہت بڑی حد تک جوش صاحب کی اسی خواہش کی تکمیل میں لکھی گئی ہے۔ اس میں میں نے جوش صاحب کی فکر کے تقریباً تمام گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب کی زندگی، شخصیت اور فکر کا یہ میرا بالکلیہ شخصی تجزیہ ہے۔ گو میں نے حتی الامکان معروضی انداز اختیار کیا ہے لیکن بہرحال یہ ایک شخصی تاثر ہے جو اپنے حدود رکھتا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو میرے نقطہ نظر سے اختلاف ہو تو یہ ان کا حق ہے۔ لیکن میں نے اپنی بساط کے مطابق انتہائی دیانتداری سے جوش صاحب کے خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکا ہوں، اس کا فیصلہ

قارئین کرام خود فرمائیں گے۔

آخر میں جن محترم حضرات نے اپنی بے انتہا مصروفیت میں سے وقت نکال کر اس کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں بے قیمتی اور مفید مشوروں سے میری رہنمائی فرمائی ان میں جناب رحمت مراد آبادی جنھوں نے پروف ریڈنگ کے علاوہ کتاب کے متعلق ایک مضمون ہمارے جوش صاحب" تحریر بھی فرمایا۔ محترم جناب پروفیسر سحر انصاری صدر شعبۂ اردو جامعہ کراچی جنھوں نے نہ صرف پروف ریڈنگ کی زحمت اٹھائی بلکہ "جوش شناسی کا نیا زاویہ" کے عنوان سے بے قیمتی رائے بھی تحریر فرمائی۔ جناب ڈاکٹر محمد علی صدیقی ڈائرکٹر قائد اعظم اکیڈمی پاکستان جن کی ہدایت پر میں نے "دیباچہ" کے عنوان سے جوش صاحب کے پاکستان آنے سے پہلے کے واقعات تحریر کیے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کتاب کا "مقدمہ" تحریر فرمایا اور جناب مشفق خواجہ جنھوں نے "حرفِ چند" کے عنوان سے بے قیمتی رائے سے میری ہمت بڑھائی۔ ان تمام دانشور حضرات کا میں دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کیونکہ اگر ان کی رہنمائی مجھے حاصل نہ ہوتی اور قدم قدم پر یہ میری ہمت نہ بڑھاتے تو شاید مجھ سے یہ ذمہ داری کما حقہٗ ادا نہ ہو سکتی۔

ان کے علاوہ جناب جعفر رضا، جناب دانش عالم، جناب سید ساجد علی ساجد کے لیے بھی میں سراپا سپاس ہوں جنھوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت کے سلسلے میں اپنے عملی تعاون اور مشوروں سے میری مدد فرمائی۔

خورشید علی خاں

بی۔ بلاک ۔ شمالی ناظم آباد

کراچی

جناب ڈاکٹر محمد علی صدیقی

مقدمہ

مقام مسرت ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی کے سلسلہ میں ضروری نگارشات کی ابتدا ہو چکی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں پاکستان اور ہندوستان میں متعدد تصنیفات اور تالیفات شائع ہوئی ہیں۔ جن سے جوشؔ لمحی میں اضافہ ہونے کی امید ہے۔ زیر نظر تصنیف "ہمارے جوشؔ صاحب" کو جوشؔ صاحب کے ایک پرخلوص نیازمند اور دوست خورشید علی خاں کی بے تکلف رفاقت کی ایک ایسی روئیداد قرار دیا جا سکتا ہے جس میں جوشؔ کی زندگی اور فکر کے بعض کم روشن پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

اردو دنیا کی ایک بڑی قد آور لیکن بعض حلقوں میں متنازع فیہ شخصیت ہونے کے باعث، جوشؔ صاحب کی شخصیت، فن، فکر اور تاریخی حیثیت کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بعض حضرات کے لیے ان کی شخصیت ایک معما ہے۔ کیا وہ کھلی ہوئی کتاب تھے یا صرف اپنے چند دوستوں ہی پر پوری طرح منکشف ہو سکے تھے؟ کیا ان کی شاعری غیر روایتی تھی ..... اگر جواب "ہاں" میں ہے تو کیونکر؟ جوشؔ صاحب نے نظم آزاد یا نظم معریٰ یا نثری نظم میں سے کسی بھی جدید صنف "آزادی" کو درجہ قبولیت نہ بخشا۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں وہ اس قدر بھی جدید نہ تھے جس قدر مولانا الطاف حسین حالی جنھوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں ردیف اور قافیہ کی شرائط کو "بار" قرار دیا تھا۔ رہا سوال جوشؔ کا تو اس کی نظم گوئی بھی غزل کی روایت ہی کی مرہون منت ہے۔ جوشؔ کی وجہ سے اردو شاعری نے بھی دلیل کے مضامین سے ہٹ کر زندگی کے بعض ایسے گوشوں کی جانب بھی دیکھا جو ابھی تک محض

انگریز رومانوی شعراء اور شاعری کے وہاں خیال کے ساتھ مخصوص تھے۔ ہر چند کہ اقبال، شرر، طباطبائی، برج نرائن چکبست اور سرور جہاں آبادی کی شاعری میں مواد اور ہیئت کی نئی نئی کونپلیں پھوٹتی نظر آتی تھیں لیکن ان متذکرہ بالا شاعروں میں جوش سب سے زیادہ رومانوی اور پرجوش تھے۔ اپنی مخصوص افتادِ طبع اور حاسدانہ ہیں منظر کی وجہ سے جوش "مواد اور ہیئت" کے معاملہ میں خود کو بڑی سے بڑی بغاوت پر چشم زدن میں تیار کر سکتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ جوش صاحب اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں تغزل کے زیر اثر تھے۔ جوش اس زمانہ میں رومانی سرمستی اور انسان دوستی کے نشہ سے سرشار تھے۔

جوش صاحب کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ جاگیردارانہ نظام سے قدرتی وابستگی کے باوجود مغرب کی فرد افروزی سے متاثر تھے۔ وہ ایک طرف ابن عربی، کھنڈی، پیر رومی، حافظ، جامی، عرفی اور عمر خیام کے بے تکلف تھے تو دوسری طرف افلاطون، ارسطو، نیوٹن، ڈارون، اسپنسر، برگساں، مارکس اور برنارڈ شاہ کے عاشق تھے۔ ان کے یہاں مشرق اور مغرب کے بہترین اذہان کی فکر اس طرح یکجا ہو چکی تھی کہ لامحالہ طور پر جوش کو وہی کچھ ہونا تھا، جو وہ ہوئے۔ جمال پسندی، جوش کے یہاں جمہوریت کی جلوہ آفرینی سے حظ اندوزی کا جبلی رجحان تھا، جو بمنزلہ رومانیت کے تھا۔

میرا خیال ہے کہ جوش کی شاعری کا مطالعہ اگر متذکرہ بالا پیراگراف کی روشنی میں کیا جائے تو جوش کی شاعری میں نظر آنے والے متعدد تضادات از خود حل (Resolved) ہوتے جائیں گے اور یہ بھی کہ ان کی بعض طویل نظموں میں، ایک ایک لفظ کے دس دس متبادل الفاظ کی بھرمار بھی قصیدہ لکھنے کی روایت کا نمونہ تھی تاکہ ان کی طاقتِ لسانی کا جادو تسلیم کر لیا جائے۔ جوش ان شاعروں میں سے ہیں جو پڑھنے کے بجائے سننے میں زیادہ مزہ دیتے ہیں۔ جن جدید شعراء نے شاعری کی روایت سے اجتناب برتا ہے وہ کفایتِ لفظی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہیں۔ بھلا جوش ایسا کیوں کرتے وہ اپنی "گل بدنی گل بدنی" کی مخصوص مترنم طرز ادا سے مترادف الفاظ میں بھی معنوں کے باریک فرق تراشتے تھے اور اس طرح اپنے تجربات کی دنیا کے بے پناہ تحمل اور شکوہ کا جیتا جاگتا نمونہ بن جاتے تھے۔ بس کمی کی نسل جوش کے کلام میں حشو و زوائد کی "نشاندہی" کے ذریعے اپنے تجربات کی کم مائیگی

پر صاد تو نہیں کر دیں؟

میں جوشش کے بارے میں شائع ہونے والی ہر کتاب کو اسی معیار پر پرکھتا ہوں کہ آیا یہ کتاب جوش فہمی میں اضافہ کا موجب یا اس کی راہیں مسدود کرنے کا سبب بنے گی؟ مجھے خوشی ہے کہ جوش مرحوم کے بارے میں حتمی تحریریں بھی جوش کی زندگی کے بعض مثبت پہلوؤں کو لئے بغیر مکمل نہ ہو سکیں گی۔ شاید ایسے کسی جوش کی تصویر کشی ممکن نہ ہو سکے جو صرف اہرمن کا چیلا ہو۔ جوش میں یزداں صفت عنصر کے لیے بڑا تپاک ہے۔ بشرطیکہ اسے حسن، خیر اور حق کے راویوں سے دیکھا جائے

جوشش صاحب کی شخصیت واقعتاً بڑی دلچسپ تھی۔ اگر وہ اپنے اہل خاندان کے لیے ایک شفیق سرپرست تھے تو وہ دوسری طرف راجب مرد آبادی، خورشید علی خاں، ذہین شاہ تاجی، مہر عباس اور اپنے دیگر بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں سب سے کم عمر، کھلنڈرے حسن پرست نظر آتے تھے۔ ایک شفیق سرپرست کی رو سے اپنے بیٹے سجاد شہید فروش اور بیٹی کے خاندانوں کی کفالت کے لیے وہ اپنے وقت میں سے تجارت و صنعت کے اہم شعبے کے حوالوں - یا السرمن بالا کی تالیف قلب کے لیے نکلتے اور پھر اپنے دوستوں کے ساتھ ایسی شاموں کے انتظار میں رہتے جہاں عمر خیام بھی دنیا دار نظر آ سکتا تھا۔

اس حقیقت میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں جوشش صاحب کو اس طور پر مستحکم کرنے کی خاطر حتی الامکان نواز گیا۔ سیلیا، پٹرول پمپ اور مکان کے لیے پلاٹ کے حصول سے لے کر جوش لے کلیرنگ ہیڈ فارورڈنگ، بھی قائم کی۔ وزارت تعلیم میں ایک اعلیٰ ملازمت کی۔ اس پر مستزاد جوش صاحب جہاں تک کہ شنیدہ و دیدہ ہے، فضول خرچ نہ تھے۔ پیسے کی قدر کرتے تھے۔ بھیں داد و دہش کے طور پر جو کچھ بھی علاوہ اہل خاندان ہی پر خرچ ہوا۔ لیکن جوشش صاحب کے مقابلہ میں کم حیثیت افراد نے بھی خود کو زیادہ مستحکم کر لیا۔ جوش بہرحال اپنے حاصلات کو مستحکم نہ کر سکے اور مالی بد انتظامی کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی میں ٹھہراؤ نہ آ سکا۔

آج ان کے صاحبزادے کا خاندان نواب نصیر محمد خاں گویا کے وارث کے شایان شان نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جوشش صاحب جس ان دو معاشی استحکام کی تگ و دو

میں سرگرداں رہا کرتے تھے، انھیں کہیں کر نصیب نہ ہو سکا؟

میں نے جوشؔ ملیح آبادی مرحوم کو رئیس امروہوی، سید محمد تقی، ذہین شاہ تاجی، حکیم محمد علی طیب اور کبھی کبھی فیض احمد فیض کے ساتھ کسی اجڑی ہوئی ریاست کے بارح و بہار راجہ کی مانند گل افشانی گفتار کرتے دیکھا ہے۔ اس طرح کہ طرح ہونے کے منافر بھی سدھنے ہیں اور اہتمام صحبت کے بھی۔ شاید ہی کوئی ایسا فلسفیانہ مسئلہ ہو جس پر جوش صاحب کے لگے بندھے خیالات نہ ہوں۔ رئیس امروہوی صاحب کے گھر کی محفلیں خاص نوعیت کی ہوتی تھیں، ہر چند کہ ان محفلوں میں راجہ صاحب مراد آبادی، خورشید علی خاں اور صمد عباس کے نام لکھے گئے خطوط میں مندرج "ہوش ربا" معاملات ..... جو امرد پرستی اور حسن حسینہ (لونڈیا) پرستی پر محیط ہیں ..... سامنے نہ آسکے لیکن ان صحبتوں میں کائنات کے راز ہائے سربستہ کھولنے کی مشقیں ضرور ہوا کرتی تھیں۔ میں نے راجہ صاحب اور خورشید علی خاں کو ان محفلوں میں شامل نہ دیکھا۔ مجھے اس زمانے میں یہ علم بھی نہ ہو سکا تھا کہ جوش صاحب نے راجہ صاحب اور خورشید علی خاں کو جن موضوعات کے لیے "رازدار" بنایا ہے، جوش کی زندگی کے اہم مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور اب جب کہ خورشید علی خاں کی یادداشتیں میرے سامنے ہیں، میں ان کی آنکھوں سے جوش صاحب کے بارے میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب بگڑے رئیس کی طرح اپنے ندیموں کے لیے ایک رخ اور اپنے ہم فکر جلیسوں کے لیے دوسرا رخ رکھتے تھے۔

خورشید علی خاں سے جوش مرحوم کی قربت، ہر قسم کی قربت، ان خطوط سے آشکارا ہوتی ہے جو راجہ صاحب مراد آبادی کی کتاب "خطوط جوش" میں شامل ہیں۔ یہ جنھیں خطوط خورشید علی خاں کی تحویل میں ہیں۔

خورشید علی خاں کسٹم سروس کے جاندیدہ افسر ہیں۔ ریاست حیدرآباد (دکن) کے ایک صاحب ثروت و اقتدار خاندان کے فرد ہیں۔ کبھی اعظمی کی بیگم اور شبانہ اعظمی کی والدہ، شوکت خانم ان کی بہن ہیں۔ حیدرآباد کے مشہور ترقی پسند صحافی روزنامہ "پیام" کے مدیر اور شاعر اختر حسن بھی ان کے بہنوئی ہیں۔ فکری مسائل پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور

وہ جب بھی کسی مسئلہ پر بولتے ہیں تو واضح اور دو ٹوک انداز میں بولتے ہیں۔ جوش صاحب کو پاکستان آتے ہی جن چند معدودے سے قربت ذہنی حاصل ہوئی ان میں سے خورشید علی خاں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ جوشؔ ان سے خلوت اور جلوت کے مسائل یکساں سہولت اور طمانیت قلب کے ساتھ بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ جوش صاحب نے "فتنۂ آخرالزماں" کے حوالے سے ..... جس سے واقف ہوئے بغیر جوش کا جذبۂ محمود - محراب و مضراب" کا ایک حصہ پیشاں بنا رہے گا۔ خورشید علی خاں کو جس نوعیت کی معلومات فراہم کی ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بجا طور پر جوشؔ ملیح آبادی کے پاکستانی دور کے نفس ناطقہ ہیں۔

زیر نظر کتاب جوشؔ کے نفس ناطقہ خورشید علی خاں کے غیر سنسر شدہ مشاہدات کی ایک ایسی دستاویز ہے جس کے مطالعہ سے جوشؔ کے مذہب، جوش کے حد جوش کے "آخری عشق" اور جوش کی سماجی لحاظ سے خود کفیل ہونے کے لیے کاوشوں کی ایک قابل اعتبار دستاویز ہمارے سامنے آتی ہے اور یہ دستاویز ایک ایسے فرد کی خامہ فرسائی کی سرہمان منت ہے جس نے جوش صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کے واقعے سے لے کر ..... جس کے بعد خورشید علی خاں اور ان کے بھائی کی جوش سے بے محابا عقیدت کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ جوشؔ کے آخری وقت کا ایک خط (جو شاید اشاعت ہے) انتہائی پر اعتماد رفاقت کا ثبوت ہے۔ جوش اور خورشید علی خاں کے مراسم باہمی ارفع ہیں۔ جوش وہ شخصیت ہیں جو "یادوں کی برات" کی رسائی وغیرہ کے سلسلہ میں روشن علی نعیم بھی سید سبط حسن سے بھی متردد ہو گئے تھے۔ (جیسا کہ خورشید علی خاں کے نام ایک خط سے ظاہر ہے)۔ یوں لگتا ہے کہ جوش صاحب اپنے پاکستانی دور میں حسن اور پیسہ کی احتیاج سے گلو خلاصی نہ پا سکے۔ حسن یک جہاں پسند شاعر کا عام سوال ہے لیکن مقام حیرت ہے کہ وہ آخری عمر میں عاشق صادق کے طور پر نظر آتے ہیں۔ عشق کے قائل نظر آتے ہیں عاشقی کے سمیں۔

خورشید علی خاں نے جوشؔ ملیح آبادی کے سلسلہ میں اپنی یادداشتوں کو اس طرح منضبط کیا ہے کہ جوشؔ صاحب سے پہلی ملاقات کی روداد سے پہلے سرزمین پاکستان پر قدم رکھنے سے قبل جوش کی زندگی اور تخلیقات کے بارے میں ایک طائرانہ جائزہ پیش کر دیا ہے تاکہ

نووارد ان جوش شناسی اس باب سے بنیادی معلومات حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد انھوں نے مقالہ نگاری کے کسی مخصوص (Pattern) کی تقلید سے اجتناب برتتے ہوئے جوش صاحب کے بارے میں اپنے مشاہدات کو اسی ترتیب سے رقم کر دیا ہے جس ترتیب سے مشاہدات پیش آتے رہے اور اس طرح اس کتاب کی تدوین کے لیے اگر ان اصول پر متفق ہوا جائے کہ واقعات موضوعات کے تحت بیان کیے جائیں تو اس کتاب کا تانا بانا مختلف انداز کا ہو سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ خورشید علی خاں نے جس بے تکلفی کے ساتھ جوش صاحب کے بارہ سال کی رفاقت کو رقم کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک خاصہ کی چیز ہے اس نوع کی یادداشت نویسی اسی وقت ممکن ہو پاتی ہے جب مصنف کو اپنے (Subject) سے اس درجہ شیفتگی اور مناسبت حاصل ہو کہ وہ اس کی بابت اپنی یادوں کی تہذیب کی پیشہ ورانہ ضرورت کو بھی "دخل در معقولات" سمجھتا ہو اور اسے یقین ہو کہ اس کے بیان کردہ واقعات اور مشاہدات میں ایک معنوی اور قلبی ربط موجود ہے اور ان ہر دو کی بظاہر بے ربطی میں بھی وہ ارتباط موجود ہے جو (Subject) کی زندگی اور فکر میں بتمام موجود ہے۔

خورشید علی خاں کی زیر نظر تصنیف، جو مشن ملیح آبادی پر شائع ہونے والے تنقیدی مضامین کے مجموعوں، شعری انتخابات اور خطوط کے مجموعوں کی بھیڑ سے یکسر مختلف ہے۔ جوش جیسے قد آور شاعر کے لیے جس نے "شام و روز" کے افق کے قریب اکیسویں صدی کے متعدد تابندہ ستارے ابھرتے دیکھے تھے، اکیسویں صدی میں داخل ہونے والی نئی نسل کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہماری بیسویں صدی اور خصوصیت کے ساتھ اس کا نصف آخر مغربی تہذیب کے رد عمل میں قرون وسطیٰ کی مرتب شدہ اقدار و تہذیب کی بازیافت کے لیے کام میں گزرا ہے اور وہ بھی معتبر فکر کی آزاد فضاؤں کے مقابلے میں اشاعرہ کے تاصبح قیامت سر بمہر بند افکار اور ان کی سربلندی کے لیے جس نے ہمیں جدید تہذیب کے دائرہ سے خارج (Drop-out) اور اس کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ جوش کی پسندیدہ فکر کا صحت مند حصہ اکیسویں صدی کے لیے درکار فکری صلابت اور فکری استقامت کے لیے ہنوز رہنما کا کام دے سکتا ہے۔ اس فکر میں نوع انسانی کے چیدہ چیدہ بزرگ مذہبی اور سیاسی مفکرین کے بیان کی فکر میں جاری و ساری کمتری اور فرسودگی کے خلاف احتجاج کی ایک توانا

بازگشت ہے اور بازگشت ہی زندگی ہے اور یہی زندگی کی وہ توانائی ہے جس کے بغیر انسانی فکر کا جدلیاتی عمل ایک نقطہ پر آ کر رک جاتا ہے۔ افراد کی طرح انسانی قبائل اور اقوام بھی مفلوج ہو سکتی ہیں۔ خاص طور پر اس لمحہ جب وہ جدلیاتی جنگ میں شکست کھا چکی ہوں اور ان کی عقلی جدلیاتی صورت فکر اور تحلیل و تجزیہ کی صلاحیت سے شکست کھا چکی ہو۔

خورشید علی خاں کی تصنیف جوشش قلبی میں ایک گراں قدر سنگ میل ثابت ہوگی۔ یہ تصنیف جوش کی شاعری کے پس پشت فکر کے بعض مقامات کے "اسرار" کھولتی ہے۔ جوش کی شاعری میں خدا، کائنات، مذہب، انسان اور انقلاب "سرد لبرل" کی جس زبان میں بیان ہوئے ہیں اس میں الیاس و خضر بھی تعجب و بعد کی حالتوں کے شاہد ہیں۔ جوش نے انسان کو شرافت کا آخری مرتبہ قرار دینے کے بجائے (صوفیا کا یہ عقیدہ کہ انسان کے بعد کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی) مظہر عین شہود بنا دیا۔

خلوتی و جلوتی خود خود اند
ولیکن مظہر عین شہود اند

یوں لگتا ہے کہ جوش کے یہاں صوفیا کی اصطلاح کے طور پر بادہ کا وہ مطلب جو "حقیقی" بتایا جاتا ہے یکساں طور پر "مجازی" ہو چکا ہے۔ "بادہ" محبت و عشق الٰہی کا وہ فیضان ہے جو عالم غیب سے سالک کے دل پر وارد ہوتا ہے اور اسے مست و بے خود بنا دیتا ہے۔ بادہ فروش مرشد، پیر، شیخ اور ہادی طریقت ہے، باراں خود رحمت ہے، بت مظہر عشق یا تجلی ہے، چشم محبوب پیار ہے اور حیات بذات خود آگاہی، شعور اور ظہور ہے۔

اس کتاب میں خورشید علی خاں، جوشش سے ان کی انتہائی ذاتی زندگی کے مسائل کے ساتھ تفرید اور تجرید کے موضوعات پر جگہ جگہ بحث کرتے ملتے ہیں۔ خورشید علی خاں نے ان مباحث کا اندوختہ آپ کے سامنے پوری دیانت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ جوش بظاہر صوفی نہیں لیکن ان کے یہاں خدا نے مشخص کے بجائے محبوب حقیقی کا تجریدی تصور واضح طور پر موجود ہے۔ جب محبوب حقیقی یعنی تجرید اپنے بندہ کے خانہ دل میں آباد ہو جاتا ہے تو اس محبوب کے سامنے خزانے اور اس کا سارا جاہ و جلال اور قدرت و عظمت غرضیکہ وہ سب کچھ جو محبوب حقیقی کا ہے بندہ کے دل میں اتر آتا ہے اور بندہ پنی

صفات کو فنا کر کے حق تعالیٰ کی ذات و صفات سے زندہ اور باقی رہتا ہے۔ جوش کا خدا اصولی کا خدا ہے، متصوف کا خدا نہیں ہے۔ وہ مرد خود آگاہ کا خدا ہے، تجلیات کے گرداب میں مستغرق مرد کم نگاہ کا خدا نہیں۔

خورشید علی خاں نے جوشش کی شعری نعت کی قاموس فراہم کرنے کے بجائے جوشش کے فکری نظام کو بڑی شرح و بسط سے بیان کر دیا ہے کہ وہ قارئین کے دل میں محکم طور پر پیدا ہونے والے شبہات بھی بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ تاکہ جوشش کی طرف سے اپنے دوست کو بے تکلفی کے عالم میں دیے گئے جوابات معترضین جوش کو مطمئن کر سکیں اور وہ خدا اور مذہب کے بارے میں جوش کے خیالات پر بھی طعن کرنے سے پہلے سوچیں کہ آیا جوش پر لگائے گئے الزامات خود ان کی کم علمی اور غلط اندیشی پر دال تو نہیں؟

خورشید علی خاں جوش سے محبت کرتے ہیں لیکن انھوں نے جوش کے بارے میں بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جن پر جرأت رندانہ کا گمان گزرتا ہے۔ یہ رجحان قابل داد ہے اور جوش شناسی کی ضرورت ہے۔

خورشید علی خاں نے جوشش پر ایک ادیب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پرستار ایک دوست کی حیثیت سے قلم اٹھایا ہے اور حق تو یہ ہے کہ جوش کا یہ خیال غلط نہیں تھا کہ خورشید علی خاں ہی ان کی ذات و فکر کے بارے میں مجاہدانہ طور پر لکھ سکتے ہیں۔ جوش اس باب میں کس قدر بجا تھے، اس کتاب سے کھلی طور پر عیاں ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔ جوش اس صدی کی ایک عام ادبی و تہذیبی شخصیت تھے اور محققین اور نقادوں کے لیے استفادہ نما کے ساتھ ان کے بارے میں ہر قسم کے مواد کی ضرورت ہوگی۔ ہر کتاب ایک نئی کتاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور کیا عجب کہ خورشید علی خاں کی یہ کتاب جو جوش فہمی کے لیے ناگزیر اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ جوش کے دیگر دوستوں سے مدد کچھ لکھوائے۔ ویسے اب جوش کے بے تکلف دوست نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ ہند و پاکستان میں جوش کی محفلوں کے حاشیہ پر بیٹھے ہوئے حضرات تو خاصی بڑی تعداد میں موجود ہوں گے لیکن ان میں سے کن حضرات کو جوشش کا مکتوب علیہ ہونے کا شرف حاصل ہوگا؟ ظاہر ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ اور اسی وجہ سے خورشید علی خاں کی اس تصنیف کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے

خورشید علی خاں نے جوشؔ کے ہم مسلک ضرور ہیں لیکن ہم مشرب نہیں۔ جوشؔ مرحوم کا حق رفاقت ادا کیا ہے اور اس کتاب کے بعد جوشؔ کے خلاف اٹھنے والے سنگ ہائے ملامت کی تعداد کم سے کم ہو جائے گی۔ جوشؔ مرحوم زندہ ہوتے تو خورشید علی خاں کی اس کتاب سے یقینی طور پر خوش ہوتے اور

You, too, Brutus

کے بجائے

Oh, you Khurshid

کہہ کر ان کا ماتھا چوم لیتے۔ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جب تک جوشؔ مرحوم کے بارے میں تحقیقی تحریریں سامنے آتی رہیں گی اس وقت تک یہ امید بندھی رہے گی کہ ہم بھی زندہ قوموں کی طرح ادب و فنون کی اہم شخصیتوں کے ساتھ انصاف کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

جوشؔ بہرحال اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں۔ ان کے ماننے والوں میں جوشؔ کو مقدس گائے قرار دینے یا انہیں اعلیٰ روحانی مقام دینے کا رجحان نہیں ہے۔ جوشؔ کے سلسلے میں یہ صورت حال جوشؔ کے بارے میں منفی اور مثبت تحریروں کے لیے خاصی سازگار ہے اور اس طرح بڑی شخصیت کے سایہ دار درخت کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی شاخوں کی ترش خراشی ہوتی رہے گی اور صرف وہی جوشؔ باقی رہ جائے گا جو اپنی شاعری کی انفرادیت کی بنا پر زندہ رہے گا۔

میں خورشید علی خاں کی کتاب کا نہ صرف استقبال کرتا ہوں بلکہ یہ امید کرتا ہوں کہ جوشؔ مرحوم کے دیگر بے تکلف دوست اور ان کی محفلوں کے بے تکلف جلیس بھی جوشؔ پر قلم اٹھائیں گے۔ افسوس کہ ان حضرات کی تعداد اب انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، واثق جونپوری، جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، سید محمد تقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر گیان چند اور متعدد دیگر محبان جوشؔ پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جوشؔ اور سماج کے مقدمہ میں اپنی اپنی گواہی پیش کریں کہ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ علم و ادب کے ساتھ اپنے مسلک کی معتبر طور پر وکالت کی جا سکتی ہے۔

خورشید علی خاں نے بلاشک و شبہ ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ یہ کام اس لیے اور بھی قابل داد ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو ستر کے سنگ میل کو پار کر چکا ہے اور جس نے جوش اور کینی پر قلم اٹھا کر بہت دیر سے ہی سہی لیکن قابل کا فرض ادا کر دیا ہے۔

"ہمارے جوش صاحب" ایک جدید دستاویز ہے اور اسے "جوش شناسی" کے سلسلے میں "یادوں کی برات" کے بعد سب سے اہم مرجع ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
جامعہ کراچی
ڈائرکٹر قائداعظم اکیڈمی پاکستان
کراچی

"ہمارے جوش صاحب"

یادش بخیر حضرت جوش ملیح آبادی پر کام کرنے کی ضرورت تو اس وقت بھی تھی جب وہ افق شاعری سے نصف النہار کے، اور بے شمار آب دار کی شعاعوں سے اس کارگاہ ہستی کو منور کر رہے تھے۔ لیکن ان کی وفات حسرت آیات کے بعد یہ ناگزیر ہے کہ ان کے خیالات، نظریات، سیاسیات، معتقدات، مرغوبات، مکروہات، مختارات، متروکات، تلمیحات، ترصیات، مسموعات، ماکولات، مشروبات، اختراعات، معمولات، منقولات، ترجیحات، اعلانات اور تلفظات کو بھی جہاں تک ممکن ہو محفوظ کر لیا جائے۔ ان کی فکر فلزم آشام کا ہر گوہر تاب دار، تحریر کے رشتے میں پرو دیا جائے۔ ان کے محامد و محاسن اور فضائل و مکارم اور تقریباً پون صدی پر محیط منفرد و مثالی علمی و شعری خدمات اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے اور تعصب و تنگ نظری کی عینک اتار کر انھیں تحقیقی اور معیاری زبان میں پیش کیا جائے تاکہ جوش کی علمی عبقریت اور فضل و کمال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

جب جناب جوش کی زندگی اور شعری و ادبی کارناموں پر اقبال و غالب کی طرح سینکڑوں مقالے اور کتابیں منظر عام پر آئیں گی اس وقت جوش کے مقام کا تعین ممکن ہو گا۔ ماضی بعید سے قطع نظر گزرے پاکستان سے ان کے انتقال پر ملال تک پچیس چھبیس سال مدت پر ایک نظر ڈالیں تو ایسا لگتا ہے کہ انور رود اول است۔ ان کی پاکستان میں آمد پر ان کے مخالفین، معترضین اور معاندین نے جو حشر برپا کیا تھا وہ ابھی تک معدوم نہیں ہوا۔

جوش صاحب کے خلاف غلط پروپیگنڈے اور بے سروپا الزامات کی اشاعت میں مرحوم

جناب راحت مرادآبادی

کے سینکڑوں بدخواہان سطح میں دبنگ طرف مصروف عمل شر انگیزی ہیں لیکن وہ دن دور نہیں جب اس عظیم شاعر کی عداوت و عظمتوں کا آفتاب و ماہتاب چڑھتا ہی چلا جائے گا اور اہل علم و دانش، ارباب فضل و کمال بے ساختہ کہیں گے،

آفتاب آمد دلیل آفتاب

الحمد اللہ علیٰ حمدہ کہ حضرت جوش کے ایک مخلص و بے لوث قدر شناس، نکتہ سنج و جوش فہم نے "ہمارے جوش صاحب" جیسی نادر کتاب لکھ کر حق رفاقت و محبت کی ادائیگی کیا ہے۔ بجا، گر یہ کہا جائے کہ،

ہمارے جوش صاحب حضرت خورشید کا راجب
ادب کو جس پہ کیا کیا ناز ہے وہ کارنامہ ہے
جو بجتا ہے ہر انداز، فرق جوشش عظم پر
تعالیٰ اللہ یہ بے رسمے و گماں ایسا عمامہ ہے

حضرت جوشش سے بھی خورشید علی خاں کی ملاقات پہلی بار ۱۹۶۶ء کے اواخر میں ہوئی تھی۔ اس وقت جناب جوش "فیڈرل بی ایریا" کراچی کے دو منزلہ مکان میں رہا کرتے تھے جو ایک ہزار گز کے قطعہ زمین پر بنا ہوا تھا۔ اب تو اس مکان کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔ مدت ہوئی اسے خریدنے والے نے منہدم کر دیا تھا۔ کاش اس مکان کی کوئی تصویر ہی ہوتی جسے اس کتاب میں شامل کیا جا سکتا۔

جوش و خورشید کے ربط و تعلق کی مدت تقریباً بارہ سال ہے۔ اس مدت میں خورشید علی خاں نے حضرت جوش کی بعض تحریروں، آڈیو (سمعی)، کیسٹس، ڈائریوں اور حافظے کی مدد سے واقعات کو ترتیب سے بیان کیا ہے۔ گفتگو ہر موضوع پر کھل کر ہوتی تھی۔ جناب جوشش بے تکلف احباب کی محفلوں میں تحفظات (Reservations) کے قطعی پابند نہیں تھے پھر بھی خورشید علی خان نے بعض باتوں کو جو بہت گفتاری کے زمرے میں تھیں بڑی احتیاط اور سلیقے سے بیان کیا ہے اور حقائق کا چہرہ بالکل مسخ نہیں ہوا۔ جوش کے سلسلے میں اپنی یادداشتوں کو اس نہج پر منضبط کیا کہ موصوف سے پہلی ملاقات سے آخری ملاقات تک کے واقعات (گفتگو و ناگفتگو) محفوظ ہو گئے۔ مختصر یہ کہ اپنی ہمہ ساز صحبتوں کا اندوختہ، کامل دیانت سے قارئین

کے سامنے رکھ دیا ہے۔

اس کتاب میں جو واقعات، محفلوں کے تذکرے، دعوتوں، ادبی، شعری نشستوں اور بعض شخصیات سے ملاقاتوں کا ذکر ہے ان میں نہ تو مبالغہ آرائی ہے نہ کثر بیانی اور کسی حقیقت و صداقت کا جزوی یا کلی خلا۔ لیکن ان خوبیوں کے علاوہ بھی اس کتاب میں اور بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ان سب کا احاطہ اس مختصر سے اظہاریے میں ممکن نہیں۔ مثلاً حرف آخر کے اقتباس۔ یہ ایک طویل منظوم ڈرامہ ہے جو کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں، تخلیق کائنات و آدم و حوا قدیم روایات کی روشنی میں، حصہ دوم میں تخلیق کائنات جدید سائنسی ارتقا کی روشنی میں وغیرہ وغیرہ۔ خورشید علی خاں نے منظوم اقتباسات دیے ہیں جو نہ تو آپ کو جوش صاحب کی کسی کتاب میں ملیں گے اور نہ یہ کسی اور ناقد و مورخ کی کتاب میں۔ جوش نے مجھ سے دو تین بار اس طویل منظوم ڈرامے کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ وہ اس پر نظرثانی اور ترمیم و اضافہ کرنا چاہتے تھے اس لیے کہ سائنس نے گزشتہ نصف صدی میں جو ترقی کی ہے، اس کی روشنی میں یہ ضروری تھا۔ لیکن موت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ کام کر جاتے۔

اے بہا آرزو کہ خاک شدہ

اللہ سے چھیڑ چھاڑ فارسی اور اردو کے بیشتر شعرا نے کی ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالب

گلشن نیست کہ بر غالب ناکام چو رفت
می توان گفت کہ ہم بندہ خداوند نداشت

غالب

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں، تو بھی تو ہرجائی ہے

اقبال

خاموشی، جینے کا محشر ہیں جنوں میرا
یا چاک گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
محمد سے مے پینے کو شرم — بظاہر ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اقبال

آتی کو ٹال دے جبھی جانیں — دم بخود ہے تو پھر خدا کیا ہے
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے — کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے

مرزا یگانہ

جوش صاحب کو دراصل اُس خدا سے اختلاف رہا ہے جسے مذہبی پیشواؤں نے سلاطین اور شاہانِ تاج کلاہ کی طرز پر تراشا ہے۔ چنانچہ جوش صاحب والشکاف الفاظ میں کہتے ہیں۔

یاروں نے شخص کا تراشا ہے جو بت
افلاد ہے صرف اسی خدا کا منکر

خورشید علی خاں نے فکر و نظر اور تحقیق و تلاش کا ایک نیا دروازہ بھی کھول دیا ہے۔ یادوں کی برات میں حضرت جوش نے حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ میں اپنی ملازمت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ممکن ہے قارئین جوش اب تذبذب و تشکیک میں مبتلا ہو جائیں اور یہاں جوشش انھیں قابل قبول نہ ہو فرزندِ علی حیدر میموریل کمیٹی نے حکومت اترپردیش، یو پی، بھارت کے مالی تعاون سے ایک کتاب "جوش اور دیارِ دکن" سرفراز پریس لکھنؤ سے ۱۹۸۳ء میں شائع کی ہے۔ اس میں جوشش صاحب کی زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو اب تک ہیں پردہ تھے۔ اس کتاب کے مصنف جناب جوشش کی سن کے داماد مائل ملیح آبادی ہیں۔ اس میں بعض ایسی نظمیں بھی ہیں جو حضرت جوش کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہیں۔ مائل صاحب نے شوکت عثمانی کے نام سے ایک دستاویز کا بھی ذکر کیا ہے۔ چوں کہ اس کتاب میں جوش صاحب کی کسی بھی مستند تحریر کا عکس نہیں اسے صد فی صد صحیح تسلیم کرنے میں تامل ہو سکتا ہے۔ مائل صاحب کی اس کتاب میں جوش صاحب کی

ایک نظم۔ فقیر کی صدا۔ بھی ہے جو بقول اہل حضرت نظام کے روبرو پہلی یا دوسری حاضری کے موقع پر خود پڑھی تھی۔ بقول اہل جیسا کہ اس میں شامل نظم جوش اور درخواست جوش سے مترشح ہے۔ فردوسی کے شاہنامے کی طرز پر تاریخ دکن کو نظم کا جامہ بے مثل و مثال پہنانا چاہتے تھے۔ رزمیہ اور بزمیہ اشعار کے نمونے خورشید علی خان نے دیے ہیں۔

المختصر۔ ہمارے جوش صاحب۔ خورشید علی خان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ میرے خیال میں اس کتاب کو بھی یادگار افکار کے جوش نمبر کی طرح اہم نے اردو کے نصاب میں برائے مطالعہ شامل ہونا چاہیے۔ میں خورشید علی خان کو اپنے دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

دیں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

راجب مرادآبادی

۱۶-۱۰-۹۵

حرفے چند

جوش صاحب کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے حسن نے بھی ایک عالم کو مسحور کر رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے کردار کی کوشش ستیزیوں کی وجہ سے پر کشش انسانی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان کے گرد پند و ناپسند کا وسیع حلقہ قائم ہے۔ بہت سے لوگ جن محاسن کی وجہ سے ان کی مدح سرائی کرتے ہیں بعض دوسرے انھیں محاسن کو معائب گردانتے ہوئے ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اردو ادب کی تاریخ کا یہ ایک نادر واقعہ ہے کہ جوش کی زندگی میں ان کے خلاف ایک ادبی رسالے کا ضخیم جوش نمبر شائع ہوا جس میں درجنوں معاصرین نے جوش کے ان "عیبوں" کی نشان دہی کی جو اگر جوش میں نہ ہوتے تو ہم ایک طرح دار اور رنگا رنگ شخصیت سے محروم رہ جاتے۔ جوش کی شخصیت کے عیوب و محاسن پر اب تک جو گفتگو میں ہو چکی ہیں، ان کے پیشِ نظر یگانہ کے اس شعر پر گمان گزرتا ہے جیسے جوش ہی کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہو،

نکالے عیب میں سو حسن حسن میں سو عیب
خیال ہی تو ہے جیسا بندھے بندھ جائے

جوش صاحب کو اپنے خلاف فضا پیدا کرنے میں خود بھی مزہ آتا تھا۔ اسے ان کی سادگی کہیے یا کردار کی مضبوطی کہ غلط یا درست جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہ زبان پر آجاتی تھی۔ وہ اس سلسلے میں نفع و نقصان کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا خالص نفع تو ان کی شاعری تھی باقی جو کچھ تھا خسارہ ہی خسارہ تھا۔

تخلیقِ شعر کے لمحات کو چھوڑ کر، ان کی پوری زندگی مجلس آرائیوں میں گزری۔ ان

جناب مشفق خواجہ

مجلسوں میں زیادہ تر ایسے لوگ شریک ہوتے تھے جن کی ذہنی سطح مشاعروں میں داد دا کرنے والوں کی ذہنی سطح سے بلند نہیں ہوتی تھی۔ گفتگو کا معیار اس وقت بلند ہوتا تھا جب شرکائے مجلس میں خورشید علی خاں جیسے بلند فکر شامل ہو جاتے تھے۔ خورشید صاحب بارہ برس تک جوش صاحب کے قریب رہے۔ اتنے قریب کہ جوش صاحب کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ صحیح معنی میں خلوت و جلوت کے ہم راز تھے۔ ان سے جیسے محبان بے ریا جوش صاحب کی زندگی میں کم ہی آئے ہیں۔

خورشید صاحب مت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اردو اور فارسی ادب پر ان کی نظر مت گہری ہے۔ علوم عربی کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ ان کے علم و فکر کا صحیح اندازہ اس وقت ہو گا جب ان کی لکھی ہوئی غالب کے ان اشعار کی شرح شائع ہو گی جو متداول دیوان میں موجود نہیں ہیں۔ خورشید صاحب کی خوش ذوقی کا یہ حال ہے کہ انھیں ہزارہا اچھے شعر یاد ہیں اور جوش صاحب کا تو تقریباً پورا کلام حفظ ہے۔

جوش صاحب کی محفلوں میں عموماً علمی گفتگو ہوتی تھی لیکن خورشید صاحب کی موجودگی سے رنگ محفل بدل جاتا تھا۔ گفتگو کا معیار بلند ہو جاتا تھا اور ادب اور زندگی کے سنجیدہ مسائل زیر بحث آتے تھے۔ یقیناً یہ خورشید صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں جوش صاحب کی رفاقت میسر ہوئی۔ لیکن جوش صاحب بھی کم خوش قسمت نہیں تھے کہ انھیں خورشید صاحب سے تبادلہ خیال کے ذریعے جدید زمانے کے سب سے فکری مسائل و مباحث سے آگاہی ہوئی۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جوش صاحب جو ایک عرصے سے مطالعہ کتب سے دستبردار ہو چکے تھے، ان کی زندگی کے آخری چند برسوں میں نئے خیالات سے آگاہی کے لیے جو دریچہ کھلا، وہ خورشید علی خاں ہی کی صورت میں کھلا۔

جوش صاحب کی وفات کے بعد خورشید صاحب کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا اس کی تلافی انھوں نے اس طرح کی کہ جوش صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کو از سر نو گزارنا شروع کر دیا یعنی جو کچھ یاد تھا، اسے تحریری طور پر محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ کئی برسوں کی محنت کے بعد زیر نظر کتاب وجود میں آئی جسے جوش شناسی کی راہ میں سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں جوش صاحب کی زندگی کے آخری دس بارہ برسوں کی تفصیلات ہی نہیں ملتیں بلکہ

جوش صاحب کے ان خیالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے جو عام حالات میں ہوا میں تحلیل ہو جاتے مگر اب خورشید صاحب کی توجہ سے صفحۂ قرطاس پر محفوظ ہو گئے۔ یہی نہیں، اس کتاب میں جوش صاحب کی بعض نظموں کے پس منظر اور مطالب پر بھی فکر انگیز مباحث ملتے ہیں اور اس طرح یہ کتاب ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کا ایک ایسا وسیلہ بن گئی ہے جسے جوشؔ کا کوئی سوانح نگار، کوئی نقاد اور کوئی عام قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔

مشفق خواجہ

۱۹-۵-۹۵ء

جوش شناسی کا ایک نیا زاویہ

دنیا کی ایسی ہستیاں جو اپنی صلاحیتوں سے اپنے عہد میں کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیتی ہیں اور کسی نہ کسی عنوان سے تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں خدا مستقیم کی شخصیتیں ہوتی ہیں اس لیے ان کو گرفت میں لینے کے لیے مختلف جہات کی واقفیت ایک لازمی شرط بن جاتی ہے۔ ایسی ہی معروف اور غیر معمولی ہستیوں میں سے ایک حضرت جوش ملیح آبادی بھی تھے

ہر چند کہ جوش صاحب خود کو ایک کھلی کتاب کی طرح پیش کرنے کی سعی کرتے تھے اور انھوں نے نظم و نثر میں کھل کر اپنی زندگی کے نشیب و فراز اور گرم و سرد کا تذکرہ بڑے تسلسل کے ساتھ کیا ہے لیکن ان ساری تحریروں اور دستیاب حقائق کی مدد سے بھی کوئی ایک فرد جوش صاحب کی شخصیت کی مکمل تصویر بنا لینے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ایسا دنیا کی غیر معمولی شخصیتوں کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

سودا نے یہ کمال کا شعر کہہ دیا ہے۔

جو حال ہے سودا ترا، اچھا تو نہیں ہے
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

اس میں معروضیت (OBJECTIVITY) اور موضوعیت (SUBJECTIVITY) کی جدلیات اور اس سے تعلق رکھنے والی نفسیات کا بڑا خوبصورت اظہار ملتا ہے اور اس سماجی اضافیت کی سمت بھی نشان دہی ہوتی ہے جو انسانی روابط و تعلقات میں ناگزیر ہے اور اصل

پروفیسر سحر انصاری

معروض اور موضوع کا باہمی رشتہ اپنی ایک الگ منطق اور جداگانہ روش رکھتا ہے۔

خورشید علی خاں صاحب ایک ادب دوست شخصیت ہیں۔ انھیں شعر و شاعری، ادب، فلسفہ اور نفسیات سے گہرا لگاؤ ہے۔ غالب اور جوش کے تو وہ عاشق ہیں۔ غالب سے بالمشافہ ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔ بس انھوں نے دیوانِ غالب ہی کو "دیوانِ ملاقات" بنا رکھا ہے۔ جوش صاحب سے البتہ ان کا ایک مرتبہ تعارف ہو ہی گیا اور ایسا ہوا کہ جوش صاحب کے انتقال کے بعد بھی خورشید صاحب اسی طرح جوش شناسی کا حق ادا کرنے کے پیرایے ڈھونڈ کرتے ہیں جس طرح جوش صاحب کی زندگی میں ان کا طریقہ تھا۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے، جوش ملیح آبادی کی شخصیت اور فن کا احاطہ کسی ایک فرد یا ایک زاویے کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا غالب کے بارے میں حالی کی کتاب پڑھ کر کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ اگر انھیں ڈاکٹر جانسن کی طرح کوئی باسویل یا گیٹے کی طرح کوئی ایکرمان مل جاتا تو صورت کتنی مختلف ہوتی۔ جوش صاحب کے ضمن میں بھی یہی خیال آتا ہے کیوں کہ جوش صاحب کی محفلیں ہر لحاظ سے ایک بڑے تخلیقی ذہن کی محفلیں ہوتی تھیں۔ جوش صاحب شاعرانہ اوصاف کے علاوہ خوش گفتاری کا ہنر بھی رکھتے تھے۔ باتوں باتوں میں ایسے خیالات ایسے سجے سجائے الفاظ میں ادا کر دیتے تھے جو مستقل کے لیے سخت غور و خوض کے بعد بھی ممکن نہیں ہوتا۔ نکتہ آفرینی، لفظوں کا تخلیقی برتاؤ اور بذلہ سنجی ان کی ہر نشست کی خصوصیات میں شامل تھی۔

جوش قسمتی سے خورشید علی خاں صاحب کو ایک خاص مدت تک جوش صاحب سے روزانہ ملاقات کا موقع میسر آ گیا اور انھوں نے اپنے بھائی کے ہمراہ گھنٹوں جوش صاحب سے ایسے سوالات کیے جن سے جوش صاحب کی شاعری، طرزِ حیات اور فکر و خیالات کے متعدد اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ خورشید صاحب اپنے ماحول میں واپس آ کر اس ساری گفتگو کو قلم بند بھی کر لیتے تھے۔ اس طرح جوش صاحب کے بارے میں انھی کے الفاظ میں، ایک اچھا خاصا دفتر اکٹھا ہو گیا ہے۔ خورشید علی خاں صاحب کا حافظہ سایت عمدہ ہے اور انھیں مطالعے یا مشاہدے میں آ جانے والی کسی بھی بات کو اس کی جزئیات کے ساتھ من و عن بیان کر دینے کا ملکہ حاصل ہے۔

خورشید علی خاں صاحب نے جوشؔ صاحب کے تعلق سے جو یہ کتاب ہمارے جوشؔ صاحب" لکھی ہے وہ ان کی روزانہ ڈائری لکھنے کے شغف جوشؔ صاحب سے عقیدت و محبت اور قوی حافظے کا نتیجہ ہے۔ خورشید صاحب پلاٹنس و سال کی منزل پر فائز ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کی سمت متوجہ ہوئے ہیں۔ مضامین تو وہ ایک مدت سے لکھ رہے ہیں لیکن اب تواتر اور تسلسل سے کتابوں کی باری ہے۔ اسی سال وہ مشہور شاعر کیفی اعظمی کے بارے میں "جشنِ کیفی" (دو جلد) کے موضوع پر ایک کتاب پیش کر چکے ہیں جو بلاشبہ ایک یادگار تصنیف ہے۔ اب جوشؔ صاحب پر خورشید صاحب کی کتاب منظر شہود پر آیا ہی چاہتی ہے اور غالب کی تقسیم کے ضمن میں ایک ضخیم کتاب منتظر اشاعت ہے۔

جوشؔ صاحب کے بارے میں اس کتاب کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس کی چند انفرادی خصوصیات تو ایک مطالعے ہی میں واضح ہو جاتی ہیں۔ اس کتاب میں جوشؔ صاحب سے انسان کائنات اور خدا جیسے بنیادی موضوعات پر سوال کیے گئے اور ان کے بارے میں جوشؔ صاحب کے افکار و خیالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ جوشؔ صاحب کا مفکرانہ ذہن زندگی کے مختلف مسائل کے ضمن میں کیا اور کس سطح سے سوچتا تھا اس کا ایک مربوط اور فکر انگیز جواب اس کتاب میں ملتا ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی نے انقلاب، شباب، سیاست، مذہب، سائنس، نفسیات، تصوف و معاشرتی اقدار۔ غرض ہر زاویۂ حیات سے اپنا گہرا اور زندہ تعلق قائم رکھا اور ہر ایک شعبے پر خلاقانہ دسترس کے ساتھ سوچا اور لکھا ہے۔ پھر ان کی شاعرانہ تمثالیں اور لفظیات اپنا ایک جداگانہ رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔ ان کی فکر اور تخیل کی پرواز جب ان کے مخصوص ڈکشن میں ڈھل جاتی ہے تو اس تک رسائی حاصل کرنا بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں رہتی۔ خود جوشؔ صاحب نے ایک جگہ کہا ہے۔

الفاظ کے سر پر ہیں اڑتے معنی
الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھو

اس نکتے کو خورشید صاحب نے پوری توجہ اور بصیرت کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے چنانچہ اس کتاب میں ایک طرف تو جوشؔ صاحب کے کلام کا خاصا اہم انتخاب بھی شامل ہے جس میں

بیشتر مخطوطات غیر مطبوعہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ "حرف آخر" کا جتنا حصہ خورشید صاحب نے "ہمارے جوش صاحب" میں شامل کیا ہے، اتنا اس سے پہلے کہیں اور شائع نہیں ہوا۔ پھر اس پوری کتاب میں جگہ جگہ خورشید صاحب نے کلام جوش کی تشریحات بھی کی ہیں۔ بیشتر نظموں کے پس منظر بیان کیے ہیں اور کئی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

خورشید صاحب کی یہ تمام تر مساعی یقیناً جوش شناسی کی راہ کو روشن تر کر رہی ہے۔ جوش پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ان کی یہ کتاب ناگزیر ماخذ کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ خورشید علی خاں صاحب کا انداز تحریر نہایت شگفتہ اور شستہ و رواں ہے۔ اور یہی ہر اچھی کتاب کی پہلی شرط ہوتی ہے کہ وہ (READABLE) ہو۔ "ہمارے جوش صاحب" جوش شناسی کے خزانے میں ایک اہم اضافہ ہے۔

اگست ۱۹۹۵ء

سحر انصاری
صدر شعبہ اردو
کراچی یونیورسٹی

آندھی جاگی ہے شاخِ سار و ہُشیار
ذرات ہمک رہے ہیں تار و ہُشیار

اِک زلزلۂ وہم شکن راہ میں ہے
اے دیر و کلیسا کے منار و ہُشیار

دیباچہ

ہندوستان کے شہر لکھنؤ سے تقریباً تیرہ میل کے فاصلے پر سرسبز و شاداب کھیتوں اور آم کے گھنے باغوں کے درمیان سرحدی پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی بستی ملیح آباد ہے۔ اب تو لکھنؤ نے بڑھ کر ملیح آباد کو اپنے دامن میں اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ وہ اس کا ایک محلہ معلوم ہوتا ہے مگر ہم جس زمانے کی بات کر رہے ہیں، اس وقت لوگ ملیح آباد سے لکھنؤ ریل کے ذریعے جایا کرتے تھے جیسے ایک بستی سے دوسری بستی کو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ملیح آباد اپنی دو چیزوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایک تو وہاں کے آم اور دوسرے حضرت جوش ملیح آبادی۔

جوش صاحب اپنی سوانح حیات "یادوں کی برات" میں ملیح آباد کے متعلق لکھتے ہیں۔

"آم کے باغوں کی رسیلی اور گمبھیری چھاؤں میں جھومتا، بور کی بوئے مستانہ سے مہکتا، کوئلوں کی کوکو اور پپیہوں کی پی پی سے چہکتا ملیح آباد ہندوستان کی تہذیبی جنت یعنی لکھنؤ سے تقریباً تیرہ میل کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے جس کے ایک گوشے میں ہم لوگ یعنی درہ خیبر سے آئے ہوئے آفریدی اور دوسرے گوشے میں قندھار سے آئے ہوئے قندھاری آباد ہیں"۔

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کے پردادا نواب فقیر محمد خاں گویا کے دادا یار بیگ خاں درہ خیبر کے آفریدی سرداروں میں سے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے محمد بلند خاں اپنے دو بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کو ساتھ لے کر ہندوستان آ گئے تھے۔

فقیر محمد خاں گویا:

محمد بلند خاں لکھنؤ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ ان کے بیٹوں میں فقیر محمد خاں نے بڑا نام پیدا کیا۔ اور لکھنؤ کی سرکار سے شہر جنگ حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں کے خطابات سے نوازے گئے۔ انھوں نے لکھنؤ کے مضافات میں جائے داد پیدا کی اور شیخ آباد میں اپنے محلات تعمیر کروائے۔ شاعر تھے اور گویا تخلص کرتے تھے۔ صاحب قلم بھی تھے اور صاحب سیف بھی اس طرح بزم اور رزم دونوں جگہ ان کی شہرت بے مثال تھی۔ ان کا دیوان "دیوان گویا" کے نام سے کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے مگر اب کمیاب ہے۔ ان کا انتقال ۱۸۰۰ء میں ہوا۔ (بحوالہ "صاحب سیف و قلم" از جعفر شیخ آبادی) ان کا ایک شعر:

دلوں جوش جنوں کا تھا بھی تک گویا
نظر آیا نہ کوئی آبلہ پا میرے بعد

نواب محمد احمد خاں:

گویا کے بیٹے اور جوش صاحب کے دادا نواب محمد احمد خاں بھی صاحب دیوان شاعر تھے احمد تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان "مخزن الکلام" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کمسنڈی غورو کے تعلقہ دار تھے اور بقول جوش صاحب "جسمانی اور جنسی طاقت کے اعتبار سے ایک غیر معمولی انسان تھے۔ ان کی (۲۵) (۲۰) بیویوں سے ایک سو بارہ (۱۱۲) بچے پیدا ہوئے"۔ اتنے بچوں میں ان کی آبائی جائے داد کا جو حشر ہوا اس کو جوش صاحب نے یوں بیان کیا ہے کہ "جس طرح ململ کی چادر کو ہوا کے اوپر ڈال کر اور پھر زور سے کھینچ کر تار تار کر دیا جائے اسی طرح انھوں نے اپنی جائے داد کے ٹکڑے اڑا کر رکھ دیے"۔ ان کا انتقال ۱۸۰۰ء میں ہوا۔

نواب بشیر احمد خاں:

نواب احمد خاں کے بیٹے نواب بشیر احمد خاں جوش صاحب کے والد تھے۔ ان کا شمار بھی شیخ آباد کے رؤسا میں تھا۔ ورثے میں دو موضعات محمد نگر اور سیدا پور اور اس کے علاوہ متعدد تعلقات اراضی ملے تھے۔ نواب بشیر احمد خاں بھی شاعر تھے اور بشیر تخلص کرتے تھے

ان کا دیوان "کلام بشیر" کے نام سے شائع ہوا۔ مست صاحب اور مسلیں رہان میں شریک تھے۔
ان کا ایک شعر ہے۔

ہم بھی کل ان کو دیکھ آئے بشیر
واہ کیا دیکھنے کی صورت ہے

ان کی شادی آگرے کے ایک رئیس گھرانے میں بسم اللہ بیگم سے ہوئی جن کی والدہ راجپوت تھیں مگر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ نواب بشیر احمد خاں کا انتقال چالیس (۴۰) سال کی عمر میں ۱۸۹۰ء میں ہوا۔ جوش صاحب کی والدہ بسم اللہ بیگم شیعہ عقائد رکھتی تھیں اور عظمت اہل بیت کی قائل تھیں۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے بادشاہ اور امرا سب شیعہ تھے اس لیے شیعہ عقائد لکھنؤ کی ثقافت کا ایک اہم حصہ بن گئے تھے۔ چنانچہ بسم اللہ بیگم کی خواہش پر ملیح آباد میں پہلا امام باڑہ قائم کیا گیا۔ جہاں محرم میں تعزیے اٹھائے جاتے اور مجالس عزا منعقد کی جاتی تھیں۔ جوش صاحب کے عقائد کی تشکیل میں اس ماحول اور ان کی والدہ کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔

نواب بشیر احمد کا خاندان:

نواب بشیر احمد خاں اور بسم اللہ بیگم کی سات اولادیں تھیں۔

(۱) اکبر جہاں
(۲) شفیع احمد خاں
(۳) شبیر حسن خاں (جوش ملیح آبادی)
(۴) انیس جہاں
(۵) رئیس احمد خاں
(۶) عظمت خاں
(۷) شوکت جہاں

جوش صاحب ملیح آباد میں ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء کو صبح چار بجے پیدا ہوئے۔ اپنی سوانح حیات "یادوں کی برات" میں جوش صاحب نے اپنے حصول علم کے متعلق جو تفصیل

بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کالج کی تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے مگر عربی، فارسی، اردو اور ادب کا علم، اس دور کے نہایت مستند اساتذہ سے حاصل کیا تھا۔ شاعری میں اصلاح کے لیے والد صاحب نے حضرت عزیز لکھنوی کو ان کا استاد مقرر کر دیا تھا۔ جوش صاحب تقریباً پانچ چھ سال تک ان کے شاگرد رہے۔ اس تعلق سے جوش صاحب نے لکھا ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عزیز بہت اچھے استاد اور بہت بڑے علم بزرگ تھے اور جہاں تک زبان کی صحت اور لہجے کی لطافت کا تعلق ہے ان کی ذات سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا لیکن جب مجھ کو واضح طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ میری فکر کا جادہ ان سے مختلف ہے اور ہم دونوں کی تخیل ایک ہی سمت سفر نہیں کر رہی ہے اور ان کی اصلاح سے اشعار کا لفظی رنگ و روغن تو ضرور نکھر آتا ہے لیکن معنویت دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے تو میں نے اصلاح لینا ترک کر دیا۔"

جوش صاحب کی ابتدائی تعلیم پہلے گھر پر پھر سیتاپور کے سکول میں اس کے بعد لکھنؤ کے حسین آباد والا سکول میں ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے مگر کچھ ہی دن بعد لکھنؤ آ گئے۔ اس کے بعد آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل کر دیے گئے تاکہ سینئر کیمبرج پاس کر لیں مگر ۱۹۱۶ء میں جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو یہ سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا اور وہ اپنے گھر آ گئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس (۲۰) برس کی تھی۔ یہاں آ کر انھوں نے زمیندار کی حیثیت سے اپنے قصبہ ملیح آباد میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۲۰ء میں اپنے وطن میں ایک مکان تعمیر کروایا جس کا نام قصر سحر رکھا۔ اس زمانے میں انھوں نے خود کو عبادت و وظائف میں مشغول کر لیا۔ داڑھی رکھی اور نہایت پابندی سے نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے لگے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نمازوں کے وقت کمرہ بند کر کے سجدہ اور گریہ و زاری کرتے اور اس قدر طویل رکوع و سجود کے ساتھ نمازیں پڑھتے کہ قرون اولیٰ کے سچے مسلمانوں کی یاد تازہ کرنے لگتی۔

قصر سحر کی سکونت کے زمانے میں وہ اپنے حصے میں ملے باغوں کی دیکھ بھال اور ۴۰ بیگھے زرخیز زمین پر فصل اگا کر ان کی پرورش اور نگرانی کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری اور نثر کی کتابیں بھی منظر عام پر آنے لگیں۔ ۱۹۲۱ء میں ان کی شاعری کی پہلی کتاب

"روح ادب" شائع ہوئی جس پر اس دور کے ادیب اور دانشور رفیع احمد جاں ام۔ اے نے مقدمہ لکھا اور حضرت اکبر الہ آبادی نے اپنی تعریفی رائے لکھی۔ علامہ عبدالماجد دریا بادی اور علامہ اقبال نے ان کے خیالات اور شاعری کی تعریف کی۔ ملک کے نامور مشاہیر نے روح ادب پر تبصرے لکھے۔ اس سلسلے میں ان کے سیاسی مضامین کے مجموعے مقالات رزیں، اوراق سحر بھی شائع ہوئے۔ دو طویل نظمیں "جدبات فطرت" اور "آوازہ حق" بھی ۱۹۱۸ء کی لکھی ہوئی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئیں۔ بعد میں ان کو "شعلہ و شبنم" میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح ۱۹۲۱ء تک جوش صاحب ہندوستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں تو مشہور ہو ہی گئے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ملک کی تمام سیاسی شخصیتوں سے بھی متعارف ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ کانگریس کے احمد آباد والے اجلاس میں شریک ہوئے اور وہاں ان کی ملاقات مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، دیبے لکشمی پنڈت، مدن موہن مالویہ، مولانا محمد علی، شوکت علی جیسے ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں سے ہوئی۔ گو اس اجتماع میں بھی جوش صاحب کی دلچسپی سیاست سے زیادہ حسن پرستی ہی سے معلوم ہوتی ہے اور یہاں بھی وہ ایک دانشمند دوشیزہ کا دیوانہ وار پیچھا کرنے سے نہیں چوکے۔ وہ احمد آباد سے واپسی پر رستے میں ایک اسٹیشن کے باہر سگنل نہ گرنے کی وجہ سے جب ریل جنگل میں کچھ دیر کے لیے رکی تو یہ جنگل کی ایک شاہزادی کو دیکھ کر ریل سے اتر پڑے اور ریل چل دی ——

کراچی میں ایک بزم میں جوشؔ صاحب سے پوچھا گیا یہ نظم جنگل کی شاہزادی سنائی تھی تو میں نے ان سے دریافت کیا تھا کہ جب ریل چلی گئی اور آپ اس حسینہ کے ساتھ جنگل میں اکیلے رہ گئے تو پھر کیا ہوا؟ تو جوشؔ صاحب نے فرمایا کہ اس جگہ سے اسٹیشن قریب تھا اور چونکہ رات ہو چکی تھی اس لیے وہ لڑکی ان کو لے کر اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں آ گئی جہاں وہ دونوں صبح تک باتیں کرتے رہے اور صبح کی گاڑی سے اجمیر روانہ ہوئے۔ واللہ عالم۔

جوشؔ صاحب کا ایک شعر ہے۔

ہر اسٹیشن پہ وہ اک زخم کاری دل پہ کھاتے ہیں
سفر کرتے ہیں یا ہم جنگ کے میداں میں جاتے ہیں

اجمیر سے جب لکھنؤ آئے تو وہاں ان کی ملاقات رابندر ناتھ ٹیگور سے ہوئی اور انھوں

نے جوش صاحب کو شانتی نکیتن آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ چھ مہینے تک شانتی نکیتن میں بھی رہے اور ٹیگور کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد جب بیگم نے تار دے کر ان کو ملیح آباد بلوا لیا تو واپس آ کر پھر جائے داد کی دیکھ بھال میں مشغول ہو گئے۔ مگر جوش صاحب کا مزاج اور طبیعت کی افتاد ایسی تھی کہ زمینداری کے پیچیدہ معاملات ان کے بس کا روگ نہ تھے۔ ان کو قدرت نے فکر، شاعری اور علم و ادب کی گتھیاں سلجھانے کے لیے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ جب بیوی نے یہ محسوس کیا کہ ان کی جائے داد کی آمدنی ان کے اخراجات کی کفیل نہیں ہو پا رہی ہے تو انھوں نے جوش صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کہیں ملازمت تلاش کر لیں تاکہ معاش کی طرف سے کچھ اطمینان نصیب ہو۔

اتفاق سے انہیں دنوں میں جوش صاحب کو کسی حیدرآبادی خاتون سے عشق ہو گیا جس سے مجبور ہو کر انھوں نے ریاست حیدرآباد میں نوکری تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس سلسلے میں سفارشات فراہم کرنا شروع کر دیں۔ اس واقعہ پر جوش صاحب "یادوں کی برات" میں اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ "یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ سفر دکن حال ایک معاشی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ میری ایک روحانی گتھی بھی ایسی تھی جو حیدرآباد جائے بغیر کھل ہی نہیں سکتی تھی"۔ اس کے بعد حاشیے میں فرماتے ہیں کہ "حیدرآباد پہنچ کر میں نے "تیرے لیے" کی سرخی سے ایک نظم بھی کہی تھی" جو حسب ذیل ہے۔

"تیرے لیے"

دیکھ کیوں کر جی رہا ہوں دل دیا تیرے بغیر
ہر نفس ہے اک حادثہ کربلا تیرے بغیر
مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے واسطے
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لیے
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لیے
میں کہ آسودہ سکوں میں پا چکا تھا آپ کو
پھر محیط کشمکش میں کھو گیا تیرے لیے

حسرتیں دل کی رواں ہیں کارواں در کارواں
ہر نفس ہے عمر بھر میں بانگ درا تیرے لیے

آرزو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابن رئیس
بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لیے

شرع سے درخواست کرتا ہوں کشود کار کی
کھٹکھٹاتا ہوں در دار القضا تیرے لیے

تو اک لمحے کی خاطر کہنا پڑتا ہے مجھے
شیخ سے نادل کو مرد خدا تیرے لیے

جب بلاں ہے خسرو کے ناسزا اقوال کو
ناسب پڑتا ہے بے چین و جفا تیرے لیے

چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس
زیب تن کی ہے فقیری کی قبا تیرے لیے

شرط پوری ہو چکی اللہ اب تو رحم کر
دیکھ کیا تھا جوشش اور کیا ہو گیا تیرے لیے

غرض جوش معاش اور وصال محبوب کی خواہش کے علاوہ جوش ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خواب میں تشریف لائے اور ان کو ریاست حیدر آباد میں نظام دکن کے پاس جانے کا حکم دیا اور وہاں دس برس تک رہنے کی ہدایت دی۔ جوش صاحب نے اپنی بیگم سے یہ خواب بیان کر کے، اگر ایک طرف حیدر آباد جانے کی اجازت حاصل کی تو دوسری طرف جب وہ حیدر آباد پہنچے تو نظام دکن کو اس خواب کے ذریعے اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے جوش صاحب کی مرضی کے مطابق ان کا تقرر پہلے انگریزی ادب کے مترجم کے طور پر کیا اور پھر ان کو مشیر ادب کے عہدے پر فائز کر دیا۔

بہرحال جوشش صاحب خواہ اپنی معاشی مجبوری کے تحت حیدر آباد گئے ہوں یا کسی محبوبہ کے عشق میں گرفتار ہو کر دل کے ہاتھوں مجبور ہوئے ہوں یا دونوں ہی وجوہ سے، انھیں ترک وطن کرنا پڑا ہو۔ ۱۹۲۲ء میں ملیح آباد سے رخصت ہو کر حیدر آباد پہنچے تھے۔ وہاں ان کی

وسائی نظام دکن نواب میر عثمان علی خاں کے دربار میں کیسے ہوئی اور ان کو جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں ملازمت کیسے ملی ان تمام باتوں کی تفصیل خود جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں بیان کر دی ہے اور ممکن ہے وہ سب باتیں بالکل اسی طرح سے واقع ہوئی ہوں جیسے انھوں نے بیان کی ہیں مگر ان کی سن کے داماد جناب مائل ملیح آبادی نے جو واقعات اپنی کتاب "جوش اور دیار دکن" میں بیان کیے ہیں وہ ایک اور ہی نقشہ پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں سرفراز پریس لکھنؤ سے فرزندین علی احمد سعید علی کیفی حکومت اترپردیش کے ان تعاون سے چھپ کر منظر عام پر آئی ہے۔ مجھے یہ کتاب حیدرآباد دکن کے ایک بک اسٹال سے ملی ہے اور اس میں جوش صاحب پر کام کرنے والوں کے لیے بعض بہت مفید معلومات ہو سکتی ہیں اور حیات جوش کے بعض ایسے پہلو بھی اجاگر ہو سکتے ہیں جو ابھی تک منظر عام پر کم از کم پاکستان میں نہیں آئے۔ اس کتاب میں بعض ایسی نظمیں بھی ہیں جو جوش صاحب کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔ مائل صاحب نے اپنی کتاب میں جوش صاحب سے منسوب ایک غیر مطبوعہ دستاویز کا ذکر کیا ہے جو "شوکت عثمانی" کے نام سے کسی خوش خط کاتب نے لکھی ہے۔ کتاب پر جوش صاحب کے قلم کی کوئی تحریر نہیں ہے نہ اس پر ان کے دستخط ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب نے اس کتاب کی کئی نقلیں تیار کروائی تھیں اور ان کو مشاہیر دکن کی خدمت میں پیش کر کے ان میں سے بعض کی آرا کو کتاب کے آخری حصے میں شامل کر دیا۔

نواب صدری یار جنگ کے والد نواب عماد الملک جن کے سفارشی خط کا جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں ذکر کیا ہے "شوکت عثمانی" میں ان کا بھی تبصرہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوش صاحب کی اس وقت تک کی تقریباً تمام تخلیقات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کا مطالعہ بھی کر چکے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے

"آپ کے بے نظیر رسائل اردو روح ادب، مقالات نذیری، اوراق سحر، جذبات فطرت اور آوازہ حق پہنچے۔"

اس پر جناب مائل ملیح آبادی لکھتے ہیں "یہی جوش صاحب حیدرآباد گئے تو ان کے یہ رسائل اور کتابیں بھی حیدرآباد پہنچ چکی تھیں اور اہل نظر میں تقسیم کی جا چکی تھیں۔ اس

طرح جوش صاحب پوری تیاری کے ساتھ حیدرآباد پہونچے تھے اور کسی کی سفارش یا کوشش کی بجائے اپنی علمی لیاقت اور شاعرانہ عظمت کا لوہا منوانا چاہتے تھے۔ کچھ بھی ہو ہمارے پاس جوش صاحب کی غیر مطبوعہ کتاب "شوکت خیال" میں وہ تفصیلی پروگرام ہے جو جوش صاحب نے نظام دکن کے سامنے پیش کیا تھا۔ انھوں نے پہلی یا دوسری حاضری کے وقت جو نظم پڑھی تھی وہ ہم نیچے لکھ رہے ہیں جو آج تک کہیں طبع یا شائع نہیں ہوئی ہے۔

"فقیر کی صدا"

قریب ہے کہ ڈبو دے مجھے ہوائے فساد
سنبھال جلد مقید دکن کی باد مراد

گھرا ہوا ہوں کچھ اس طرح آفتوں میں کہ ہے
بغل میں میرے سر پہ تیشۂ فرہاد

مرا نہ جوہر تکمیل شاعری افسوس
مرا نہ دست ہنر ہائے نوبلیتن فریاد

بزرگ تر ز ہنر در زمانہ چیست نیست
زمیں سپرس کہ ایں عیب بر تو چاں افتاد

در دیں زمانہ چو فریاد رس نمی بینم
مرا رسد کہ رسانم بگوش شہ فریاد

گرچہ قوت تحصیل و زور فکر سے کج
مرے دماغ پہ قائم ہے شعر کی بنیاد

مگر جہاں میں اس حد کا میں کہ نام ہے
مرے وجود کی نسبت سے قوم آدم زاد

مجھے فلک نے دیا ٹھیکرا گدائی کا
کبھی تھے صاحب جاہ و حشم مرے اجداد

مگر یہ بات برائی نہیں ہے دنیا میں
ہمیشہ فکر پہ واجب ہے فضل کی بنیاد

پسند ہوتی ہے جس ذات کی خوش الحانی
اسی پہ دام بچھاتا ہے ڈھونڈ کر صیاد

رہتے رہتے ہیں جن کے دلوں سے چشم و نور
انھیں کو رکھتی ہے سب تشنہ بخت کی بیداد

جو سر جھکے ہوئے فکر سخن میں رہتے ہیں
انھیں پہ تیغ لٹاتا ہے چرخ کج بنیاد

نگاہ عود سے تمہیں پہ جو کی تو کھلا
کمال فن ہے حسین اور زمانہ ابن زیاد

نہ تنگ کرتی جو دنیا تو اس گدائی کو
قبول کرتی نہ شاعر کی فطرت آزاد

مگر میں نے کہا کیا ہے میری حقیقت کیا
ترے حضور تو خم ہے سر غرور قباد

فروغ شمع تبسم ترا ہر یک سخن
نسیم باغ ترنم ترا ہر یک ارشاد

خیال راہ ترا قافلۂ روح ہستی
نشان پا ہے ترا تاج عالم ایجاد

ازل میں تجھ کو بنا کر جمال مطلق نے
بیاض حسن پہ تیری کیا ہے آنکھ سے صاد

نہیں ہے تیرے برابر جہاں میں کوئی ادیب
نہیں ہے تجھ سا کوئی فن شعر میں استاد

عطا ہوئی ہے وہ تجھ کو نظر کہ تیری طرح
نہ ہو گا دہر میں باریک بیں کوئی نقاد

ترے قلم کی ہے جنبش کہ رقص باد سحر
تری رقم ہے کہ ہے نقش مانی و بہزاد

ترے جمال سے رنگیں ہے گلشن ایجاد
ترے جبیں سے درخشندہ مجلس بہزاد

ترے کرم کے لیے جمع ہوں ابھی اضداد
مصالحت کے لیے جمع ہوں ابھی اضداد

خزاں کے دور میں چلنے لگے نسیم مراد
تو عاشقوں کے دلوں کی ہوں بستیاں آباد

ترے وکن کی دل آویزیوں پہ قرباں ہے
نسیم خاک معطر و آب رکنا باد

بجائے طعنہ گر تیغ ہی زند دشمن
ز شاہ دست تدبیر ہر چہ بادا باد

دم کہ محرمن اسرار بود دست قضا
ورق بہ بستہ و کلیدش بہ دست عثماں داد

تو تا بروئے من اے شہر یار دہ لبق
دگر جہاں در شادی بروئے من نکشاد

ستم ہے تیرے زمان عطا بخشش میں
ہو ایک شاعر خوش گو کی زندگی برباد

شکستہ دل بہ در گلبت آدم کہ طبیب
بہ موسیاں لطف تو ام نشانی داد

ملا تھا پھر سے زلیخا کو جس طرح سے شباب
ہوا تھا قید سے جس طرح یاد مصر آزاد

اسی طرح تجھے حاصل ہو مدعا میرا
یونہی ہمارے کی بابت بر آئے تیری مراد

نجل نہ ہونے دے تجھ سے مرے کمالوں کو
ادھر بھی ایک نظر اے امیر نیک نہاد

بہا دو فیض کا دریا جو پی ہو میں چلے
اچھالتا ہوا موتی سوئے لیج آباد

دعا پہ ختم کر اے جوش اب یہ نظم طویل
کہ شہر یار دکن کامراں و زندہ باد

اس کے بعد جناب مائل لکھتے ہیں کہ "یہ درخواست جوش صاحب نے نظام کو سنائی یا پیش کی، ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں ہیں لیکن یہ نظم "شوکت عثمانی" میں ہے۔ اسی شوکت عثمانی میں جوش صاحب کی ایک درخواست بھی ہے جو پہلے دن اپنی "لقیر کی صدا"

سنانے کے بعد پیش کی ہوگی یا پیش کرنا چاہتے ہوں گے۔ وہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت ظل سبحانی، حامی دین و ملت، خسرو دارا صولت،
عارف نکتہ شناس، حامی ارباب کمال، تاجدار سکندر جلال
حضرت سرکار عالی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

بہ بارگاہ، نجم سپاہ . . . . . بجی رسانند

مشرقی تہذیب و شرافت کا معیار، اور پرست یورپ کے آداب و تہذیب و آئین تمدن سے ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ انتہائی زبان و قلم سے اپنی ثنا و صفت کا اظہار ایک ایسا فعل مکروہ ہے جو کسی طرح بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

(۱) اور اسی بنا پر عریضہ نگار یہ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی ناچیز اور غیر مستند شخصیت کو جامعہ عثمانیہ کی مستقل خدمت کے واسطے کیوں ہر طرح قابل انتخاب سمجھتا ہے۔

(۲) اور اسی طرح اس کے وجوہ بھی نہیں بیان کر سکتا کہ تاریخ دکن کو فردوسی کی سی قوت بیان کے ساتھ شاہنامے کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے وہ اپنی ذات کو کن مناسب خاص کی بنا پر اس درجہ موزوں تصور کرتا ہے۔

(۳) جامعہ عثمانیہ کی خدمت کے متعلق عجیب عالی خیالات عریضہ نگار کے دل میں تڑپ رہے ہیں۔ اگر قسمت نے مساعدت کی تو اپنے مقدور کے اندر دکھا دے گا کہ ایک ایسے دارالعلوم سے جس کی بنیاد خالص زبان اردو پر ہو اور جس کا سنگ بنیاد دکن کے موجودہ بیدار مغز اور صاحب فکر تاجدار نے رکھا ہے، کس قدر معمول لیاقت کے طالب علم برآمد کیے جا سکتے ہیں؟

نیز تاریخ دکن کے متعلق بھی اس کے دل میں خاص جذبات موجیں مار رہے ہیں اور صدہا عجیب و غریب روشنیاں اس کے دماغ میں رقص کر رہی ہیں۔ وہ تاریخ دکن کو صرف

نظم کا نادر لباس ہی نہ پہنائے گا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اوراق کو دکن کے موسموں کی رنگین تصاویر، دکن کی قابل ذکر ہستیوں کے فوٹو، دکن کے قدیم و جدید رسم و رواج اور عمارات کے نقشوں سے اس طرح آراستہ و پیراستہ کر دینے کی تمنا رکھتا ہے کہ زمانے کا کوئی انقلاب حوادث کی کوئی زبردست گردش اس کے ایک نقش کو بھی دھندلا نہ کر سکے۔

اس کے علاوہ یہ خادم دکن کا ماضی و مستقبل، دکن کے کارنامے اور خدمات، دکن کی جائے وقوع اور دکن کی سیاسی اہمیت پر بھی اس طرح روشنی ڈالنا چاہتا ہے کہ ادبی لطافتوں کے دوش بدوش یہ مجموعہ ایک انتہائی "کارآمد" اور "مفید" تصنیف کا خطاب بھی حاصل کر سکے۔

(۴) جامعہ عثمانیہ اور تاریخ دکن ان دونوں کی خدمات کا دلدادہ تو اس ناچیز عریضہ نگار کے دل میں ضرور ہے لیکن ان چیزوں کے واسطے اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے اس کے منہ میں زبان نہیں۔ ہر چند اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ قدردان تاجدار کی بارگاہ میں اپنی خصوصیات کے متعلق کچھ عرض کرے مگر تکلم کے نازک جذبات کو ٹھیس لگتے دیکھ کر اس کی زبان دہن میں اس طرح جنبش کر کے رہ جاتی ہے جس طرح نسیم سحر کی نرم رو میں گلاب کی پنکھڑی یا جذبات کی کشاکش اور کلام کے دوق میں گونگے کے لب۔

(۵) غریب شاعر یوں شاہی میں داخل ہوتا ہے۔ سر جھکائے مودب اور خاموش اس کے ایک ہاتھ میں اس کی ناچیز تصانیف ہیں جن ان عقیدوں کے جنھیں ملک کے مسلم الثبوت ارکان علم و ادب نے اس کے مرصعات کے متعلق لکھا ہے اور دوسرے ہاتھ میں وہ نظم جو اشتہار (رزمیہ بزمیہ) نظمیں ہیں جنھیں تاریخ دکن کے موضوع پر اس نے بطور نمونہ پیش گاہ نظر میں گزرانے کے لیے اس مختصر قیام حیدرآباد کے اثنا میں تحریر کیا ہے۔ اور یہ دونوں نتائج افکار جوہر شناس نظر میں خود فیصلہ کر دیں گے کہ ان کا پیش کرنے والا اپنے میں ان دونوں خدمتوں کے انجام دینے کی کس حد تک اہلیت رکھتا ہے۔ بارگاہ خسروی کا جلال شکستہ دل شاعر کی رگ رگ پر چھایا ہوا ہے۔ آنکھیں جھکی ہوئی ہیں اور دل دھڑک رہا ہے مگر اس کی مطالعہ فطرت کرنے والی آنکھیں تاجدار دکن کی نکتہ شناس نگاہوں کی طرف ایک عجیب امید و بیم کے ساتھ اٹھی ہوئی ہیں۔

ع جواہرے دارم و صاحب نظرے می جویم

گزارندہ

عاکسار شہیر حسن جوش ملیح آبادی

اس کے بعد جناب مائل لکھتے ہیں: "جوش صاحب نے جس انداز اور زبان میں یہ درخواست گزاری ہے بالکل قدرتی ہے۔ نظام دکن کے سامنے درخواستیں گزارنے کا جو طریقہ تھا اور جن القاب و آداب سے انھیں مخاطب کیا جاتا تھا، جوش صاحب اس سے مستثنیٰ نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اگر اس انداز مخاطبت پر کوئی اعتراض کرے تو وہ ان حالات سے ناواقفیت کی بنا ہی پر کر سکتا ہے جو اس دور میں ضروری تھے۔

اس درخواست میں جوش صاحب نے اپنے لیے دو خدمتیں منتخب کی ہیں۔ ایک تو جامعہ عثمانیہ کی خدمت اور دوسری تاریخ دکن کو فردوسی کے شاہنامے کی طرح نظم میں ترتیب دینا اور اردو زبان میں وہی اور بیان پیدا کرنا جو فردوسی نے فارسی زبان میں شاہنامے کے ذریعہ پیدا کر کے حیات جاوداں حاصل کر لی ہے۔ اس درخواست کے ساتھ جوش صاحب نے جو نمونے پیش کیے ہیں اور جو "شوکت عثمانی" میں موجود ہیں وہ اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر نامعلوم سبب کی بنا پر تاریخ دکن کا سلسلہ بہ طرز شاہنامہ فردوسی ٹوٹ نہ جاتا تو آج اردو ادب کا دامن ان جواہرات سے بھی بھرا ہوتا جو جوش ملیح آبادی اس کے خزانے میں ڈالنا چاہتے تھے۔

نیز مائل صاحب نے اپنی کتاب میں "شوکت عثمانی" کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کی رو سے اس کی ترتیب آئندہ صفحات پر بیان کی جا رہی ہے۔

نمونہ

(مسودہ)

شوکت عثمانی

یعنی

تاریخ دکن، شاہنامے کے طرز پر

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی نبیرہ حسام الدولہ تہور جنگ
نواب فقیر محمد خاں گویا

(جلد دوم)

فہرست مضامین

تصریح مضامین۔ نمبر مضمون

الف ۱ مرحل وحشت

۲ فقیر کی صدا

۳ مرثیہ نگار کی فہرست تصانیف

۴ مرثیہ نگار کی تصانیف کے متعلق نقاد

۵ مرثیہ نگار کے متعلق ملک کے مسلم الثبوت اساتذہ ادب کے خیالات

الف۔ تعارف

۶ مرثیہ نگار کی تصنیف روح ادب کے انگریزی ترجمے اور اس کے مصنف کی شاعرانہ حیثیت کے متعلق حیدرآباد کے بعض پروفیسروں کی رائے

ب ۱ ۔ فوکسٹ حقانی ۔ پر حیدرآباد کے ارباب علم و فضل کی رائیں
۲ مقدمہ کتاب
۳ نظمیں

اصل کتاب :

گزارش احوال واقعی
بیداری قلم
نمونہ نثر (سرکہ حضور آصف جاہ اول و پانچ راز ۱۱۳۰ھ)
نمونہ نظم
نمونہ واقعہ نگاری (اخلاق دکن پر شعاع اسلام ۱۱۹۰ھ)

ج روح ادب کی تنقیدیں

(تصانیف) روح ادب کا انگریزی ترجمہ
(متعلقات تصانیف) مرتبہ نگار کی مطبوعہ تصانیف کے نسخے

جوش صاحب فردوسی کے شاہنامے کی طرز پر دکن کی تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے متعلق انھوں نے "مقدمہ برائے ارباب تنقید" کے عنوان سے فوکسٹ حقانی کے ایک باب میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہم اس کے ذکر سے شروع کرتے ہیں۔

شوکت عثمانی

از

جوش ملیح آبادی

(مقدمہ برائے ارباب عقیدہ)

تاریخ حیات انسانی کا وہ زبردست اور اہم شعبہ ہے جس کی عظمت سے کوئی عقل مند انکار نہیں کر سکتا۔

تاریخ کیا چیز ہے اور ہمیں کیا سکھاتی ہے اور تاریخ نگاری کی بہترین شکل کیا ہو سکتی ہے یہ سوال ہے جس کا جواب ان چند سطور میں نہیں دیا جا سکتا۔ گر حالات نے مساعدت کی تو انشاء اللہ اس موضوع پر کافی روشنی ڈالنے کی ہر ممکن سعی عمل میں لائی جائے گی۔

صوبہ دکن ہندوستان کی قدیم شہنشاہیت کا سب سے درخشاں صوبہ ہے اور زمانہ دراز سے اپنی عظمت و رفعت کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں ایک ممتاز اور نمایاں وقار کا مالک ہے۔ یہاں کے واقعات اور کارنامے اگر وہ سلیقے کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں اور اپنی دیرینہ عظمت سے بے خبر موجودہ نسلیں عظمت کی نیند سے بیدار ہو جائیں۔ افسوس کہ اس عظیم صوبے کی تاریخیں جو بھی تک لکھی گئی ہیں اور جو اب تک میرے مطالعے سے گزری ہیں، سراسر ناکافی اور غیر دلچسپ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دکن کے تمام واقعات ضبط تحریر میں آگئے ہیں لیکن فاضل مورخ مجھے معاف فرمائیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے اوپر نیچے چن دیئے گئے ہیں جن میں علاوہ بنیادی کمزوری کے نہ دلکشی ہے نہ حسن ترتیب اور یہ بات بھی حیرت سے خالی نہیں کہ اس موضوع پر ابھی تک کسی نے توجہ بھی نہیں کی۔ میں اپنی کم مائگی اور بے علمی کی حد تک بخوبی واقف ہوں اور اسی بنا پر میری ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس زبردست مہمت کا بار اپنے کمزور شانوں پر اٹھاؤں لیکن طبیعت کی امنگ بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔

ایک روز تاریخ دکن کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دفعتاً دماغ میں ایک بجلی سی چمکی اور معاً خیال پیدا ہوا کہ بعض واقعات کو نظم کا لباس پہنا دوں اور دیکھوں کہ وہ کیا شکل اختیار کرتے ہیں۔ خیال آتے ہی قلم لے کر بیٹھ گیا اور ایک گھنٹے کے اندر ایک مختصر سی نظم تیار ہو گئی۔ دیکھا تو

یہ اتفاق سے کچھ ایسی بری بھی نہ تھی۔ ہمت ہوئی کچھ اور لکھوں۔ چنانچہ دو ایک نظمیں اور بھی لکھیں۔ جنھیں آئندہ صفحوں پر آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس راہ میں میری سعی کہاں تک مشکور ہوئی ہے۔ یہ آپ کی رائے پر چھوڑتا ہوں۔

دکن کی تاریخ سے متعلق میرے دماغ میں بہت سے خیالات کروٹ لے رہے ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ اگر یہ خدمت مجھ سے بن پڑی تو دراصل ایک عجیب مادر زاد یادگار چیز ہوگی اور زبان اردو میں ایک سبق آموز اور دلچسپ تصنیف کا اضافہ ہوگا۔

دراصل وہ دنیا کا بڑا آدمی تھا جس نے کہا ہے کہ اگر تمہیں کسی قوم کے عروج و زوال کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے مقبروں میں جاؤ۔ اس مقولے سے اس کا یہ مقصد ہے کہ گو قوم عروج کی طرف جا رہی ہوگی تو بھی تاریخی عظمت سے واقف ہونے کی بنا پر اپنے اسلاف کے مقبروں کو آراستہ و پیراستہ رکھے گی۔ اگر زوال پذیر ہے تو عدم واقفیت کے باعث اس کے مقبرے ویران اور اجاڑ ہوں گے۔ بیشک قومی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ ہم کم از کم اپنے اسلاف کے کارناموں اپنے ملک کے واقعات، ان کے جوڑ توڑ، اپنے قدیم و جدید تمدن و رسم و رواج اور حوادث کے اسباب و نتائج سے کما حقہ واقف اور آگاہ ہوں۔ یہاں ایک نکتہ اور بیان کر دینے کے قابل ہے اور شاید وہ اس سوال کا جواب ہوگا کہ نثر کے کشادہ میدان کو چھوڑ کر تاریخ کے واقعات کو نظم کرنے کا خیال کیوں پیدا ہوا۔ دنیا کا کتنا ہی زبردست سے زبردست واقعہ لیجیے اور لیجیے طرز بیان بے جوڑ فلسفیانہ، کمزور اور پست لہجے میں بیان کیجیے اور دیکھیے کہ کتنے سامعین پر آپ کی تقریر سے گہرا اور پائیدار اثر چھوڑ دے اور اس کے بعد آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ واقعے کی خطا نہ تھی بلکہ آپ کے طرز بیان کی خطا تھی۔ برعکس اس کے اگر طرز بیان کی شستگی و سلاست لہجے کی شیرینی و مناسبت اور الفاظ کی تراوٹ آپ کے قبضے میں ہے تو دنیا کی حقیر سے حقیر داستان آپ کی زبان سے ادا ہو کر دل میں ایک گونج پیدا کر دے گی۔ نثر اور نظم میں یہی فرق ہے۔ فارسی میں فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر جن چیزوں کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا اور جن بعض معمولی واقعات کے سروں پر اس نے تاج رکھ دیا اگر تمام عالم کے سنجیدہ مورخ نثر میں یہ خدمت انجام دینا چاہتے تو عمریں صرف ہو جاتیں اور کامیاب نہ ہوتے۔ اردو میں میر انیس اعلی اللہ مقامہ نے واقعات کربلا کو جس شکل سے نظم فرمایا اور جو

مستقل اثر وہ مذہب اور ادب پر چھوڑ گئے ہیں اگر روئے عالم کے تمام ذاکر نثر میں صدیوں کوشش کرتے۔ قیامت تک یہ بات پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ بیشک یہ خیال بہت مبارک ہے کہ تاریخ دکن کو نظم کا لباس پہنایا جائے اگر توفیق بھی شامل حال ہے تو باوجود پیری بے مائگی کے حتی الوسع اس خدمت جلیلہ کو بوجہ حسن انجام تک پہونچا کر رہوں گا اور مجھے امید ہے کہ اگر یہ کام مجھ ایسے بے بضاعت سے بن پڑا تو یہ خدمت ہندوستان کے واسطے بالعموم اور ریاست حیدرآباد کے لیے بالخصوص ایک نہایت دلچسپ مفید اور سبق آموز خدمت ہوگی۔ اب مضمون کا دروازہ بند کرتے ہوئے کچھ ان نظموں کے متعلق بھی سن لیجیے، جنھیں آپ چند لمحوں بعد ملاحظہ فرمائیں گے۔

یہ نظمیں سرسری فکر کا نتیجہ ہیں۔ غور و تامل اور عمیق فکر کی کاوش و کاہش کو ان میں دخل نہیں۔ اس لیے کہ یہ جو کچھ ہے وہ صرف نمونے کے طور پر ہے اور ظاہر ہے نمونے مختصر ہی اچھے ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان نظموں کو اسی نقطہ نظر سے دیکھیں گے۔

غزل کہہ لینا اور چیز ہے اور تاریخ کے پیچیدہ واقعات کو ربط کے ساتھ نظم کرنا اور چیز ہے۔ جن حضرات کو کبھی ایسے اتفاقات پیش آتے ہیں وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ وہ میدان ہے کہ محمود نے فردوسی کے سپرد جب یہ خدمت کی تو حکم دیا کہ فردوسی کو ایوان شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے جو تمام ضروری سازو سامان سے آراستہ ہو اور آلات جنگ اور اسلحہ حرب، شاہان عجم کے مرقعوں اور پہلوانوں کی تصاویر سے دیواریں سجا دی جائیں۔ ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہونچ جائے تو ہزار اشرفیاں دے دی جایا کریں۔ لیکن باوجود اس قدر سامان قدردانی اور حوصلہ افزائی فردوسی نے کامل پینتیس (۳۵) برس میں یہ میدان طے کیا۔ جیسا کہ خود اس کے اشعار سے ثابت ہے۔

سی و پنج سال از سرے رنج و سخن بسے رنج بردم بہ امید گنج
چو بر باد دادند گنج مرا تہی ماند مغز و تہی ماند جا مرا

شیر حسن خاں جوش ملیح آبادی

جوش صاحب نے تاریخ دکن کے سلسلے میں آصف جاہ اول کے صوبہ دار دکن ہو کر دہلی سے آنے اور مرہٹہ سردار باجی راؤ کو شکست دے کر دکن کا انتظام سنبھالنے کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

شوکت عثمانی

دیر سرپرستی

اعلیٰ حضرت سکندر صولت، دارا حشمت، پشت و پناہ ارباب کمال
سلطان العلوم، حضور پرنور نواب میر محبوب علی خاں
تاجدار دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

نمونۂ رزم

حضور آصف جاہ اول و پانچے راؤ

ہوا

جن ، یوم نواب علی جاہ
بھرا تھا شریروں سے دامن کہ
مہیا تھا کب پانچے راؤ شریر
جدھر دیکھیے ظلم کا زور تھا
فن ظلم و بدعت میں وہ طاق تھا
کسی سے بھی ہوتا نہ تھا انسداد
کہ دلی سے اک چند دلیر
وہ نواب روہیلے تھے دلگیر
مٹاتا ہوا ظالموں کے نشاں
زباں پر صدائے بگیر و بتن

ہوا دکن کے ہوئے صوبیدار
لٹیروں کے پھرتے تھے ہر سو گروہ
بدی میں نہ تھا جس کا کوئی نظیر
سبب تیغ خوں ریز پر تیز تھا
تبیت عفریناک قزاق تھا
وہ قاتل لئے برپا کیے تھے فساد
جھپٹتا ہوا آ گیا مثل شیر
دیکھتے تھے سامنے سے جس کے شریر
وہ آیا ستم گاروں کے درمیاں
لیے پشت پر لشکر صف شکن

---

۱ وہ جس کے جسم پر تیغ و تیر کا گزر نہ ہو۔

چپ و راست تیغ آتش سوار — لڑاتے ہوئے جنگلوں میں غبار
وہ کرنوں میں خنجر دمکتے ہوئے — وہ برچھے فضا میں چمکتے ہوئے
وہ تیغہ ہرد آتا ۔ شمشیریں — وہ سادات لڑتے ہوئے آستیں
کمر سے وہ تیغیں لٹکتی ہوئی — وہ نیزوں کی ڈانڈیں لچکتی ہوئی
وہ دل فتح مندی میں تکتے ہوئے — وہ گھٹنوں تلک ہاتھ لٹکتے ہوئے
وہ سینوں کو تانے ہوئے پہلوان — وہ دانتوں میں دابے ہوئے داڑھیاں
وہ ہتیار باہم کھڑکتے ہوئے — وہ مرکب دلوں میں اکڑتے ہوئے
اچھلتے چٹانیں ہلاتے ہوئے — دہاڑوں کو باہم چلاتے ہوئے
غضب کا تھا لشکر قیامت کی فوج — زمیں ہل رہی تھی کہ دریا کی موج
بھرا تھا پھریروں میں آندھی کا زور — وہ گھوڑوں کی ٹاپیں وہ قرنا کا شور
ملے کوہ شیروں کی للکار سے — فلک کانپا تیغوں کی جھنکار سے
فضا کو پھریروں سے بھرتے ہوئے — بڑھے بادلوں سے گرجتے ہوئے
لرزنے لگی روح بہرام و گور — اٹھا باجے راؤ کے لشکر میں شور
ملے آ کے اقبال و بخت دژم[1] — مقابل ہوئے آ کے لشکر بہم
وہ گھوڑوں کی چھل بل نے دوہری زمیں — اٹھی گرد تا حد چرخ بریں
ادھر کھینچ کے تلواریں بل کا کتیں — ادھر قسمتیں بڑھ کے ٹکرا گئیں
تیاسل سے خنجر اٹھے لگے — کم چھوٹ کے ہاتھ چلنے لگے
قیامت کی تیغیں تھیں سرگرم کار — پہاڑوں سے جھنکار جاتی تھی پار
کوئی گرز کھا کر جبیں پر گرا — کوئی تیر کھا کر زمیں پر گرا
پر گندہ خاطر تھی فوج شریر — اجل تھیں تیغیں برستے تھے تیر
شریروں کا تلواریں غل چاٹتی — صفوں میں وہ آئیں جھنکار کاٹتی
کمانیں قضا کی کڑکنے لگیں — مراٹھوں کی لاشیں پھڑکنے لگیں
بڑھے گھوڑے للکارتے جب شریر — اتر آئے ڈھالوں سے جیبوں میں تیر

---

1. شکستہ، ہشکستہ، بدسرشت

2. نیزے کی کڑیوں کی طرح ہوتی تھیں جو تلوار کی جنگ کے زمانے میں سر پر ڈال لیتے تھے۔

ادھر سے بڑھا وہ بہ تیر و کماں
ادھر اس کی پھنکار ہی میں تیر تھا
ادھر رہ گیا شوق صید فگن
رہی گرم تھی آسماں پر شفق
ہوئی اس طرف تیغ براں بلند
کہ دشت میں اک ہیل تن پہلواں
اکڑتا ہوا شور کرتا ہوا
قریب آ کے گھوڑے کو کاوا دیا
کیا وار ظہار کا جھوم کر
ادھر داہنی سمت وہ آ گیا
بھگیتی ادھر کو۔ اسس کی چلی
شرر بار تیغ دوسہ قلی کر
گزرتی ہوئی پشت دیوار سے
یکایک ادھر کک دھماکا ہوا
گئی گرد اڑ اڑ کے افلاک پر
غرب کر ہوئی فاش دم بھر میں سرد
شجاعت کے تیور ادھڑنے لگے
بڑھے یاں دلیراں صوت فتاں
جھکھوڑا چلا ہے گرایا انھیں
تعاقب میں دشت بے اضطراب
ہر اک مرد غازی کڑکتا ہوا
چلے جا رہے تھے برابر دلیر
ہوئے گم چٹانوں کے اوجھل میں

ادھر سے چلا یہ بہ تیغ و سناں
ادھر اسس کا خنجر گلوگیر تھا
ادھر بھونک دی اس نے رزہ کرانی
کہ اس نے پھینکی بصد اضطراب
گرے کٹ کے سب ملا پائے کند
گرجتا ہوا آیا کھب دہاں
تھکن کی صورت بپھرتا ہوا
بڑھا اور پھر بند کے دھیما کیا
ادھر ایک غازی نے رخ کی سپر
ادھر دست چپ کی طرف یہ ہٹا
ادھر اس نے بڑھ کر کیا یا علی
لگائی سر فسرق پہ ماد گر
رہی پر کی فرق خسرو سے
ادھر شور "اصفہ" برپا ہوا
سر تیغ کا خاک پر
ہوا رنگ فرق زادوں کا زرد
قدم خوف یاں سے اکھڑنے لگے
یہ شمشیر و خنجر یہ تیر و کماں
نتیجے میں آخر بھگایا انھیں
لگاموں کو کھینچے ہوئے شہسوار
لہو کھنچیں سے ٹپکتا ہوا
جھپٹتا ہے رہوار پر جیسے شیر
مرہٹوں کے دل چھپ گئے کوہ میں

۱؎ دلاور۔ رستم کا لقب
۲؎ سست اچھا کیا تو نے

نبرد تھا مسکراتے ہوئے　　پلٹ آئے گھوڑے کدکتے ہوئے

خطاب بہ شہریار دکن

ہوا مظہر حق دیار دکن　　ترے واسطے شہریار دکن
مشیت کی در پردہ تائید تھی　　تری سلطنت کی یہ تمہید تھی
برسے گا گھر کے ہر کرم　　سنا تھا کہ آئیں گے تیرے قدم

ع آواز پا جیسی آنے لگی
زمین دکن مسکرانے لگی

اس نمونہ رزم کے بعد جوش صاحب نے دوسرا "نمونہ بزم" بھی شوکت عثمانی میں پیش کیا ہے۔ اسے بھی دیکھیے۔

نمونہ بزم

پلا ساقیا بادۂ تند و تیز　　کہ پھر ہے نسیم چمن عطر بیز
ملا دے مرے لب سے لبریز جام　　کہ پھر جلوہ گستر ہے ماہ تمام
اٹھا چوم کر ساغر روزگار　　کہ آیا ہے پھر موسم نوبہار
صبا رنگ گلیوں میں بھرتی ہوئی　　چلی آتی ہے رقص کرتی ہوئی
چمن روح افزا ہوا خوشگوار　　فرح بخش سبزہ لب جوئبار
ترنم سے لبریز ہے پھر ہوا　　چھلکتے ہوئے جام لا ساقیا
پپیہوں کی دھن قمریوں کی پکار　　خوشا وقت شادی خوشا روزگار
ہوا چلتی ہے دل لبھاتی ہوئی　　دلہن کی طرح سے لجاتی ہوئی
یہ کلیاں چمن میں چٹکتی ہوئی　　یہ پھولوں کی شاخیں لچکتی ہوئی
قیامت کا چھایا ہوا ہے خمار　　ادا دیکھ تو پھنتے کی بہار
شب ماہ ہے یا کوئی نازنیں　　سپہ زینت آسمان و زمیں
نکلتی ہے آنکھیں جھکائے ہوئے　　ستاروں کی افشاں لگائے ہوئے
اٹھا ہاتھ سے ساقی دل نواز　　کہ چھیڑا ہے بیلے کی کلیوں نے ساز

نشست میں ذوق ہے موج صبا — ادھر کھاتی ہے ادھر موجیا
مزا ساقیا جلد تکلیف ہوش — وہ دیکھ آ گیا کوئی گیسو بدوش
گلے میں سبک ہار ڈالے ہوئے — حرارت سے دامن سنبھالے ہوئے
عیاں حال و خدا سے سار چمن — سر دوش گیسو شکن در شکن
کمر لوچ کھاتی ہوئی بار بار — صراحی سی گردن میں پھولوں کا ہار
نگاہوں میں ذوق ہوئی ہر نظر — نگہ میں چھپے کی دھن کا اثر
یہ کیوں ہو دسمبر کے دل میں سیاہ — کہ آ چل گلابی سے رنگیں سیاہ
تبسم لبوں پر ہے یوں موج زن — کہ غنچے میں اتری ہے پہلی کرن
یہ آنکھوں کے ڈوروں میں رنگ شباب — جھلکتی ہے دیدے کے پیچھے شراب
فضا میں یہ جذبات کی برہمی — جبیں پر یہ دوشیزگی کی نمی
یہ رخسار پر ولولوں کی چمک — لبوں میں یہ کم سن کی مہک
مجھے بھول ہے عقل جس سے ہو تنگ — لڑکپن کی خوشبو جوانی کا رنگ

اس کے بعد ایک نظم ہے۔ سورج۔ جس کا پہلا شعر ہے۔

ادھر چرخ پر جلوہ افتاب — لب جو ادھر کوئی مست شباب

اور اس کا آخری شعر ہے۔

وہ سے دے کر آ رہے پائے تھکن — کہ لکھنا ہیں سلطنت تک دکن

اس کے بعد ایک طویل نظم ہے جس میں مسلمانوں کی دکن میں آمد سے متعلق حالات بیان کیے گئے ہیں اور یہاں آنے کے بعد ان پر کیا گزری اس کا اجمالی نقشہ پیش کر کے آخر میں خطاب بہ شاہ دکن سے یہ دو شعر درج ہیں۔

عیاں اس سے ذرے سے ایماں تھا — تری سلطنت کا یہ سامان تھا
کیے ، لحن اپنی آواز — دکن دیکھتا تھا ترا راستہ

ان اشعار پر "شوکت عثمانی" کو ختم کر دیا۔

اس کے بعد جناب ناصر ملیح آبادی لکھتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں کہ اس خواہش کا

نظام دکن نے کیا جواب دیا؟ یہ منصوبہ اور جوشؔ صاحب کے احساس والہانہ جذبے کو میر عثمان علی خاں تک رسائی بھی ہوئی یا نہیں لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ حیدرآباد اور دربار شاہی کے اہم امراء کے پاس "شوکت عثمانی" کی نظمیں پہنچ چکی تھیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دربار نظام کے امراء نے جوشؔ صاحب کو "حیثیت بیکن" کے توجیہ تک تو قبول کر لیا تھا لیکن اس سے آگے بڑھ کر ان کے فردوسی دکن کے منصب تک پہنچ جانے کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تو جناب نائل کا خیال تھا لیکن ان کے صاحبزادے جناب ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی صدر شعبہ اردو ودیانت بھون ڈگری کالج لکھنؤ نے جوشؔ صاحب پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے جو "کتاب جوشؔ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یہ کتاب بھی فرزند دین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے "نئی پریس لکھنؤ" نے چھاپی ہے اور کراچی میں میرے کرم فرما جناب محسن اعظم ملیح آبادی نے مجھے بغرض مطالعہ عنایت فرمائی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے جوشؔ صاحب کا ایک خط شامل کیا ہے جو انھوں نے ۲ نومبر ۱۹۴۲ء کو حیدرآباد سے اپنے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں کو لکھا جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ان کو منظوم تاریخ دکن لکھنے کے لیے ڈھائی سو روپے دیے جائیں گے۔ وہ خط ملاحظہ فرمائیے۔

"جان برادر ایمان برادر سلامت رہو۔ میری کامیابی پر خوش ہونے والے سلامت رہو۔ تجھ سے زیادہ آشفتہ مزاج اور دیوانے جوشؔ کو کون چاہتا ہے اور کون چاہ سکتا ہے۔

تیری ذات میں فرزند کی سی اطاعت اور ماں کی سی محبت ہے۔ تیرے بھائی پانچ سو روپے کا ملازم ہو گیا ہے۔ دو مہینوں میں کام کرے گا۔ ڈھائی سو روپے ماہوار تو وہ اتر جائے گا اور ڈھائی سو روپے تاریخ دکن کو نظم کا لباس پہنانے کے واسطے مقرر ہوئے ہیں۔ بس اس قدر کافی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے جوشؔ کی ہر پیشین گوئیوں کو غلط ثابت کر دکھایا۔

شبیر حسن جوشؔ"

(آخر میں ڈاکٹر عصمت نے لکھا ہے کہ راقم الحروف کے پاس یہ خط محفوظ ہے)

اس خط کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے جوشؔ صاحب کا ایک اور خط بھی نقل کیا ہے جس

میں "مشیر ادب" کے عہدے پر ترقی حاصل کرنے میں پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر کیا ہے۔

"جان برادر!

تمہارے دونوں خط آج ملے۔ حالات حاضرہ سے آگاہی ہوئی۔ میری ترقی کی کارروائی کا مختصر حال سنو اور پھر فیصلہ کرو کہ مجھے آنا چاہیے یا نہیں۔

میری درخواست اور ناظم شعبہ تالیف و ترجمہ کی رپورٹ ہوم آفس پہونچی، جس سے معلوم ہوا کہ اس جگہ کے واسطے دو بیرونی امیدوار بھی ہیں اور ارکان دارالترجمہ میں سے دو صاحبوں کی بابت ناظم نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ اس خدمت کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ میری بھی کسی حد تک سفارش کی ہے۔

ہوم آفس کے افسر اعلیٰ نواب اکبر یار جنگ صدر نے اس کارروائی پر اپنی رائے لکھی جو سرتاپا میرے موافق ہے اور ایسے دلائل تحریر کیے جس سے تمام دوسرے امیدواروں کے واسطے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ رائے لکھ کر نواب صاحب موصوف نے اس کارروائی کو تمام ارکین کونسل کے پاس گشت کر دیا اور آٹھ ممبروں میں سے چھ آدمیوں نے میری ہی رائے میں رائے دی۔ اب رہے دو ممبر۔ حیدری اور مسعود۔ یہ حضرات رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ابھی ان کی رائیں موصول نہیں ہوئی ہیں۔ غالباً اس ہفتے کے اندر آ جائیں گی۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ ان حضرات نے کون سا رخنہ ڈالا ہے اور کون سی چال چلی گئی ہے۔

اب اس موقع پر اگر میں وطن آتا ہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ رخنہ انداز کامیاب ہو جائیں گے اور ہر چند کہ ممبروں میں سے چھ ممبروں کے ووٹ میری تائید میں ہیں لیکن اس قوت کے باوجود میری غیر حاضری اس معاملے کو خراب کر دے گی۔

حالات مندرجہ بالا پر غور کرو اور بتاؤ کہ اس وقت میرا یہاں موجود رہنا ضروری ہے یا نہیں؟

تمہارا جوش

۱۲ اگست ۱۹۲۶ء

دارالترجمہ، حیدرآباد دکن

نوٹ:

(یہ خط بھی جوش صاحب نے اپنے بھائی رئیس احمد خاں کو تحریر فرمایا تھا اور میرے پاس ہے۔ عصمت ملیح آبادی)

خیر۔ مشیر ادب کے عہدے پر تو جوش صاحب کو ترقی مل گئی مگر تحقیق طلب سوال یہ ہے کہ دکن کی منظوم تاریخ لکھنے کی جو ذمہ داری جوش صاحب نے قبول کی تھی، اس کا کیا ہوا؟ کیونکہ "شوکت عثمانی" میں جو مواد کام ملتا ہے اس کے علاوہ جوش صاحب نے تاریخ دکن پر کیا کام کیا؟ اس کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ شاید جوش صاحب پر تحقیق کرنے والے مستقبل میں اس کا جواب دے سکیں۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اتنے اہم واقعہ کا ذکر جوش صاحب نے اپنی سوانح "یادوں کی برات" میں نہیں کیا یا ذکر کرنا بھول گئے۔ واللہ علم بالصواب۔ "شوکت عثمانی" کے محقق ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ "وہ دستاویز آج بھی ملیح آباد میں میرے ایک عزیز کے پاس محفوظ ہے"

مجھے احساس ہے کہ جوش صاحب کی حصول ملازمت کا ذکر "شوکت عثمانی" کے تعلق سے خاصا طویل ہو گیا ہے مگر چونکہ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس کا علم عام طور پر پاکستان کے علمی حلقوں میں نہیں ہے۔ اس لیے میں نے مناسب جانا کہ اس پر ذرا تفصیلی گفتگو ہو جائے۔

حیدرآباد دکن میں جوش صاحب کے دس برس سخت عیش و آرام سے گزرے۔ اس کے علاوہ وہاں کے علما کی صحبت سے انھوں نے جو فیض حاصل کیا، اس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ "یادوں کی برات" میں لکھتے ہیں "میری یہ بڑی خوش قسمتی ہوگی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبہ دارالترجمہ کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا اور خصوصیت کے ساتھ علامہ عمادی، علامہ طباطبائی اور میر محمد ہادی رسوا کے فیضان صحبت نے مجھ بے سواد آدمی کو میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوق مطالعہ پر مامور کر دیا اور صحت الفاظ کا بہت کچھ کا جو پودا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی سرزمین پر لگایا تھا، اگر طباطبائی، میر محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پودا کبھی شاداب اور بارآور نہ ہوتا۔ میرزا محمد ہادی صاحب میرے پڑوسی تھے۔ میں دکن آ کر پھر

ان سے پڑھنے لگا اور اس بار قادری کے ساتھ ان سے انگریزی ادب اور فلسفہ کا بھی باقاعدہ درس لینا شروع کر دیا۔ یہ تو تھا وہ علمی فائدہ جو جوش صاحب کو حیدر آباد کے قیام کے دوران میں حاصل ہوا۔ اب وہاں کی معاشرتی زندگی کا حال بھی خود جوش صاحب ہی کی زبانی سنیے۔

"یا سے کیوں کر بیان کروں کہ اس وقت میرا حیدر آباد کیا چیز تھا۔ امرانی اور اس پر دولت کی فراوانی۔ ہر طرف یک چہل پہل تھی۔ امرا کے دروازوں پر صبح و شام نوبت بجا کرتی تھی۔ آئے دن جلسے، مجرے، دعوتیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔ متوسطین تک مزے اڑا رہا کرتے تھے۔ وہاں کا علمی و ادبی ماحول، موسیقی، اعتدال، مجلسی ابھار اور تہذیبی نکھار۔ ہائے کن کن باتوں کا ذکر کروں۔"

غرض اس علمی اور روحانی فضا میں جوش صاحب نے حیدر آباد دکن میں دس برس گزارے مگر کچھ اپنی افتاد طبع کے باعث اور کچھ درباری سازشوں کے نتیجے میں نظام کے معتوب جناب ہوئے اور حیدر آباد کو خیرباد کہنا پڑا۔ مگر وہاں سے نکلنے کے برسوں بعد بھی وہ خاک دکن کو یاد کر کے کہتے ہیں۔

شاید پلٹ آئے زندگانی میری — پھر گونج اٹھے ترنم جوانی میری
میں خاک دکن چھوڑ کر تو دیکھوں — ممکن ہے ٹپک پڑے جوانی میری

حیدر آباد سے رخصت ہو کر مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے دلی پہنچے۔ یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ دلی میں مسز سروجنی نائیڈو کے مشورے اور ان اعانت سے ایک رسالہ "کلیم" نکالنا شروع کیا مگر اس میدان میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے کلیم کو ترقی پسند ادب کے پرچے "نیا ادب" میں ضم کر کے اپنے وطن ملیح آباد آ گئے۔ وہاں اپنی تیس بیگہ زمین اور ایک آم کے باغ کی دیکھ بھال میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران میں جوش صاحب نے اپنی وہ مشہور نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" لکھی جس کو علی سردار جعفری صاحب نے "نیا ادب" میں شائع کر دیا۔ اس پر انگریزی حکومت نے اس نظم کی اشاعت پر پابندی لگا دی اور جوش صاحب کے گھر کی تلاشی بھی لی جس پر جوش صاحب نے ایک اور نظم لکھی جو "تلاشی" کے عنوان سے مشہور ہوئی۔ اس طرح جوش صاحب تمام ہندوستان میں انگریز دشمن اور آزادی کے ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں کسی مشاعرے کے سلسلے میں

بمبئی گئے۔ وہاں سجاد ظہیر صرف بے بھائی کے کہنے پر ڈبلیو زیڈ احمد نے جوش صاحب کو فلمی صحبت سے وابستہ کر لیا اور وہ فلموں کے لیے گیت لکھنے پر گیارہ سو روپے ماہوار پر مامور ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ڈبلیو زیڈ احمد پاکستان آ گئے تو جوش صاحب مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو کی سفارش پر رسالہ "آج کل" کے مدیر بن کر دہلی منتقل ہو گئے اور ان کو حکومت ہند کی سفارش پر صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے "پدم بھوشن" کے اعلیٰ اعزاز سے نوازا گیا۔

۱۹۵۵ء میں کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان گئے۔ اس زمانے میں ان کے دوست ابوطالب نقوی جو اے۔ ٹی۔ نقوی کے نام سے مشہور تھے، کراچی کے چیف کمشنر تھے۔ انھوں نے جوش صاحب کو پاکستان کی شہریت قبول کرنے پر راضی کر لیا اور وہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کے مستقل شہری بن گئے۔

اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان میں جوش صاحب کی ستر سے زائد اور دو ثانوی نظمیں مشہور ہو چکی تھیں اور ان کے حسب ذیل مجموعے شائع ہو چکے تھے۔

۱۔ روح ادب۔ ۱۹۲۱ء۔ لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ نظم
۲۔ مقالات نثریں۔ ۱۹۲۱ء۔ لکھنؤ نثری مجموعہ
۳۔ اوراق سحر۔ ۱۹۲۱ء۔ لکھنؤ۔ نظم بعد نثر، صبح کے متعلق
۴۔ اشارات۔ ۱۹۲۲ء۔ دہلی۔ کلیم میں شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ
۵۔ نقش و نگار۔ ۱۹۲۶ء۔ دہلی
۶۔ شاعر کی راتیں۔ ۱۹۲۷ء۔ دہلی
۷۔ شعلہ و شبنم۔ ۱۹۲۷ء
۸۔ فکر و نشاط۔ ۱۹۲۷ء۔ جامعہ ملیہ دہلی
۹۔ جنون و حکمت۔ ۱۹۲۷ء۔ دریا گنج دہلی، کلیم بک ایجنسی
۱۰۔ عرفان و حکایت۔ ۱۹۲۸ء۔ دہلی
۱۱۔ آیات و نغمات۔ ۱۹۳۱ء۔ لاہور
۱۲۔ عرش و فرش۔ ۱۹۳۳ء۔ تاج آفس بمبئی
۱۳۔ رامش و رنگ۔ ۱۹۳۵ء۔ بمبئی

۱۳۔ سلسل و سلاسل۔ ۱۹۴۴ء، بمبئی

۱۴۔ سیف و سبو۔ ۱۹۴۷ء، لاہور اور بمبئی سے ایک ساتھ شائع ہوئی

۱۵۔ سرود و خروش۔ ۱۹۵۲ء، دہلی

۱۶۔ سموم و صبا۔ دہلی

طرحی جوش صاحب جب اپنے اس دلی سرمائے اور شہرت کے ساتھ پاکستان تشریف لائے تو یہاں کے حکومتی اور ادبی حلقوں میں ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اس کی تفصیل جوشؔ صاحب نے "یادوں کی برات" میں بیان فرما دی ہے۔ جس کو دہرانے کا یہ موقع نہیں ہے۔

ہماری کتاب جہاں سے شروع ہوتی ہے وہ ۱۹۶۹ء کا زمانہ ہے جب میں جوش صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوا اور اس کا اختتام اس وقت ہوا جب فروری ۱۹۸۲ء میں جوشؔ صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ کتاب میری ان یادداشتوں پر مشتمل ہے جو میری ڈائریوں میں درج ہیں۔ میں نے جوش صاحب کی زندگی کے آخری عشرے کے واقعات اور ان کی فکر کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی دیانت داری سے اپنی فہم کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ قارئین فرمائیں گے۔

خورشید علی خان

بی۔ ۸۶ بلاک ۱۔ شمالی ناظم آباد

کراچی

ارباب نشاط

خورشید علی خاں ۔ حضرت جوش ملیح آبادی ۔ اختر حسن

حرفِ آغاز

شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی اردو ادب کے ان عظیم روز گار مشاہیر میں سے ہیں جنھوں نے فکر و دانش کے خزانوں سے اردو شاعری کو مالا مال کیا ہے۔ جوشؔ صاحب انتہائی قادرالکلام مفکر شاعر تھے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی پہلو ذہنِ انسانی میں آنے والا کوئی خیال آنکھوں کو دکھائی دینے والا کوئی منظر ایسا نہیں ہے جس کو جوشؔ صاحب نے شعر کے سانچے میں نہ ڈھالا ہو۔ فکری اعتبار سے جوشؔ صاحب حریتِ فکر کے علم بردار تھے اور ان کی شاعری کا مقصد ذہنِ انسانی کو ہر قسم کی ذہنی غلامی سے آزاد کروانا تھا کیونکہ یہ غلامی خواہ کسی نوعیت کی کیوں نہ ہو وہ عظمتِ الٰہی کے اس عظیم منصب کے منافی ہے جس پر آدم کو فائز فرمایا گیا ہے۔ اس لیے جوشؔ صاحب ہر اس قدر کے مخالف تھے جو نسلِ انسانی کو اس کے شایانِ شان مقام حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس لیے ہم جوشؔ کو شاعرِ انقلاب کہتے ہیں۔

جوشؔ صاحب کو یقین تھا کہ ہم تحقیق، تجسس اور علم کے ذریعے سے قوانینِ کائنات کو مسخر کر کے نہ صرف حیاتِ ابدی حاصل کر سکتے ہیں بلکہ حسن اور شباب کو بھی دوام عطا کر سکتے ہیں۔ اس لیے جوشؔ شاعرِ شباب بھی ہیں اور شاعرِ حسن و محبت بھی۔ جوشؔ صاحب نے ترقی پسند ذہن کی تخلیق میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے بیرونی استعماری طاقتوں اور ان کی آلہ کار اندرونِ ملک رجعت پرست قوتوں کے خلاف جو محاذ بنایا اس نے نوجوان نسل کے ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا۔

جوش صاحب سے تعارف:

جوش صاحب سے میری باقاعدہ ملاقات ۱۹۴۰ء کے آخری مہینوں میں ہوئی۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں اور میرا چھوٹا بھائی نعمت اللہ خاں جو کراچی پولیس میں ڈی ایس پی کے عہدے پر فائز تھے، بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ آج ہمارے دور میں فکری اعتبار سے دنیا کے بڑے بڑے آدمی کون کون ہیں۔ نعمت اللہ خاں کہنے لگے یورپ میں تو کئی لوگ ہیں جیسے برٹرینڈ رسل، جارج برنارڈ شا، آئین سٹائین یا چین میں ماؤزے تنگ وغیرہ مگر خود ہمارے ملک میں حضرت جوش ملیح آبادی ہیں جو عقل و دانش میں کسی سے بھی کم نہیں اور خوش قسمتی سے وہ خود ہمارے شہر کراچی میں مقیم بھی ہیں اور ان سے سرسری سی کچھ تعارف بھی ہے۔ لہٰذا ہم دونوں بھائیوں نے یہ طے کیا کہ جوش صاحب سے تعلقات بڑھانے چاہئیں کیونکہ

جوش قربت کے تدبیروں سے ماں پانے کو
قرب یک لمحہ صاحب نظراں کافی ہے

چنانچہ ایک دن میں صبح آٹھ بجے ان کے گھر درخ ڈی۔ ۸۰ لیڈل بی ایریا کراچی، اپنی گاڑی میں پہنچ گیا۔ جوش صاحب اس وقت محسن صاحب اعظم گڑھی کے ہمراہ کہیں باہر جا رہے تھے اور ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے۔ میں فوراً ان کے قریب گیا اور اپنا تعارف کروایا "میرا نام خورشید علی خاں ہے۔ میں آپ کے قریب ہی شمالی ناظم آباد میں رہتا ہوں۔ آپ کی شاعری اور فکر کا مداح ہوں اور اس وقت آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا مگر چونکہ آپ کہیں باہر تشریف لے جا رہے ہیں اس لیے پھر کسی وقت حاضری دوں گا۔" یہ سنتے ہی جوش صاحب خود ٹیکسی سے اتر گئے۔ ٹیکسی والے کو کچھ دے دلا کر رخصت کیا اور مجھ سے فرمایا کہ "ہم لوگ اس وقت بابا دین شاہ تاجی سے ملنے ریاست نیشنل ہسپتال جا رہے تھے، وہاں ان کا بیٹا علیل ہے مگر کوئی بات نہیں وہاں پھر کسی اور وقت چلے جائیں گے اور یہ کہہ کر مجھے اپنے گھر کے اندر لے جانے لگے۔ میں نے کہا آپ اپنا جانا ملتوی نہ فرمائیں بلکہ میری گاڑی میں تشریف رکھیں۔ میں آپ کو ریاست نیشنل ہسپتال لیے چلتا ہوں۔ جوش صاحب کہنے لگے ارے آپ کیوں زحمت کرتے ہیں مگر میرے اصرار پر وہ دونوں میری گاڑی میں بیٹھ گئے اور ہم لوگ

ہسپتال روانہ ہو گئے ۔۔۔ جہاں بابا ذہین شاہ تاجی کے صاحبزادے کینسر کے علاج کے لیے داخل تھے۔ اسی دن بابا صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ عجیب پر کشش شخصیت تھی۔ بڑی سفید داڑھی، گورا اور پرنور چہرہ، سفید براق لباس، دراز قد، چوڑا چکلا جسم صبر و استقامت کا پیکر ۔۔۔ بیٹا مرض الموت میں گرفتار مگر باپ ہر حال میں راضی بہ رضائے الٰہی ۔۔۔ ہسپتال میں جوش صاحب مختلف ڈاکٹروں سے ملتے اور بابا صاحب کے صاحبزادے کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ وہ ڈھائی بجے جب بابا صاحب دوا کھانے سے رخصت ہوئے تو ہم لوگ بھی وہاں سے روانہ ہوئے پہلے محسن، عظم گڑھی کو ان کے گھر پہونچایا پھر جوش صاحب کے گھر آئے۔ راستے میں جوش صاحب سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے ترقی پسند تحریک اور حریت فکر پر خود جوش صاحب کے منہ سے اشعار اور رباعیات سنا ہیں۔ میں کر بہت متاثر بھی ہوئے اور خوش بھی۔ اس مدت میں وہ مجھ سے اتنے بے تکلف ہو چکے تھے کہ انھوں نے مجھے اصرار سے شام کو دوبارہ اپنے گھر آنے کا وعدہ لے کر رخصت کیا۔ کہنے لگے کہ آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی اب شام کو مزید باتیں ہوں گی۔ وہ وقت ہمارے طلوع ہونے کا ہوتا ہے۔ دیکھیے حال نہ جانیے گا۔ میں منتظر رہوں گا۔

ہے خانۂ جوش:

میں جوش صاحب سے رخصت ہو کر سیدھا نعمت اللہ خاں کے گھر گیا اور ان کو اس دن کی تمام روداد سنائی تو انھیں بے حد حیرت انگیز خوشی ہوئی۔ میں نے کہا کہ آج ہی شام کو جب میں جوش صاحب کے گھر جاؤں گا تو تم کو ساتھ لے لوں گا تم تیار رہنا۔ چنانچہ شام کو میں اور میر کمالی دونوں غروب آفتاب سے کوئی نصف گھنٹہ پہلے جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی اٹھ کر گلے لگا لیا اور ہم دونوں بھائیوں کو بہت محبت سے اپنے قریب تخت پر بٹھا لیا۔ ہم نے دیکھا کہ سامنے سجا ہوا ہے۔ بلی مار کر اگربتیوں کی خوشبو فضا میں مہک رہی ہے۔ ایک چنگیری میں چنبیلی کے پھول بھرے ہوئے ہیں سامنے اسٹول پر ایک گھڑی رکھی ہوئی ہے جس پر ایک بلی کی تصویر ہے اور سکنڈ کی سوئی کے بجائے بلی کی آنکھیں ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ تین کانچ

کے صاف ستھرے گلاس اور ان کے بیچ میں میانے سے بھی ہوتی ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب، اس وقت آپ کی گھڑی دیکھ کر مجھے غالب کا ایک شعر یاد آ رہا ہے مگر تھوڑے سے تصرف کے ساتھ، اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔

جوش صاحب نے مسکرا کر فرمایا ضرور ضرور۔

میں نے کہا:

وہ دور سے نظر آئے خانۂ ہرمز ہے
گردش ساغر بہ چشمک نے گربہ آشنا

جوش صاحب سن کر ہنسنے لگے ..... فرمایا بہت خوب بہت خوب۔ آپ نے مجھوں کو ساغر سے بدل کر ہمارے میخانے کی بہت دلچسپ اور بھی بے حقیقت تصویر کھینچ دی ہے بھی بہت خوب۔

پھر میں نے اپنے بھائی کا تعارف کروایا۔ "جوش صاحب! یہ میرے بھائی ہیں نعمت اللہ خاں یہ بھی آپ کے چاہنے والوں میں ہیں۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے ایل ایل بی کیا، اب یہاں کراچی میں پولیس کے محکمے میں ڈی ایس پی ہیں ..... جوش صاحب نے فرمایا۔ بہت خوب بہت خوب مگر یہ بتائیے کہ Is he a gentleman میں نے ان کے اس جملے کا مفہوم سمجھے بغیر کہا کہ یہ پولیس کے محکمے سے متعلق ہونے کے باوجود بہت شریف آدمی ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا کہ۔ نہیں نہیں، آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ہماری اصطلاح میں Gentleman کے معنی ہیں کہ یہ جام و سبو سے بھی شغل فرماتے ہیں یا نہیں پھر خود ہی کہنے لگے کہ یہ اصطلاح پنڈت جواہر لعل نہرو استعمال کیا کرتے تھے۔ میں نے کہا بدقسمتی سے اس معاملے میں ہم دونوں بھائی Gentlemen نہیں ہیں۔

جوش صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ارے تو کیا آپ بھی؟ اور کسٹم کے جیسے محکمے سے تعلق رکھنے کے باوجود۔ میں نے کہا۔ جی ہاں میں بھی ..... اور اسی وقت میرے دو گلاس بنا دیئے گئے۔ اتنے میں آفتاب غروب ہو گیا تو جوش صاحب نے یہ رباعی پڑھی۔

دل کی جانب سے طلوع ہوتا ہوں میں — سر تا قدم مصروع ہوتا ہوں میں
جب سر میں غروب ہو جاتا ہے — پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

اس کے بعد جوش صاحب نے پیمانہ بھرا۔ گھڑی دیکھی اور جام اٹھا کر کہا "یاد فلاں بنت فلاں" اور ایک گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھ دیا۔ جوش صاحب نے وہ ایک گلاس پچیس (۲۵) منٹ میں ختم کیا اور اس طرح کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں چار مرحلوں کے بعد شغل سے نوشی اختتام پذیر ہوا۔ اس دن چونکہ ہماری ملاقات کا پہلا دن تھا اس لیے زیادہ تر تعارفی باتیں ہی ہوتی رہیں۔ پھر ہماری فرمائش پر انھوں نے اپنا کلام سنایا جن میں چند رباعیات یہ تھیں:

میں دولت سک بات نہیں ہو سکتی — توہین غربا بات نہیں ہو سکتی
مجرے کے لیے آئے ہیں جبریل امیں — کہدو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

اک دوست کی محفل سے پلٹ کر سرِ شام — میں لے کے جو جھجک کے ساتھ تھا پیالۂ جام
تو نے کہا مشیت نے کہا ہے سرِ عام — پی مرد حلال پہ نہیں ہے یہ حرام

مجھے تری زندگی پہ دل جلتا ہے — نفس یک قسم کے لیے کھلتا ہے
مجھ سے کہا کہ اس چمن میں بابا — یہ ایک قسم بھی کسے ملتا ہے

قطعہ

سنو اے ساکنانِ خاک پستی — صدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر — غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

رباعی

ہر گام پہ ہے جنگ و جدل کی وادی — ہر موڑ پہ ہے امن و اماں فریادی
آپ اور یہ صد حیل و حصر وحشت — افسوس ہے اے جوش ملیح آبادی

انگشت بہ دنداں ہے مری عمرِ دراز — اسلام کے چہرے پہ ہے رنگ آغاز
رگ رگ میں گرج رہا ہے یوں بادِ مہار — دم بھر دم بھر کی آ رہی ہے آواز

طرح کوئی دو ڈھائی گھنٹے تک یہ دلچسپ محفل جاری رہی۔ جب جوش صاحب نے تیسرا پیگ ختم کر کے چوتھا شروع کیا تو ام الشعرا بیگم جوش تشریف لائیں اور تخت پر بیٹھ کر دریافت کیا

اے میاں کو تھا؟ جوش صاحب نے اسی لہجہ میں جواب دیا۔ اے لی لی چوتھا ـــــ ہی کے ساتھ ہی کہ، کھانا لاؤ۔ جوش صاحب نے چوتھا پیگ کھانے کے ساتھ ہی ختم کیا ـــ کھانے میں سیخ کباب، گوشت کا شوربا اور روٹی تھی۔ ہم سے کہنے لگے کہ آؤ آپ لوگ بھی شریک ہو جاؤ مگر ہم بھائیوں نے معذرت کی اور اجازت چاہی۔ جوش صاحب کہنے لگے اب دوبارہ آپ کے دیدار کب ہوں گے؟ ہم نے کہا، جب حکم ہو۔ کہنے لگے کل ضرور آئیے گا اور یہ کہہ کر بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت کیا۔

ہم دونوں بھائی جب گھر لوٹ رہے تھے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ آج ہم ہی محبوب ترین شخصیت سے مل کر آ رہے تھے۔

میں نے نعمت سے کہا ـــــ

بہت ہی خوش ہو اے ہم نشیں اب جوش سے مل کر
ابھی، ابھی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

نعمت نے جوش صاحب کے والد کا شعر پڑھا ـــــ

آج ہم ان کو دیکھ آئے بشیر واقعی دیکھنے کی صورت ہے

اس کے بعد ہم دونوں بھائی بھی جوش صاحب کی محفلوں میں شریک ہونے لگے اور دوستی ایسے بڑھی کہ

غم دست نوازش بن گیا ہے طوق گردن کا

جوش صاحب کا حلقۂ احباب:

کراچی میں جوش صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا ـــــ زیادہ تر دوست ان کی شام کی محفل میں شریک ہوتے تھے مگر میرے سامنے جو اصحاب زیادہ تر جوش صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور جن کے نام اس وقت مجھے یاد ہیں ان میں راجہ مراد آبادی، سرور بارہ بنکوی، فراست رضوی، سرور اقبال، حافظ مراد آبادی، سلامت علی خاں، ڈاکٹر طالب امام، مرزا عالمگیر قدر، منور عباس، ایڈوکیٹ، ڈاکٹر یاور عباس، پروفیسر منظور حسین شور، علیگ، ریاض مصطفیٰ اور ان کے بھائی فیاض مصطفیٰ تھے۔ ہماری محفلوں میں اکثر یک نوجوان شاعر اور محقق بلال نقوی بھی شریک ہوتے تھے۔

حضرت جوش ملیح آبادی اپنے بچے کے ساتھ

(دائیں سے) ناصر احمد خاں ملیح آبادی، رئیس امروہوی، راجہ مہدی علی آبادی، جوش ملیح آبادی، ساحل ہنگرامی، جسٹس وہ
غلام بیگ بیرنگ سے بیٹھے اور رضا علی

(دائیں طرف سے) راغب مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، میر علی احمد تابش پور (دیر ناتھ)
یوسف جمال (سیکریٹری سدا سیشن ۔ ۔ ۔ ۔)

(دائیں طرف سے) راغب مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، ابراہیم ۔ میر علی احمد خاں تابش پور (دیر ناتھ) اور صادق

کرسیوں پر (دائیں سے) جوش ملیح آبادی، اختر، مرزا عالمگیر قدر، ماسٹر محمد خان

استادہ راجہ مہدی علی خان، مستقل قیام، رعنا اختر

(دائیں طرف) رفعت مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، میر علی محمد خان تالپور (سابق ایڈوکیٹ)

یوسف جمال (سابق سیکرٹری اطلاعات سندھ)، ادریس دقیق (مشہور مصور)

جوش صاحب کے مراثی پر تحقیق کر رہے تھے اور جوش صاحب سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔

ایک اور صاحب نسیم احمد بھی تھے جو بہت اچھے شاعر اور ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ اور رف صاحب کے محکمہ لیبر و تعمیر میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ جوش صاحب ان کے خیالات کو پسند کرتے تھے۔

ان کے علاوہ روشن علی بھیم جی، آغا حسن عابدی، میر علی احمد ناشپور، میر رسول بخش ناشپور، مشتاق احمد یوسفی، ماہر ذہین شاہ تاجی، جوش صاحب کے کرم فرماؤں اور عقیدت مندوں میں سے تھے اور صبح ناشتے کے بعد اکثر جوش صاحب ان حضرات سے ملنے کے لیے ان کے مکان یا دفتر جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اور کبھی ان کے ساتھ ہوتے۔

ان دنوں میں بابا ذہین شاہ صاحب تاجی کا مکان پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس میں تھا اور جوش صاحب زیادہ تر صبح کو ان ہی کے گھر جایا کرتے تھے۔ بابا صاحب کے گھر کے قریب ہی فضل احمد کریم فضلی صاحب کا مکان "بیت الغزل" تھا اور جوش صاحب کبھی کبھی بابا صاحب کے گھر سے فضلی صاحب کے گھر بھی چلے جاتے اور وہاں بہت پر لطف شعر و شاعری کی محفل جمتی۔

جوش صاحب کا خاندان:

جوش صاحب کے دو بچے ہیں۔ بیٹی سعیدہ خاتون اور بیٹا سجاد حیدر۔ سعیدہ خاتون صاحبہ کی شادی التفات احمد صاحب سے دہلی میں ہو گئی تھی جو شاعر بھی تھے اور شہاب تخلص کرتے تھے اور بیٹے سجاد حیدر صاحب میں ان کی شادی بمبئی میں نور عالم صاحبہ سے ہوئی تھی۔

سعیدہ خاتون مع اپنے بچوں کے جوش صاحب کے ساتھ ان کے گنبد والے مکان ۲۲۸ ڈی فیڈرل بی ایریا میں رہتی تھیں۔ ان کے قبضے میں مکان کا پچھلا حصہ تھا۔ جوش صاحب اور ان کی بیگم اشرف جہاں بالائی منزل میں رہتے تھے۔

سعیدہ جن کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے سات بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں ... جوش صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے عزیزوں کو عام طور پر ان کے اصلی نام سے پکارنے کے بجائے خود ہی عطا کردہ عرفیت سے مخاطب ہوتے تھے ... ان کے نواسے نواسیوں کے نام مع ان کی عرفیت کے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ انور سعید خاں عرف میاں ۲۔ حیدر مسعود خاں عرف بلے

۳۔ پروین شباب خاں عرف پری یہ اسلام آباد میں جوش صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی ہر طرح خدمت کرتے تھے۔ ۴۔ صبوحی خاتون عرف بانی۔ ان کے شوہر ناصر صاحب تھے۔ اچھا شعر کہتے تھے مگر افسوس جوانی میں انتقال ہو گیا۔ ۵۔ خورشید خاتون عرف خزیا

۶۔ خسرو شباب خاں عرف بلو یہ علی کے ست لڑکے تھے اور جوش صاحب علی کے لفظ سے انہیں پکارا کرتے تھے۔ ۷۔ علی معظم خاں عرف علی کبھی کبھی ان کو مسکین شاہ بھی کہہ دیتے تھے

۸۔ نرگس جمال عرف گلنار ۹۔ سراج انور خاں عرف کبی

جوش صاحب کے صاحبزادے سجاد حیدر خاں لکھنؤ میں ۲۲ جون ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔

شاعری ورثہ میں ملی تھی اور جوش کی مناسبت سے حروش تخلص کرتے تھے۔ اور جوش صاحب اکثر آبدار شعر کہتے تھے۔ مگر خود حروش صاحب کا خیال تھا کہ جوش صاحب جیسے گھنیرے درخت کے سائے میں ان کی شاعرانہ بلند پروازی کو وہ قبولیت عام حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ لکھنؤ کی بھاتکھنڈے یونیورسٹی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور شاندار کامیابی پر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ بمبئی کے قیام کے دوران سجاد صاحب نے محمد حنیف صاحب پیشتر اور ناصر وزیر جو ناگڑھ کی صاحبزادی اور نام سے شادی کر لی تھی۔ شاعری اور موسیقی کے ساتھ ساتھ اسٹیج اداکاری بھی کرتے تھے۔ بمبئی میں فلمی صنعت سے بہ حیثیت موسیقار وابستہ رہے۔ پاکستان میں سجاد صاحب جوش صاحب کی سمت کی ایجنسی کو چلاتے تھے لیکن ۱۹۶۸ء میں جب ایوب خاں صاحب صدر پاکستان نے یہ ایجنسی بند کر دی تو سجاد صاحب نے ایک چھوٹی سی ورکشاپ قائم کر لی مگر چونکہ ہنرمند ہاتھ نواز بھی تھے اور اس فن میں استاد کا درجہ رکھتے تھے اس لئے ریڈیو پاکستان والے ان کی خدمات سے استفادہ کیا کرتے تھے میں جس زمانے میں جوش صاحب کے حلقہ ارادت میں داخل ہوا ان دنوں میں سجاد صاحب ناظم آباد کے نئے اور تنگ آباد کے مکان نمبر ۲۰ ر ۲۰ میں رہتے تھے۔ میں نے جوش صاحب کو سجاد صاحب کی طرف سے فکر مند پایا۔ بات یہ تھی کہ ان کو بھی بہت مطلب کا چسکا پڑ چکا تھا۔

ایک دن میں اور جوش صاحب سجاد صاحب کو دیکھنے ان کے مکان گئے وہ بیمار تھے اور پلنگ پر

لیٹے ہوئے تھے۔ مکان بہت چھوٹا تھا اور آنگن کی دیوار کا ایک حصہ گر گیا تھا اس ماحول میں میرے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر جاوید صاحب نے اپنا ایک شعر پڑھا

ویرانی دل دیکھ کے تم چیخ اٹھو گے
کیا دیکھ رہے ہو مرے اجڑے ہوئے گھر کو

جوش صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے جاوید صاحب کو کچھ رقم دی اور ہم لوگ تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آگئے۔ میں نے محسوس کیا کہ جوش صاحب ہمیشہ اپنی اولاد اور ان کے متعلقین کی طرف سے فکر مند رہتے تھے۔ وہ اتنے بڑے شاعر، مفکر اور دانشور تھے کہ برصغیر تو کیا تمام انسانیت ان پر ہمیشہ فخر کرے گی۔ وہ فکر انسانی کے ارتقا میں صدیوں تک نشان منزل بنے رہیں گے مگر اتنا عظیم انسان اپنے متعلقین کی معاش کی فکر میں اہل ثروت اور اہل اقتدار کی نگاہ التفات کا طالب رہتا تھا۔ ذرا ان کے اس کرب کو ملاحظہ فرمائیے۔

آفاق پہ خندہ زن ہے جس کا ایوان — جس کے آگے نظام شمسی حیران
بچو شاہد رہو کہ میں نے تم پر — اس عزت نفس کو کیا ہے قربان

جب جوش صاحب اسلام آباد میں منتقل ہو گئے تو انہوں نے جاوید صاحب اور ان کے بیوی بچوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ اسلام آباد میں جاوید صاحب پاکستان کونسل آف آرٹس میں ملازم ہو گئے اور آخر تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔۔۔ جوش صاحب کے انتقال کے بعد جاوید صاحب بارہ برس تک زندہ رہے مگر افسوس کہ جوش صاحب کے کلام اور ان کی تخلیقات کی اشاعت کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکے۔

جاوید صاحب کی حسب ذیل اولادیں ہیں۔

۱۔ سید حیدر خان۔ جوش صاحب ان کو حیدر کہتے تھے۔ پاکستان نگر میں ان کی ورکشاپ ہے جہاں موٹر سائیکلیں ٹھیک کرتے ہیں۔

۲۔ نازنین خاتون۔ ان کو جوش صاحب امی کہتے تھے اور یہ جوش صاحب سے اسی طرح محبت اور ان کی خدمت کرتی تھیں جیسی ماں اپنے بچے کی کرتی ہے۔

۳۔ ترنم خاتون۔ عرف جاوید۔

۴۔ تبسم خاتون ۔۔۔ عرف تبسمی ۔۔ جب یہ بچی چھوٹی تھی تو مست بچ بچ کر بات کرتی تھی۔ چونکہ سب سن بھائیوں میں خوبصورت تھی تو سب لوگ پیار کرتے تھے ۔۔۔۔۔ بڑی ہو کر بہت باصلاحیت خاتون نکلیں۔ اسلام آباد میں ست چچے گھرانے میں شادی ہوئی اور اب صاحب اولاد ہیں۔ جوش صاحب کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت میں کوشاں ہیں۔ اب وہ اسلام آباد کی جوش میموریل کمیٹی کی صدر ہیں اور تبسم اعظمی جاج آبادی کے نام سے مشہور ہیں ۔۔۔۔۔ ان کی کوششوں اور مولانا کوثر نیازی کے ہر حتی تعاون سے جوش صاحب کا ایک غیر مطبوعہ مجموعہ کلام محراب و مضراب چھپ کر آ چکا ہے۔

۵۔ فواد حیدر ۔۔۔ ان کی سر پر بالوں کی ایک لکیر ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے اس لیے جوش صاحب نے ان کو دمدار کی عرفیت عطا کی تھی۔ یہ جب چھوٹے سے تھے تو جب ہی سے جوش صاحب کی گھڑی چرانے کی مشق کیا کرتے تھے اور چھوٹی موٹی خرچی تک درست کر لیا کرتے تھے۔

نوٹ جوش صاحب کے انتقال کے بعد سجاد حیدر خروش چند دن تو اسلام آباد ہی میں رہے مگر پھر کراچی واپس آ کر اپنے قدیم مکان واقع محلہ اورنگ آباد پاپوش نگر ناظم آباد میں مقیم ہو گئے۔ سعیدہ مس کے انتقال کے بعد سجاد صاحب جوش صاحب کے مکان ۴۸ ڈی واقع فیڈرل بی ایریا میں منتقل ہو گئے مگر کچھ ہی دن بعد انھوں نے وہ مکان فروخت کر دیا اور جنرل روڈ میں ایک چھوٹا سا مکان لے کر اس میں رہنے لگے۔ صحت خراب رہنے لگی اور بالآخر ۸ نومبر ۱۹۹۲ء کو سجاد صاحب کا انتقال ہو گیا۔

اشرف جہاں (بیگم جوش):

کراچی میں جوش صاحب کی شام کی محفلیں مست دلچسپ ہوتی تھیں۔ سردیوں کے دنوں میں وہ اپنے بالاخانے کے ہال میں بڑے تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ تخت کے دوسرے سرے پر ایک دوسرے گاؤ تکیے کے سہارے ام الشعرا بیگم جوش بیٹھ جاتیں اور دونوں میاں بیوی میں مست دلچسپ نوک جھونک ہوتی رہتی۔ جب سورج غروب ہو جاتا اور بلاوے کو دن بال کشائی مل جاتا تو ام الشعرا دو گلاسوں میں ایک ایک پیگ شراب

ڈالتیں ایک گلاس اپنے سامنے رکھتیں اور ایک گلاس جوش صاحب کی طرف بڑھا دیتیں۔

ایک دفعہ وہ شراب میں پانی ملانا بھول گئیں اور ویسے ہی جام جوش صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ جوش صاحب نے ان سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا۔

کشتی مے کو حکم روانی بھی بھیج دو
جب آگ بھیج دی ہے تو پانی بھی بھیج دو

بیگم جوش نے ٹھنڈے پانی کی بوتل سے پہلے تو اپنے گلاس میں پانی انڈیلا پھر وہی بوتل جوش صاحب کی طرف بڑھا دی۔ ایسے وقت میں جوش صاحب کوئی کام اپنے ہاتھ سے کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ بوتل پی جگہ رکھی رہی۔ میں نے جب جوش صاحب کے چہرے پر بے چینی کے آثار دیکھے تو خود آگے بڑھ کر بوتل اٹھالی اور جوش صاحب کے گلاس میں پانی ڈال دیا۔ جوش صاحب نے عجیب نظروں سے بیگم کی طرف دیکھا اور یہ رباعی پڑھی۔

کب راکھ پہ گرتے ہیں نہ ہونے والے
شعلوں سے ہیں لاکھ لو لگانے والے
بوڑھا ہو کر وفات پاتا ہے جو عشق
بیٹے کبھی اس کی لاش اٹھانے والے

بیگم صاحبہ کہنے لگیں۔ اے کیا تم خود کو بہت بڑا آدمی سمجھتے ہو؟ ہرجائی کہیں کے۔ جوش صاحب نے ایک گھونٹ لے کر کہا ـــ بی بی تمہارا قصور نہیں ہے یہ میاں بیوی کا رشتہ ہی بہت بُرا ہوتا ہے۔ میں نے آج تک کسی بیوی کو اپنے میاں کی تعریف کرتے کبھی سنا خواہ میاں پیغمبر ہی کیوں نہ ہو ـــ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ یہ شادی کا ادارہ ہی ختم ہو جانا چاہیے۔

بیگم جوش۔ اے توبہ کرو توبہ کیوں کفر بک رہے ہو۔ شادی تو اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے ـــ تم اس ادارے ہی کو ختم کرنا چاہتے ہو ـــ کیا حرام کاری کو جائز کرنا چاہتے ہو۔

جوش صاحب۔ اے بھائی میں نے حرام کاری کی بات کب کی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ عورت اور مرد کے درمیان سب سے مستحکم اور مقدس رشتہ عشق و محبت کا ہوتا ہے۔ جہاں شادی ہوئی وہ ایک دوسرے کی جائیداد بن جاتے ہیں اور وہ لطیف جذباتی رشتہ جسے عشق و

محبت کہتے ہیں، ٹھنڈ پڑنے لگتا ہے۔

بیگم جوش: ارے بس رہنے دو میرا منہ نہ کھلواؤ۔ تم نے کب کب یاد معاشقوں پر کتنا کیا ہے۔ تم نے تو پی کیفیت خود اپنے منہ سے بیان کی ہے

راتیں گزارتے تھے ہم جوش گھر سے باہر
رہتے تھے مے و شیں کے انفاس سے معطر
اور گھر میں جب پہنچتے ہم ہوئے سراسر
تو پوچھتی تھیں بیگم یہ صبح کو بگڑ کر
کیوں جی، قسم تو کھاؤ کل رات کو کہاں تھے

جوش صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

بیگم جوش: اچھا تو اب تم نے عاشقی سے توبہ کر لی ہے؟ اور یہ شعر کس کے ہیں۔

اس سن میں بھی پڑتی ہیں حسینوں پہ نگاہیں
اب بھی ہیں وہی شوق کی آگ سی کرہیں
اب بھی یہ دعا ہے کہ میں بھولوں سی باہیں
مر جائیں ہم اے جوش بتوں کو جو نہ چاہیں
گھٹی میں پڑی عاشقی و بے بسی ہے

جوش صاحب: ارے اس گل مدنی کی بات کر رہی ہو۔ بیگم کاش تم میری جگہ مرد ہوتیں تو تمہیں حسن کی جادوگری کا پتا چلتا

با حسنش ایں جنوں کہ تو بیں تحمل است

بیگم جوش: اے میاں تم پر تو ہر حسینہ کا جادو اسی طرح سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہر حال ہے تمہیں اپنا وہ شعر یاد ہے۔

چمن کو حرق سوز و ساز کر جاتا ہے جب بھولا
نیاز عاشقی کو جز کر جاتا ہے جب بھولا

خوشی کو لطیف گداز کر جاتا ہے جب بھنورا
کلی کو چوم کر پرواز کر جاتا ہے جب بھنورا
اور اس کے بعد جب تاثیر شبنمی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

ذرا سوچو تم کس خوبصورتی اور دلنشینی سے اپنی آوارگی کو دلکش انداز میں بیان کر جاتے ہو شاعر اعظم کہلاتے ہو۔

جوش صاحب اس وقت چوتھا پیگ ختم کر چکے تھے۔ کہنے لگے چچا اب حضرت تھوک دو اور کھانا لاؤ۔

اتنے میں جوش صاحب کی صاحبزادی سعیدہ بیگم آ گئیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو آواز دی جو جوش صاحب کے لیے کھانا لے آئیں۔ جوش صاحب نے تخت کے ساتھ رکھے ہوئے ایک دیو ہیکل گلدان میں ہاتھ دھوئے اور کلیاں کر کے کھانا شروع کر دیا تو سب لوگ رخصت ہونے لگے۔ مجھ سے جوش صاحب نے کہا ارے میاں تم تو میرے ساتھ کچھ کھاؤ مگر میں نے بھی معذرت چاہی اور چلنے لگا تو کہنے لگے اگر کل صبح کوئی کام نہ ہو تو تو (۹) بجے آ جاؤ۔ ذہین شاہ کے وہاں جائیں گے۔ میں نے وعدہ کر لیا اور گھر آ گیا۔

بابا ذہین شاہ تاجی:

دوسرے دن جب میں ۹ بجے میں پانچ منٹ کم پر جوش صاحب کے گھر پہنچا تو شیروانی پہنے ہوئے ہاتھ میں لیے تیار بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے واہ واہ تم تو وقت کے اتنے پابند نکلے ــــ معلوم ہے؟ وقت کا پابند ہونا سچے انسان کی علامت ہے۔ میں نے ایک رباعی میں کہا ہے۔

دنیا اسے کاندھا بھی نہ دے گی واللہ
لعنت کے دلدل پہ جو ہو گا نہ سوار

جوش صاحب نے اپنی دو تین بیاضیں ساتھ لیں اور ہم دونوں بابا صاحب کے آستانے پر پہنچ گئے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بابا صاحب ہمارا انتظار ہی کر رہے تھے۔ سفید براق

کپڑے، بڑے بڑے پائنچوں کا پاجامہ، سفید لمبی داڑھی، دانتوں پر پان کی اس قدر گہری تہہ کہ سیاہی میں تبدیل ہو گئی تھی ..... ہم دونوں کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور محبت سے گلے مل کر اپنے قریب ہی شہ نشین پر بٹھا لیا۔ بہت سے مرید وہیں ہال میں فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ لوگ آتے رہے، بابا صاحب کے ہاتھ کو عقیدت سے بوسہ دیتے رہے۔ بعض بعض لوگ خصوصاً عورتیں ان کے پیروں پر سر رکھ کر دعا کی طالب ہوتی رہیں۔ بابا صاحب ہر ایک کی خیریت دریافت کرتے، ان کی پریشانی سنتے اور دعا دیتے۔ اکثر لوگ بوتل میں پانی بھر کر لاتے تھے۔ بابا صاحب نے اس پانی پر دم کیا اور بوتل لوٹا دی۔ میں نے دیکھا کہ جب بابا صاحب پان پر پھونک مار رہے تھے تو پان کی پیک بھی بوتل کے منہ پر گر رہی تھی جس کو مرید تبرک سمجھ رہے تھے۔

میں اور جوش صاحب دلچسپی سے لوگوں کی معصوم نفسیاتی حالتوں کا مشاہدہ کرتے رہے۔ بابا صاحب کے تخت کے قریب ایک بڑی میز پڑی ہوئی تھی جس پر انواع و اقسام کی مٹھائیاں اور پھلوں کی ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ بابا صاحب کے اشارے پر وہ مٹھائیاں اور بہت سے پھل ہمارے سامنے رکھ دیے گئے۔ ہم نے ایک ایک کیلا کھایا۔ پھر بہت لذیذ چائے پیش کی گئی۔ جوش صاحب نے پھل کھانے سے پہلے اور چائے پینے کے بعد گلوریاں لیں پھر پان کھا لیا۔ بابا صاحب کا پان کا بیڑا بڑا ہوا کرتا تھا جب کہ جوش صاحب بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھاتے تھے۔ بابا صاحب کا قوام بھی بہت خوشبودار، عطر ملا ہوا کرتا تھا جس کی خوشبو تمام کمرے میں مہکتی رہتی تھی۔

بابا صاحب کے آستانے پر قوت کام و دہن کا بندوبست کرنا ان کے مریدوں کی ذمہ داری تھی جس میں کسی قسم کی کوتاہی کی جرأت وہ اپنی آخرت کو خطرے میں ڈال کر ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے کھانے کی ایسی بہت تھی جو وہاں موجود نہ ہو۔ بابا صاحب کے پاس ایک قوال بھی تھا جسے وہ اپنے ساتھ جیپ پر لے آئے تھے۔ سفید اچھی داڑھی، چوڑی دار پاجامہ، شیروانی، آنکھوں میں کاجل، درمیانہ قد مگر آواز میں غضب کا ترنم اور مٹھاس ..... وہ صرف بابا صاحب ہی کا کلام سنانے پر مامور تھا۔ بابا صاحب اور جوش صاحب جب ایک دوسرے کو اپنا اپنا کلام سنا چکے تو جوش صاحب کی فرمائش پر قوال صاحب طلب کیے گئے۔ وہ اپنے ہارمونیم

جناب سبطِ حسن

(6)

کے ساتھ آئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک دلکش موسیقی کی بھاور پڑتی رہی۔

تقریباً ایک بجے ہم نے اجازت چاہی۔ بابا صاحب نے بادل ناخواستہ رخصت کیا۔ راستے میں میں نے جوش صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کے اور بابا صاحب کے عقائد اور افکار میں بعد المشرقین ہے پھر وہ کون سی بات ہے جس کے باعث آپ بابا صاحب کو اس قدر پسند کرتے ہیں؟

جوش صاحب نے کہا۔ دو باتیں مجھے بابا صاحب کی بہت پسند ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی قسم کی تنگ نظری کا برا نہیں مانتے دوسرے وہ وسیع المشرب انسان ہیں جو ان کے بہت بڑے عالم ہونے کی دلیل ہے۔ ان کے دل میں کسی مذہب کسی فرقے کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات نہیں ہیں بلکہ وہ ہر انسان سے صرف انسان ہونے کی حیثیت سے محبت کرتے ہیں۔ غرض ہم یہ باتیں کرتے ہوئے جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ جوش صاحب نے گاڑی سے اتر کر کہا آپ مجھے اوپر تک نہیں پہنچائیں گے؟ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ اوپر اپنے کمرے میں جا کر جوش صاحب نے کپڑے بدلے تہبند باندھا اور پٹا پر اس تہبند کے نیچے میں اوڑھ لیا۔ جوش صاحب کا یہ لباس تھا جس کو وہ بولتے تھے۔ اس کے متعلق جوش صاحب کا خیال تھا کہ وہ ہر وقت ان کے پیر کی ناک میں رہتا ہے اور جس قدر ملتے ہی ان کی پوجا لے اڑتا ہے۔ جب میں چلنے لگا تو جوش صاحب نے کہا اسے بھی ذرا سبط حسن کو نے ٹی لون کر کے پوچھ لو کہ میری کتاب "یادوں کی برات" طباعت کی کس منزل میں ہے۔ میں نے کہا کہ گھر جا کر نے ٹی لون کروں گا۔ اس کے بعد جوش صاحب سے رخصت ہو کر ڈھائی بجے گھر پہنچا۔

یادوں کی برات کی طباعت:

دوسرے دن میں سبط حسن صاحب کے دفتر گیا جو مری روڈ جلال کے قریب قمر ہاؤس اور اسٹیٹ لائف انشورنس کراچی کے دفتر کے درمیان کی عمارت میں واقع تھا۔ سبط حسن صاحب سے میں نے اپنا تعارف کروایا کہ کیلی اعظمی میرے ہموطن ہیں اور میں یہاں کسٹم کے محکمے میں ملازم ہوں مگر اس وقت جوش صاحب نے مجھے بھیجا ہے وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی کتاب "یادوں کی برات" طباعت کی کس منزل میں ہے؟ سبط حسن صاحب بہت محبت

سے ملے۔ مجھے اپنے پاس بٹھایا چائے پلائی پھر کہنے لگے کہ کتاب چھپ کر آ گئی ہے اور اس کی جلد بندی بھی ہو گئی ہے۔ مجلد کتاب کی قیمت ۲۰ روپے اور جلد کے بغیر ۱۵ روپے رکھی ہے۔ اس کتاب کی طباعت کے اخراجات کے لیے روشن علی بھیم جی صاحب سے بیس ہزار روپے قرض لیے گئے تھے اب یہ کتاب دوکانداروں کو دی جائے گی اور اس کی فروخت سے جو آمدنی ہو گی اس میں سے پہلے بیس ہزار روپیہ وضع کر کے بھیم جی صاحب کا قرض ادا کیا جائے گا پھر باقی رقم میں خود جوش صاحب کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ ویسے بھی یہ تمام حساب لکھ کر میں جوش صاحب کو سمجھا دوں گا۔ جب میں چلنے لگا تو سبط حسن صاحب نے کہا آپ سے مل کر خوشی ہوئی آپ ضرور ملتے رہا کیجیے گا۔ وہاں سے رخصت ہو کر میں پیدل دفتر گیا۔ شام چار بجے گھر پہنچا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور پھر نعمت اللہ خاں کو ساتھ لے کر جوش صاحب کے گھر پہنچا۔ جوش صاحب غسل ثانی فرما کر سفید کرتے پاجامے میں ملبوس پلنگ تخت پر براجمان ہو چکے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر کہنے لگے ارے واہ واہ بہت خوب وقت پر آئے۔ میں اب چائے پینے ہی والا تھا۔ اب آپ دونوں بھائی بھی میرے ساتھ شریک ہو جائیں۔ کم از کم چائے میں تو آپ میرے ہم پیالہ ہو جائیں۔ میں نے کہا جوش صاحب ہم دونوں تو چائے سے زیادہ چاہ کی خاطر آپ کے شیدائی ہیں۔ اتنے میں چائے آ گئی اور جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اچھا اچھا پہلے چائے پیو پھر بتاؤ کہ سبط حسن سے ملے تھے؟ انھوں نے کیا کہا؟

میں نے سبط حسن صاحب سے ملاقات کی تمام تفصیل سنائی یہ سن کر تو جوش صاحب خوش ہوئے کہ "یادوں کی برات" چھپ کر آ چکی ہے مگر جب یہ سنا کہ پہلے قرض ادا ہو گا اور کتاب کی فروخت کے بعد باقی رقم جوش صاحب کے حصے میں آئے گی تو ان کے خوش و خرم چہرے پر کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو گئی جیسے کوئی میٹھا بادام کھاتے کھاتے کڑوا بادام کھا لے۔ میں نے منہ کا مزا بدلنے کے لیے فوراً کہا کہ سبط حسن صاحب بہت جلد تمام تفصیل لکھ کر آپ سے ملیں گے اور آپ کے مشورے کے مطابق کام کریں گے۔ یہ بات ۱۹۷۰ء کی ہے۔

جوش صاحب کی پاکستان آمد:

ہم لوگ چائے ختم کر چکے تو دیکھا کہ غروب میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔ نعمت نے کہا جوش صاحب ہمارے لیے یہ بہت خوش قسمتی کی بات ہے کہ آپ پاکستان تشریف لے آئے ورنہ ہندوستان میں تو آپ سے ملاقات کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے مگر یہ بتائیے کہ

کے کشید ایں فطرت کہ جنید و من آمدی؟
تو سد عالم دیگری رکجا بہ ایں چمن آمدی؟

جوش صاحب آخر وہ کیا حالات تھے جن کی بنا پر آپ نے جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے دوستوں کی صحبت ترک کی اور پاکستان آ گئے؟ اور جن مقاصد کو سامنے رکھ کر آپ نے ترک وطن کیا، کیا وہ پورے ہو گئے؟ نعمت کا سوال کافی طویل ہو گیا تھا مگر جوش صاحب خاموشی سے سنتے رہے اور جب نعمت خاموش ہوئے تو جوش صاحب نے پہلے تو گاؤ تکیے کا ٹیکا لیا پھر نہایت اطمینان سے بات شروع کی۔ میاں، جہاں تک بیدل کے اس شعر کے حوالے سے جو ابھی آپ نے پڑھا، میرے دامن فطرت کو کھینچنے کا سوال ہے تو سچی بات تو یہ ہے کہ میں فطرتاً سیماب صفت انسان واقع ہوا ہوں۔ کسی نے اس شعر میں میری ہی فطرت کی عکاسی کی ہے۔

دمے بیک مقام نہ گردد بہ رنگے
از بوئے بہ بوئے بردار رنگ بہ رنگے

میرے اندر کا شاعر مجھے کسی ایک مقام پر چین سے بیٹھنے نہیں دیتا اور ہر وقت ایک مقام سے دوسرے مقام پر لیے لیے پھرتا ہے اور اس مسلسل گردش میں رہنے والے جہاں جہاں گشت شاعر کو اگر کسی ایک مقام پر بند کر دیا جائے تو وہ خون تھوک تھوک کر مر جائے گا۔ میری یہی بے چین فطرت مجھے ملیح آباد سے لکھنؤ لے گئی وہاں سے میں حیدرآباد دکن چلا گیا کچھ دنوں بعد وہاں سے بھی دل بھر گیا تو میں بمبئی چلا گیا وہاں سے پونے منتقل ہو گیا۔ پھر دلی چلا آیا اور اب کراچی آ گیا ہوں مگر یہاں سے بھی ست جلد اسلام آباد منتقل ہو جاؤں گا۔

میں نے عرض کی کہ جوش صاحب یہ تو رہی ایک شاعر کی حیثیت سے آپ کے سیماب صفت ہونے کی بات مگر اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ آپ کو آپ کے ہم عقیدہ ابوطالب صاحب نقوی نے جو اس زمانے میں کراچی کے چیف کمشنر تھے ایک بڑا پلاٹ سینما کے لیے ایک پلاٹ آپ کے بنگلے کے لیے اور پچاس ایکڑ زمین آپ کے برج کے لیے الاٹ کر دی تھی۔ اس کے علاوہ آپ کے اور آپ کے بچوں کے لیے مستقل آمدنی کا بندوبست کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

جوش صاحب نے کہا ہاں یہ بات صرف وعدے کی حد تک تو درست ہے مگر ابوطالب صاحب نقوی کی جس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا یہ استدلال تھا کہ ہندوستان میں اب اردو کا مستقبل مت تاریک ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں اردو رسم الخط سمجھنے والا کوئی شخص باقی نہیں رہے گا آپ کے کلام کو دیوناگری زبان میں لکھ کر لوگ پڑھا کریں گے اور شین کی جگہ سین اور قاف کی جگہ کاف پڑھیں گے اور آپ جو اس قدر صحت تلفظ پر زور دیتے ہیں، اپنا سر پیٹ کر رہ جائیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ اس کے برعکس پاکستان میں اردو کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوگی اور چونکہ یہاں کسی صوبے کی زبان اردو نہیں ہے اس لیے اردو سے محبت کرنے والے ہر ادیب اور شاعر کا فرض ہے کہ وہ پاکستان میں اردو کی ترقی کے لیے کوشش کرے۔ نقوی صاحب نے مزید کہا۔ جوش صاحب یہاں پاکستان میں آپ جیسے اردو زبان کے ماہروں کی ضرورت ہے تاکہ خواہ وہ حکومتی سطح پر ہو یا عوام میں ادبی سطح پر آپ لوگوں کی رہنمائی کر سکیں اور ہماری حکومت اور عوام آپ کی رہنمائی میں اپنی اصلاح کر سکیں۔ اس کے علاوہ آپ کی وہ تہذیب جس کے تعلق سے آپ اس قدر حساس واقع ہوئے ہیں کہ آپ اس محفل میں بھی شریک ہونا پسند نہیں کرتے جہاں آپ کے معیار کے مطابق لوگ مہذب نہ ہوں، وہ تہذیب اب آپ کو پورے ہندوستان میں کہیں نہیں ملے گی کیونکہ اس تہذیب کے حامل تمام انسان اب پاکستان منتقل ہو گئے ہیں۔ تو کیا یہ عظیم سماجی اور روایتی بربادی آپ کو پسند ہے؟ تو جناب ابوطالب صاحب نقوی کی اس مدلل اور جذباتی گفتگو نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے۔

نصرت نے کہا کہ جوشؔ صاحب کیا اب آپ اپنے اس فیصلے سے مطمئن ہیں؟ جوشؔ صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

اتنے میں رعب صاحب مراد آبادی، فراست رضوی اور سرور اقبال آ گئے۔ موضوع مطرب ہو چکا تھا۔ ام الشعرا نے جو اتنی دیر سے ہماری گفتگو بڑی بیزاری سے برداشت کر رہی تھیں، ایک جام بھر کر جوشؔ صاحب کو دیا اور جوشؔ صاحب نے "بیاد فلاں بنت فلاں" کہا اور ایک گھونٹ لے کر گلاس میز پر رکھ دیا۔

فراست رضوی اور سرور اقبال خاصے ذہین نوجوان ہیں۔ شعر اچھا کہتے ہیں۔ خاص طور سے فراست رضوی کی شعر گوئی پر قدرت کو جوشؔ صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ لوگ آ گئے تو گفتگو کا موضوع شاعری کی طرف منتقل ہو گیا۔ جب جوشؔ صاحب تیسرے پیگ پر پہنچے تو ہم دونوں بھائیوں نے اجازت چاہی اور رخصت ہو گئے۔ رستے میں مجھ سے نصرت نے کہا کہ میں جوشؔ صاحب سے رعب اور ان کے متعلق بھی ان کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کسی دن شام کو ذرا جلدی ان کے گھر چلیں گے اور ان سے اس موضوع پر کچھ باتیں کریں گے۔ میں نے کہا پہلے ایک کام کرو کہ جوشؔ کے متعلق جوشؔ صاحب کا جتنا کلام ہے وہ پڑھ لو پھر اس کی روشنی میں سوالات کرنا۔ میں بھی جتنا کلام مجھے ملے گا پڑھ کر آؤں گا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے اس نقطہ نظر سے جوشؔ صاحب کے کلام کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کے بعد کئی روز تک جوشؔ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔

یادوں کی برات

ایک دن میں اور نصرت جوشؔ صاحب کے گھر گئے تو دیکھا کہ ان کی سوانح حیات "یادوں کی برات" کی کچھ جلدیں ان کے تخت پر رکھی ہوئی ہیں۔ جوشؔ صاحب نے مجھے ایک جلد دے کر کہا کہ آپ دونوں بھائی سے پڑھ لیں۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے کتاب لے لی اور تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر گھر آ گئے۔ یہ تقریباً ساڑھے سات سو صفحات کی بڑی ضخیم کتاب ہے

اور اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں نے اس کتاب کو بہت غور سے پڑھا۔ میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ اس کا انداز بیان اردو زبان کے ادب عالیہ کا لافانی شاہکار ہے۔ اور جہاں تک اس کتاب کی ادبی حیثیت کا تعلق ہے یہ ایک بیش بہا ادب پارہ ہے۔ جس منظر کو بیان کیا اس کی تصویر کشی اس قدر فنکارانہ کی گئی ہے کہ اس منظر کو قاری کی آنکھوں سے دکھا دیا۔ جس شخصیت کا سراپا بیان کیا اس کو قاری کے حافظہ میں امر بنا دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ذہن کا حافظہ کیے رہتا ہے کہ ان کی عظمت رفتہ کی نقش گری اور معاشقوں کی تفصیل کا ذکر مبالغہ آمیز شاعرانہ ہے۔

فسانے اپنی محبت کے سچ تو ہیں لیکن
بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے

اور کئی واقعات اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ حقیقت کے بجائے ان میں جوش صاحب کی اپنی خواہشات کی تکمیل کا عکس جھلکتا ہے۔ مگر اس کتاب سے جوش صاحب کے گھر کا ماحول، ان کے عقائد، ان کی تعلیم لکھنؤ کی روایتی آباد جاگیردارانہ تہذیب، اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنیں اور احساس کمتری جس کے رد عمل کے طور پر برتری کا دعویٰ شیعہ عقائد کی ذہن پر مضبوط گرفت، اپنی عظمت رفتہ کا شدید احساس اور اس کے نتیجے میں انگریز کی غلامی سے نفرت، اس دور کے نوابوں کی تقلید میں شراب و شباب کی بزم ہائے طرب کی طرف فطرت کا میلان اور کوچہ عیش و عشرت کی طرف جانے والی راہوں میں رکاوٹ ڈالنے والی مذہبی اقدار سے بغاوت اور اس بغاوت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تشکیک اور تنقید کی صلاحیت، غرض جوش کی شخصیت کے تمام اجزائے ترکیبی "یادوں کی برات" کے نوشتہ کے چہرے پر شاعرانہ الفاظ کا سہرا باندھتے اور روحانی جذبات اور عقل و دانش کے گلہائے رنگین و معطر میں ان کو لپیٹے نظر آتے ہیں۔ جوش صاحب کی ابتدائی تعلیم اس دور کے جاگیردار گھرانوں کے رواج کے مطابق زیادہ تر گھر پر ہی ہوئی۔ اس میں عربی، فارسی اور اردو کا معیار تو بہت بلند تھا مگر عصر حاضر کے سائنسی، معاشرتی اور معاشی علوم سے اس کا نصاب بے بہرہ تھا۔ جوش صاحب نے بھی ابتدائی جماعتوں کی حد تک تو اسکولوں میں داخلہ لیا مگر وہ کالج کے معیار کا علم حاصل نہ کر سکے اور جدید علوم میں گہری بصیرت حاصل کرنے کے لیے جس معیار کی انگریزی

دین کے علم کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی ان کو حاصل نہ تھا۔

مذہبی فکر کا ارتقاء:

لیکن جوشؔ صاحب کا ذہن نابغہ روزگار کا ذہن تھا۔ وہ کسی بات کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے جب تک پوری طرح منطقی طور پر اس سے مطمئن نہ ہو جاتے۔ ان کا ذہن حقائق کا متلاشی تھا اور ہر محقق کی طرح وہ متشکک بھی تھے۔ مذہب اور کائنات سے متعلق ہزاروں سوالات ذہن میں پیدا ہوتے تھے۔ ویسے بھی اگر خارجی دنیا کا معروضی سائنسی علم حاصل نہ ہو تو اس کے حقائق، اس کی پیچیدگیاں اور نظام حیات کی سماجی گتھیاں اور سماجی، سیاسی، عمرانی، اخلاقی اور مذہبی پابندیاں، معاشرتی رسم و رواج کی جکڑ بندیاں ان کے اسباب اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیاں ان کی گہرائی اور گیرائی حدود نگاہ میں نہ ہوں تو انسان ظاہری رسوم ہی کی پابندیوں کو اصل مذہب سمجھ لیتا ہے اور مروجہ عقائد کی روشنی میں ذہنی تسلی کے لیے دائرے کے روایتی بت تراش کر ان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور بڑی بڑی باتوں کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی باتوں میں ذہنی آسودگی حاصل کرتا ہے اور صرف ظاہری رسوم کی تکمیل ہی کو مذہب کا اصل مقصد سمجھ بیٹھتا ہے

جوشؔ صاحب نے بھی ابتدا میں روایتی مذہب کا سہارا لیا اور بقول ان کے۔ اس میں اس قدر شدت پیدا ہو گئی کہ میں بڑی محنت کے ساتھ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے لگا۔ (یادوں کی برات)۔

تصور الٰہ:

یہ دور وہ تھا جب ۱۹۲۰ء میں ان کی پہلی تصنیف "روح ادب" شائع ہوئی تھی۔ مگر متجسس دماغ کبھی غیر منطقی روایات سے مطمئن نہیں ہو سکا۔ چنانچہ جوشؔ صاحب کہتے ہیں کہ "جب میں آگے بڑھا فکر کا میدان بھی وسیع ہو گیا۔ پھر نظام شمسی پر نظر پڑنے لگی اور اس بات کی لگن لگ گئی کہ "علت العلل" کا سراغ لگاؤں اور ذات و صفات کے تمام مسائل کو سمجھوں۔ پھر انھوں نے اس کائنات کی تشکیل اور شکست و ریخت میں ایک

"توانائی مطلق" کی جلوہ گری کو محسوس کیا اور جیسے جیسے اس عظیم الشان طاقت کے متعلق ان کا شعور اور تعین واضح ہوتا گیا اور ان کے اندر ناآشنا توانائیں علت و معلول کا ادراک بڑھتا گیا، جوش صاحب پر مذہب کے پیش کردہ خدا کے شخصی تصور (Personified God) کا مضحکہ تضاد روشن ہوتا گیا تو انھوں نے خدا کے روایتی تصور سے بھی بغاوت کی اور نہ صرف مذہبی رسوم اور غیر منطقی عقائد کو بے تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ مذہبی علما کی منطقی علمیت پر بھی اعتراضات کیے اور اس طرح خدا کے تصور کو انسانی ذہن کے محبس سے آزاد کیا۔ اس سلسلے میں ان کی حسب ذیل رباعیات قابل غور ہیں۔

اوج زاہد کو پست پایا میں نے	دام کا بندوبست پایا میں نے
خالق کو تشخص کا کیا ہے پابند	مومن کو بھی بت پرست پایا میں نے

علت کا نہ معلول و قضا کا منکر	حاشا نہ خبر نہ مقتدا کا منکر
یا عقل نے تشخص کا تراشا ہے جو بت	الحاد ہے صرف اس خدا کا منکر

اس کے بعد جوش صاحب کا مذہب، مذہب انسانیت بن گیا اور عظمت، محبت اور احترام انسانی کی راہ میں تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ان کے فن کا نصب العین۔ جوش صاحب اپنی کتاب "حرف و حکایت" میں "دین آدمیت" کے عنوان سے ایک نظم میں عقائد گزیدہ ذہنوں کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

لو گلابو! یہ بڑے بوڑھے نہ ہنسیں گے کبھی
عصمت افکار سے خالی ہے ان کی زندگی
صبح کا جب نام آتا ہے تو سو جاتے ہیں یہ
روشنی کو دیکھتے ہی کور ہو جاتے ہیں یہ
ان کے شانوں پر تو ایسے سر ہیں اے اہل نگاہ
جن کا گودا جل چکا ہے جن کے خانے ہیں سیاہ
اور وہ خانے ہیں جن تک روشنی جاتی نہیں
آندھیوں کے وقت بھی جن میں ہوا آتی نہیں

بجھ چکے ہیں عمل کے جھونکوں سے ان کے سب چراغ
کب سے ہیں حق، نفس میں جو ان کے مداح
ان کی عقل پر اک مدت سے ہے ظلمت گزیں
فکر کی ٹھنڈی ہوا میں سانس لے سکتی نہیں
ذہن ان کے رینگتے پھرتے ہیں زیر آسماں
اپنی نظروں میں دبائے وہم کی جیا کہیں
ان سے بڑھ کر علم و حکمت کا کوئی دشمن نہیں
ان کے تہ خانوں میں روشن دان کیا روزن نہیں

اس کے بعد جوش صاحب ان نام نہاد علما کا دین کے متعلق جو تصور ہے وہ پیش کرتے ہیں کہ یہ نادان رہبر دین اپنی کم علمی اور عقائد پرستی کے سبب اس حد تک پستی میں گر گئے ہیں کہ ان کے نزدیک

دین کیا ہے، خوف دوزخ حرص جنت کے سوا
رسم تقوی کچھ نہیں جبن و جہالت کے سوا
اللہ اللہ یہ مقدس عالمان پرشکوہ
تاجروں کی ایک جماعت بزدلوں کا اک گروہ

سیکڑوں قوموں کا ہر نیکی پہ ہے ان کو یقیں
سود لینے میں مہاجن سے بھی یہ شرماتے نہیں
بند پانی سے انھیں کیا آ سکے بوئے فساد
یہ تو ہیں مخصوص خدا کے بندگان خانہ زاد

جوش صاحب کی فکر اور منطقی استدلال نے انھیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ اگر ہم ہر انسان کو اس کی ذہنی صلاحیت کے مطابق خدا کا تصور قائم کرنے کی اجازت دے دیں تو ذہن انسان کی ناپختگی اور قوت ادراک کی محدود صلاحیت کی وجہ سے یہ بات ناممکن ہے کہ انسان کسی خیر مادی طاقت کا تجریدی تصور قائم کر سکے۔ خاص طور سے جب کہ اس وجود کی کوئی

صورت مثال ممکن نہ ہو۔ بقول حافظ شیرازی:

در رہِ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرمِ راز　　ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد

(ترجمہ۔ عشق کے راستے میں کوئی شخص بھی یقین کے ساتھ واقف راز نہیں ہو سکا۔ ہر شخص نے اپنی اپنی ذہنی صلاحیت کے مطابق گمان قائم کر رکھا ہے۔)

علامہ اقبال نے اپنے حواس کی محدودیت کا اس طرح شکوہ کیا ہے:

تیری خدائی ہے میرے جنوں کو گلہ　　اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو

جوش بھی اس مقام پر پہنچ کر یہ دعا مانگتے ہیں:

مجھ کو تو پیغمبری دے اور نہ شاہنشاہ کر
بن پڑے تو سرِ موجودات سے آگاہ کر
اپنے اصلی حال و خد سے آشنا کر دے مجھے
ہمدگر کب جہل مطلق ہے خدا کر دے مجھے

اور یہ دعا اس طرح قبول ہوتی ہے کہ جوش کو معرفت کا وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جہاں ہر قسم کا تشخص الٰہ ایک بُت بن جاتا ہے اور جوش ہر قسم کی اصنام پرستی کا مخالف بن کر شخصی تصور الٰہ کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ:

جسے ہو ایک توانائی عظیم کی دھن　　وہ کیا پرستش معبود خانہ ساز کرے

جوش صاحب کی نظم و نثر میں جہاں جہاں خدا کے خلاف خیالات ملتے ہیں وہ دراصل خدا کے اس تصور کے خلاف ہیں جو ناپختہ ذہن انسانی کا تراشیدہ "شخصی خدا" Personified God ہے۔ جوش صاحب نے ایک سائنس دان کی طرح اس کائنات میں لامحدود توانائی مطلق کو محسوس کیا ہے جو ہے، اٹل اور ناقابل تغیر قوانین کی رو سے خالق بھی ہے، حاکم بھی ہے، کامل اور حکیم بھی ہے اور اس میں کسی شخص کا شائبہ بھی نہیں اور اس کی حاکمیت مطلق میں کوئی دوسرا شریک بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شخصی خدا کے تصور کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ان کو اس اصلی خدا سے دور کی نسبت نہیں
جس کے قبضے میں زماں ہے جس کے قبضے میں زمیں

آج تک چلتی نہیں جس اوج تک چشم خیال
یک نامعلوم قوت ایک نادیدہ جلال
واجب شخصیت سے ہے ناآشنا جس کی جبیں
نوع انساں کے تخیل کی جسے حاجت نہیں
جس کا ہر نقش ہے مصحف جس کا ہر ورق کتاب
جس کے دفتر کی ہے زیبا مہر قرص آفتاب
وہ خدا وہ قاصد قدسی وہ دارائے حیات
جس کی اک ادنیٰ سی جنبش کا لقب ہے کائنات
اس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا
لیکن ان دریائے بے ساحل کا راز ہے خدا
وہ خدا لا کوئی سے چاہتا ہے بندگی
شکل حسن کو بہت ہے خوش ادا کی

(دین کا حسن۔ حرف و حکایت)

مجھ کو پوجو مجھ کو چاہو کی صدا دیتا ہے جو
جو نہ چاہے اس کو دوزخ کی سزا دیتا ہے جو

اسی تصور کو علامہ اقبال نے ایک جگہ اس طرح پیش کیا ہے:

ہستیم، گر اے تو یا تو گدائے ما ستی — سر نہ نہی از سجدہ در پس ما دیدہ ای
فتنہ دیر یک طرف غوغائے کعبہ یک طرف — از آفرینش جہاں دو سر خریدہ ای

(ترجمہ۔ کیا میں تیرا بھکاری ہوں یا تو میرا بھکاری ہے۔ ایک مجھے کی خاطر میرے پیچھے پیچھے بھاگا آ رہا ہے۔ ایک طرف دیر کا فتنہ تو ایک طرف کعبہ کی غوغا۔ یہ جہاں پیدا کر کے تو نے اپنے لیے ایک دو سر خرید لیا ہے۔)

ظاہر ہے کہ جوش ہوں یا علامہ اقبال یہ صرف اُس "تصور خدا" کا مذاق اڑاتے ہیں جسے کوتہ عقلوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے اپنے ذہنوں میں تراش رکھا ہے۔ راہدر ناتھ ٹیگور نے ایک جگہ اس تصور کو بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ایک دن

آبادی میں یہ منادی کی گئی کہ آج دن میں فلاں وقت بھگوان اپنی رتھ میں شہر کی بڑی شاہراہ سے گزریں گے۔ میں بھی اپنا کشکول لے کر ایک چوراہے پر کھڑا ہو گیا۔ جب وقت مقررہ پر بھگوان کا رتھ وہاں سے گزرا تو پہلے اس کے کہ میں اپنا کشکول بڑھاتا میں نے دیکھا کہ رتھ کی کھڑکی کا پردہ ہٹا اور اس میں سے بھگوان کا ہاتھ باہر آیا جس میں خود ایک کشکول تھا جو بھگوان نے میری طرف بڑھا دیا۔ غالباً اس لیے کہ بندہ اس میں کچھ صفات کی بھیک ڈال دے۔

جوش بھی ایسے ہی تصور خدا کے خلاف کہتے ہیں۔

چار دن جو شاد ہے اور چار دن ناشاد ہے
یہ خدا تو آدمی کے ذہن کی ایجاد ہے
حکمت حیرت جہاں یہ کیسا وہم کا طوفان ہے
اے عزیزو یہ خدا کے بھیس میں انسان ہے
مدتیں گزریں کہ عقل انجمن مدقوق ہے
وہ سنو ایسا خدا خالق نہیں مخلوق ہے

رابندر ناتھ ٹیگور ہوں یا علامہ اقبال یا جوش ملیح آبادی، انسانی ذہن کے حاملین کو ہر قسم کے علت و معلول سے صاف کر کے اس میں توانائی مطلق اور مسبب کے قوانین کا معروضی تصور پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ انسان میں خود شناسی کا شعور بیدار ہو اور وہ خارجی کائنات کو اس میں رائج علت اور معلول کے ناقابل تغیر قوانین کے حوالے سے سمجھ کر اور قوانین فطرت کو معلوم کر کے ان سے استفادہ کر سکے اور اس طرح اس کائنات کے تمام وسائل کو اپنے تصرف میں لا سکے۔

جوش صاحب نے اس معروضی توانائی مطلق کے تصور کو نہایت وضاحت سے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ۔ طلوع فکر۔ میں خدا کے متعلق کہتے ہیں:

دنیا کو تو بتائے گا یہ نکتہ جمیل — یعنی ازل سے ایک توانائی جلیل
جس کی کوئی نظیر نہ جس کا کوئی عدیل — اس کا کچھ وقت گریزاں کی ہے کفیل
اقبال و انجذاب نہ وہ انعکاس ہے
دنیا سے دور ہے نہ وہ دنیا کے پاس ہے

انسان کے مزاج کی اس میں سمیں ہے بو
وہ کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں ہے سوائے تو

وہ شاہ نرم طبع نہ سلطان خند خو
وہ دل نواز دوست نہ راحت شکن عدو

وہ پاسدار رسم وفا و جفا نہیں
جذبات جس پہ ٹوٹ پڑیں وہ خدا نہیں

ہاں دن کو تو کرے گا سیر ذات سے جدا
دنیا حقیقتوں کو روایات سے جدا

دل کو تمام قیاسات سے جدا
اس دو وصف دست و اشارات سے جدا

داغوں سے تو اسد کے دنیا کو بچائے گا
شخصی تعینات سے حق کو بچائے گا

پرکھے گا تیر علم ہی اس کائنات کو
جانچے گی تیری عقل ہی خون حیات کو

وہ تو ہے کھرچ کے مخفی صفات کو
دیکھے گا اک حکیم کے مانند ذات کو

بے حد کو حسن حد سے چھڑائے گا
تو کبریا کو دام حدود سے چھڑائے گا

مذکورہ بالا اشعار میں جوش صاحب نے جس توانائی مطلق کا تصور پیش کیا ہے آج سائنس، علم طبیعیات کی رو سے جوہر میں مدغم توانائی مطلق تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف ہے جو "وحدت" کے چشمے سے نکل رہی ہے۔ طبیعیات دانوں نے جب اس مادی کائنات کے بنیادی جزو ترکیبی یعنی جوہر کا تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس میں توانائی چار شکلوں میں ظاہر ہو رہی ہے۔ ایک طاقتور توانائی جسے انگریزی میں Strong Force کہتے ہیں وہ مرکزے یعنی NUCLEUS کے اندر پروٹون اور نیوٹرون کو متحد کر کے مرکزہ بناتی ہے۔ اس کے بعد الیکٹرون میں کمزور توانائی جسے انگریزی میں Weak Force کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ توانائی جو برقی مقناطیسی قوت میں ظاہر ہوتی ہے جسے انگریزی میں Electro Magnetic Force کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی چوتھی شکل قوت ثقل یا Gravitational Force ہے جو ایک مادی شے اور دوسری مادی شے کے درمیان پائی جاتی ہے لیکن سائنس دانوں نے سوچنا شروع کیا کہ گو ان چار صورتوں میں توانائی کا اظہار مختلف ہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ چاروں طاقتیں توانائی کی وحدت کے چشمے سے نکل رہی ہوں۔ چنانچہ سائنس دانوں نے اپنی

تحقیقات کا دائرہ اور وسیع کرنا شروع کر دیا اور جوش صاحب ان کی ہمت بڑھاتے رہے۔

متاعِ کفر نے یا سعادتِ ایماں
جلا مشعلِ تحقیق ہر چہ بادا باد
غرض ہے علم سے اے جوش بت ہے کہ خدا
اٹھا کبھی پردہ اسرار ہر چہ بادا باد

چنانچہ سائنس دانوں نے اپنی منزل مقصود اس کائنات میں "عظیم وحدت" کی تلاش کو بنایا جسے انگریزی میں Grand Unifying Theory(GUT) کہتے ہیں اور اب طبیعیات دان Electro Magnetic Force اور Weak Force کی وحدت کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن میں ہمارے ملک پاکستان کے ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل انعام بھی مل چکا ہے اور اب طبیعیات دان Strong Force کی اہمیت تک قطعاً پہنچ چکے ہیں اور ان کو یقین ہو چلا ہے کہ وہ اس کو بھی وحدت کے سرچشمے سے ملا دیں گے۔ جوش صاحب ان کے ہم خیال ہو کر کہتے ہیں۔

موسمِ گل نہ سنبل کا تمنائی ہوں — بلبل کا نہ اب گل کا تمنائی ہوں
مطلب ہے حیثیت ذات مطلق — اجزا کا نہیں "کل" کا تمنائی ہوں

جدید طبیعیات اور ریاضی کے امام لی آن سٹائن اور برٹرینڈ رسل اسی بات پر متفق تھے کہ یہ تمام کائنات ایک لامحدود توانائی مطلق کے مختلف اظہار کی کرشمہ سازی ہے۔ چنانچہ علم طبیعیات کی رو سے جوہری ذرات ایک مقام پر پہنچ کر توانائی مطلق میں ضم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آن سٹائن کا نظریہ یہ ہے کہ توانائی (Energy) کا جوہر کے ذرات (Particles of Atom) میں "اظہار" کوئی وجودی تبدیلی نہیں بلکہ واقعات کے تسلسل کا "اظہار" ہے۔ جوش صاحب اسی تصور کو کس قدر بلیغ انداز میں ایک رباعی میں پیش کرتے ہیں۔

آوازۂ کن عنصر فنا میں — اک ذرہ بھی پروردۂ ارشاد نہیں
ممکن ہی نہیں عدم سے پیدا ہو وجود — عالم فقط "اظہار" ہے ایجاد نہیں

اس کائنات کے لباس مجاز زیب تن کرنے سے پہلے صرف توانائی مطلق کی جلوہ گری تھی جس کو مذہب خدا کا نام دیتا ہے اور سائنس ازلی توانائی مطلق کہتی ہے

بقول غالب:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

اسی توانائی نے جب لطافت سے کثافت کا سفر طے کیا تو اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے عمل کو اسلام لفظ "کن" سے تعبیر کرتا ہے۔ جوش صاحب اسی تصور کو ایک رباعی میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ لفظ "کن" توانائی کا وہ وار دھبہ ہے جس کے ذریعہ سے اس نے اپنی جلوہ گری کے لیے کس کی چٹکی سے عدم کی نقاب ہٹا دی اور لباس مجاز میں ظاہر ہو گئی ۔۔۔ کہتے ہیں۔

پہلے ہی سے موجود تھا ہستی کا رباب
عرصہ کن نے کیا ہے کار مضراب
یہ علم نہیں اصل میں وہ چٹکی ہے
جس نے رخ زندگی سے الٹ دی ہے نقاب

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب "مغربی فلسفہ کی تاریخ" History of the Western Philosophy میں ایک جگہ کہتا ہے۔

From all this it seems to follow that events, not particles, must be the stuff of physics. What has been thought of as particle, will have to be thought of as series of events.

اور پھر آگے چل کر لکھتا ہے

Physics has been making matter less material.

(ترجمہ۔ ان تمام باتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ علم طبیعیات کا موضوع مادی ذرات کے بجائے غیر مادی واقعات کی تحقیق ہے۔ اب تک جن کو ہم بنیادی حقیقت کے طور پر جوہر کے ذرات سمجھ رہے تھے، ان کو اب واقعات کے تسلسل سے تعبیر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ طبیعیات مادے کو غیر مادی وجود ثابت کر رہی ہے)

جوش صاحب اس اصول کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

چلتا نہیں کچھ زور تمامت لی کا — حسن ظن ہے بس اللہ ہی بینائی کا
ہر برف کی سل میں برق ہے پرافشاں — ہر ذرہ مرکب ہے توانائی کا

لیکن جیسے ہی یہ توانائی مادی لباس زیب تن کرتی ہے وہ حتمی منظم اور ناقابل تغیر قوانین کو جنم دیتی چلی جاتی ہے اور اس طرح یہ توانائی ریاضی کے سے منظم قوانین کے تحت اپنا دوری سفر جاری رکھتی ہے اور ان قوانین کا جبر اور ان کی طاقت بھی اس توانائی مطلق کے شعور اور وجود کی ناقابل تردید شہادت فراہم کرتے ہیں۔ جوشش صاحب اس تمام حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں اور جگہ جگہ اس کو بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا — دنیا میں کچھ نہیں طاقت کے سوا
قوت حاصل کر اور صوفی بن جا — معبود نہیں ہے کوئی قوت کے سوا

ایک اور جگہ اس سائنسی حقیقت کو معرفت کے رنگ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

حاکی نے تجابات سے تعبیر کیا — عالم نے عناصر سے تعبیر کیا
اس ارض و سماء کے ذرے ذرے کو مگر — عارف نے فقط ذات سے تعبیر کیا

!

محروم تجلیات دافر ہو جائے — خود سے یہ گناہ سہل نادر ہو جائے
مومن نہ کرے سجدہ تو مسلم نہ رہے — عارف جو کرے سجدہ تو کافر ہو جائے

اسی تصور کو غالب نے اس طرح بیان کیا ہے کہ

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے گر حسن نہ ہوتا خود بیں
قطرے میں بحر تنگ حوصلہ ہے روئے زمیں
سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

سائنس دان "Grand Unifying Theory" کے تحت جس ذات مطلق تک پہنچنا چاہتے ہیں، جوش صاحب ہر قدم پر ان کی سمت بڑھاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

آیات صفات کی تلاوت نہ کرو — جو بندگی ذات میں حکمت نہ کرو
لفظ اللہ پردہ ہے جلوہ نہیں — اس حرف مقفل پہ قناعت نہ کرو

یا ایک نظم میں کہتے ہیں۔

تا جلوۂ مست اسباب دیکھ لیں
اسباب کی نقاب اٹھاتے رہیں گے ہم

جوشؔ صاحب اپنی سوانح عمری "یادوں کی برات" میں "میرا دین" کے باب میں جیسے ملکہ عین الیقین کی کس شدت کے ساتھ ببانگ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ "ایک جری انسان کی، سر میں تلوار بلند یہ اعلان کرتا ہوں جو ادھر دیکھ رہا ہے وہ ادھر مڑ جائے۔ جو دور ہے وہ قریب آ جائے، جس نے اب تک نہ سنا ہو وہ کان کھول کر سن لے۔ جو اب تک مجھ کو مومن سمجھ رہا ہے وہ اپنے حسن ظن سے دست بردار ہو جائے اور جس کے نزدیک میں خدا کا منکر یعنی مقلد خدا کے لامحدود معنی میں منکر ہوں، وہ بھی اپنے سوء ظن سے توبہ کر لے کہ میرا دین عیاں دماغ انسانی کی تمنائے رنگ و بو، حصول علم و فقدان جہل کی آرزو اور محرک اولیں کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے"۔

معرفت کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد جہاں تمام کائنات "ہمہ اوست" کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ جوشؔ صاحب کہتے ہیں۔

کیا مجھ کو بلا دے گا کعبے کی طرف
ہر سانس میں سو طواف کرتا ہوں میں

ایک جگہ کہتے ہیں:

کعبے کو تو یک بات کہتا ہوں میں
پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زباں سے "میں" نکلتا ہے نہ ہم
اس پردے میں کائنات کہتا ہوں میں

جب اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس توانائی مطلق ہی کی ذات کا مظہر ہو تو پھر انسان اس ذات کی جلوہ گری سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر عارف بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے "ما موجود الا اللہ" اور جوشؔ سرمستی ہوتے ہیں

ہر روز بپا جشن کریں گے اے جوشؔ — پیمانۂ سرشار بھریں گے اے جوشؔ
کیا موت کی ہستی ہے کہ دامن چھو لے — اللہ سرا تو ہم مریں گے اے جوشؔ

یہاں جوش صاحب بھگت کبیر داس کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"ہر مرے تو ہم مریں - اپنی مرے بلا"

غالب نے کہا:

مشکل ہے کہ پہچانیے کہ ہمراہ ہیں دوست اتنا کسی تو ہم کہ اشارت سے بتا دو

یہ دراصل میر تقی میر کے شعر کا غدری میں ترجمہ ہے:

پایا نہ یوں کہ کریے اس کی طرف اشارہ
یوں تو جہاں میں ہم نے اس کو کہاں نہ پایا

اللہ کے اس کائناتی تصور کے برعکس مذہبی پیشواؤں نے جو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے طرز پر ایک جابر انسان کا بت تراش کر اس کا نام خدا رکھ دیا ہے جوش صاحب تمام عمر اس بت پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہے اور ان کو اپنے استدلال کی صحت پر اس قدر یقین ہے کہ وہ اس صنم خانہ حیات میں اعلان حق کرنے سے نہیں گھبراتے اور کہتے ہیں:

خدا بصورت سلطان نشستہ بر سر عرش
یہی جو بت شکنی ہے تو آذری کیا ہے

اپنی کتاب "الہام و الفکر" میں جوش صاحب نے ایک طویل نظم میں شاعر اور نام نہاد مذہبی فکر کے تراشیدہ "شخصی خدا" کے درمیان ایک مکالمہ بیان کیا ہے۔ چونکہ یہ نظم جوش صاحب کے طرز فکر کو بالکل ٹھیک ٹھیک ظاہر کرتی ہے، اس لیے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

"ایک مکالمہ"

(مابین شاعر و خدا)

خدا: "شاعر تیرے نصیب میں جنت نہیں"
شاعر (جوش): "ہے خود شکستہ لب و انگبیں نہیں"
خدا: "بزم کا حریم قلب میں عشق و جنوں کی آگ"
شاعر: "عشق و جنوں کی آگ خیال آفریں نہیں"

خدا: "دل کی طرف رجوع ہو اے کشتۂ دماغ"

شاعر: "دل طفل کم نگاہ ہے آفاق میں نہیں"

خدا: "مومن ہے شیوۂ تعصب سے سرفراز"

شاعر: "ملحد بھی ہے بنائے تجسس لیے ہوئے"

خدا: "کیا دل نشیں نہیں ہیں مقالات متقیان؟"

شاعر: "بے شبہ دل نشیں ہیں مگر سر نشیں نہیں"

خدا: "اٹھ غیب کی زمین پہ رکھ دیں کی بنا"

شاعر: "ہیں جو غیب پر ہو وہ احسن سے دیں نہیں"

خدا: "اقوال پر نگاہ کر افکار پر نہ جا"

شاعر: "یہ خاکسار مولوی جہد آفریں نہیں"

خدا: "رکھ دے حریم قدس کے در پر سر نیاز"

شاعر: "تھک جائے بے دلیل یہ ایسی جبیں نہیں"

خدا: "دھو ان کی شراب سے چھلکا ہوئے دل"

شاعر: "ہر شراب وہم مرا سانگیں نہیں"

خدا: "فطرت میں ہے کجی تو اسے مستقیم کر"

شاعر: "ہاں تو کیا یہ مالست روح الامیں نہیں"

خدا: "دیدار کی تڑپ ہے تو مرشد بریں کو دیکھ"

شاعر: "کیا جلوہ گاہ ناز یہ فرش زمیں نہیں؟"

خدا: "اچھا، تو آسماں کی طرف ہی نظر اٹھا"

شاعر: "خودی کے اقتدار میں اب تک رہیں نہیں"

خدا: "ہاتھوں سے دیکھ حبل متیں چھوٹنے نہ پائے"

شاعر: "تکلم تو ہے خود کوئی حبل متیں نہیں"

خدا: "آ، سوئے نور و ظلمت و تصور و عمل"

شاعر: "میں مشتہر ہاں کا الٰہی کہیں نہیں"

خدا۔ "ایمان ہے نگین سلیمانِ زندگی"
شاعر۔ "ایمان اک فریب نگیں ہے، نگیں نہیں"
خدا۔ "مرگان بے نوا پہ چھپٹ، مہر عشق باز"
شاعر۔ "انسان ہوں، عتاب نعیم و نعیں نہیں"
خدا۔ "میں تجھ پہ خشم گیں ہوں اسیر دلیل و عقل"
شاعر۔ "حکمت پناہ! یہ روشن نکتہ ہیں نہیں"
خدا۔ "دوزخ ترا مقام ہے اے عہد بے الف"
شاعر۔ "جنت مری نجیر ہے میں سم گیں نہیں"
خدا۔ "ہو گی سزا بروز جزا باوجود جبر؟"
شاعر۔ "ملتے ہیں آسماں پہ یہ رسم و دیں نہیں"
خدا۔ "کاشانہ خیال میں مشعل جلا"
شاعر۔ "حکمت میں ڈوب کر جو نہ ابھرے یقیں نہیں"
خدا۔ "بندے نظام دہر سے شاید حزیں ہے تو"
شاعر۔ "ہاں مجھ کو اعتراض ہے لیکن حزیں نہیں"
خدا۔ "کانٹوں سے رشتہ جوڑ خزاں دلیل توڑ"
شاعر۔ "وہ مردہ ہے جو گرم چمن و چنیں نہیں"
خدا۔ "کیا دل مچل رہا ہے مرے قرب کے لیے"
شاعر۔ "اللہ رے حادثات تجاہل، نہیں نہیں"
خدا۔ "اے جوش دل میں ہے کہ جگر میں کہاں ہے درد"
شاعر۔ "اے شاہد بطون دو عالم، کہیں نہیں"

اب معلوم ہوتا ہے ان آخری دو اشعار میں جوش صاحب اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے اور جو عشق ان کو اس ڈرامائے حیات اور خالق کائنات سے تھا وہ بے قابو ہو کر چھلک پڑا ہے۔ وہ اس پوری نظم میں ایک سچے عاشق کی طرح اپنے محبوب کے چہرے سے وہ نقاب اٹھانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں جو مذاہب کے نام نہاد علما نے بربنائے ناواقفیت اس پر

ہوا دی ہے۔ جوش صاحب کی تمام فکر ہی ذات مطلق کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتی ہے جس کو وہ کہیں "سبب اول" اور کہیں "علت العلل" اور کہیں "توانائی مطلق" کے استعاروں سے یاد کرتے ہیں۔

غرض جب میں اور نعمت جوش صاحب کے تصور الٰہ اور دین کے متعلق اتنا مواد جمع کر چکے تو ایک شام کو جوش صاحب کے گھر گئے۔ جوش صاحب ہم دونوں کو دیکھ کر کہنے لگے ارے میاں تم دونوں بھائی تنے دن کہاں غائب ہو گئے تھے، میں تو تم لوگوں کی صورت بھی بھول چکا تھا مگر اب تک پانچ فیصد بھلا سکا ہوں۔ میں نے کہا حضور والا ہم لوگ گزشتہ ایک ہفتہ سے آپ کو تلاش کر رہے تھے۔

کہنے لگے، کیا بدھو بنا رہے ہو۔ بھلا میں کہاں چلا گیا تھا؟ میں نے کہا، جوش صاحب قبلہ یہ بتلایئے کہ کیا آپ کو اپنی شخصیت کی معرفت کامل حاصل ہے؟ میں کیا آپ خود کو پہچاننے کی طرح پہچانتے ہیں؟ جوش صاحب نے حیرت ناک نگاہوں سے مجھے اوپر سے نیچے تک اس طرح دیکھا جیسے وہ مجھے اب پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کہنے لگے میاں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا حضرت آپ کی شخصیت ان گشت پوست کے پردوں اور شدید دھندلکوں کی تہوں کے سرچشمک پہاڑوں کے درمیان کہیں پوشیدہ ہے۔ ہم دونوں بھائی یک جٹ ہو کر اسی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جوش صاحب کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کہنے لگے پھر کچھ پتا چلا یار؟ میں نے کہا جی ہاں آپ کا قصر عالیشان تو دکھائی دے گیا ہے مگر ابھی ہم لوگ اس محل میں داخل نہیں ہو سکے مگر ہمیں امید ہے کہ جوش صاحب قبلہ آہستہ آہستہ خود ہم سے ملنے اپنے سنگین محل سے نکل کر ہمارا استقبال کریں گے۔ اس کے بعد ہم نے جو کچھ ان کے تصور الٰہ اور دین کے متعلق معلومات جمع کی تھیں وہ ان کو سنائیں تو سخت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ آج تک کسی نے مجھ کو اس طرح نہیں سمجھا جس طرح آپ لوگوں نے سمجھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اپنی کتاب "عرفان آخر" کی مطالعہ کے لیے دوں جس کو میں نے ناقابل اشاعت کے زمرے میں داخل کر دیا ہے کیونکہ میرے خیال میں ہمارے معاشرے کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں ہوئی ہے کہ اس فکر کو برداشت کر سکے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے مجھے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ کتاب دی جو

ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے۔ ہم دونوں بھائی وہ کتاب لے کر گھر آگئے اور دوسرے دن سے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہ طویل منظوم ڈراما جوش صاحب نے ۱۹۴۸ء میں لکھنا شروع کیا تھا مگر ابھی تک اس کے بعض حصے تشنۂ تکمیل ہیں۔

حرفِ آخر

اس طویل منظوم ڈرامے کے دو حصے ہیں۔

پہلے حصے میں کائنات اور آدم و حوا کی تخلیق سے متعلق جو قدیم روایات مشہور ہیں، جوش صاحب نے ان کو "حسبِ روایتِ پیشیں" کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد نہایت تفصیل اور زبان و بیان کی بے پناہ مہارت سے اس تصور کے اجزائے ترکیبی کا منطقی نقص بیان کر کے اس نظریے کو رد کر دیا۔

دوسرے حصے میں اس کائنات کی تخلیق کے متعلق جدید سائنسی نظریہ ارتقاء کو بیان کیا ہے جس کے تحت مادہ مختلف ارتقائی مراحل سے گزر کر حیات کی شکل اختیار کرتا ہے جس کی آخری منزل انسان ہے۔ اس کے بعد ارتقاء انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کو تسخیر کائنات کے ذریعے انسان کی حقیقی منزل یعنی مقام الوہیت پر فائز ہونے کی تلقین کرتا ہے اور یہی حرفِ آخر ہے۔

جوش صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ آج ہم فکرِ انسانی کے جس دور میں ہیں وہ سائنس اور منطق کا دور ہے۔ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا۔ مذہب کا دور عقیدہ پرستی کا دور تھا، آج تحقیق اور جستجو کا دور ہے۔ مذہب میں خوف اور لالچ انسانی عمل کے محرکات تھے۔ آج علم اور منطق کے قوانین کا ادراک اور حقوق اور فرائض کے شعور کا دور ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا دور ہے۔ مذہب کا دور فکری انجماد سے جمود کا دور تھا آج ذہنی اور فکری ارتقا کا دور ہے۔ مذہب صرف اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو زندگی کا حق دیتا ہے جبکہ آج تمام نوعِ انسانی کو اس کائنات کے وسائل سے فیضیاب ہونے کے مساوی حقوق کا تصور عام ہو رہا ہے۔ مگر بدقسمتی سے تیسری دنیا کے ممالک میں علم کے فقدان کے باعث ابھی مذہب اور

عقیدہ پرستی کی گرفت عام ذہنوں پر بہت مضبوط ہے اور اس کو قائم رکھنے میں معاشرے کے مراعات یافتہ طبقات کا بڑا ہاتھ رہا ہے اور یہ لوگ مذہب کے توسط سے لوگوں میں ان کے اصلی حقوق کا شعور بیدار ہونے سے روکتے اور مذہب کی بنیاد چونکہ خدا اور ابلیس کے مروجہ شخصی تصور پر قائم ہے، جو خیر اور شر کی طاقتوں کے نمائندے ہیں، اس لیے ان تصورات کی جگہ طاقت اور مطلق کے، مثبت ناہستا توانین کے تصور کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر چونکہ ابھی تک انسانی ذہن پختگی کی اس منزل تک نہیں پہنچ سکا جہاں اس فکر کو آسانی سے قبول کیا جا سکے تو جوش صاحب نے اس کتاب کے متعلق لکھ دیا کہ اسے ان کی زندگی میں شائع نہ کیا جائے۔ لیکن جوش صاحب کی فکر کا کماحقہٗ ابلاغ کرنے کے لیے اس راز سے بھی پردہ اٹھ جائے تو کیا ہرج ہے۔ یہ مکمل نظم تو یہاں درج نہیں ہو سکتی مگر میں اس کے چیدہ چیدہ اہم حصے نقل کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ اس طویل منظوم داستانی تخلیق کے توسط سے جوش صاحب کا خیال پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ عام قاری تک پہنچ جائے۔

"تخلیق سے پیشتر"

(طویل نظم حرف آخر سے اقتباس)

منظر (۱) سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب (حسب روایات پیشین)

سین (۱)

ایک انسوں بدوش ظلمت میں — ایک گہرے سکوت کا عالم
روئے خنداں نہ دیدۂ گریاں — جلوۂ گل نہ زخمۂ شبنم
سازِ دیوانگی نہ سوزِ خرد — نغمۂ سرخوشی نہ نوحۂ غم
نہ محبت کا جامۂ صد چاک — نہ جوانی کے گیسوئے پرخم
موجِ تخلیق سازِ در پردہ — اور بیرون پردہ زیر و بم
جیسے بادل کی تہ میں بجلی — جیسے بربط کے تار میں سرگم
نیم پوشیدہ، گاہ نیم عیاں — ہم آویزشِ وجود و عدم

اک عمیق و رسیدہ معنی میں
جلد و پا بہ گلی عناصر میں
خود سے گتھی ہوئی سی اک سحر
سینۂ خاکی میں رہ رہ کر
بول اٹھے کے شوق بے حد سے
حرکت بے تخیل موجد
کرب ناگفتہ حرف میں پنہاں
کپکپی قلمتوں میں یوں گویا
جذب جگنو سے دم بدم تاباں
تیرہ اوج خلا پہ جنبش میں
پرفسوں قلمتوں میں پرافشاں
دھندلی اونچی فضاؤں میں غلطاں
سست کوندے کی طرح روش میں
تیرگی اس چراغ کے ماند
یوں فضاؤں پہ سرگرانی سی
ابروئے ذوق آفرینش میں
ایک کھوئے ہوئے سے جادے پر
ایک اندازہ سا نہ قل نہ تھیں
ایک عالم نہیں لیل و نہار
اک جہاں حرف نارسیدہ بہ لب
ایک چشمک سی بے مقام وجہت
ایک تعمیر بے در و دیوار
اک حکایت نہیں گوش و زباں
ایک نادیدہ حلقہ بے ناخن

لغزش بلنے کا جذبۂ مبہم
اک بھرتا ہوا سا جذبۂ رم
خود سے کھلتا ہوا سا یک طلم
بیخود تاب فروش موجہ بہم
خاموشی منتظر کرب و الم
شش جہت میں تصور عالم
فکر نا آفریدہ جام میں جم
نور بلنے کی کہہ رہی ہے قسم
چند پلکیں سی پے بہ پے برہم
عکس تسنیم و پرتو زمزم
جادوئے آذری و خواب صنم
زلف حوا و دامن آدم
روح عظمت پہ ذہن کا پرچم
ہر نفس ہو رہا ہو جلا مدھم
عمل سے جیسے دشت مریم
یک دھندلے ہلال کا سا خم
ایک رکتی ہوئی صدائے قدم
ایک اسرار سا نہ کیف نہ کم
یک پیماں نہیں علاء و ستم
یک نرالی نگینہ بے خاتم
اک تمنا سی مخفی و مبہم
ایک تشکیل بے حد دست و قدم
اک کتابت نہیں لوح و قلم
یک کدورہ راز بے محرم

اور اس آوارہ راز کے اندر قلب خالق کی جنبشِ پیہم

سین (۲)
(عدم سے وجود کی جانب)

ایک وحدت کے کاسماں ہے چاروں طرف سکوت سا ہے۔ گاہ گاہ وجود ذوالجلال سے ایک کرن سی پھوٹتی اور گرد و پیش کے سارے پن میں گم ہو جاتی ہے۔ خدا کے جسم میں رہ رہ کر ایک تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وہ اسے بار بار دباتا ہے اور وہ ہر بار تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے کہ ایک شدید ہیجان کے عالم میں پھریری لے کر خدا اپنا داہنا ہاتھ پوری قوت سے بلند کر کے گھما دیتا ہے۔

خدا کی پہلی آواز

اے میری تخیل! بن جا کائنات ہست و بود ہاں مچل اے جذبۂ بیداد تشریف وجود
اے عدم! اٹھ گامزن ہو شکل موجودات میں اے مرے جمال آ جا رنگ تفصیلات میں
ہاں مجسم حسن ہو جا اے مرے دل کی ترنگ اے نزولِ سادگی بن جا نگارِ آب و رنگ
محمل اسماء میں آ جا لیلیٰ وصفِ جمیل پردۂ اشکال میں چھپ جا مری روحِ جلیل
محفلِ امکاں میں در آ اک نئے انداز سے اے مری ذات اپنے دامن کو جھٹک کر ناز سے
اے مرے ہیجان بن جا گاہ این و متیٰ سرحدِ ہستی میں آ جا اے زمیں اے آسماں

یہ کہتے ہی خدا کو پھر شدت کے ساتھ پھریری آتی ہے۔ وہ اپنے جسم کو جھٹکتا اور اس زور سے جھٹکتا ہے کہ اس کے ہر رن موسے اک آنچ سی نکلنے لگتی ہے۔ آنچ میں اتنی ہی سرعت کے ساتھ گردش کرتی ہوئی بے شمار چنگاریاں کانپنے لگتی ہیں اور کانپتے کانپتے پورے نظامِ شمسی کی شکل اختیار کر کے توازن، تطابق، حرکت و حرارت اور رنگ و نور کے ایک تابناک عالم میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ خدا اس منظر کو اس نشے ہوئے لیکن مسرت انگیز سکون کے ساتھ دیکھتا ہے جو کسی درد کے رفع ہونے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ وہ مسکراتا ہے۔ دوبارہ مسکراتا ہے اور

پھر ایک ایسی رستگاری آمیز تسکین کے ساتھ قہقہہ لگا کر دفعتاً نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ
کاندھے سے کوئی زبردست وزن گرا دینے کے بعد حاصل ہوا کرتی ہے۔

منظر (۲)
(خلقت کے یک بدست دو زکے بعد)

خدا پہلی بار مرسلین کا دستہ کھول کر عیر آباد کرۂ ارض پر نگاہ ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

سین (۱)

یہ ربطِ حسن و خوبی یہ بہارِ رنگ و بو
یہ سرود لالہ و گل یہ سرودِ آب و
یہ شگوفے یہ شاخسار یہ گلوے یہ حباب
یہ بیاباں یہ ساراں یہ سمندر یہ سراب
یہ ربابِ دورِ گل یہ نغمۂ بادِ مراد
یہ خروشِ قلزم و طوفاں یہ جوشِ برد باد
یہ فلک کی تختہ کاری یہ فضا کی فرگلی
یہ گھٹا یہ دھوپ یہ کہرا یہ مینہ یہ چاندنی
یہ خنک شاداب شاخیں پھول برساتی ہوئی
ندیاں یہ بن کے اندر پیچ و خم کھاتی ہوئی
صبح کی یہ نور دوڑاتی ہوئی قرص رواں
شام کی یہ کروٹیں لیتی ہوئی تاریکیاں
یہ قمر یہ کہکشاں یہ کوہ یہ وادی یہ بن
بن کے اندر یہ خم آب رواں کا بانکپن
یہ صبح و نرم صبحیں یہ سہانے بوستاں
یہ سلونے جھٹ پٹے یہ سانولی تاریکیاں
سرخ جنبش میں یہ کھلتی ہوئی کلیوں کا رنگ
رنگ کے تیوروں میں یہ پھولوں بیلے کی امنگ
پرنسیں یہ دشت پر اسرار یہ پست و بلند
تیرگی میں بے حقیقت روشنی میں ارجمند
یہ شب مہتاب و روز ابر و فصل برشگال
یہ خرام باد یہ موج سبزہ یہ باد شمال
یہ حیاتِ بحر و بر یہ جلوۂ کہہ و کمر
کس قدر مشہود ہے یہ عالم شمس و قمر

یہ کہہ کر خدا ٹھہر جاتا ہے اور پھر کچھ رکتی سی آواز میں کہتا ہے،

کس قدر مشہود ہے یہ عالم شمس و قمر

اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ دھیمی آواز سے ارشاد فرماتا ہے،

کس قدر ضوبار ہے یہ عالم شمس و قمر

یہ کہتے ہی خدا کی آنکھیں خاکدان کے سینے میں پیوست ہو جاتی ہیں اور وہ فرطِ تحیر میں یہ معلوم کر کے کہ سینۂ ارض کے اندر کیا تمنائیں کروٹیں لے رہی ہیں۔ پھر کہنا شروع کرتا ہے۔

خاک کی تمنا

لے رہے ہیں کروٹیں پر کروٹیں لیل و نہار
ہاں میں سمجھا اس کرہ کو ہے کسی کا انتظار
آرزو یہ کس کے طوفاں کی ہے؟ یہ کیا راز ہے
خاک کا یک یک ذرہ گوش بر آواز ہے
وہ شباہت کو ساداں ہو کر رقص آب ہے
دہر کی ہر چیز کا دل ہے شہید آرزو
کہ کھنک سی ہو رہی ہے قلب موجودات میں
یک پرتو سا ہے فشاں سینۂ ذرات میں
یہ جو ہوتی ہے دھمک رہ رہ کے سطح خاک میں
اپنے ساقی کی یہ حسرت ہے بطنِ خاک میں
یک اک ذرہ ہے مثلِ شوق کے گاتا ہوا
اشتیاقِ دید میں پلکیں سی جھپکاتا ہوا
ایک اک ساعت میں فشاں ہے صراحِ آرزو
وقت کے سینے میں ہے روشن چراغِ آرزو
قلب کی حاجت ہے اس بے چین سینے کے لیے
یہ انگوٹھی ملتی ہے نگینے کے لیے

خدا کی یہ آواز سنتے ہی ذرات بگولوں کی شکل میں آسمان کی جانب بلند ہونے لگتے ہیں۔ پنکھڑیوں کی نسوں میں یک گہرا رنگ دوڑنے لگتا ہے۔ دریاؤں کی روانی میں تیزی آ جاتی ہے اور درخت یک بارگی جھومنے لگتے ہیں اور خدا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ارادۂ تخلیقِ انساں

حد کرسی پر متمکن ہے۔ جس کے ذہن میں انسان کا ہیولیٰ غلطیدہ ہے۔ سامنے کی ارض کا پرتو فضا میں کانپ رہا ہے اور خدا اس تمنا سے بے چین پرتو کی طرف آنکھیں اٹھا کر بڑی گرم جوشی کے ساتھ ارشاد فرماتا ہے۔

ہاں میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی

کہ ستے میں چند رکتے ہوئے قدموں کی چاپ محسوس ہوتی ہے۔ حد ناخوش گواری کے ساتھ ادھر گردن موڑتا ہے اور دیکھتا ہے کہ چند فرشتے سروں کو جھکائے اور ہاتھوں کو جوڑے ادب اور خوف کے ساتھ بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر حد کہتا ہے،

کیا ہوا اس احتجاجی شکل سے آنے ہو کیوں

(یک نسبتاً معمر فرشتہ آگے بڑھ کر)

فرشتوں کا اعتراض

حاضر رہو دلوں کے دلوں پر یہ پڑا ہے عکس ابھی
حضرت انساں پہ مائل ہے دماغ داوری
بارگاہِ نور میں حاصل ہو کیوں ظلمت کو بار
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار
ان پہ انگلی کی ہے ان پہ بھول کے نشاں
یہ ہماری داڑھیاں ہیں دیکھ یہ پیشانیاں
ماسوا اس کے ضمیر آب و گل میں ہے جنوں
خاک پر تیری بہانے کا شقی انسان خوں
اس کے نیزے ٹوٹ جائیں در علم میرے گڑیں
یہ اسی دھن میں بلا دے گا پہاڑوں کی جڑیں
ہر عمل اس کا بنے گا کب زباں رد عمل
اسے صدا اس سے پٹ جائیں گے یہ دشت و جبل

پھول مرجھا جائیں گے پودے اکھڑ جائیں گے
سینہ ہستی بھر دو بر صبحو پھاڑے جائیں گے
کاٹ دے گی خون کے رشتوں کو تیغ شعلہ رو
بھائی کی تلوار سے بھائی کا ٹپکے گا لہو
حشر تک بوتا رہے گا کشت جاں میں تخم شر
اور کبھی انجام سے بھی یہ نہ ہو گا بہرہ ور
پہلے تو فطرت کہے گا یہ تری آیات پر
اور ہنسے گا پھر یہ خود تیری مقدس ذات پر
دھوپ سلگا جائے گی اور چاندنی کھو جائے گی
ظلمتوں کے پہلو میں روشنی سو جائے گی
طبع عالم پر گرانی ہو گی بے حد و حساب
فتنہ خوابیدہ کو رہے بھی دے معروف خواب
پھر وہی ہم عرض کرتے ہیں بچشم اشک بار
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار
ان پہ انگشت کی سی ہے ان پہ سجدوں کے نشاں

یہ سنتے ہی خدا بگڑ کر جواب دیتا ہے۔

معترض فرشتوں کو خدا کا جواب

تم سے کہہ رہتے ہو سدا اپنی ہی آوازوں میں گم
مشورہ دینے کی خاطر مجھ کو اور آتے ہو تم
یعنی اسرار کو پہچان سکتے ہی نہیں
ہے جو میرے علم میں تم جان سکتے ہی نہیں
ربط بھی معلوم ہے آغاز میں انجام میں
جاؤ اور لگ جاؤ جا کر اپنے اپنے کام میں

یہ سنتے ہی فرشتے شرمندگی اور خوف کے ساتھ ملنے قدموں بھاگتے اور عرش کی سیڑھیوں سے اترتے ہی زمین پر گر جاتے ہیں اور خدا دوبارہ خاطر کو جمع فرما کر فضا میں کہتے

ہوئے کرۂ ارض کے پرتو کی جانب آنکھیں اٹھا کر کہنا شروع کرتا ہے۔

ہاں میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی

اور فرشتوں کا خیال آتے ہی دیوانہ

یہ فرشتے بھی ہیں کتنے کم نگاہ و کم سواد

اور پھر سے ہاں فضا میں کانپتے ہوئے کرۂ ارض کے پرتو پر نگاہیں جما کر انسان سے بلند تر امیدیں وابستہ کر کے کہتا ہے۔

ہاں میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی
کون انساں؟ فاتح کونین امیر تب و تاب
نور گیتی، مشعل افلاک، شمع انجمن
ناصر اوج نگاہاں، نالۂ بر و تحن
مدعائے آسمان و مقصد روئے زمیں
شارح آیات ہستی، شارح دین حیات
مکتب نور و حرارت، درس گاہ خیر و شر
دور بیں خشک و تر معیار فقہ مدح و ذم
شاہ گیتی صاحب آفاق ادارائے حیات
اک زمیں پرور محقق اک فلک پیما حکیم
آسماں کا داور و دارا زمیں کا کج کلہ
دہر کی پیہم و پنہاں طاقتوں کا شہریار
طرفہ تر یگانہ موجودات کا اسرار باز
برق پیما دہلیز شام و سحر کا شہسوار
عرصہ ہستی کی صور فطرت نوعیں کا نشاں
روشنی کا نطق، فطرت کا کفن، حق کا پیام
عالم اسباب کی محراب اعظم کا چراغ
چشم ہستی کی بصارت زندگی کا رازداں

کون انساں؟ نیر کائنات و فخر زندگی
سینۂ آفاق کا لرزندہ و بیدار دل
اک مجسم کی کتابی اک سراپا بانکپن
ناظر صبح جہاں ناقد سرود و سخن
مرکز اضداد عالم محور دنیا و دیں
قاضی شہر صفات و کاتب دیوان ذات
صاحب نار و برودت، رکب شمس و قمر
خود بیں آب و گل میزان جنس کیف و کم
ابر رحمت وارث فطرت رئیس کائنات
ایک مقیاس تجمل اک رصد گاہ عظیم
بر کا آقا، بحر کا مولا فضا کا بادشاہ
نظم کا پیغامبر، آئین کا پروردگار
اوج کا تیاض، پستی کا طبیب و چارہ ساز
جنبشوں کا میر لشکر گردشوں کا تاجدار
بحر ظلمت کا سبک رو کشتیوں کا بادباں
صرصر کا مقتدا، سرکش عناصر کا امام
پیکر حرص و ہوا کے کاسۂ سر کا دماغ
خاطئی کا زمزمہ گونگے حقائق کی زباں

خون کی بوندے گا جو ان میں نہ ٹپکا خاک میں — تج کر دوں گا وہ پیمانہ جس کی خاک میں
سر جھکا دو اے فرشتو زندگی کے سامنے — خاک پر رکھ دو جبیں آدمی کے سامنے

غرض خدا اپنے تصورات کو آب و گل کا پیکر عطا کر کے اسے آدم کی شکل میں خلق فرماتا ہے اور تمام کائنات کو اس کے لیے مسخر فرما دیتا ہے اور تمام فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ چنانچہ تمام فرشتے آدم کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں مگر ابلیس سجدہ کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

خدا حقارت بھری کے عالم میں ابلیس کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔

خدا: بد گہر، یہ سرکشی، یہ زعم باطل، یہ غرور
کس لیے جھکتا نہیں تمہارا آدم کے حضور

ابلیس: کام ہے ادراک سے بالا خدا ادراک ہے

خدا: کیا کہا، میں کام ہوں، کیا کام ہوں ادراک ہے؟

ابلیس: یہ کہ ابلیس آگ سے ہے اور آدم خاک ہے

خدا: ہاں میں واقف ہوں کہ شیطاں بند ہو آدم فیں ہے

ابلیس: خاک کے قدموں پہ گرنا آگ کی توہین ہے

خدا: آگ کی توہین ہے؟ یہ شعلہ یہ طمطراق

ابلیس: شق ہو میرے سر پہ شق ہو گنبد فیروزہ فام
تجھ سے کہتا ہے خدا یہ شعلہ یہ طمطراق
شعلہ تو ہے مرا عین مزاج آتشیں

خدا: خاک پر بنداں فرشتے خاک پہ رکھ دے جبیں

ابلیس: اف یہ سر اور آدم خاکی۔ نہیں ہرگز نہیں

خدا: کیا کہا ہرگز نہیں، کیوں اے سراپا بغض و کیں
دور ہو اے آتشیں مردود اے روح لعیں
حشر تک رہے گی لعنت تجھ پہ غرب و شرق سے
اے رضا کے تاج گر جا اس شقی کے فرق سے

یہ بلند یہ ایستادہ یہ مکیں یہ کرّ یہ آن بان
عرش سے جا فرش پر گر پڑ زمیں کی خاک چھان

ابلیس: ابلیس کو کیا زمیں کی سمت بھیجا جائے گا؟

خدا: کھائے گا او باغی و ملعون دھوکا کھائے گا

ابلیس: خیر دیکھا جائے گا معبود دیکھا جائے گا

اس کے بعد خدا آدم کو کرۂ ارض پر اپنا خلیفہ مقرر فرماتا ہے اور تمام کائنات کو اس کے لیے مسخر فرما دیتا ہے۔

"خدا کا حکم زمین اور اس میں موجود تمام اشیاء کے لیے"

سے زمیں آباد ہو جا آشنائے راز سے
گونج تو اے آسماں انسان کی آواز سے

سے خموشی بڑھ رکاب خلق آدم تھام لے
اے پہاڑو سر جھکا دو آدمی کے سامنے

اپنی تنگی سے خبردار اے عروس بحر و بر
ہو رہا ہے خاک پر اسرار حق کا پرتو

ہاں اٹھ اے سینۂ گیتی سے موج شراب
شاہد آفاق کے چہرے سے اٹھ جا اے نقاب

سے سمندر ہاں ادب کے ساتھ موجوں کو دبا
پاک انساں کے قدم سے سے دیکھنے آلائش

ہاں تو اے آفاق استقبال آدم کے لیے
سرد تو ہو اے عناصر خیر مقدم کے لیے

تلخیوں کو ترک کر دو گرمیوں سے کام لو
برف و باد اے طوفانوں کی باگیں تھام لو

پیش دانی کو ادب سے پیش دانی کو بڑھو
سے کواکب جگمگاؤ اے گھڑ گھڑاتے بجو

سے شگوفو مسکراؤ آبشارو گیت گاؤ
گنگناؤ سے ہواؤ اے پرندو چہچہاؤ

جھنجھناہٹ سے تجھے روح عظیم و قدس پاک
ہاں کلک فرنج کر سے جواں اقبال خاک

ہوش میں آ اے خمودہ فرش خاکی ہوش میں
کچھ خبر ہے عرش آتا ہے تری آغوش میں

آدم کا نزول

آسماں نے علم کھولے زمیں نے سانس لی
غصے غصے سے اٹھی اک جوش موج زندگی

مہتاب بن کر چھائی میدانوں پہ روح بحر و بر
دید کی خاطر پہاڑوں نے اٹھائے سر سے سر

سنانی سینۂ فولاد میں تیغ دو دم
ہوئے میدانوں میں شہروں کا کھیل جاگ اٹھا
گونج تھی کہسار کے سینے میں تیشے کی صدا
حکم قدرت کے لیے موج ہوا آنے لگی
ذوق بکاوت و صنعت کا نکھل بجنے لگا
اپنے میثاق اطاعت کو نبھانے کے لیے
سینے آ آ کے اشیا نے پہنائے اپنے نام
حد طوفانوں کی اکڑی گردنیں خم ہو گئیں
رکھ کے کشتی میں خواص این و ہوس سر عرج
جھک گئی جس تو مودب ہو گئے فرش و سما
روشنی کو سینۂ ظلمت میں راہیں مل گئیں
تو عروس دہر نے رخصتوں کو برہم کر دیا

پتھروں میں کتنے ناتراشیدہ صنم
ایک پرتو سا در و دیوار کا پڑنے لگا
لیکن تعمیر کا رخسار تو دیکھے لگا
بادب یا ہوش کی پیہم صدا آنے لگی
آتی طبل عالم ماکی سے دل دل کی صدا
آئیں ساری قوتیں عالم کی صف باندھے ہوئے
ہو گئے بکھرے عناصر نے کیا جھک کر سلام
احترام آدم خاکی کو سوچیں انھیں
نذر کو آیا تو اپنے کارفرما کا خراج
شاہدان دہر نے دے کر دیے بند قبا
ماک کے کھل گئے کانوں کی کیا پھیں کھل گئیں
چاند بجرے کو جھکا، سورج نے سر خم کر دیا

ادھر تمام کائنات اپنے مزاج سے حضرت آدم کے استقبال کے لیے موجود تھی مگر ادھر آدم خود اپنے وجود میں کسی شے کی کمی محسوس کر رہا تھا اور یہ کمی اس کے نصف ستر کی جستجو جو اس کے گرم خون میں آتش سوزاں بن کر دوڑ رہی تھی۔ آدم کی اس جسمانی طلب اور طبیعی لگن کا نقشہ کس مہارت سے کھینچا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

آدم

حیراں ہوں ماک پر ہے یہ کیا زندگی کا طور
دریا، درخت، سبزہ، سکوں، بر، آبشار
سینے میں مثل شعلہ بھڑکتا ہے کس لیے
کچھ اس کی اصل بھی ہے کہ وسواس ہے مجھے؟
ہر لو ایک دھن ہے تو ہر تن ایک گرید
ساکن ہوں اور خیال ہے آوارہ چار سو

ہر ساعت ایک فکر ہے ہر سانس ایک خود
ہر چند دلفریب ہے لیکن یہ قلب زار
کیا چیز ڈھونڈتا ہے دھڑکتا ہے کس لیے
کس چیز کی کمی کا یہ احساس ہے مجھے
اور کیوں ہے کس بنا پہ ہے کھلتا نہیں یہ بھید
کس چیز کی تلاش ہے؟ کس شے کی آرزو

یہ واقعہ غریب ہے یہ مرحلہ عجیب
خود سے ہوں فاصلے پہ کبھی اور کبھی قریب

اور بالخصوص فکر میں تھکتی ہے جب جبیں
خود کو ٹٹولتا ہوں کہ میں ہوں بھی یا نہیں

راتی ہے مثل ہر مسلسل دماغ پر
سنجیدگی و سوز خفی سے عمیق تر

جیسے میں کانپتی ہے مرے یک موج نور
دل سے قریب، فہم سے بالا نظر سے دور

رہتا ہوں ایک فرد تعلق سے منفصل
اپنے سے دور دور مناظر سے منفصل

رہتا ہوں کیوں اداس سا آنسو پیے ہوئے
کیسی یہ سنسنی ہوں رگوں میں لیے ہوئے

گونجی ہوئی ہیں کس کے قدم کی یہ آہٹیں
کیسی یہ میرے جسم میں ہیں کسمساہٹیں

چھالا سا دل میں وقت سحر پھوٹتا ہے کیوں
راتوں کو نامراد بدن ٹوٹتا ہے کیوں

باد شمال ہو کہ وہ ابر جواں خرام
ناقص ہر یک چیز ہے ہر شے ہے ناتمام

احساس نا تمامی عالم تو ہے مگر
اب تک ہوں ناتمام کے معنی سے بے خبر

کوندا سا اک لپکتا ہے ہر شاخ تاک پر
پرتو سا ایک کانپتا رہتا ہے خاک پر

دوران خون میں ہے رواں ایک تیز دھار
خود اپنی سانس لینے میں چبھتی ہے بار بار

کچھ اجنبی زبان میں کرتی ہے گفتگو
راتوں کو اک بھیس میں موہوم آرزو

چشموں کو کیا کروں لب ساحل کو کیا کروں
اس نامراد کشمکش دل کو کیا کروں

خود اپنے دلوں کو بھی پہچانتا نہیں
کس راستے کے موڑ پہ ہوں جانتا نہیں

آدم ہے، حوا کی ہر شے کو حیرانی سے دیکھتا ہے اور بار بار یہ الفاظ دہراتا ہے۔

اس نامراد کشمکش دل کو کیا کروں
ہاں نامراد کشمکش دل کو کیا کروں

خدا ہے جینے کی باطنی خلش کو دور کرنے کی خاطر حوا کی تخلیق کرتا ہے۔

صیاد غم کا ہوتا ہے مرہم
مبارکباد مرگ تو ہے آدم

زمین پر جب آدم و حوا ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو ان کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ پہلے آدم کا حال سنیے۔

یہ کس شے کی مہک، اجنبی، نا آشنا خوشبو ہے
یہ کس لذت خفی کا لمس و موہوم پرتو ہے

یہ میرے گرد کیسا دھیمی سا اجالا ہے
یہ سیل روشنی سے پست ہے ظلمت سے بالا ہے

نہ جانے رستے میں ہیں کہ محو رقص منزل ہیں
یہ کیسے تلخ و شیریں ولولوں کی بزم ہے دل میں

یہ کس ناخن کا پرتو پڑ رہا ہے صفحۂ دل پر
یہ کیسی سے جزر و مد کے کانپ اٹھتی ہے ساحل پر

یہ کیا ہے موج ساحل جاگتی ہے اور نہ سوتی ہے
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

فضا میں بڑھ رہے ہیں کیا تلاطم ہے
یہ طوفان حقیقت ہے کہ طغیان توہم ہے

یہ کیسی گنگناہٹ دل نشیں آواز آتی ہے
کہ جیسے اک گرہ لگتی ہے تنگ کر کھل سی جاتی ہے

یہ کس ناآشنا سے مہرباں کی آمد آمد ہے؟
یہ کس بے سمجھے بوجھے کارواں کی آمد آمد ہے

یہ کیا عالم ہے ہر شے بحر ظلمت میں ڈوبتی ہے
یہ کس کی سانس چہرے پہ مجھے محسوس ہوتی ہے

ہوں دم بخود یہ میری بھول میں دھمک کیسی
ارے یہ دفعتاً جنبش سی کیسی یہ چمک کیسی

یہ آہٹ کس کی ہیں گونجی مرے بے چین سینے میں
صبا جیسے گلی میں رہ گئی جیسے مقبرے میں

یہاں آیا ہے کوئی یا جنوں نے مجھ کو گھیرا ہے
ارے یہ کس کا شانہ مس ہوا تو کون ہے؟ کیا ہے؟

ادھر آدم کا یہ حال تھا اور ادھر خود اپنے داخلی جذبات و ہیجان میں مبتلا تھی ـــ جذبہ تخلیق چنگاریاں بن کر ہر موئے تن میں سرایت کر رہا تھا محسوس کی یہ کیفیت جوش صاحب کی زبانی سنیے۔

۱۷

بازو یہ نرم نرم یہ گدری کلائیاں
بیدار ہیں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے

آنکھوں سے ایک بھاپ سی اٹھتی ہے گرم و سرد
تڑپ رہا ہے کون دل درد مند کو

رگ رگ میں خون لیتا ہے قم قم کے چٹکیاں
کوئی ہمک رہا ہے نہ انداز دل نشیں

کانوں سے لو نکلتی ہے اور آگ ہے جبیں
رو پہ سونے والے ہی سے کیوں نہ پوچھ لوں

دھوئیں چلی ہوتی ہیں وہ دل میں کہ الاماں
اک پوری پھٹ رہی ہے لجتی تخوم سے

ہوتی ہے کیوں چلک سی کمر میں یہ بار بار
یہ تن بدن میں کیوں کی لہریں رواں دواں

کیسی یہ نیند سی ہے اعاظ کیے ہوئے
پنڈے کے جھکیے پن میں ہے کیسے مزے کا درد

اینٹھن سی کھائے جاتی ہے ہر جوڑ بند کو
رخ سے لٹوں کے چھوتے ہی اٹھتا ہے اک دھواں

سینے میں ہے کہ گود میں مجھ کو خبر نہیں
چھاتی ابل رہی ہے نہ ہو جائے فتق کہیں

یہ بے خودی سی مجھ پہ چھنی جا رہی ہے کیوں
اینٹھی سی جا رہی ہیں نکھوٹی کلائیاں

کیا صبح ہو رہی ہے رگ و پے میں دھوم سے
کیسا ہے اف یہ دھوم مچاتا ہوا ابھار

پیدا ہوتی ہے بات یہ شاید ست بری
پہلو سے زلف مس ہو تو آتی ہے جھرجھری

تیزی سے بن رہی ہوں میں اک دانہ پھول بن
ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے پھیکا ہوا بدن

ہر رونگٹے کی جاگ اٹھی پیاس اٹھاں
احساس اور جسم کا احساس اٹھاں

شیریں و تلخ رہر رگ و پے میں بھر دیا
کس نے یہ مجھ کو جسم سے آگاہ کر دیا

لگتا ہے تیر بن کے چبھنا ہزار کا
در آیا ہے بدن میں زمانہ سدھ کا

رو رو کے کون چیز مچلتی ہے کیا کروں
کوڑی کے پاس آگ سی جلتی ہے کیا کروں

صبوحہ میری اس کو پی لے کوئی کرن
سیال ہو رہی ہوں سنبھلتا نہیں بدن

صحراؤں میں گھومتے گھومتے اتفاقاً آدم و حوا ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ اس اتفاقی ملاقات کے نتیجے میں ان کا بے کیف ماحول یک دم رنگین اور خوبصورت بن جاتا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت کا حال سنیے۔

واقعہ تھا کہ گماں تھا مجھے معلوم نہیں
کل یہ کیا فرق سماں تھا مجھے معلوم نہیں

پرتو صبح کی ہاتھ رہیں کی جانب
کون شب کو نگراں تھا مجھے معلوم نہیں

ذرے ذرے سے جوانی کی مہک آتی ہے
کس کا لب طرفشاں تھا مجھے معلوم نہیں

ایک چشمے کی سی آواز تو آتی تھی ضرور
اور وہ چشمہ کہاں تھا مجھے معلوم نہیں

جس کی رفتار سے تھی کائنات جنبش میں
کون وہ سرو رواں تھا مجھے معلوم نہیں

چاند کا سینہ ستاروں کا جگر خاک کا دل
کس کی شوخی سے جواں تھا مجھے معلوم نہیں

بام گردوں پہ کہاں سے علم کھولا تھا
یا حقیقت کا فسوں تھا مجھے معلوم نہیں

آسمانوں سے برستے تھے خوشی کے گوہر
یا فلک رنگ فشاں تھا مجھے معلوم نہیں

جھٹ پٹے کی شکن آلود فضا کے پیچھے
دوست یا دشمن جاں تھا مجھے معلوم نہیں

شام کی جنبش تاباں کی گرفتاری میں
کون یہ نیم جواں تھا مجھے معلوم نہیں

آدم و حوا کو دلی ذہن کے ہاتھوں آتش بجاں تھے مگر اس بے چینی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے کہ اتنے میں ایک سرخ پوش انھیں ترغیب دیتا ہے۔

(ابلیس) سرخ پوش کی ترغیب

اس عہد تبسم میں نہ کٹنے کی روانی — اس عرصے سے جھلکیں گے معانی
اس حسن سے ہوگی نہ کبھی شعلہ فشانی — برسے گا اک بوند بھی اس برسے پانی
نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

اس سلسلہ شرم سے جل جائے گا جس وقت — رگ رگ میں جواں خون مچل جائے گا جس وقت
سانچے میں ہی آگ کے ڈھل جائے گا جس وقت — کانٹا ترے سینے سے نکل جائے جس وقت
کھل جائیں گے تخلیق کے اسرار نہانی

ہاں جھوم کہ دنگا ہو جوانی کا دمک جائے — کوندا سا لپکے تجھے بجلی سی چمک جائے
یوں پی سے حشرت کہ ترا جسم چھلک جائے — اور اتنی کہ انگڑائی جو لے جلد سمک جائے
اٹھ رقص میں آ رقص میں بھر پور جوانی

اس شرم سے اس ضبط سے اس بے ہوش جا سے — سہمی جو بہ ناموس سے ہو خوف خدا سے
اس شدت آواز سے اس فرط حیا سے — اس خلقت و معزوں انداز و ادا سے
شاعر ہی سلولی ہیں نہ صحیفے ہیں سماوی

سرخ پوش (ابلیس) کی اس ترغیب کے بعد ماحول اور بھی رنگین ہو گیا۔

کروٹیں لیں زلف نے لیں غنچوں نے آنکھیں کھول دیں — آسماں تھا نرگسِ تر کے لگی کم من زمیں
سر پہ پہلی بار چمکا قوس کا رنگین پل — گلشنِ ہستی میں پہلی بار نکلی شاخِ گل
جگمگے مسکرا کر پہنا پھولوں کا لباس — چہرۂ گیتی پہ پہلی مرتبہ تری سماس
درس پہلی بار دنیا کو لطافت کا ملا — اولیں طرہ چھڑا اور اولیں ضرب کھلا
گل کے پیراہن سے پہلی بار نکلی بوئے گل — تاک کے خوشے سے پہلی بار ٹپکا خون دل
اک لگوٹ سی ہوئی پیدا ہتی جو زلف کے لاگ — لے سے پہلی بار نکلی طرۂ سوزاں کی آگ
ہندنی شدت احساس میں ڈوبا ہوا — دیدۂ ارض و سما سے اولیں آنسو گرا
اور پھر گھر کر تمنا کا بادل آ گیا — گھر کے گرجا اور گرج کر اک جہاں پر چھا گیا

پھر تو برسانے لگا ذوقِ حسن ذوقِ نگاہ
خاک پر الھڑ جوانی کا جمال بے پناہ

حرمتے بے خود ہوئے برنائی اٹھلانے لگی
شوخیاں مچلیں جوانی رقص فرمانے لگی

یوں کھنچے ابرو نئے سانچے میں عالم ڈھل گیا
یوں ابھی چھلکیں رگِ ہستی پہ نشتر چل گیا

کانپتی، تپتی دہکتی حسرتیں پیدا ہوئیں
زندگی کے طاق کاشوری میں شمعیں جل اٹھیں

عرش نے بوسہ اٹھایا فرش کی پلکی نگر
دمسنے لگے و نم گنگنانے بحر و بر

جھرنوں میں جل نغمے بہنے جھکنے سے لگے
سینۂ ماسس میں کنگن جھنکنے سے لگے

نرم ریشم کی تمنا دہر پر چھانے لگی
کب خیالی سرسراہٹ کی صدا آنے لگی

سینۂ دوشیزۂ گیتی کے اندر ناگہاں
کروٹیں لینے لگا ذوقِ حریر و پرنیاں

عارضِ بے آب گوہر پر صباحت چھا گئی
روئے روپ پر جوان یوں دوڑا کہ سرخی آ گئی

سینۂ گوہر میں بندھنے کی تمنا جاگ اٹھی
قلبِ بیم و نور میں اک پازیب سی بجنے لگی

دفعتاً عالم کی پیشانی پہ گویا چھا گئی
پاک بچوں کے تبسم کی سہانی چاندنی

کھل کھلا نے شگوفے چہچہانے طیور
نغمہ گو کا زیر و بالا، رنگ دوڑا دور دور

جھوم کر گنگور ساون کی گھٹا آنے لگی
رنگ رنگ جھونکے صبا چلنے، صدا آنے لگی

اس پُرکیف فضا میں آدم، حوا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

آدم کا پہلا ترانہ

اے نرگسِ جاناں یہ نظر کس کے لیے ہے
یہ شعلہ، یہ بجلی یہ شرر کس کے لیے ہے

اے قامتِ بالا و بلند سے تو سرو
یہ سرو یہ شاخِ گلِ تر کس کے لیے ہے

اے سنبلِ دلکش کے لیے پیکِ ہزیمت
پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لیے ہے

اے سایۂ کاکل میں جھکتے ہوئے چہرے
یہ شام کے حلقے میں سحر کس کے لیے ہے

اے مہر و مہتاب سے دمکتے ہوئے مکھڑے
تجھ پر یہ تبسم کا اثر کس کے لیے ہے

اس پیکرِ شفاف کے گرداب سے تاباں
دھنکی ہوئی یہ تب گہر کس کے لیے ہے

اے دخترِ شبنم و پروردۂ نرگس
یہ تب یہ دزدیدہ نظر کس کے لیے ہے

اے خود سے الجھتی ہوئی سرشار جوانی — ہر سانس میں یوں زیر و زبر کس کے لیے ہے

حوا کا جواب

یہ کچھ نہیں معلوم مگر تجھ سے سنوں گی — یہ بات کہ تو خاک بسر کس کے لیے ہے
ہر سانس میں یہ زیر و زبر تیرے لیے ہے — ناداں! یہ مصروف مشجر تیرے لیے ہے

آدم: کس درجہ زندگی تھی پریشاں ترے بغیر
حوا: سچ سچ یہ زندگی تھی پریشاں مرے بغیر؟
آدم: ہاں ہاں یہ زندگی تھی پریشاں ترے بغیر

پھیکا تھا رنگ لالہ و گل دور جز میں — گونگے تھے طائران خوش الحان ترے بغیر
پڑتی تھی تند و سرد سی شے سے بھی اک خراش — حساس اس قدر تھی رگ جاں ترے بغیر
چمکتی تھی پہلوؤں میں ستاروں کی روشنی — ڈستا تھا پرتو مہ تاباں ترے بغیر
ہوتی تھی مس تو آنکھوں میں لگتی تھی باد سرد — کتنا سبک تھا دیدۂ حیراں ترے بغیر

آدم و حوا کے قرب پر حوروں کا ترانہ مبارک باد

مبارک حضرت انساں مبارک — مبارک جلوۂ جاناں مبارک
دلوں کو غم کو عشرت کی بشارت — نجوم درد کو درماں مبارک
شب تاریک کی خاموشیوں میں — خروش صبح خوش الحان مبارک
نگاہ رہرو رہ طلب کو — سواد کوچۂ جاناں مبارک
غم محراب چشم آرزو کو — چراغ چہرۂ خنداں مبارک
فضائے شام غم کی تیرگی کو — نسیم صبح گل افشاں مبارک
سکوت موسم لب تشنگی کو — سرود بربط و باراں مبارک
دلوں کلفت پیمانۂ غم کو — نجوم عشرت پیماں مبارک
ہوائے جلیہ زخم جگر کو — لوائے جنبش مژگاں مبارک
لب امید کو موج تبسم — یہ لیلیٰ دیدۂ گریاں مبارک
سبک رفتار موج زندگی کو — مبارک دولت طوفاں مبارک

آدم و حوا کے قرب پر آتش بگولا ابلیس نعرۂ مسرت لگاتا ہے۔

خود کو گم کردہ راہ کر کے چھوڑا — حوا کو بھی تباہ کر کے چھوڑا
کیا کیا کیے حضرتِ والا نے جتن — آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا

اس کے بعد ابلیس کے قہقہے فضا میں گونجنے لگے۔

میری لحدِ اولیں کو توڑ کر لے آسماں
ہاں جلا دل کو، کہاں کس طرف ہیں آندھیاں

قرب آدم و حوا کے ایک زمانے کے بعد جب انسانی آبادی بڑھنے لگتی ہے تو حوا آدم کی طرف دیکھ کر کہتی ہے۔

آفریں جوشِ حیات و مرحبا روحِ نمو — یہ مرے بچے ہیں میری نسل ہے میرا لہو
اپنے بچے زندگی کے یوں ترے گائیں گے — کون کہہ سکتا تھا ہم اتنے عدد بن جائیں گے
آسماں زندگانی کے مدد پروردیں ہیں یہ — کتنے پیارے کتنے بھولے کس قدر شیریں ہیں یہ
بچپنا ہے کس قدر رفتار میں گفتار میں — جی میں آتا ہے کہ رکھ لوں اس کلیجے میں انھیں
دے مجھے قربان پھر ہے جو کس قدر بے گانہ وار — آؤ آؤ اس طرف تو آؤ ہاں تم پر نثار
آؤ آؤ مثلِ باد تو جستجو کی آؤ آؤ — آؤ بچو آؤ میں ہوں ہاں تمھاری آؤ آؤ

آدم

یہ بلندی کی صدا میں کس قدر بے سود ہیں — جب کہ حوا خود یہ تیری ذات میں موجود ہیں
آج کل جو شکل انساں میں دکھاتا ہے بہار — یہ تری ان سرکشی آنکھوں کا ہے رنگِ خمار
ان کی شیریں زندگانی زندگانی ہے تری — یہ تمنا ہے تری یہ نوجوانی ہے تری
یہ جو چہروں پر نظر آتی ہے اک شیریں بھبھن — یہ ترے بکھرے کہ رنگیں جنت ہے ہم تن
دکھ رہے ہیں یہ جو اٹھا کر ترے بچے قدم — در حقیقت یہ تری آواز کا ہے زیر و بم
بلندوں پر یہ جو رنگیں اڑ رہی ہیں تابدار — یہ تری مہکی ہوئی سانسیں ہیں اے جانِ بہار
یہ ادھر جو جا رہی ہیں دلفریب خندہ دم — یہ اسی وادی کی کلیاں ہیں جہاں جنگلے تھے ہم
یہ جو بیٹھے رہ گئے ہیں سے گنگناتی ہے زمیں — مسکراہٹ یہ ترے بیٹے کی ہے اور کچھ نہیں

خاک پر مچلی ہوئی ہے یہ جو اک موجِ شباب
یہ ترے ہونٹوں کی ہے تیری آنکھوں کی شراب

یہ جو جنبش سی نظر آتی ہے تجھ کو دور تک
میری جنوں کی دھمک ہے تیری پلکوں کی چمک

یہ جو دو آنکھوں میں لہریں دو دلوں میں میل ہے
یہ وہی کھیلا ہوا اپنا پرانا کھیل ہے

زندہ و پایندہ و رخشندہ و تابندہ باد
نسلِ آدم زندہ باد و نسلِ حوا زندہ باد

انسانی تہذیب کی ترقی سے خوش ہو کر حضرت آدم و حوا کی نسل نوحِ آدم کی تعریف کرتا ہے۔

مرحبا اے نوحِ انساں مرحبا صد مرحبا
یہ تجلی یہ ترنم یہ تبسم یہ ضیا

یہ چمن یہ کھیت یہ تالاب یہ نہریں یہ بند
یہ کلس رنگین و درخشاں منارے یہ بلند

یہ محل یہ طاق یہ گنبد یہ مینارے یہ باغ
یہ اجالے کے دھچکے یہ اندھیرے کے چراغ

یہ مردش مطرباں یہ نغمہ چنگ و رباب
یہ ہجوم رنگ و بو غن یہ وجود آب و تاب

یہ قبائیں یہ جواہر یہ نوادر یہ بخور
موجِ آب و موجِ رنگ و موجِ عود و موجِ نور

کون کہہ سکتا تھا وحشت کی بلا ٹل جائے گی
صوفگن چہروں کے سینے میں خلش پاتل جائے گی

مگر یہی دنیاوی رونق میں آدم و حوا اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ اپنے خالق و آقا خدا کو بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ حوا آدم سے پوچھتی ہے۔

حوا — کون ہیں یہ بزرگوار و پیر؟
آدم — ان کو دیکھا تھا کیا کبھی میں نے؟

خدا

ان کا سے جو بندی بھول گئے ان کا جو ہے لہجا بھول گئے
افسوس کہ اپنے خالق کو یہ آدم و حوا بھول گئے

یہاں سے زوالِ آدم شروع ہوتا ہے۔ خدا کو بھولنے کے معنی یہ ہیں کہ آدم منصب خلافتِ الٰہی کو بھول جاتا ہے۔ یہ دراصل ابلیس کی فتح تھی جس نے آدم کو اس مقامِ بلند سے نیچے گرا دیا تھا۔ چنانچہ خدا یہ تصدیق فرماتا ہے کہ:

زندگی ہے پیچ مرکز حقیقت کے بغیر
یہ ورق تاریک ہے مہر نبوت کے بغیر

اے کہ دامن چھپا لے اس اندھیری رات سے
اے کہ رخشندہ ہو جا مشعل آیات سے

ہاں چمک برق ہدایت ہاں برس ابر کرم
جاگ اے روحانیت کھل اے رسالت کے علم

خدا آدم کی راہ نمائی کے لیے لاکھوں پیغامبر بھیجتا ہے۔ ان پیغمبروں کے حالات زندگی اور ان کے پیغامات سے متعلق جوشش صاحب کی اس کتاب کے صفحات بھی حامل ہیں۔ جب آخری پیغمبر بھی دنیا سے پردہ فرما لیتے ہیں تو خدا تمام پیغمبروں کو جمع کر کے فرماتا ہے کہ اب تو کرۂ ارض جنت میں تبدیل ہو چکا ہوگا تو تمام پیغمبر شہادت میں جواب دیتے ہیں۔ خدا اس دنیا کے معاملے کے لیے آسمان اول پر تشریف لاتا ہے اور آسمان میں سوراخ کر کے دنیا کا نظارہ فرماتا ہے۔ یہ مغرب کا وقت ہے اور ایک شہر کی مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دیتی ہے۔ خدا خوش ہو کر اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ مسجد کے قریب ہی ایک محل پر نظر پڑتی ہے جو روشنیوں کی وجہ سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے گھنگھروؤں کی جھنکار میں کسی مغنیہ آتش نفس کی شعلہ بیانی امام مسجد کی تلاوت قرآن پر حاوی ہوتی ہوئی کنگرۂ فلک سے ٹکراتی ہے جو ایک انتہائی جنسی اشتعال پیدا کرنے والا گانا گا رہی تھی۔ اسی محل کی دیوار کے زیر سایہ ایک گھاس پھونس کی جھونپڑی میں ایک مفلوک الحال غریب بیوہ عورت اپنی بیمار جوان بیٹی کو لیے بیٹھی ہے جو تیز بخار میں مبتلا ہے اور اس کی دوا دارو کے لیے بھی اس غریب عورت کے پاس دام نہیں ہیں۔ دوسری طرف محل میں جشن نادو نوش برپا ہے اور عالم یہ ہے کہ "چمن میں آج ہر گلبانگ نوشا نوش ہے ساقی" کا سماں ہے۔ ادھر وہ بوڑھی بیوہ ماں بیٹی کی بیماری سے مجبور ہو کر محل کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ اندر سے چند پہریدار برآمد ہوتے ہیں اور اس بڑھیا کو دھکے مار کر محل کی سیڑھیوں سے نیچے گرا دیتے ہیں۔ بڑھیا گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ بہت دیر کے بعد جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ گرتی پڑتی پھر کٹیا میں پہنچتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ اس کی جوان بیٹی تڑپ تڑپ کر مر چکی ہے۔ مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ محل سے مغرب کی بھی اذان سے زیادہ بلند ہے مگر ان سب سے زیادہ بلند بیوہ ماں کا گریہ و ماتم ہے جس نے ساکنان عرش کے قلوب کو تڑپا دیا۔ خدا

تمام پیغامبروں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا ہے اور آسمان اول کا در بند ہو جاتا ہے اور یہ صدمے کے عالم میں عرش پر بیٹھ جاتا ہے کہ اتنے میں فرشتوں کی جانب سے کورس میں کچھ گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

معترض فرشتوں کی یاد دہانی

الٰہی حکمت آدم کے اجمالی ارادے میں
کروروں ہو گئے تھے یہ غلطاں ہم نہ کہتے تھے

تری تسبیح کو حاضر ہے لشکر حاملانِ روحوں کا
یہ آدم ہے بڑا باغی بڑا طاغی بڑا کھوٹا
ہجوم دے گا لہو میں دہر کو یہ خاک کا پتلا
بشر بیکار شر ہے اسے پیدا نہ کر مولیٰ
یہ آل تیغ ہے اولاد پیکاں ہم نہ کہتے تھے

جہاد و جدل و جلال و جنگ کی دھن میں
حصار چتر و سر و افسر و اورنگ کی دھن میں
رہیں رنگ و نسل و قوم و دین و رنگ کی دھن میں
دفعہ شبہ و ناقوس و حدود جنگ کی دھن میں
بہائے گا لہو گیتی پہ انساں ہم نہ کہتے تھے

گریں گی بجلیاں امن و اماں کے آشیانوں پر
حکومت مار کی ہو گی سکتے گلستانوں پر
مزے کا ہر یت سر کار حق صرف آسمانوں پر
مزے گا ہر یت سر کار حق صرف آسمانوں پر
رہیں پر ثبت ہو گی مہر شیطاں ہم نہ کہتے تھے

سعادت کو گرایا جائے گا قصر نحوست میں
کتب خانے جلائے جائیں گے شہر جہالت میں
زبان صدق کاٹی جائے گی دار الخلافت میں
سر اخلاص توڑا جائے گا صحن عدالت میں
یہ میزان لم شمشیر براں ہم نہ کہتے تھے

مرے گا یہ لقمہ اپنی ہی عشرت کے پیٹ پر
یہ ڈاکے کا گھر سب پی ہی ٹوپی کے پیٹ پر
ترس کھائے گا یہ عالم نہ مردے پر نہ جیتے پر
ملکہ قہر اب ہے کس لیے اپنے جیتے پر
بشر ہے خسرو اقلیم صدماں ہم نہ کہتے تھے

ہے گا کوئے خوباں ہی نہ خالی مرکز قدرت
خرابات مغاں ہی میں نہ گونجے گی حکایت
یہ سے بڑھ جائے گی اتنی کہ مہر مستی و عشرت
مرہیں بھی کہ ہے دار الامان عفت و عصمت
جلائی جائے گی قندیل عصیاں ہم نہ کہتے تھے

کبھی طیبان وحشت سے کبھی جوش تمنا سے
کبھی دل کے اشارے سے کبھی عقل کے ایما سے
کبھی آہنگ مشرب سے کبھی گلبانگ فردا سے
کبھی دیجان مستی سے کبھی دست ربا سے
پھٹے گا حضرت ناصح کا داماں ہم نہ کہتے تھے

بنے گا شوق عصیاں کوہ آتش بار کا لاوا
نکالا جائے گا اس آدمی کا خلد سے باہر
خلافت کھائے گی اک روز وحشت کفر میں کاوا
ہماری بات کو ٹھکرا کر اب کیوں سر پہ پچھتاوا
بغاوت پر اتر آئے گا انساں ہم نہ کہتے تھے

ڈبوئے جائیں گی اعمال صدا جو ظلمت میں
ندیم پائے گی اک شمع بھی طاق رسالت میں
ترے کلمات ڈھالے جائیں گے سرمل بودگت میں
ترے آیات گائے جائیں گے محراب قرأت میں
فقط اک اصول بن جائے گا قرآں ہم نہ کہتے تھے

خداوندا یہ انساں مل طاعت پر ستم ڈھا کر
یہ عصیاں کار حیاں ولایت پر ستم ڈھا کر
یہ صد افسوس انقلاب بدیت پر ستم ڈھا کر
امامت کو فنا کر کے رسالت پر ستم ڈھا کر
تو بھی پھاڑ ڈالے گا گریباں ہم نہ کہتے تھے

قوائے این و آں کو فکر کی بھٹی میں پگھلا کر
محیا بے کراں ثابت و سیکو پر چھا کر
زمین و آسماں کی طاقتوں کو لخ لخ کر
حیات جاوداں کا تاج پیشانی پہ محکما کر
یہ کچھ ہوگا الوہیت کا خواہاں ہم نہ کہتے تھے

اس کے بعد جوشش صاحب انسانی معاشرتی خرابیوں کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں علماء دین کے ظلمت کدوں کا ذکر بھی فرماتے ہیں کہ

چوں ز ظلمت می روند آں کار دیگر می کنند

علما جو عوام میں پاکیزگی اور طہارت کی علامت بن کر ظاہر ہوتے ہیں اپنی خواب گاہوں میں رہبن بازاری کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اسی کے ساتھ جوش صاحب ہمارے معاشرے کی مختلف رسوم پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک قصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑکا اختر ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ لڑکی مذہبی گھرانے کی تربیت یافتہ ہوتی ہے اور باوجود اختر سے محبت کرنے کے جب ماں باپ اس کی شادی ایک دیندار شخص سے کر دیتے ہیں تو

لڑکی اختر سے ملنا جلنا ترک کر دیتی ہے۔ کیسے موقع پا کر اختر لڑکی سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو لڑکی یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیتی ہے کہ

شادی کے بعد دل کو محبت کا حق نہیں

(مگر اختر پُرجوش اور بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیتا ہے)

کیا کہا دل، اور جو دانندہ رسم و رواج
قلب سے حق محبت چھین لے اور ازدواج
ازدواج انساں کے دور اہلیت کا شعار
ازدواج ایام وحشت کی ہمیں یک یادگار
جیسے میدان طلب، قحط دیار جستجو
جیسے روح تمنا قبر دل آرزو
خستگیٔ عشق و اضمحلال شوق حد گام
مقتل جذبات، بوسس مرگ سوز ناتمام
ایک قرب دائمی بیگانہ روان فصل
لذت ہجراں سے خالی اک مسلسل کرب وصل
اک مقیدہ سعت رو آلودہ طوفاں کے بغیر
اک فریبہ مضمحل ارمان عصیاں کے بغیر
الاماں یہ بدمزہ بے کیف شادی کا چلن
اک بدھا پانی سے اک چکنا ہوا رعنت کفن
جس میں یوں لپٹے ہوئے دو جسم رہتے ہیں سدا
بیشتر جو موت سے پہلے نہیں ہوتے جدا
ہڈیاں چبھتی ہیں گو اک دوسرے کے جسم کی
عمر بھر حاصل نہیں ہوتی ہے لیکن تلخی
کیف تبدیلی سے جو ہوتے نہیں دنیا دوچار
قبر یکسانی و یکسانی میں دیتا ہے فشار

مشعلِ حسن و جوانی کو بجھا دیتا ہے جو
حسن و انداز کی تعمیر ڈھا دیتا ہے جو
بام و در اپنی سے عورت کو گرا دیتا ہے جو
خانۂ شوہر کا فرنیچر بنا دیتا ہے جو
دید کی اور لیبیں سے دل کو بھر دیتا ہے جو
حسن کے اجمال کو تفصیل کر دیتا ہے جو
آج یہ سو فیصدی بچے جو نابینا ہیں
قربتِ بالجبر کی دراصل پیداوار ہیں

اس طرح معاشرے کے مختلف اداروں پر تنقید کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مذہب کے توسط سے جو خدا کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ نہ قادر مطلق ہے اور نہ عالم کل ہے کیونکہ اس کی خواہش کے علی الرغم انسان شرف انسانیت سے بہرہ ور نہ ہو سکا۔ پھر تصور الٰہ کی مختلف منازل اور مدارج سے بحث کرتے کرتے کہتے ہیں کہ خدا کا تصور انسانی علم اور ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ مختلف منازل سے گزرتا ہوا وحدت کے تصور تک پہنچا۔

اور پھر بھٹی میں یہ سارے خدا ڈالے گئے
کسے واحد کی شکل میں ڈھالے گئے
اور مسلط ہو گیا دنیا پہ وحدت کا دروغ
اور ہا الشرکۃ اصنام یزداں کو فروغ
جس کو تو اللہ کہتا ہے سن اے مردِ خدا
نام ہے وہ تو کروڑوں خالقوں کے حلف کا
ایک دانا نے تراشا ہے اسے ہر بشر
وہم کے لاکھوں کروڑوں آئینے توڑ کر
اب تو اے شیطاں یقیں آیا خدا کچھ بھی نہیں
ایک پرانے وہم باطل کے سوا کچھ بھی نہیں

کل تھا جس صورت سے بندوں میں سنگ بت
ہے یوں ہی تیرا خدا بھی آج رب کائنات
وہ بھی تھا اک کار ناداں اور یہ بھی کار ہے
پہلے بھی سنگ تھا اب دہر اب اللہ ہے
ان تمام اسماء میں ہے اوہام کی صورت گری
فرق اتنا ہے وہ کل کی بات تھی یہ آج کی

اس کے بعد جوش صاحب کہتے ہیں کہ یزداں اور ابلیس چونکہ ذہن تخیل بشری کے تجزیہ ہیں اس لیے اب عقل انسانی دونوں کو تسلیم نہیں کرتی اور اس طرح مقصد ابلیس و یزداں متحد شد کہہ کر یہ باب بند کر دیتے ہیں لیکن وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ذہن انسانی اپنے محدود حواس کی بنا پر جب بھی کسی شے کا ادراک کرتا ہے تو اس کو مثالی سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے انسان خواہ کتنا ہی عقلمندی کا دعویدار کیوں نہ ہو اگر کسی وجود کو ذہن میں مشخص کر کے اس کو کوئی نام دے گا تو وہ حقیقی خالق کائنات نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی محدود قوت متخیلہ کا تراشا ہوا بت ہو گا بقول غالب

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اور چونکہ لامحدود کا تصور محدود ذہن انسانی کے لیے محال ہے اس لیے ہم اس کو صرف قوانین فطرت اور اصول قدرت ہی کے توسط سے جان سکتے ہیں۔ جو اس کائنات میں حیات کی صورت گری میں محسوس کی جا سکتی ہے اور جو تبدیلی اور ارتقاء کے ذریعے سے ہر لمحہ ایک نئی شان میں جلوہ گر ہے۔ جس کی بے پناہ طاقت مادے کے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے چنانچہ جب یہ مادی ارتقاء اس کرہ خاکی کو اپنی جولانیوں کے لیے منتخب کرتا ہے تو کس طرح اپنے اظہار کے لیے مختلف روپ اختیار کرتا ہوا حیات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جوش صاحب نے نہایت تفصیل سے اس ارتقا کو بیان کیا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے۔ ارتقاء یہاں سے کتاب کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔

ارتقا

رنگ و بو کا یہ ستارہ جس میں ہے یہ ریل پیل
یہ کرہ یہ آب و گل کی کارگاہ ہست و بود
رقص میں کب سے ہے یہ رقاصۂ جادو ادا
محو کیا ہے اس تماشا گاہ بود و باد کی
یہ مہ و خورشید یہ سیارگان ہفتمیں
ایک ہی حلقے میں رقصاں تھے یہ سب آتش جمال
گرمی رفتار سے لیکن یہ بزم اتفاق
شعلہ رو تھے سے جدا ہو کر پریشاں ہو گئے
اور پریشاں ہو کے ٹکرا کے تباہ و خم کھانے لگے
مہر کا زور کشش یوں ناز جھٹکانے لگا
اور ہمارا یہ ستارہ بھی بہ شوق آب و گل
الاماں والحفیظ اس دور آتش کا سماں
ارض تھی بحر خلا میں ایک انگاروں کی ناؤ
ایک ہیبتناک بھٹی تھی خلا کے درمیاں
بحر آتش سے خود پنا گریباں پھاڑتی
دھوں دھاں دھاں گم گم گرد و غبار و غرغراہٹ شائیں شائیں
الاماں یہ سخت آوازیں تھیں اور ارض عقیم
یورش صدمت سے حالت تھی چٹانوں کی تباہ
دھات کے پگھلے ہوئے دریا تھے بہتے ہوئے
یہ زمیں تھی نام دوزخ ہر نفس جھلتی ہوئی
گو بھی اسٹیم ، سنتی ہوئی چنگاریاں
پتھروں کی بھی پگھلی ہوئی گندھک کا جوش
کانپتے شعلوں کی لرزش کپکپاتی لو کا دم

زندگی کا جس میں کھیلا جا رہا ہے کب سے کھیل
قبل از پیدائش تھی ہے جس کا وجود
ذہن میں آتا نہیں اندازہ ماہ و سال کا
غور کرتے وقت دک جاتی ہے سانس اعداد کی
اور اسی کے ساتھ یہ گردندہ و غلطاں زمیں
جس کے گرداگرد تھا رقصندہ اک شعلوں کا جال
پل میں برہم ہو گئی کچھ یوں چھٹکا صور برق
پھول گھستے ہیں جتنے تھے پریشاں ہو گئے
گرد مہر ناز پرور ناچنے گانے لگے
کوکبوں کا جتھہ رم رقص فرمانے لگا
بن گیا دوش خلا پر اک وجود مستقبل
آگ تھی صرف آگ پانی کا نہ تھا نام و نشاں
ایک آتش بار مجمع یک دہشتناک
شعلہ جنباں و آتش پرور و دوزخ فشاں
گونجتی ، بلتی ، لڑھکتی ہوئی چنگاریاں
سنسناہٹ دھڑ دھڑاہٹ گڑگڑاہٹ شائیں شائیں
سنگ ریزے تھے حقیر اور خاک پارے تھے عظیم
سینہ گیتی سے اٹھتے تھے بخارات سیاہ
آگ سے لوہا تھا پانی اور پتھر موم تھے
کانپتی ، جلتی ، دندکتی ، کھولتی تپتی ہوئی
کپکپی ، جھنگے ، دھماکے ، زلزلے ، شعلے ، دھواں
آتشیں لاوے کے فوارے چٹانوں کا خروش
سرخ انگاروں کی ہلچل حد آپس کا ادھم

کھولتے اجزائے گیتی کی بھیانک مستکیاں
ہو اس دود و دھاں سے باہزار اضطراب
دیدہ کرتا گرم پرچھوں سے زمیں کو پاش پاش
چیختی بھنتی ۔ ابلتی ، گونجتی گلتی رہی
سست گامی کی بدولت ٹھوکریں کھاتی رہی
جب ہوا پیدا مزاج نار میں کچھ اعتدال
ہو پھر آہستہ آہستہ ، کہ تھے آہنگ سے
جس سے پھوٹا چشمۂ گرم فطرت خوش آب
خود کو آب تیرہ کی رفتار میں کھونے لگے
رفتہ رفتہ سینۂ گیتی میں دل بننے لگا
اور پھر سینے سے ٹھنڈی ہوائیں مس ہوئیں
آب و آتش میں بہم سرگوشیاں ہونے لگیں
اور تدریجاً یوں گھٹتی رہی بے مہر آگ
آگ مرتے ہی گھٹائیں بال بکھرانے لگیں
بدلیاں بنتی چٹانوں کو ہوا دینے لگیں
یک بہ یک طرح طرح صد ناز و ادا پڑنے لگی
ہو گیا فطرت کا دل مرغوب خوشی سے باغ باغ
اور برسنے لگے ، ٹھنڈی ہوا چلنے لگی
گنگناتے پیچ و خم کھاتے ہوئے دھارے چلے
اور موج بادہ باراں ہو گئی مشغول کار
جو کے دھانوں کو خراشا سبزوں کو پھوڑ کر
سطح پر لا کر جمایا جو ہر صد زشت و خوب
دوش سے بال غنیمت جمع کرنے کے لیے
سوئی ذرات سے بھرنے لگی جیب زمیں

دور تک ، کب ہول پرور جنبش دود و دھاں
سرخ گردوں کو جھکا کر باز افشاں آتشیں
سینۂ گیتی کے شعلوں کو رہا سے چاٹ کر
یوں ہی لاکھوں سال بیچاری رہی جلتی رہی
وقت کی لاانتہا وسعت میں چکراتی رہی
مائل رہی ہوا طرفہ آتش کا بطن
پھوٹ نکلے کھولتے سوتے بطون سنگ سے
آگئی بدلے رہی پر اک نوکھی آب و تاب
پستیوں میں سرخ ذرے دلنشیں ہونے لگے
آب کا گلنا پہیہ سبز گل ہے لگا
مسکراتے پتھروں پر بوٹیاں پلنے لگیں
بوندیوں کی گود میں چنگاریاں سونے لگیں
ہنس کے پھولوں کی بیاض ہوئی قدرت سے رنگ
شادیانوں کی صدا میں چرخ سے آنے لگیں
دل کشی سے ندیاں انگڑائیاں لینے لگیں
تیرہ تاروں میں سمندر کی بنا پڑنے لگی
بن گیا گردوں رقیق انقلاب گیتی تر و خشک
چکر گیتی میں تبدیل ہوا چلنے لگی
آگ کے سینے پہ پانی کے خنک آرے چلے
سنگ کو کاٹا اس کو چھانٹا اس کو رگڑا بار بار
سنگ ریزوں کو تراشا پتھروں کو توڑ کر
سخت چیزوں کا بنایا جزم اشیا کا ریوب
بستیوں کی سمت طوفانی دھڑے چل پڑے
سرخ تخلیق میں آنے لگی سالک مبیں

مدتوں دنیا رہی آشفتہ حال و سینہ چاک
اور پھر بحرِ حیات آور نے آکر جوش میں
تختۂ کاہی کو بالآخر جامِ کوثر دے گیا
اور پھر آئیں بلائیں کاروں در کاروں
برف گرتی تھی بلائے آسماں کی طرح
پتھر کے تودوں کی بھی بستی تھی میدانوں میں پیاڑ
ہو کے جشنے گرا کرتے تھے پیہم دھاتیں دھاتیں
بجلیاں گرتی تھیں چٹانوں پر کڑک کر بجلیاں
خند خو طوفان آتے تھے اور تھے مقتل
ژالہ باری کے دھماکے تھے چٹانوں پر صبیب
قرمت خورشید دھر تھی اک بلائے بے اماں
ہر نفس اک دلزلہ اک سیل اک طوفان تھا
الغرض دنیا جب خوش تھی سراب آرام میں
کم سی اور کم سی میں یہ بلائیں ہوں کہ
ایک تھے دکھیا رہیں کے واسطے قہر و کرم
الغرض تابید اور سرما دونوں تھے
اپنا طوفانی سفر الغرض کھینچ رہی
صبر لیکن مدتوں کے بعد کام آ ہی گیا
آرزو دل کی بر آئی سینکڑوں قرنوں کے بعد
آب و آتش کو سمو دیا وقت کی رفتار نے
عارضِ مشکیں کی تابش میں تحرزں کھو گیا
ہو گئے طوفاں گزیدہ بحر و بر شاداں بحال
مژدۂ ہستی لیے صبح صبیب آنے لگی
اور پھر اس دلفریب و دلنشیں انداز سے

تب کہیں جا کر فراہم ہو سکے اسباب خاک
نو عروسِ سبز جاکر اس کو لے لیا آغوش میں
بحر کیا پایا، عروسِ سبز خاک کو بدل گیا
برف باری ہو رہی سیلاب سرسر آ رہی
اور برس پڑتی تھی بعض وقت پانی کی طرح
یوں گرجتی تھیں گھٹائیں چیخ اٹھتے تھے پہاڑ
برق و تھکڑ چلا کرتے تھے دن بھر سائیں سائیں
سرخ نو بن کر نکل پڑتی تھی پتھر کی رگیں
کانپتا رہتا تھا تو مولود کہساروں کا دل
بولتے تھے ہر قدم پر شاہ طوفاں کے نقیب
اور ادھر بپھرے عناصر کی صدائیں گونجیں
کک گرج اک گونج اک ہنگامہ اک ہیجان تھا
پہلے بھی میں تھی مضطرب بھنور کے دامن
آگ سے کل یہاں تھی تیرہ پانی سے بلاک
کل تھے، آگ کے مقام آج اندر کے حم
کل تو اس کا قہر تھا اور آج اس کے مرے
ارض قرنوں کروٹوں پر کروٹیں لیتی رہی
تیرہ شب کو روز روشن کا پیام آ ہی گیا
رک گئیں طوفاں کی صفیں تھم گئی آندھی
سانس لی راحت کی پہلی مرتبہ سنسار نے
دیو جنبش نے کر کھولی تلاطم ہو گیا
یوں عناصر میں ہوا پیدا تمہاں اعتدال
تازگی نے اور خوشی چھیڑ دیں گانے لگی
خاک سے پودوں نے سر اپنے نکالے بڑھے

اور پھر سبزے کی جنبش سے زمیں لہرا گئی
اور پھر کچھ تخم کے اندر ایک موج سرخوشی
خاک سے انگڑائی لے کر اپنے جثے کو چھوا
زندگی کی خود جنبش سے ملی روح نمود
کوپلیں بن بن کے پھوٹے ماکداں سے کھلے
کلیوں کی نبضیں بھی زیر تحکماں چلنے لگیں
دہر کے تاریک گوشے تک معطر ہو گئے
زندگی کیا دولت بیدار ادراک و حواس
زندگی موج شعور و جلوہ دانش زندگی
خسرو گردوں گرداں شاہ گیتی زندگی
خلد پرور خلد پیکر خلد افشاں زندگی
منتشر تاریخ دنیا کی موثر زندگی
زندگی سالار بحر و بر اسیر برق و باد
میر عالم فاتح پیدا و پنہاں زندگی
غرض سب زندگی کا کارواں چلنے لگا
اور بحر میں چلتا رہا بڑھتا رہا
بحر سے نکلا تو بحر بے کراں بن کر چلا
جتنا قدرت سے شکست و ریخت کا منظر بڑھا
ہر نفس، ہر آن بام اوج پر چڑھتی گئی
اور بالآخر ہر طرف تھی زندگی ہی زندگی
کتنے قرنوں میں بڑھا یہ کارواں زندگی
عقل پر اوہام کے ہاتھوں نے اتنا جور کر
موج تو کس منزل طوفاں سے آئی ہے حیات
کتنی قاصد در کھیروں کو ہے توڑے ہوئے

اسس سناٹے کی مسیں بھیگی جوانی آ گئی
قلزموں میں زندگی کی اور جنبش ہوئی
آئی سطح بحر سے سیلاب خوابی کی صدا
اور لیں مضراب سے لرزاں ہوا تار وجود
کچھلیوں کی شکل میں بحر اور دے بحر کے
پانیوں پر سانس لیتی کشتیاں چلنے لگیں
زندگی کی سانس سے مہکے معطر ہو گئے
زندگی آواز اشارہ گیت آگاہی قیاس
سیل احساسات و طوفاں گاہ جنبش زندگی
زندگی، تابندگی، رقصندگی، رخشندگی
تند طوفانی عناصر کی روانی زندگی
دین کے رنگیں صحائف کی مصنف زندگی
دہر کا دل خاک کی سرمج فطرت کی مرد
کردگار اشیاء خالق یزداں زندگی
اور کتنی شکلیں سنے اجسام میں ڈھلنے لگا
اور پھر آہستہ آہستہ زمیں پر آ گیا
پاؤں رکھتے ہی زمیں پر آسماں بن کر چلا
زندگی کا قافلہ مرحلہ اتنا ہی بڑھا
جس قدر قدرت سے وہ لڑتی گئی بڑھتی گئی
کچھلیاں حشرات طائر چار پائے آدمی
سانس اکھڑ جاتی ہے اس تفسیر سے تاریخ کی
خود کو دیکھیں میری کاوشوں پر خود کر
کتنی موتوں کو کچل کر مسکرائی ہے حیات
اور کتنی کتنے طوفانوں کی ہے موڑے ہوئے

کتنی ہچکی کے اندر پانی ہے راہ نجات
کتنے میداں تھے جہاں گر گر کے ٹھہری ہے حیات

کتنی اندھی طاقتوں سے کس قدر دکھ پائے ہیں
کس قدر سفاک قدرت کے طمانچے کھائے ہیں

بتدریج منزلوں کی ہے پر و بال کو دیکھ
قبر تک مادے کی ہمت حال کو دیکھ

قدرت جبار کا بھی خشک ہوتا ہے لہو
مادے کے فاتحانہ ولولوں کی روبرو

روح کے دھوکے میں عاقل کو نہ آنا چاہیے
مادے کا ذہن میں پرچم اڑانا چاہیے

آخری تین اشعار کے متعلق نعمت اللہ خاں نے کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین اشعار اس پوری نظم میں پیش کردہ تصور سے مختلف نظریہ پیش کر رہے ہیں۔ یہاں روح اور مادے کو دو الگ الگ وجود تصور کر کے روح کا انکار اور مادے کا اقرار کیا جا رہا ہے جبکہ اس تمام نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ مادہ تو صرف ایک توانائی مطلق کا صفاتی لباس ہے جس کے ذریعے سے وہ ہر آن نئے روپ اختیار کرتی اور ہر لمحہ نئی شان میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے۔ مادہ تو ہر آن نئی شکل تبدیل کرتا رہتا ہے جبکہ توانائی ہر منزل پر اپنے وجود کا اثبات کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ارتقا کی ہر منزل پر مادی لباس بدل جاتا ہے مگر توانائی مطلق ناقابل تغیر ہے۔ مادی اشکال کی تبدیلی سے ظاہری صفات بدل جاتی ہیں جیسے پتھر کی صفات پانی کی صفات سے مختلف ہیں۔ پانی کی صفات سے بو کی صفات مختلف ہیں۔ پودوں کی صفات سے حیوانوں کی صفات مختلف ہیں وغیرہ۔ مگر ان اشکال اور ان کی صفات کی تبدیلی سے توانائی میں جو ہر وجود میں موجود ہے کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور جس کو جوش صاحب نے اوپر کے اشعار میں حیات کہا ہے وہ دراصل وہی توانائی ہی تو ہے جس کو روح بھی کہتے ہیں۔

سوچ تو کس منزل طوفاں سے آئی ہے حیات
کتنی موتوں کو کچل کر مسکرائی ہے حیات

اور یہاں موتوں کو کچلنے سے مراد مادی پیکر کی تبدیلی ہی تو ہے پھر مادے کو حقیقت اور روح کو دھوکا کیسے کہا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا یہ بہت اچھا نکتہ تم نے نکالا ہے۔ اس پر خود جوش صاحب سے گفتگو

کرتے ہیں۔ چنانچہ جب دوسرے دن ہم جوشش صاحب کے گھر گئے تو ان کی توجہ اس جانب مبذول کروائی تو کہنے لگے تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں اس پر ضرور نظر ثانی کروں گا اور سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں اس میں ترمیم کروں گا۔ میں نے عرض کیا کہ طبیعیات کی جدید تحقیقات نے مادے اور روح کے فرق کو ختم کر کے ایک توانائی مطلق کا تصور پیش کیا ہے اور "ارتقا" کوئی موجود بالذات وجود نہیں ہے بلکہ پسندیدہ اور تعمیری تغیر کے لیے انسانی عقل نے فکر سے عطا کردہ ایک قدر ہے۔ ہر تغیر کو ارتقا نہیں کہہ سکتے چونکہ ہر تغیر توانائی مطلق کے اظہار کا آئینہ دار ہے اور وہ تمام تغیرات جن کا آپ نے اس قدر تفصیل سے اس نظم میں ذکر کیا ہے دراصل یک توانائی مطلق کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرتے ہیں جبکہ ہر تغیر مادے کی بے ثباتی کا شاہد ہے۔ جوش صاحب نے کہا۔ تم بالکل درست کہتے ہو یہ نظم دراصل اس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جبکہ سائنسی تحقیقات توانائی کی ماہیت کی دریافت میں اس مقام تک نہیں پہنچی تھیں جس مقام پر وہ آج ہیں۔ میں ضرور ان اشعار پر نظر ثانی کروں گا۔ مگر نہ معلوم انہوں نے پھر اس میں کوئی تبدیلی کی یا نہیں کیونکہ پھر میری نظر اس کتاب پر نہیں پڑی اور اب تو مجھے امید نہیں کہ وہ کبھی منظر عام پر آ بھی سکے گی۔

مگر یہ طویل منظوم ڈرامہ جس آخری نظم پر ختم ہوتا ہے وہ اس قابل ہے کہ آج بھی ہر انسان اس میں دیے گئے پیغام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے۔ چنانچہ اسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "ارتقا کا اعلان" یہ آج انسان کی ترقی کی آخری منزل تو ہو سکتی ہے لیکن کل جب انسان اس منزل پر پہنچ جائے گا اور پھر کہے گا کہ "ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب" تو اس وقت کا غالب یا جوش اس کی رہنمائی کسی منزل کی طرف کرے گا اسے ہم مستقبل کے حوالے کر کے آج کے جوش کے ارتقا کا اعلان سنتے ہیں۔

ارتقا کا اعلان

جوانو وہ تم ہو کہ بلندیاں بڑھے چلو بڑھے چلو
یہ سلام تک چلا وہ آسماں بڑھے چلو بڑھے چلو
فلک کے ٹوٹ گرے ہوئے وہ پاسباں بڑھے چلو بڑھے چلو
یہ راہ ہے وہ مہر ہے یہ کہکشاں بڑھے چلو
لیے ہوئے زمین کو کشاں کشاں بڑھے چلو

تمہارے زیر اقتدار کاہ مہر و ماہ ہے
تمہاری ذات اصل میں الوہیت پناہ ہے
تمہارا دل رسول ہے تمہارا ذہن اللہ ہے
بس اک نفس کی دیر ہے بس اک قدم کی راہ ہے
ستارہ بار و مہ چکاں و خور فشاں بڑھے چلو

ابھی یہاں نہ حور ہے نہ خلد بے عدیل ہے
نہ غازیوں کے جھنڈے میں بانگ جبرئیل ہے
نہ سیم و زر کے قصر ہیں نہ موتیوں کی جھیل ہے
نہ لوح آب و رنگ ہے نہ موج سلسبیل ہے
ہنوز دہر کا نقش ہے خاکداں بڑھے چلو

تمہاری جستجو میں ہیں رواں جہاں پناہیاں
فلک کی شہریار یاں زمیں کی کج کلاہیاں
تم اور لہاظ ہے دل پہ دل شکن جاہیاں
ہر اک قدم پہ ہیں تو ہوں تباہیاں سیاہیاں
تباہیوں سیاہیوں کے درمیاں بڑھے چلو

ابھی تو دست آدمی میں تیر ہے کمان ہے
زمیں ابھی لڑائیوں شرارتوں کی کان ہے

ابھی تو طفلکِ حیات نو برس کی جان ہے
مزاج چھوٹی عمر ہے دماغ دھان پان ہے
سمجھ ہوئی ہے زندگی ابھی جواں بڑھے چلو

ابھی نشاں نہیں ملا ہے منزلِ نجات کا
ابھی تو دن کے ولولے میں وسوسہ ہے رات کا
ابھی پیا نہیں ہے دل نے جامِ حیات کا
ابھی پتا چلا نہیں ہے سر کائنات کا
ابھی نظر نہیں ہوئی ہے رازداں بڑھے چلو

وہ مرمریں ہے یہ فرش ہے وہ دام یہ خیال ہے
نہ وہ کشادہ دام ہے نہ یہ حصارِ جال ہے
نہ وہ بڑا شگون ہے نہ یہ فراست فال ہے
تمہاری رہ روک لے کسی کی یہ مجال ہے؟
زمیں ہی سنگِ رہ ہے نہ آسماں بڑھے چلو

زمیں کے طول و عرض پر ہیں غم کی قہرمانیاں
چھڑی ہوئی ہیں دہر میں وبالوں کی کہانیاں
مثلِ الدوام کھل رہی ہیں زیست کی کتابیاں
ہوئے زندگی پہ ہے اجل کی فکر نیساں
حیات ابھی نہیں ہوئی ہے جاوداں بڑھے چلو

ابھی تو خاک کی کلی چٹک کے مسکرائی ہے
زمیں پہ لیلیٰ خودی ابھی تو گنگنائی ہے
ابھی تو فرشِ خاک پر حیات رسمسائی ہے
ابھی تو اس زمین پر خدا ہی کی خدائی ہے
ابھی تو تم پہ عظمت کا ہے گماں بڑھے چلو

گلوں میں اور خار میں خزاں میں اور بہار میں
فضائے لالہ رنگ میں ہوائے مشک بار میں
فروشش برق و رعد میں سرود آبشار میں
ازل کے دن سے آج تک بشر کے انتظار میں
کھڑی ہیں کائنات کی جوانیاں بڑھے چلو

ابھی تو قصر زندگی کی نیو ہے حساب پر
نہ سکہ سطح خاک پر نہ مہر موج آب پر
نہ حلقہ پائے وقت میں نہ قبضہ ہے شباب پر
نہ پاؤں ماہتاب پر نہ ہاتھ آفتاب پر
ابھی تو آسمان پر ہے کہکشاں بڑھے چلو

آج انسان نے پاؤں ماہتاب پر تو رکھ دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہاتھ کب آفتاب رکھتا ہے۔

قریب ختم راست ہے رواں دواں سیاہیاں
سفینہ ہائے رنگ و بو کے کھل رہے ہیں بادباں
فلک دھلا دھلا سا ہے زمیں ہے دھواں دھواں
افق کی نرم سائلی سیاہیوں کے درمیاں
مچل رہی ہیں زندگی سرخیاں بڑھے چلو
... بڑھے چلو

اور اس طرح انسانیت کی اس کے شاندار اور اس کی عظمت کے شایان شان مستقبل کی طرف رہنمائی کر کے یہ طویل منظوم خطبہ جس کو جوش صاحب نے "حرف آخر" کا نام دیا ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے اس جانب بھی جوش صاحب کی توجہ مبذول کروائی تھی کہ انسانی ارتقا کے سفر میں کوئی فکر "حرف آخر" نہیں ہو سکتی۔ آج کے ذہن کا حرف آخر کل کی فکر کا حرف آغاز ہو سکتا ہے۔ اس لیے کسی خیال یا نظریہ کے متعلق یہ کہنا کہ یہ حرف آخر ہے خود نظریہ ارتقا کی نفی کرنا ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ یہ تو تم بالکل درست کہہ رہے ہو کہ

کوئی انسانی فکر حرفِ آخر نہیں ہو سکتی مگر ہر زمانہ کی نسبت سے جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں نمودار ہونے والی فکر کو اس دور کی حد تک حرفِ آخر سمجھا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ ہم بھی ہم جدید فکر تو کہہ سکتے ہیں مگر حرفِ آخر کا حکم نہیں لگا سکتے۔ میں نے کہا کہ اب آپ تصورِ الٰہی کو لے لیجیے ہر دور میں انسانی ذہن کی رسائی کی حد تک خارجی مظاہرِ قدرت سے اپنے زمانوں میں انسان کے الٰہ بنتے رہے ہیں۔ سورج، چاند، دریا، سمندر، طوفان، درخت، پتھر وغیرہ۔ اور ہر دور میں ان بتوں کو آخری حقیقت ثابت کرنے کے خود پر ہوا گیا مگر ہر بت دراصل علم کے خزانے کا ایک قفل ثابت ہوا جو انسانی تجربات تحقیقات اور اپنے دور کے جدید ترین علوم کی کنجیوں سے کھلتا رہا اور اس بت کے ٹوٹنے یعنی اس قفل کے کھلنے کے بعد جو علم کے خزانے دریافت ہوئے اور جن کی وجہ سے ذہنِ انسانی نئے نئے حقائق سے آشنا ہوتا گیا تو قدیم نظریات بھی بدلتے گئے اور انسانی علم ترقی کے مدارج طے کرتا رہا اور یوں ہر دور کی فکر کا حرف آخر نئے دور کی فکر کا حرفِ آغاز بنتا چلا گیا۔

غالب نے ایک شعر میں اس مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حسن مطلق یا توانائی مطلق اپنے ظہور کے لیے صفات کا جامہ زیب تن کرتی ہے تو جگہ جگہ بدلتے قبا بھی تانک کر حسن معنی کو پوشیدہ کر دیتی ہے مگر جب علم انسانی ہر بند قبا کھولتا ہے تو اس میں پوشیدہ حسنِ معنی کی بوقلمونی سے اس کی نگاہ خیرہ ہو جاتی ہے۔ شعر یہ ہے:

بند قبا سے یار ہے فردوس کا خیال
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ اک عالم گلستاں ہے

اس شعر پر جوش صاحب یک دم چونک کر کہنے لگے کہ غالب کے اس شعر کو آپ نے جس مقام پر استعمال کیا ہے اس کی داد نہ دینا بڑی ستم ظریفی ہوگی۔ اس وقت تو غالب کی روح بھی وجد کر رہی ہوگی۔ واہ واہ سبحان اللہ۔

میں نے کہا کہ بند قبا کھولنے کی اصطلاح اس معنی میں آپ نے بھی تو کئی جگہ استعمال فرمائی ہے۔ مثلاً موجہ و منکر میں آپ نے کہا ہے کہ

انجم و اوزات کے بند قبا کھولے گئے
سانے تک ناپے گئے اور مکس تک تولے گئے

ایک اور جگہ اس سے بھی زیادہ کھل کر آپ نے کہا ہے،

تھک گئی ہستی مودب ہو گئے ارض و سما
شاہدانِ دہر نے وا کر دیئے بندِ قبا

تحقیق اور تفتیش کے ذریعے سے حقائق کائنات پر پڑے ہوئے حجابات کو اٹھانا دراصل بند قبا کھولنا ہی تو ہے۔ جیسے جیسے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہوتا جا رہا ہے، آخری حقیقت کے طور پر تسلیم شدہ نظریہ بھی بدلتا جا رہا ہے۔ اس لیے جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا کوئی فکر حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکے گی۔ اب آپ نے آخری حقیقت کے طور پر یہ اعلان فرما دیا کہ

روح کے دھوکے میں عاقل کو نہ آنا چاہیے
مادے کا ذہن میں پرچم اڑانا چاہیے

لیکن آج آپ کی سطحِ مشاہدہ بدلی اور آپ نے سائنس کی جدید تحقیقات کا مطالعہ فرمایا تو پھر یہ اعلان بھی کر دیا،

چلتا نہیں کچھ زورِ تہہ شاخی کا — حافظ ہے بس اللہ ہی بینائی کا
جب سطحِ مشاہدے کی بدلی تو کھلا — ہر مادہ مرکب ہے توانائی کا

تو آج کی سائنسی فکر نے مادے اور روح کی اس دوئی کو ختم کر دیا بلکہ روح کے قدیم تصور کو بھی بدل کر ترقی یا توانائی کا تصور پیش کیا ہے مگر ہم اس تصور کو بھی حرفِ آخر نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اقبال کا شعر

ہے عیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اور کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کبھی اس قابل ہو بھی سکے گا کہ وہ اپنی فکر کے نتائج کو حرفِ آخر کہہ سکے۔ جوش صاحب جو بہت غور سے میری باتیں سن رہے تھے اور میری تائید کر کے میری ہمت بڑھا رہے تھے، آخر میں فرمانے لگے۔ "خورشید علی خاں یہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یک یک لفظ سچ ہے لیکن آپ شاید روح اور مادے ہی میں الجھ کر رہ گئے۔ حالانکہ اس پوری نظم میں میں نے جو اصول پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ مادہ جب خود کو

"حرف آخر" کے طور پر پیش کر کے فکر انسانی کے ارتقا پر تحدید عائد کرتے ہیں وہ حرف آخر نہیں بلکہ "ارتقا" "حرف آخر" ہے۔ غالباً آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ اب اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہوں گا۔

"این سخن را فاش تر گفتن خطاست"

اتنے میں قریب کی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز سنائی دی تو کہنے لگے۔ موذن مرحبا بروقت بولا۔ تری آواز مکے اور مدینے۔ لو میاں وہ شعلے بدسیاہ غروب ہو چکا ہے۔ اب وقت ہو چکا ہے کہ بحث کی سنجیدگی کو عرق سے تلب کر دیں۔ اتنے میں اور احباب بھی آ گئے اور ہم دونوں بحال اجازت لے کر اپنے گھر آ گئے۔

۱۹۷۱ء کے واقعات

پرویز علی خاں کی کامیابی کی پارٹی

یہ واقعہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء کا ہے کہ میرے بیٹے پرویز علی خاں نے سرگودھا ایئر فورس کالج سے آخری امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ہم نے اس خوشی میں تمام خاندان والوں کی دعوت کی تو سب نے اصرار کیا کہ اس تقریب میں جوش صاحب کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا جائے۔ چنانچہ میں اور نعمت، جوش صاحب کے گھر گئے اور جیسے ہی ہم نے ان سے اپنی پارٹی میں شرکت کی درخواست کی وہ فوراً تیار ہو کر ہمارے ساتھ ہو لیے۔

سب احباب نے پرویز علی خاں کے ساتھ ساتھ جوش صاحب کو بھی پھول پہنائے۔ گل پوشی کے بعد جوش صاحب نے پرویز علی خاں سے مخاطب ہو کر ایک مختصر تقریر فرمائی پہلے تو انھوں نے پرویز کو امتیازی کامیابی پر مبارک باد دی پھر فرمایا کہ "آپ نے اپنے بزرگوں کی پیروی میں فوج کی خدمت اپنے لیے پسند فرمائی۔ اس میں شک نہیں کہ ہم پٹھان جب ہندوستان میں آئے تھے تو ہم نے بازو سے شمشیر زنی کے ذریعے سے یہاں اپنا مقام پیدا کیا تھا مگر اس دور کے طریقہ جنگ اور آج کے طریقے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے بزرگ میدان جنگ میں صرف اس دشمن سے لڑتے تھے جو ان کے مقابلے میں اسی کی طرح ہتھیاروں سے لیس ہوا کرتا تھا مگر آج مخالف ملک کی شہری آبادیوں پر فضائیہ کے ذریعے سے بم گرائے جاتے ہیں اور معصوم بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور پرامن انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ یہ عمل کسی طرح بھی شیوۂ مردانگی نہیں ..... میرے بیٹے! آج ہمارے سامنے جنگ کے نئے نئے میدان ہیں۔ سب سے بڑی جنگ تو ہم کو جہالت کے خلاف لڑنا ہے۔ پھر بے روزگاری، بیماری، بھوک افلاس، معاشی معاشرتی اونچ نیچ اور استحصال کے خلاف کثیر جہات

جنگ لڑتا ہے۔ نوع انسان کو ہر قسم کی ذہنی غلامی سے نکال کر اس کو مقام انسانیت عطا کرتا ہے اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر طاقت سے جنگ کرتا ہے مگر اس کے لیے پہلے آپ کو خود ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہونا ضروری ہے اس لیے خوب گھبرا گھبرا کر علم حاصل کرو۔ یہ بات بھی خوب یاد رکھو کہ کسی ملک کا تحفظ صرف اس کی جغرافیائی سرحدوں ہی کی حفاظت میں مضمر ہوتا حالانکہ یہ بھی سخت ضروری ہے مگر اس سے زیادہ ضروری بات اس مملکت میں رہنے والوں کی فکری علمی اور عقلی سرحدوں کی نگہداشت ہے۔ آج کا دشمن پہلے پراپیگنڈے کے ذریعے سے آپ کی فکری صلاحیتوں پر حملہ کرتا ہے اور اس کے ذریعے سے آپ میں داخلی انتشار پیدا کر کے آپ کے اتحاد کی طاقت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے اور آپ کو داخلی طور پر کمزور کر کے آپ کی قوت مدافعت کو ختم کر دیتا ہے اور اس طرح سے مقاصد حاصل کرتا ہے۔ ہم دشمن کے اس وار کا مقابلہ اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو مستحکم بنا کر ہی کر سکتے ہیں۔ یہ جو قدرت نے آپ کو اپنی شخصیت کی تعمیر کا موقع عطا فرمایا ہے اس کا ایک ایک لمحہ کارآمد بناؤ اور زندگی کے میدان میں ایک مکمل باصلاحیت سپاہی بن کر اس ایکاڈمی سے باہر آؤ۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔" جوش صاحب کی تقریر ختم ہوئی تو سب نے کھانا کھایا اور جب ناؤ نوش سے فارغ ہو گئے تو جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی۔ جوش صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ بلبل کیا پیش کروں یا موتا مال؟ پھر خود ہی فرمایا اچھا آج آپ لوگوں کو اپنی ہجرت کا کرب سناتا ہوں جس کو میں نے "ہچکیوں کا قطعہ" کہا ہے۔

سب نے ایک ساتھ کہا ارشاد ارشاد صرور سنائیے۔

جوش صاحب نے مجھ سے کہا، موتے مال کی بیاض تو دیکھیے۔ میں نے بیاض پیش کی۔ وہ نظم آپ بھی سنیے۔

ہچکیوں کا قطعہ

اب نہ دریا ہیں نہ گلزار چنار اور گرم
کوئی مونس ہے نہ غم خوار چنار اور گرم

اب نہ کھڑکیوں کے سمن زار چنا جور گرم
اب نہ پازیب کی جھنکار چنا جور گرم

اب نہ وہ عصر کا بازار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

تنگ گلیوں میں سلونی کی مجھری روتی ہے
شب کو بجتی نہیں رہ رہ کے گھڑی روتی ہے
آب رو تربت ماضی میں پڑی روتی ہے
سینۂ عرصۂ اجداد کھڑی روتی ہے

اب نہ وہ در نہ وہ دربار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

لکھنؤ کے وہ سلیقے نہ اودھ کے آداب
نہ عقب ہی کے وہ دریا نہ طرب کے گرداب
اب نہ جمنا کا وہ بچپن نہ وہ گنگا کا شباب
اب نہ وہ چنگ و دف و عود و طاؤس و رباب

اب نہ وہ کاکل و رخسار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

نغمۂ نغمہ میں نہیں زمزمۂ چنگ و رباب
دے سے دفتر بھی ہے افسردہ نہ دو بے آب
چشم فرزند میں بھی درد کے لاکھوں گرداب
دل پہ ہے شحنۂ ساقی بھی لیے فرد حساب

اور ہیگم بھی ہیں بیساختہ چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

آخری سے ہے خیالات کا کرنا دھیلا
سر ہے برسات میں بیٹھا ہوا کچا ٹیلا
رہبر حالت سے غیرت کا ہلا ہے ٹیلا
خیر سے روئے مقدس بھی ہے سیلا سیلا
تن بھی گرتی ہوئی دیوار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

پاؤں میں گردش پیہم سے ہیں آلے چھالے
دھوپ جس سے بیاباں میں بدن ہوں کالے
گرم سڑکیں ہیں کہ ہوں سے کہ دہوں بھالے
کیا مجھے گھور رہا ہے نہ ہے تانگے والے
بول ہاں تو بھی مرے یار چنا جور گرم

کوئی فقاد زباں ہے نہ ادا بیخ سخن
باد کی رو میں دیا برق کی رو پر خرمن
ذہن الجھ کر کہ کشاش میں ہے گھر و کفن
سڑ گئے دل کہ مری عظمت دیرینہ لن
پھر رہی ہے سر بازار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم

اب تو ہر سانس ہے اک معرکہ جد و حسین
خود طوفان عداوت ہے میان ثقلین
مجھ پہ حملے کے لیے فوج عدو ہے بے چین
میں کہ پیاسا ہوں جس نے مے عقل میں حسین

سب مشاہدات کے ہیں آئنہ چنا جور گرم
زندگی اسپ ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو بن گیا مجیدار چنا جور گرم

پاؤں میں رشتۂ پرکار ابھی کیا کہنا
سب افسردہ پہ اشعار ابھی کیا کہنا
دوش تخیل پہ کہسار ابھی کیا کہنا
سامنے ہے رسن و دار ابھی کیا کہنا

سر پہ چلتی ہوئی تلوار چنا جور گرم
زندگی اسپ ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو بن گیا مجیدار چنا جور گرم

راگ طوفان نے چھیڑا ہے ہا ہا ہا
وہ کیا فرد تھپیڑا ہے ہا ہا ہا
کیا دریچے پہ دریڑا ہے ہا ہا ہا
فرق ہونے ہی پہ بڑا ہا ہا ہا

موت کتنی ہے بھلی اس پار چنا جور گرم
زندگی اسپ ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو بن گیا مجیدار چنا جور گرم

اس کے بعد سب نے فرمائش کی کہ "گل بدنی" سنائیے۔ چنانچہ جوش صاحب نے اپنی مشہور نظم گل بدنی سنانی شروع کی۔

گل بدنی

کیا شعلۂ طور وہ اللہ غنی ہے
کیا لرزش تابندگی بیم تتی ہے
رشک مہ کنعاں ہے غزل غنچی ہے
افشاں ہے کہ آوارگی دو شکنی ہے

تمہیں میں ہیا فلک سے زلی ہے
کیا گل ہوئی، گل ہوئی، گل ہوئی ہے

ہر موجۂ انفاس میں وقت کی روانی
ہر لرزشِ مژگاں میں نئی خواب فشانی
ہر لوچ میں کھیلی ہوئی شاخوں کی کمانی
ہر بن میں پرستا کا برستا ہوا پانی

ہر بول میں اک چشمۂ شیریں کھلی ہے
کیا گل ہوئی، گل ہوئی، گل ہوئی ہے

ہلکا ہے یہ سینے پہ کہ اک موجِ حبابی
ہلکا کہ خنک صبح کی تصویرِ شبابی
ہلکا ہے کہ انسان کے سائے میں گلابی
آنکھیں ہیں کہ چھلکے ہوئے دو مست شرابی

ہاتھ کا خم دیکھ کہ سرو چمن ہے
کیا گل ہوئی، گل ہوئی، گل ہوئی ہے

زلفیں ہیں شبِ مالوہ، رخ صبحِ سنداں
ابرو ہے کہ اک چاپ، ترا ہے ہیں کہ طوفاں
غمزے ہیں کہ شمشیر، شبیہ ہے کہ پیکاں
صندل کی تراوٹ کہ ہتھیلی پہ گلستاں

کھڑے کی دمک ہے کہ چنبیلی بدن ہے
کیا گل ہوئی، گل ہوئی، گل ہوئی ہے

آواز میں ہے سلطنتِ زمزمہ خوانی
انداز میں ہے جنبشِ بزمِ دستانی
ہر ایک بن مو سے ابلتی ہے جوانی
تھکتی ہے سماعت سے کہ بھاپ سی روانی

اک چادر خوشبو ہے کہ آنگن میں تنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

گردن میں چمن بار کمانی میں ہے کنگن
کوزہ ہے جو پنڈا تو جمن خیز ہے بجن
جوبن ہے جوانی کے دھندلکے میں تو کمسن
بھری ہوئی چھلی ہے چھلکتا ہوا جوبن

گل رنگ شلوکا ہے قبا بادنی ہے
کیا گل بدنی گل بدنی، گل بدنی ہے

ہونٹوں پہ ہے مسکان کہ ہے رات کی رانی
نقش قدم نجم ہے یا تاج کیانی
کشتی کا تلاطم ہے کہ تو کار جوانی
ساحل کا خمستاں ہے کہ پوشاک ہے دھانی

بل کھا کی خنک چھاؤں ہے یا زلف گھنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی گل بدنی ہے

بل کھائی شوں میں ہے یہ پیشانی رخشاں
یا سایۂ قسمت میں ہے اک چشمۂ حیواں
ٹیکا ہے کہ ساگر میں جواں چاند ہے غلطاں
ماتھوں پہ یہ مکھڑا ہے کہ ہے دھل پہ قرآں

تل ہے کہ دھنوانی ہوئی ہیرے کی کنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

کس لوچ سے چونکی ہے دھڑکنے کو جگانے
الجھی ہوئی زلفوں میں دھواں دھار لبھانے
بن دھوئے سدوفال میں نیندوں کے خزانے
انگڑائی کی جھنکار میں ندی کے ترانے

دھند میں جھجکتی ہوئی اصل شکل ہے
کیا گل بدلی، گل بدلی، گل بدلی ہے

ناصح ہیں کہ اک فوج کھڑی لوٹ رہی ہے
تیرا ہے کہ پھاتی کو رہی کوٹ رہی ہے
جنبش ہے کہ پر بند پہ کرن ہلا رہی ہے
انگڑائی کا غم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے

کھڑا ہے یہ قامت پہ کہ مجرے پہ اتی ہے
کیا گل بدلی، گل بدلی، گل بدلی ہے

پہلو میں خموشی ہے شبستاں میں تکلم
خلوت میں تواضع ہے تو خلوت میں تحکم
حجرے میں ہے تکرار تو مجرے میں ترنم
مسند پہ تنک صبح ہے بستر پہ تلاطم

آغوش میں طوفان ہے گھونگٹ میں جنی ہے
کیا گل بدلی، گل بدلی، گل بدلی ہے

پہنچا ہے سرِ بام حرم دیر کا طوفاں
رقصندہ ہے پھر وہ صنم فتنہ دوراں
مغرب میں پکار آؤ کہ پھر کفر ہے جولاں
موہاف کے لچکے میں لپیٹے ہوئے ایماں

اب کے سے حوصلہ بدلی ہے
کیا گل بدلی، گل بدلی، گل بدلی ہے

اس سن میں بھی پڑتی ہیں چھلاوں پہ نگاہیں
اب بھی ہیں وہی شوق کی اگلی سی کراہیں
اب بھی یہ دعا ہے کہ ملیں کاکلِ سیاہیں
مر جائیں ہم اے جوش بتوں کو بدلنے چاہیں

گھٹی میں پڑی ہاشمی و برہمنی ہے
کیا گھٹی بدنی، گھٹی بدنی، گھٹی بدنی ہے

اس کے بعد جوشش صاحب نے کچھ رباعیات سنائیں پھر مجھ سے کہا کہ اب ہمارے انتقال کا وقت ہو گیا ہے ہمیں گھر پہنچا دو۔ جوش صاحب کے رخصت ہونے کے بعد سب لوگوں نے نعمت اللہ خاں سے فرمائش کی کہ وہ اپنے پسندیدہ شعر کا کلام سنائیں۔ نعمت کو جوش، فیض، حبیب جالب اور ساحر لدھیانوی کا بہت سا کلام یاد تھا اور ان کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ شعر کی روح میں اتر کر کلام پڑھتے تھے اور شعر کی تمام جذباتی کیفیت کو سامعین میں منتقل کر دیتے تھے۔ محفل نے حبیب جالب کی نظم "ایسے دستور کو صبح بے نور کو میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا" جس طرح پر تاثیر انداز میں سنائی کہ سب لوگ محو ہو کر ..... "میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا" کورس کے انداز میں کہنے لگے۔ غرض یہ محفل نعمت کی وجہ سے بہت دلچسپ رہی اور جوشش صاحب کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ہمیں افسوس کہ نعمت کے ساتھ یہ محفل آخری تھی۔

نعمت اللہ خاں جناح ہسپتال میں:

اس کے کچھ دنوں بعد ان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ جناح ہسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ جوش صاحب کو جب معلوم ہوا تو میرے ساتھ جناح ہسپتال گئے اور بہت دیر تک نعمت کے پاس بیٹھے رہے۔ اسی میں کچھ لڑکیاں جن کا تعلق کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات سے تھا، ایک سوالنامہ لے کر نعمت کے کمرے میں آ گئیں۔ وہ دراصل یہ معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ جن لوگوں کو دل کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے، ان کی گھریلو زندگی کیسی ہوتی ہے۔ ان کے کتنے بچے ہیں، ان کی آمدنی کیا ہے۔ وہ کس محکمہ میں کام کرتے ہیں یا ان کے کاروبار کی نوعیت کیا ہے۔ اگر شادی شدہ ہیں تو بیوی سے ان کے تعلقات کیسے ہیں؟ بہت سے سوالوں کے جواب ہاں یا نہیں میں تھے۔ جب وہ لڑکیاں نعمت سے سوالنامہ پر کروا چکیں تو جوشش صاحب نے کہا کہ کیا تم مجھ سے کوئی سوال نہیں پوچھو گی۔ میں تو پیدائشی دل کا مریض ہوں۔ میں نے ان لڑکیوں سے جوش صاحب کا تعارف کروایا تو ان میں سے ایک لڑکی جس کا نام

فرزانہ تھا اور جو دوسری لڑکیوں کی نسبت زیادہ پرکشش شخصیت رکھتی تھی جوش صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ جوش صاحب اگر آپ میں دل نہ ہوتے اور آپ کے دل میں ہر گل سے زخمی ہونے کی صلاحیت نہ ہوتی تو آپ اتنے عظیم شاعر کس طرح ہوتے اور یہ بھی تو آپ کی رباعی ہے۔

پہلو میں مرے دیدۂ پرنم ہے کہ دل
معبود یہ مقیاس جہنم ہے کہ دل
ہو ذرہ بھی کج تو بال پڑ جاتا ہے
یہ شیشۂ ناموس دو عالم ہے کہ دل

جوش صاحب انتہائی پرمسرت حیرت سے اس دبلی پتلی کا منہ تکنے لگے اور کہا کہ اتنی مشکل رباعی تمہیں کس طرح یاد رہی۔ میں نے تو آج تک اردو کے کسی استاد کے منہ سے یہ رباعی نہیں سنی۔ لڑکی نے کہا جوش صاحب! آپ میرے سب سے پسندیدہ شاعر ہیں اور میں نے آپ کا کلام ہمیشہ سبقاً پڑھا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔ پھر اس نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب نے چند رباعیات سنائیں جو ان لڑکیوں نے لکھ لیں۔ ان میں چند حسب ذیل ہیں۔

جس وقت یہ فیض فکر و عقل جواں — انسان ہے گا مجسمہ ناداں
مجھ کو نہ ملا تو اے نگار آفاق — بچ کر مری آغوش سے جائے گا کہاں

اس دھن میں کہ دل عقل کے شیدا ہو جائیں — آفاق کے اسرار ہویدا ہو جائیں
دست سے گرا رہا ہوں تخم افکار — شاید کہ نئے دانش پیدا ہو جائیں

قدرت سے کرے گی عقل اس نوع — ہو گا مرے فرزند کا دل دفتر و درج
شمس و قمر و نجوم و عرش و کرسی — کل میری ہو آئے گی لے کر یہ جمع

غرض کافی دیر تک جوش صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد لڑکیوں نے اپنی اپنی کاپیوں پر جوش صاحب کے آٹوگراف لیے۔ جوش صاحب نے فرزانہ کی کاپی پر یہ شعر لکھ کر

دھتکارکیے۔

متاعِ کفر لے یا سعادتِ ایماں
جلا شمعِ تحقیق ہر چہ باداباد

تقریباً دو ڈھائی گھنٹے بیٹھ کر جب ہم لوگ چلنے لگے تو جوش صاحب نے لعنت سے کہا بھائی تم جلدی تندرست ہو کر آ جاؤ ہماری محفلیں تمہارے بغیر سونی ہو گئی ہیں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ جوش صاحب نے ان سے کہا کہ جناب آپ ہمارے دوست کو گھر جانے کی اجازت کب دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ کل سے گھر جا سکتے ہیں بشرطیکہ گھر جا کر یہ ان ہدایات پر عمل کریں جو ان کو یہاں دی جائیں گی۔ ہم لوگ ہسپتال سے رخصت ہو کر پرنس روڈ آئے وہاں لسی کی ایک دوکان ہے جس کا نام دلدار لسی ہے۔ جوش صاحب کو یہاں کی لسی بہت پسند ہے۔ چنانچہ ہم دونوں نے وہاں لسی پی اور گھر آ گئے۔

۲۶ فروری ۱۹۷۸ کو جمعہ کے دن چونکہ مجھے ڈیوٹی پر جانا پڑا تھا اس لیے میں دن میں جوش صاحب کے گھر نہ جا سکا تو شام کو ان کا ٹیلی فون آیا کہ اسے میاں آج سارا دن تمہارا انتظار کرتا رہا تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے کہا جوش صاحب آج ایک خط آنے والا تھا اس لیے میری ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ جوش صاحب نے کہا کل ہفتہ کے دن اگر فرصت ہو تو شام کو آجاؤ ٹی وی اسٹیشن چلنا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن بروز ہفتہ ۲۷ فروری میں سہ پہر کو جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا اور ان کو لے کر ٹی وی اسٹیشن چلا گیا۔ وہاں جوش صاحب نے اپنی ایک طویل نظم "موجد و فکر" سنائی جس کو فلم لیا گیا۔ یہ نظم، ماہچ کو ٹیلی کاسٹ کرنے کے لیے فلمائی گئی۔ یہ نظم "الہام و افکار" میں موجود ہے لیکن یہ مسدس اس قابل ہے کہ اس کو یہاں نقل کیا جائے۔ اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ایجادات انسانی تہذیب اور تمدن کی بنیادی ضرورتیں پوری کرتی ہیں اور انسانوں کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرتی ہیں مگر موجد کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں مگر مفکر جو تہذیب انسانی کو شرافت، نیکی اور اخلاقی قدریں عطا کر کے محبت، اخوت اور اتحاد کا درس دیتا ہے اور

معاشرہ انسانی کو امن و امان خوشحالی اور پرمسرت زندگی عطا کرتا ہے۔ تاریخ انسانی کی بے مثال فراموش شخصیت بن جاتا ہے۔

موجد و مفکر

"موجد"

سنگ کر جب ہوئی طلوع شہاں کی سحر — جنگلوں سے شہر کی جانب بڑھی فکر بشر
بستیاں آمادہ بام چھتا قدق در — کشت خاک تیرے اگنے لگے شمس و قمر
خوشۂ حسن زمیں یوں ناز سے پکنے لگا
داب کر دانتوں میں انگلی آسماں تکنے لگا

ہر اشارے کو صدا بن کر نکھرنا آ گیا — پھر صدا کو لفظ میں ڈھل کر سنورنا آ گیا
لفظ کو آہنگ دے کر بکھرنا آ گیا — خاک صامت کو بالآخر بات کرنا آ گیا
لب ہلے تو کشتیاں چلنے لگیں اعجاز کی
فکر انساں کو سواری مل گئی آواز کی

شاہراہ عام ترشی بانگ نکلی شہر کی — روشنی کی موج نے اس بانگ میں افشاں چنی
تب افشاں جدوں تعیش میں ڈھل کر بنی — مشعلیں یوں جگمگائیں نیند شب چلنے لگی
ساز شب سے لے بنے صبح دم پیدا ہونے
بستیاں مزے لگیں گلیوں میں غم پیدا ہونے

آرزوئے خانہ آرائی کی شمعیں جل گئیں — کنزا کر صنعت نوخیز نے آنکھیں ملیں
طاقچے تعمیر سے ہیوتی لبالب ماہ و ملیں — سر پہ رکھ کر گنبدوں کے قمقمے ناچی رہیں
سنگ ریزے ناز سے ہنکے منارے بن گئے
کروٹیں بدلیں سے کچھ یوں میں کہ تارے بن گئے

۱۔ انسان نے رہنے کے لیے مکان تعمیر کیا
۲۔ زبان اور بولیاں ایجاد ہوئیں۔
۳۔ راستے اور گلیاں بنیں اور ان میں روشنی آئی۔

نشۂ انفراد کو مل جل کے رہنا آ گیا آدمی کو بین و نغمہ کی آنچ سہنا آ گئی
جذبۂ احساس میں پھولوں کا گہنا آ گیا وقت کے دھارے کو بالترتیب بہنا آ گیا
ناز سے زلفِ لطافت کی گرہ کھلنے لگی
پھول کے کانٹے پہ روحِ گل ستاں تلنے لگی

سر جھکایا جل نے پھر حلم کے دربار میں دائرے بننے لگے جنبش ہوئی پرکار میں
آ گئی روح نبوت سرحدِ گفتار میں سبزۂ آیات نکلا گلشنِ انوار میں
اور جب اس سبزے میں دریا کی روانی آ گئی
نوعِ انساں کی مسیں بھیگیں جوانی آ گئی

پھر بڑھی دنیا کو سر کرنے حیاتِ نوجواں بادہ بار و مشک ریزہ سر بزد سر پیکاں
پرفشاں جنساں جناں ہر سو رواں طوفاں دواں قلزمِ خوں شادماں ہراساں نوستدہ ہیں جوش جیاں
پتھروں کو پیستی شیشوں کو پگھلاتی ہوئی
کارخانوں کے دھوئیں میں پیچ و خم کھاتی ہوئی

خشک و تر کو جانچتی مرض و مسہل کو بھانپتی صبح کو کھڑکی دکھاتی شام کو منہ ڈھانپتی
لپلپاتی، چھنچناتی، لپلپاتی، کانپتی دوڑتی، بڑھتی، گھسٹتی، دندناتی، ہانپتی
ربط تکرار تکلم پر گاتی ہوئی
موت کو نیچا دکھا کر ناز فرماتی ہوئی

ناز سے جزو مکاں بن کر زماں گانے لگا چکیوں میں کارخانوں کا دھواں گانے لگا
مرغزے چھیڑے زمیں نے آسماں گانے لگا تاروں کا ذکر کیا خود آسماں گانے لگا
ہو چلے نوحِ جشر کے ناز فرمانے لگے
ہاتھ باندھے آسمانِ آتش کے خواص آنے لگے

ساعتوں کو کوک بھرنے ہی روانی مل گئی ہر دقیقے کو منظم پرفشانی مل گئی
گنگ لمحوں کو گہر کی طرح خوانی مل گئی عمر کے سونے کو لوہے کی کمانی مل گئی

۱؎ گھڑی کی ایجاد ہوتی ہے۔

سوئیوں کی رو میں لمحوں کو چمکتا آ گیا
وقت کو محراب آہن میں لٹکتا آ گیا

دیدہ و رخسار اور گوش و زباں کے درمیاں فاصلوں کی چھٹ گئیں مضبوط بایں ہو گئیں
یک بہ یک دریائے ہم آغوشی ہوا گویا رواں آ گیا کھنچ کر پتھر یک مرکز پر حواس
اور یوں آواز گرم قطع منزل ہو گئی
عکس کو بھی قوت پرواز حاصل ہو گئی

یک کروٹ ہی پھر ایسی عام بکاد ہے برف لپکی سرد کاندھے پر شرارے لاد ہے
نوبیاں بدلیں بصد دھماکے برق و باد نے موم کی گردن میں بایں ڈال دیں فولاد نے
جنگ جو اضداد میں صد مدار ہو گیا
درمیاں جام و سدھ بھال چار ہو گیا

شکل کے نکتہ ہائے شہر تک ہونے لگے سطح جیاں پہ تمدن کے گھر رہنے لگے
کم و بدوات کے بند قبا کھولنے لگے سانسے تک ناپنے لگے اور عکس تک تولنے لگے
عرش تک فرش مہیں کی ہیئت حال گئی
خط و شمس میں بل دے کر گرہ ڈال گئی

ذوق نکھرا، کھلکھلاتی ہام و در بنے لگے سنگ ریزے آئینے، قطرے گہر بنے لگے
برق پاسے موج ہائے نامہ بر بنے لگے آسمی اعصاب ڈھل کر بال و پر بنے لگے
زندگی اوج ثریا کی طرف جانے لگی
قلب، نبض کے دھڑکنے کی صدا آنے لگی

کھلکھلاں گئی، نظر چھونے لگی افلاک کو فکر بنانے لگی اجرام حیرت ناک کو
اور پھر گیتی کی جانب موڑ کر ادراک کو آدمی کہنے لگا ضربات نبض خاک کو

۱۔ نئے ل شان اور نئے ل لون کی ایجاد۔
۲۔ رف وی جریٹر کی ایجاد
۳۔ ریڈیو اور ٹیلیفون کی ایجاد۔

ذہن کی میزان میں تابانیاں تلنے لگیں
چاند اور سورج کی سوئیں کھلنے لگیں

پھر زمیں کی سمت موڑی یوں کہ اوں نے عناں — ارض کے طبقات کو آنے لگیں انگڑائیاں
طرز بانے خاک سے محو کے بنان پاستاں — ہڈیوں نے اپنے جسموں کی سنائی داستاں
تنگ غاروں میں ہوا آنے لگی پو پھٹ گئی
خفتگان خاک کے سر سے دوانی ہٹ گئی

مردہ غاروں سے سلاطین کہن پیدا ہوئے — نیم جاں ریشوں سے ماضی کے چمن پیدا ہوئے
بند کمروں سے آنکھ کھولی برہمن پیدا ہوئے — خار و خس کی کوکھ سے گل پیرہن پیدا ہوئے
مردہ پروانوں نے آہ سرد بھر کر بات کی
کشتہ شمعوں نے سنائیں داستانیں رات کی

گونج تھی اعلان سے گونگے سپاہیوں کی زباں — بول اٹھیں سنگ غار کی مرتب دیواریں
نعرہ تسبیح سے بجنے لگیں خاموشیاں — رات بھر کے جشن کا نکلا چٹانوں سے دھواں
نصف ہر ذرے پر اک پھولوں کا ڈیرا ہو گیا
شام زیر ارض میں گویا سویرا ہو گیا

خاک میں جو مل چکے تھے سدھے آنے لگے — مطربان خیمہ ہائے پاستاں گانے لگے
گل رخان دور پیشیں بال بکھرانے لگے — خستہ ہا دوسال کے کک پر چھکانے لگے
چاند فوق نجمسی میں رقص کرنے لگے
دور ہائے سنگ و آہن گفتگو کرنے لگے

دیدہ بیدار کے مانند کانیں کھل گئیں — گردن تاریخ کی سب وسعتیں کھل گئیں
سنگ در کے آہنیں کی دکانیں کھل گئیں — عصر ہائے سرد لب کی رہائیں کھل گئیں
بڑھ گئے کچھ اور پردے آگہی کے ساز میں
سن بنایا خاک نے اپنا کھلی آواز میں

۱۔ آندھی تیز کی بعد
۲۔ چٹانوں کی پرتیں صدیوں کی تاریخ ہیں۔

یہ آہن میں چمکا غضب سیف و قلم کہ ٹوٹے بتِ دست پر دیر و حرم
رہا یہ سینوں میں زنجیر کا زیر و بم کہ دنیا میں بے تیشہ و صنم
نہ ہو کنگن کی تمنا ہتھکڑیاں لینے لگی
رات کی لٹ خیا ابیں کو صدا دینے لگی

یہ فولاد تشریف کتاں بنے لگا رہبر کا اشرف ، آسمان بنے لگا
شیشہ ہوں بکھرا حریر و پریاں بنے لگا سنگ ہوں تراشا کہ رخسار بتاں بنے لگا
بوجھیں جھکیں لقاب انی ظاہر اور ہے
بنت چنگ و رنگ جہانگیر مرد انگور ہے

جو پھر مصراب تھرانی ، فضا پر رنگی ناز کی پھولی کرن اندار کی چنگی گلی
جہاں حشروں کی گھٹا چھنگی ، دا کی چاندنی دل رہبانی نے بھی آنکھیں دلوں سے لوانی
لرزش سرمگیں جسم کی کشتیاں کھینے لگی
چھو گئے نشتر رگ ہستی لہو دینے لگی

شرم سے سرگشتگان خوباں کو جھپکنا آ گیا رنگی کی آنچ پر آہوں کو پکنا آ گیا
نیند اڑی تو موج بادہ کو تھپکنا آ گیا دلوں پر رس کی بوندوں کو ٹپکنا آ گیا
خستہ نظروں کی ردا میں حسن کو ڈھکنے لگیں
قوس مستی پر تمنا میں قدم رکھنے لگیں

جاگ اٹھا گردوں کے طرف خم میں بانکپن پھٹ پڑی شاداب کھیتوں پر قیامت کی پھبن
بن گیا ہر ہو بیکر اک مکتا بھرا بن موتیے کی طرح چھلکے نازنیں کے بدن
بند ٹوٹے طرف ہنسے بیم و رد کھلنے لگے
ہنکھڑیاں ، ٹھیں تو بت خانوں کے در کھلنے لگے

رنگیں بہار کو طرز تکلم آ گیا وہ تکلم جس سے ہونٹوں پر تبسم آ گیا
وہ تبسم جو لیے موج ترنم آ گیا وہ ترنم جس سے دنیا میں تلاطم آ گیا
وہ تلاطم خون میں جس سے روانی آ گئی
وہ روانی بازو پر جس سے جوانی آ گئی

ذ جہانگیر شہر کی بیداری

نوعِ انساں میں بتدریج آدمیت آ گئی وضع میں شائستگی دل میں شرافت آ گئی
بات میں دل جوئی آنکھوں میں مروت آ گئی روح فرسا جسمیت میں خواست آ گئی
شعلہ ہائے غم گساری کو بھڑکنا آ گیا
دل کو اوروں کی مصیبت پر دھڑکنا آ گیا

موجدوں نے جب میں بھر کر قوائے کائنات پرتوِ ایجاد سے دمکا دیا روئے حیات
ایک اک قطرے سے چھینٹے برق کے صد بے ثبات ایک اک ذرے سے چھینٹے سر کے وہ کھوں صفات
ایک اک گوشے سے پیدا اور جہاں پیدا کیے
کاہ کے ریشوں سے کتنے گل مثال پیدا کیے

واہ کیا احسان ہے آفتاب ایجادات کا ایک دریا سے رہا ہے طرفہ معجزات کا
جگمگا اٹھا ہے دن کی طرح کھنڈر رات کا جسم آہن میں رواں ہے خون احساسات کا
یوں تمدن نے جزو خاک اپنا پھینا کر دیا
وسعت کے آلات کو دنا و بینا کر دیا

جو ہنر ایجاد کرنے میں ہوا تھا کامیاب عظمتیں غلطاں ہیں اس کے گرد بے حد و حساب
گھومتے پہیے کی ہر گردش ہے محو اضطراب جیب میں ڈالے ہوئے ہے سو طوائف کا ثواب
ہاں دھر اک تمکنت ہے زلزلوں کے درمیاں
ایک نفس مطمئن ہے دنوں کے درمیاں

موجدان فن کی حشم ہیں محسنان آدمی ان کی بے تابی پہ قائم ہے سکون زندگی
ان کے روئے جستجو پر جھلکیاں ہیں غیب کی ان کے ماتھے ہیں سبھی نقشے جو سجدوں سے کبھی
ان میں سے ہر فرد اویس قرنی و حلاج ہے
سر کا رانو تک پہنچ جانا یہاں معراج ہے

ان کے آگے موسموں کی تختیاں ہیں شرم سار کھیلتے رہتے ہیں یہ وحشی عناصر کا شکار
ہاں ہوا کے جذب شدہ سے باصد وقار ہم ہیں آب و خاک کے آقا ہوا کے شہریار
رعب ہے اپنا مسلط کشور اجرام پر
کاٹھیاں رکھی ہوئی ہیں پشت برق و باد پر

ان کے حسن آرزو معروف بن جاتا ہے طرف — قطرہ بنتا ہے محیط، ذرہ بنتا ہے شگرف
آگ بن جاتی ہے پانی، برق بن جاتی ہے برف — ان کے دم سے دوڑتا ہے رشتۂ آہن میں حرف
بل نکل جاتے ہیں ان سے چرخِ کج رفتار کے
یہ نواحِ ست کے گرد ہیں دیوتا سیار کے

کون ان میں خود نوازی کے لیے کوشاں نہیں — صرف اک صدمت کی دھن ہے دوسرا ارماں نہیں
ہانگ کانگ میں کچھ صداقت سے یہ دھاساں نہیں — یہ صدا یا آدمی ہے ابر کے خوابیں نہیں
خوف دوزخ کا نہ جنت کا کہیں ارمان ہے
خدمت ان کا دین ہے، خلق وفا ایمان ہے
یہ تو ہوئی موحدوں کی بات اب منکروں کے متعلق سنیے

۔ منکر ۔

دل کو لیکن عقل استیعاب سے ہے ہم نشیں — سنتے حسابات پر بھی یہ گمان میں
بن نہ پائے زیر سقف آسماں صدر رہیں — اور تو اور آدمی کے حافظے تک میں نہیں
نام ان کا دہر کے مسند نشینوں میں نہیں
یہ سفینوں میں تو ہیں موجود سینوں میں نہیں

یہ ظاہر ہے بڑی حسناں فراموشی کہ ہم — محو کر دیں ذہن سے ارباب صدمت کے کرم
زلف نسیت کے سلجھنے لیکن کون غم — یاد رہتے ہیں بشر کو صرف وہ اہل ہم
موڑ کر ذہن بشر کو بوستانوں کی طرف
جو اڑاتے ہیں زمیں کو آسمانوں کی طرف

طبع انسانی کو دے سکتا نہیں جو روشنی — صبح انسانی کا وہ آقا نہیں بنتا کبھی
آدمی کو جو غذا دیتا نہیں اور کک کی — امتوں کا مقتدا بنتا نہیں وہ آدمی
قبلہ گاہ اس شخص کو انساں بنا سکتا نہیں
ذہن انسانی کو جو آگے بڑھا سکتا نہیں

۱۔ سنے کی گرانی کی اجلاد۔

بے تکلف، بکارت و معصومات کی تابندگی — خاک پر برسا چکی ہے بے تحاشا روشنی
روشنی بھی وہ کہ جس سے وجد میں ہے زندگی — معنوی خدمت کی لیکن بات ہے کچھ اور ہی

گھر کو جو چمکائے وہ شمع شبستاں اور ہے
دل کو جو رخشندہ کر دے وہ چراغاں اور ہے

یوں تو صدیوں سے ہے ذہن کامل کا بلاں — مصر کے بازار میں جس طرح یوسف کا جمال
عقل اگر کھل جو تو شمع کشتہ ہے ماضی و حال — لاش ہے انسان اگر حلق میں شمع خیال

دود و دماں سے مردوں کو جلانا اور ہے
زندہ انسانوں کو قبروں سے اٹھانا اور ہے

افسر و اورنگ و لعل و گوہر و چتر و قصور — بارگاہ و تخت و خرگاہ و طاؤس و بخور
جامہ نقشیں و فرش مرمر و جام اور — یہ تماشا ہیں سب کے سب بیمار ہے جب تک شعور

بوستان آب و گل کی آبیاری اور ہے
جس سے نکھرے فکر وہ باد بہاری اور ہے

قامت و سیمیں کا لیلے میں لانا اور ہے — ملت و مطول پر نظریں جمانا اور ہے
کل تن کو سرو کا ہم قد بنانا اور ہے — قامت فکر و تخیل کا بڑھانا اور ہے

گیتی و گردوں کی پہنائی پہ چھا جانا ہے اور
اس گھنے جنگل میں خود اپنے کو پا جانا ہے اور

کاہ کی رگ میں جو دوڑاتا ہے خون کہکشاں — کھولتا ہے مار کے دل میں جو باب گل ستاں
شہر گل میں گونجتی رہتی ہے جس کی داستاں — نعرہ بنتا ہے اسی کا نام زیر آسماں

بلیاست عالمے میں جگمگاتا ہے وہی
برش تیغ اجل پر مسکراتا ہے وہی

جو عمل کے طاق میں رکھتا ہے شمع اعتدال — ڈالتا ہے خیر و شر پہ جو عکس بلال
بخشتا ہے عارض احساس کو جو خدوخال — جس کے دم سے سانس لینا سیکھ جاتا ہے خیال

ناچتی ہے لیلیٰ آفاق جس کے سطح پر
مینلے پکتے ہیں جس کے شعلہ آواز پر

نصب کرتا ہے دلوں میں جو حقائق کے خیام
بے زباں انسانیت کو جو سکھاتا ہے کلام
بخشتا ہے جسم حکمت کو جو عصابی نظام
اک قوی بربان بن جاتا ہے جس کا صرف نام
جوڑ دیتا ہے جو ٹوٹی ہڈیاں تکمیل کی
جس کی سانس آواز ہوتی ہے پر جبریل کی

جس سے تنہائی میں ہوتی ہیں دل کی کرتی ہے بات
ٹوٹتے ہیں جس کی ضرب طلق سے لات و منات
جس کا ناخن کھولتا ہے عقدہ ذات و صفات
جس سے بنتا ہے تصور ایک جسم ذی حیات
جس کے آگے دو بھری آنکھوں میں سے آنسو لیے ہوئے
رقص کرتی ہے زمیں گھونگھٹ کے پٹ کھولے ہوئے

پھیلاتا ہے جو نئے سانچوں میں آئین جہاں
جو عمل کے کالبد میں رنگ کرتا ہے رواں
بخشتا ہے جو نال کے بدن کو استخواں
تو نئے افکار ہو جاتے ہیں جس سے نغز خواں
جو عطا کرتا ہے گل دستے خس و خاشاک کو
جو سکھاتا ہے خرام ناز نخل خاک کو

گھومتی ہے یک گردوں جس کے لفظوں کی مہک
جس کے حرف و شد کی انگڑائی پیشی سے دھنک
سیکڑوں ہی ہوش انسانوں کو دلکش مرگ تک
ہر نفس آتی ہے اپنی سانس سے جس کی مہک
انشرح صدر کی مسہری لگا کر پلکوں میں
بیٹھتی ہے زندگی جس کی نظر کی چھاؤں میں

جس کے ہونٹوں پر بچھا دور سرخی در عدن
جس کے لفظوں میں گندھے ہوتے ہیں گلہائے چمن
جس کی موج گفتگو میں سانس لیتے ہیں لحن
جس کے لہجے سے دلوں میں پھوٹ جاتی ہے کرن
روشنی بھرتا ہے جو اخلاق کے قانون میں
جس کے فقرے دھڑکتے ہیں آدمی کے خون میں

اعتدال و حلیما کا قائم جو کرتا ہے وقار
طلعت دشت خزاں میں جو بناتا ہے بہار
بخشتا ہے چہرہ سیرت کو جو نقش و نگار
معنوی آہنگ انساں میں وہ ہوتا ہے شمار
بارشیں قرنوں کی یاس کا قصر ڈھا سکتی نہیں
آندھیاں اس کے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں

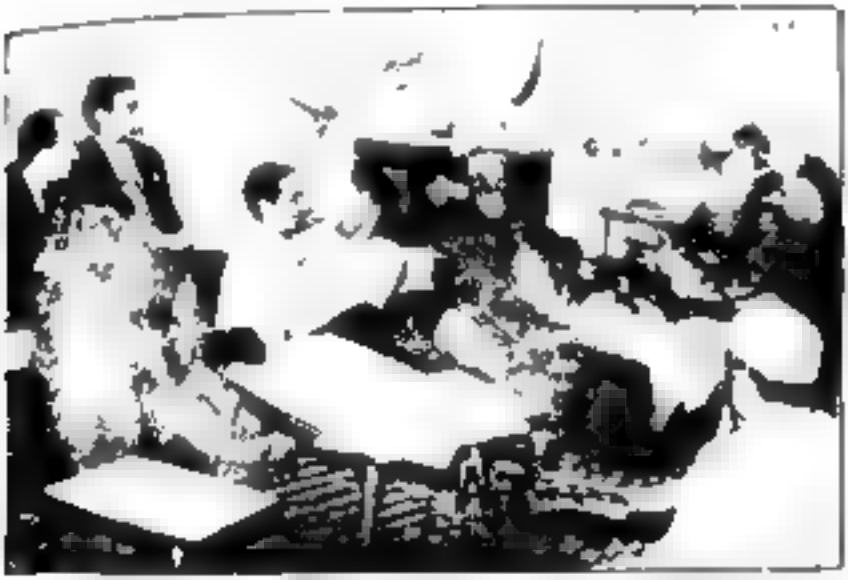

راغب صاحب، خوش صاحب، مرزا عالمگیر قدر، مرزا زین شاہ، ابی اسد عباس صاحب اور چند احباب

سروس ختم ہوا اور ہم ٹی وی اسٹیشن سے فارغ ہوئے تو میں نے جوش صاحب کو ان کے گھر پہنچایا۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کہ اگر فرصت ہو تو کل ذرا جلدی آ جائیے، ہمارے ایک دوست ہیں تھاریانی ان کے گھر جانا ہے۔ مرزا عالمگیر قدر بھی آئیں گے۔ میں نے وعدہ کر لیا اور گھر آ گیا۔

مرزا عالمگیر قدر

دوسرے دن یعنی ۲۸ فروری ۱۹۸۰ء کو اتوار تھا میں ۱۰ بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب تیار بیٹھے تھے۔ جوش صاحب کے ساتھ مرزا عالمگیر قدر بھی تھے۔ جو ان کے بچپن کے دوست تھے۔ جوش صاحب نے میرا تعارف کروایا تو وہ بہت محبت سے گلے لگایا اور کہنے لگے کہ جوش تمہاری اتنی تعریف کرتے ہیں تو ضرور تم میں کچھ خوبیاں بھی ہوں گی۔ مگر ہم تو تجربے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کریں گے۔ میں نے عرض کیا خدا کرے میں آپ کے معیار پر بھی پورا اتروں۔ جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں مرزا صاحب کا تعارف اس طرح کرایا ہے "خاندان تیموری کی یادگار، لکھنؤ کے باشندہ باوقار، کچھ اوپر چالیس برس سے عشق، انتس میں گرفتار پھر بھی آواز بلا کی پاٹ دار، زود اشتعال و شرمندہ بار، میرے لڑکپن کے یار، موسیقی و مزامیر کے ماہر اسرار، کھانا پکانے میں یکتائے روزگار، جن سخنوں کے شہریار اور معلومات عامہ کے پروردگار۔ سانولے رنگ بڑی بڑی آنکھوں کے پوست، استخوان اور کاغذی بدن کے آدمی" یہ نواب واجد علی شاہ کے بیٹے نواب مرزا برجیس قدر کے پوتے تھے۔ جوش صاحب نے ان کے متعلق یہ بالکل صحیح رائے ظاہر کی ہے کہ "اس کرۂ ارض پر معلومات عامہ کا اس قدر بڑا کباڑی اور کوئی موجود نہیں ہے"۔ طرحدار میں جوش صاحب اور مرزا عالمگیر قدر ہم تینوں تھاریانی صاحب کے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ رستے میں جوش صاحب نے کہا تھاریانی بہت اچھے آرکیٹیکٹ ہیں۔ پکے مسلمان ہیں اور مجھے مسلمان بنانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ ان کا مکان گرومندر کے نزدیک تھا۔ ہم لوگ جب وہاں پہنچے تو وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک ان کے گھر رہے پھر ان کے ایک دوست کے گھر چلے گئے جہاں ہم سب کی دعوت تھی۔ کھانے کے بعد جوش صاحب نے بہت دیر تک اپنا

کام سنایا جو ٹیپ کر لیا گیا۔ طرحی وہاں تمام دن گزار کر شام کو گھر لوٹے۔ مرزا صاحب وہیں سے کسی کے ساتھ اپنے گھر چلے گئے اور میں جوشش صاحب کو ان کے گھر پہنچا کر اپنے گھر آ گیا۔

ایرانی دوشیزہ سے ملاقات:

اس واقعہ کے چند دنوں کے بعد جوشش صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ ہندوستان سے ان کے بھائی رئیس، محمد خان آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں ۲۰ مارچ بروز جمعہ ۱۹۷۱ء سہ پہر ان کے گھر گیا۔ دونوں بھائی تخت پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ رئیس محمد خان صاحب ڈیل ڈول سے اچھے خاصے پہلوان معلوم ہوتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کشتی اور ورزش کا شوق رہا ہے۔ بیوی کے انتقال کے بعد پھر شادی نہیں کی۔ ایک لڑکا ہر وقت خدمت میں رہتا ہے۔ جوش صاحب کہنے لگے آج شام کہیں باہر چلو ڈرنک اور کھانا باہر ہی کھائیں گے۔ میں نے کہا پہلے گرینڈ ہوٹل ملیر چلتے ہیں، وہاں کا منیجر میرا دوست ہے وہیں سوئمنگ پول پر شام گزاریں گے۔ چنانچہ میں نے گرینڈ ہوٹل کے منیجر مسٹر روی کو ٹیلی فون کیا تو کہنے لگا، شوق سے آئیے، میں انتظار کروں گا۔ چنانچہ ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ اس نے سوئمنگ پول پر میز اور کرسیاں ڈلوا دیں اور جوش صاحب کے لیے ڈرنک کا بھی انتظام کر دیا۔ رئیس محمد خان صاحب نے پول میں تیرنا شروع کر دیا۔ اس ہوٹل میں عام طور پر باہر سے آنے والے مسافر ٹھہرتے ہیں جو چند دن کے لیے کراچی کی سیر کو آتے ہیں۔ اس وقت پول میں ایک ایرانی خاتون بھی تیر رہی تھیں۔ عمر تقریباً ۲۵۔۳۰ کے درمیان، گٹھا ہوا جسم، نہایت سرخ و سفید رنگ، پرکشش خدوخال۔ تھوڑی دیر میں وہ پول سے نکل کر تولیے سے جسم کو خشک کرتی ہوئی جوش صاحب کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اردو میں کہنے لگیں۔ گر میں غلطی نہیں کر رہی ہوں تو آپ حضرت جوش ملیح آبادی ہیں۔ جوش صاحب نے نہایت مسرت آمیز حیرت سے کہا جی ہاں آپ نے بالکل درست پہچانا میں جوش ہی ہوں۔ اس نے کہا میرے والد کا تعلق بھی لکھنؤ سے تھا مگر میری والدہ ایرانی تھیں۔ میرے والد ایران میں آ کر آباد ہو گئے تھے اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں کچھ دنوں کے لیے کراچی گھومنے پھرنے

کے لیے آئی ہوئی ہوں۔ میرے والد کے پاس آپ کا کلام اور تصویریں بھی تھیں وہ آپ کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کو آپ کا کلام بہت یاد تھا۔ رئیس احمد خاں نے جو ایک حسینہ کو اپنے بھائی کے پاس بیٹھے دیکھا تو خود پہلی سے نکل کر ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ جوشؔ صاحب نے ان سے کہا کہ جا کر کپڑے بدل آئیں۔ خان صاحب کو یہ مشورہ ناگوار گزرا مگر بڑی مشکل سے جا کر لباس تبدیل کر آئے اور کرسی لے کر اس خاتون کے قریب بیٹھ گئے۔ ستے میں بھنگ مزید ہو گیا اور جوشؔ صاحب پیمانہ بکف طرح ہو گئے۔ وہ خاتون جس نے اپنا نام زہرہ بتایا تھا وہ بھی شریک سے خوش ہو گئیں ..... اور جوشؔ صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کرنے لگیں ..... اس وقت جوشؔ صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے۔ انھوں نے پہلے تو تھوڑے نخرے دکھائے۔ اس کے بعد جب زہرہ نے جوشؔ صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے پیار کر لیا تو رئیس احمد خاں کا چہرہ رقابت سے چمک پڑا۔ کہنے لگے بھائی صاحب چلیے کھانے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں نے کہا خان صاحب، فکر نہ کیجیے کھانے کا بھی یہیں بندوبست ہو جائے گا مگر رئیس خاں صاحب آتش زیر پا ہو رہے تھے اور جوشؔ صاحب جو جنت در آغوش، جمال پری رخ میں محو تھے کہنے لگے میاں ہم پٹھانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہمارا ایک بھائی دوسرے بھائی کا جانی دشمن ہوتا ہے۔ اس کے بعد جوشؔ صاحب نے گلاس منہ کو لگایا۔ بھائی کے جذبات کی تلخی کو عرق سے ناب کر کے اس ترک شیرازی کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور یہ رباعی پڑھی۔

دیکھے تھے بہاروں نے کب ایسے انداز — رنگوں کا تناسب اور یہ اعجاز
دیکھ جو اسے تو دفعتہً گونج اٹھی — گل زار میں مل شاد کی آواز

اللہ یہ کافر ہے بہشت حسن میں — پالی خدا خاں میں کہ یاد و پری
یہ گلشن یہ مرمر سے یہ انوٹ یہ رنگ — اسے بار خدا کا بل برداشت نہیں

گرینڈ ہوٹل کے سوئمنگ پول کے کنارے آج کی شام نہایت حسین اور رنگین تھی۔ سے ہوئے، کیچ بارج ہو ساقی ہو باہ وش اور پھر جوشؔ جیسا شاعر اور پہلو میں زہرہ جبیں۔ جوشؔ صاحب کی طبیعت میں بلا کی روانی تھی اور وہ مسلسل اپنا کلام سنا رہے تھے۔ تقریباً

ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل کے بیرے نے کھانا لا کر میز پر رکھا۔ پہلے سوپ دیا گیا پھر بہت لذیذ کباب دیئے گئے پھر مرغ کے ٹکڑے اور اس کے بعد تلی ہوئی مچھلی۔ یہ تمام میو جوش صاحب کو بہت پسند آیا۔ جوش صاحب نے بہ اصرار زہرہ کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ غرض ساڑھے نو بجے کھانے سے فارغ ہوئے۔ زہرہ نے جوش صاحب کو الوداعی بوسہ دیا اور ہم لوگ اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں جوش صاحب جس قدر آج کی شام کی تعریف کر رہے تھے وہ میں حد خاص کی تعریف سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرا دل رکھنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ بقول غالب

رفتہ رفتہ رقم کرتے ہیں بہ نوک خنثی حقرب!

غرض تقریباً ساڑھے دس بجے دونوں بھائیوں کو جوش صاحب کے گھر پہنچا کر میں اپنے گھر آ گیا۔

۱۹۷۲ء کے واقعات

اس واقعہ کے بعد میں اپنی نوکری کے سلسلے میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ بہت دنوں تک جوش صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اسی مدت میں اپنے محکمے کی طرف سے مجھے ایک ماہ کے لیے ڈھاکے بھیج دیا گیا۔ وہاں سے واپسی پر بھی جوش صاحب کے گھر نہ جا سکا۔ آخر ۲۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو صبح ۹ بجے میں نے جوش صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ میری آواز سن کر کہنے لگے "ارے بھائی خورشید علی خاں تم پھر کہیں یاد آ گئے۔ میں تو ایک مدت سے تم کو بھلانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میں جتنی کوشش کرتا ہوں تم اتنے ہی یاد آتے ہو۔ اگر آج کوئی کام نہ ہو تو دس بجے تک میرے گھر آ جاؤ۔ ذہین شاہ صاحب کے وہاں جائیں گے۔" چنانچہ میں دس بجے اپنے ساتھ کچھ پان لے کر جوش صاحب کے گھر گیا۔ پان دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے "یہ آپ نے بہت اچھا کیا جو پان لے آئے۔ میں تو آج کل پالک کے پتے کھا رہا ہوں۔" یہ ۷۱ء کا زمانہ تھا جب مشرقی پاکستان سے خانہ جنگی کی وجہ سے مغربی پاکستان میں پان کی درآمد بہت محدود ہو گئی تھی اور تھوڑے بہت پان کہیں سے آ بھی جاتے تھے تو ان کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ عام آدمی کے لیے خریدنا بہت مشکل تھا۔ میں جب ان کے گھر پہنچا تو جوش صاحب نہا دھو بیٹھے تھے۔ فوراً میرے ساتھ ہو لیے اور ہم دونوں ذہین شاہ صاحب کے گھر ان کے پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کے مکان میں پہنچے۔ وہاں رئیس امروہوی ان کے برادران سید محمد تقی اور محمد علی ایلیا کے علاوہ راقم صاحب مرد آبادی اور چند دوسرے شعرا پہلے سے موجود تھے۔ جوش صاحب کے پہنچنے کے بعد محفل شعر گرم ہوئی۔ سب شعرا نے اپنا اپنا کلام

سنایا جوش صاحب نے ایک طویل نظم سنائی۔ اس وقت مجھے اس کا عنوان یاد نہیں مگر اس میں جوش صاحب نے زندگی کے کئی موڑ دکھائے تھے۔ پھر اپنی عقل پرستی کا اظہار کیا تھا جیسے میں ایک جسمیہ ان پر عاشق ہو جاتی ہے۔ پھر خدا کے ساتھ مکالمہ ہے۔ شاعر خدا سے شکایت کرتا ہے کہ اس نے انسان کو مجبور پیدا کیا ہے۔ انسانیت مشیت الٰہی کے شانوں پر چلنے کے لیے مجبور ہے مگر پھر کہتے ہیں کہ میں بھی بن آدم ہوں۔ باشعور ہوں اور میں خدا کی مشیت پر غالب آسکتا ہوں۔ اس کے بعد بابا صاحب نے اپنا کلام سنایا اور جوش صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ شراب کے ذریعہ خارج سے خود مستی کرتے ہیں حالانکہ اپنے اندر سے خود لیے پھرتے ہیں اور پی باطنی شراب کو استعمال نہیں کرتے۔ مستی تو خود آپ کے اندر موجود ہے۔ بندگی بھی ہے اور خارجی ذرائع کی محتاج بھی نہیں۔ جوش صاحب نے کہا بابا صاحب آپ درست فرماتے ہیں۔ خود میرا شعر ہے:

اپنے سینوں میں جو رکھتے ہیں سرور
اک جشن مسلسل ہے انھیں دن ہو کہ رات

سلامت علی خاں:

۱۹۶۲ء مئی کی شام کو میں جوش صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا۔ نعمت بھی اب تن درست ہو کر اپنے دفتر جانے لگے تھے اور جوش صاحب کا اصرار تھا کہ میں نعمت کو بھی اپنے ساتھ ان کے گھر لاؤں۔ خدا اسے کے نعمت بھی میرے ساتھ تھے۔ جوش صاحب کے ساتھ ان کے ڈھاکے کے دوست سلامت علی خاں مع اپنی بیگم سلیمہ سلامت علی کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ام الشعرا بیگم جوش بھی جوش صاحب کے قریب تخت پر تشریف فرما تھیں۔ نعمت سے مل کر جوش صاحب بہت خوش ہوئے۔ جوش صاحب نے سلامت علی خاں کا تعارف نعمت سے کرایا اور کہا کہ یہ ڈھاکے میں جوٹ کے سب سے بڑے تاجر اور برآمد کنندگان میں سے تھے۔ وہاں ان کا سب سے بڑا بنگلہ اور کئی کاریں تھیں مگر اب وہاں کے حالات کی وجہ سے کراچی آگئے ہیں۔ یہاں کچھ لوگ کاروباری رقابت کی وجہ سے ان کو پریشان کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر آپ ان کو پولیس کا تحفظ فراہم کریں گے تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ نعمت نے

دوسرے دن خان صاحب کو اپنے دفتر بلایا ان سے معاملے کی نوعیت معلوم کی اور ایسا انتظام کر دیا کہ خان صاحب ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ ہو گئے۔ اس کے بعد سے جوش صاحب نصرت کے اور بھی گرویدہ ہو گئے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس دن جب ہم دونوں بھائی جوش صاحب کے گھر پہنچے تو جوش صاحب مست اچھے موڈ میں تھے۔ چونکہ ابھی صبح کے غروب اور جوش صاحب کے طلوع ہونے میں کوئی ایک گھنٹے سے زیادہ وقت باقی تھا تو نصرت نے فرمائش کی کہ جوش صاحب اگر بار خاطر نہ ہو تو "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" سنائیے۔ یہ نظم مجھے بے حد پسند ہے۔ اسی کے ساتھ مجھے آپ کی وہ نظم بھی مست پسند ہے۔

سلام اے تاجدار جرمنی سے ہٹلر اعظم خدا اے قوم شیدائے وطن اے میرا اعظم

جوش صاحب نے فرمایا کہ یہ ہٹلر اعظم والی نظم میری نہیں ہے۔ یہ کسی صاحب نے میرے نام سے چھپوا دی تھی مگر یہ میں نے نہیں کہی۔ ہاں البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی والی نظم میری ہے۔ اس نظم کو انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ اور میرے گھر کی تلاشی بھی لی تھی۔ جس پر میں نے "تلاشی" کے عنوان سے ایک اور نظم کہی تھی۔ نصرت نے کہا جوش صاحب براہ کرم دونوں نظمیں سنائیے۔ میں ان کو لکھنا چاہتا ہوں۔ جوش صاحب نے فرمایا میں آپ کو سنا رہا ہوں، آپ ان کو "یادوں کی برات" سے نقل کر لیجیے۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب"

۱

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج اے سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو رسوا کرو
جس کو سب کہتے ہیں جنگل، بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو بار دو گولی ہے امن و بقا
بارِ انساں میں چھپے بیٹھے ہیں بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیاں پہ ہچکیاں

ہاتھ ہے ہنر کا رنگ خود سری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرسی کی آگ پر

۲

حیرت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوع انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم، سوداگری کے واسطے
نوع انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روح آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی

۳

اپنے قلم سے سیاست کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا بھی وہ دور مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کاروں در کاروں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولت ہندوستاں
دست کاروں کے نگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گزشتوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعت ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی، تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

۴

اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمن حق تھا سراج
وہ اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا رلانا یاد ہے؟

ہجرت سلطان دلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
خیبر سے لاتے ہیں کہ گرتے ہوئے کو تھامتے
کن کے سر لاتے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے
یاد تو ہوگی وہ ٹیا برج کی بھی داستاں؟
اب بھی جس کی خاک سے رہروکے اٹھتا ہے دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا یاد ہے؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلم بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ
ذہن میں ہوگا یہ جذبہ ہندیوں کا داغ بھی
یاد تو ہوگا تمہیں جلیاں والا باغ بھی؟
پوچھو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے
دار و گرگ دامن آلود اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے
ہند کے رہبر رہا کرتے تھے کس انداز سے
پوچھ لو یہ قیصر خاں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جس میں خطبۂ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جن میں کوروں کی صدا

۵

آج کشتی خلق کی امواج میں کھیتے ہیں کیوں؟
حسرت حیراں ہیں کہ اب تم ہند سے ہو کیوں

اہل قوت دام حق میں تو کبھی آتے نہیں
آدمیت کو کبھی خاطر ہی میں لاتے نہیں

۹

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
اہل حق روشن نظر ہیں اہل باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کم زور ہیں
آج سٹ یہ منزل قوت میں تم پہنچے نہیں؟
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس پہ کہتے نہیں؟
کیا کہا؟ انصاف ہے انساں کا فرض اولیں
کیا تقاضا ظلم کا ہے تم میں کس باقی نہیں؟

۱۰

دیر سے بیٹھے ہو، نکلی راستی کی جستجو میں
کیا طلسم ناکردہ کچھ موج آ گئی ہے پاؤں میں
گونج تالیوں کی ہے آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپ تازی کیا اٹھا خانے میں ہے
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیب دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا لی کھڑکی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوع انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے دادگی انصاف کی گانے لگے
تک گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

۸

مجرموں کے واسطے زباں پہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین
خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرعون کے آگے جھکا دو گردنیں
اک محافی وقت لکھے گا اسے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرعون اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے یہ فرعون ٹل سکتا نہیں

اس کے بعد صحت کی فرمائش پر جوش صاحب نے اپنی نظم تلاشی بھی سنائی۔

"تلاشی"

جس سے امیدوں میں بجلی آگ ارمانوں میں ہے
اے حکومت کیا وہ شے اس میز کے خانوں میں ہے؟
بند پانی میں سلیقے کھے رہی ہے کس لیے
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لیے؟
گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بد نہاد
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد
جس کے نور و دہشتیں پر جس طوفانوں کی ہیں
جس میں طوفان آندھیاں زندگی ہیں بجلیاں
جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمن ہندوستاں
شیر جس میں جھونکتے ہیں کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں جس سے جنگیں اژدہا اور نگ کی
جس میں ہے گونجی ہوئی آواز طبل جنگ کی

جس کے اندر آگ ہے، دنیا پہ چھا جانے والی آگ
نار دوزخ کو پسند جس سے آ جانے والی آگ
موت جس میں دیکھتی ہے سخواسس آپ کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے بیٹے کو دیکھ

اس کے بعد جوش صاحب نے تفصیل سے تلاشی کا واقعہ بھی سنایا کہ ایک ہندو انسپکٹر نے کس طرح شرافت کا ثبوت دیا کہ تلاشی لینے کے بجائے پہلے تو اس نے جوش صاحب سے ان کے مکان کے اندر آنے کی معافی مانگی پھر تکمیل ضابطہ کے لیے کاغذی کارروائی کر کے رخصت ہو گیا مگر اس دوران ایک مسلمان ہیڈ کانسٹیبل نے جوش صاحب کی نظر بچا کر جیب میں رکھ لی۔ جب جوش صاحب نے یہ داستان ختم کی تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ انھوں نے سماعت علی خاں کی طرف اس طرح دیکھا کہ اب کس کا انتظار ہے۔ پیگ بنا۔ چنانچہ اب کے ساقی کے فرائض خان صاحب نے ادا کیے اور یہ دور جاری تھا کہ میں اور نسیم محفل رندان میں بار حاضر ہونے کے بہانے جوش صاحب سے اجازت لے کر اپنے گھر آ گئے۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کہ کل صبح دس بجے آ سکو تو ضرور آ جاؤ۔ میر رسول بخش صاحب بالچہ سے ملنے چلیں گے۔

میر رسول بخش تالپور:

دوسرے دن ۱۰ مارچ ۱۹۷۲ بروز بدھ میں ٹھیک دس بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا اور ہم دونوں اسمبلی بلڈنگ چلے گئے۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ میر صاحب اوپر اسمبلی ہال میں دربار عام میں مصروف ہیں۔ میں نے اوپر جا کر دیکھا کہ ہال میں لوگوں کا ہجوم ہے اور میر صاحب کو سائلوں نے گھیر رکھا ہے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں ایک درخواست ہے اور میر صاحب ہر درخواست پر کوئی مناسب حکم لکھ دیتے ہیں۔ میں نے نیچے آ کر جوش صاحب سے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا۔ انھوں نے ایک پرچے پر لکھا "میر صاحب! آپ دربار عام میں ہیں اور میں نیچے موٹر میں بیٹھا ہوا ہوں۔ ملاقات کیسے ہو؟" ـــــ جوش

میں نے اوپر جا کر جیسے ہی پرچہ میر صاحب کو دیا انھوں نے پڑھ کر کہا "یہ میری عزت افزائی ہے جوش صاحب کو لے آئیے اور میرے چیمبر میں بٹھائیے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں" اور اس کے ساتھ انھوں نے اپنا ایک آدمی میرے ساتھ کر دیا کہ جوش صاحب کو لفٹ کے ذریعہ سے اوپر لے آئیے چنانچہ ہم لوگ جوش صاحب کو لے کر میر صاحب کے چیمبر میں آئے اور وہاں ان کو صوفے پر بٹھا کر وہ شخص یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ میر صاحب کو اطلاع کرنے جا رہا ہے۔ میر صاحب خود تشریف لائے نہایت محبت اور احترام سے جوش صاحب سے ملے پھر کہا۔ حضور اگر اجازت دیں تو کچھ لوگوں کی درخواستیں سنتا آؤں یہ لوگ سخت دور دیہاتوں سے آئے ہیں۔ جوش صاحب نے کہہ تو دیا ضرور ضرور مگر میں سمجھ رہا ہے کہ اب نہ معلوم کتنی دیر مزید انتظار کرنا پڑے گا ان کے چہرے پر اضطراری کیفیت نمودار ہونے لگی اس وقت وہاں ڈاکٹر مجید صاحب تین خواتین اور کچھ لوگ بھی بیٹھے تھے مگر جوش صاحب کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور جب انتظار کرتے ہوئے پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو مجھ سے کہا اب بھاگ چلو میں نے کہا میر صاحب برا مانیں گے تھوڑی دیر اور انتظار کیے لیتے ہیں۔ پانچ منٹ کے بعد جوش صاحب نے اپنی کاپی میں سے ایک پرچہ پھاڑا اور یہ شعر لکھ کر مجھے دیا کہ جا کر میر صاحب کو دے آؤں شعر یہ تھا۔

بدل نگاہ طور سے بے طور ہو گئے تم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے

میں نے یہ پرچہ میر صاحب کو نہیں دیا بلکہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور میر صاحب کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی میر صاحب کی نظر مجھ پر پڑی خدا گواہ ہے کہ جوش صاحب بے چین ہو رہے ہوں گے سارا سب کام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور جوش صاحب کے پاس آ کر سخت محبت اور دلگیری سے معافی چاہی کہ جوش صاحب کو انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑی۔ پھر جوش صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر کہا "فرمائیے سرکار میرے لیے کیا حکم ہے"۔ جوش صاحب نے کہا میں تو آپ کے دیدار کے لیے حاضر ہوا تھا میر صاحب کہنے لگے "کل پریذیڈنٹ بھٹو صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا مگر لوگوں نے جو ان کی کوٹھی پر مظاہرہ کیا تو اس سے ان کا موڈ بہت خراب ہو گیا۔ نہ معلوم لوگ کیا چاہتے ہیں اگر حالات پرسکون ہوں تو ترقی کے بہت کام ہو سکتے ہیں مگر لوگ کسی طرح ہم لوگوں کو اطمینان کا سانس لینے نہیں دیتے۔

جوشش صاحب یہ مسلمان قوم بھی عجیب ہے لوگوں کی باتوں میں آ کر بے مسئلوں کی دشمن بن جاتی ہے۔ بھٹو صاحب جیسا لیڈر بہت کم پیدا ہوگا۔ اگر اس مسکین کو کام کرنے کا موقع دیا گیا تو آپ دیکھنا پاکستان سب سے جلد دنیا کی صف اول کی قوموں میں شامل ہو جائے گا۔ جوش صاحب نے کہا ہاں صاحب ہماری قوم کی ہسٹری یہ ہے کہ یہ ہسٹری شیٹروں کی قوم ہے۔

اتنے میں میر صاحب کا سیکرٹری کچھ درخواستیں لے کر آ گیا اور ہم دونوں میر صاحب سے اجازت لے کر باہر آ گئے۔ چلتے وقت میر صاحب نے جوشش صاحب سے کہا کہ وہ تین چار دن کے بعد خود ان کے مکان پر حاضری دیں گے۔ جوش صاحب نے کہا پہلے سے ٹیلی فون کر دیجیے گا تاکہ میں آپ کے استقبال کے لیے تیار رہوں۔ بہرحال ہم لوگ وہاں سے رخصت ہو کر بس روڈ آئے جہاں لسی پی۔ پھر ایک بنک پر گئے جہاں سے جوشش صاحب نے کچھ رقم نکالی۔ اس کے بعد میں جوش صاحب کو ان کے گھر پہنچا کر اپنے گھر آ گیا۔

جوش صاحب اور پابندی وقت:

اکیسویں مارچ ۱۹۷۲ء کو صبح جوش صاحب نے ٹیلی فون کیا کہ آج دو بجے سے پہلے میرے گھر آ جاؤ۔ یہاں سے ٹی وی سٹیشن چلیں گے۔ آج وہاں ایک مشاعرہ ہے۔ چنانچہ میں پورے دو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ ٹھیک دو بجے ٹی وی سٹیشن کی گاڑی آ گئی۔ میں نے اپنی گاڑی جوش صاحب کے گھر پر چھوڑ دی اور ان کے ساتھ چلا گیا۔ جب ہم ٹی وی اسٹیشن پہنچے تو ہم کو سیدھے ملٹی ایوی میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ مگر وہاں ابھی اسٹیج تیار کیا جا رہا تھا اور بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی تک نہ تھی۔ وہاں کے منتظمین نے جوش صاحب کو ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا۔ میں بھی ایک کرسی پر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ جوش صاحب کہنے لگے دیکھیے صاحب یہ لوگ کس قدر غیر ذمہ دار ہیں۔ مجھے اسقدر جلدی بلوایا اور یہاں ابھی تک سٹیج بھی تیار نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو باتوں میں لگاؤں مگر جب دو بج کر بیس منٹ ہو گئے تو جوش صاحب بے چین ہونے لگے۔ مجھ سے کہا کہ بھاگ چلو۔ اب مجھ سے نہ بیٹھا جائے گا۔ میں نے کہا تھوڑی دیر اور صبر فرمایئے مگر وہ برہم ہونے لگے اور میرے روکنے کے باوجود باہر نکل گئے۔ راستے میں وہی صاحب جو ہمیں جوشش صاحب کے گھر سے لائے

تھے مل گئے۔ انھوں نے جوشؔ صاحب کو روکنا چاہا مگر جوشؔ صاحب سخت جوش میں تھے۔ سیدھے باہر سڑک پر پہنچ گئے اور مجھ سے کہا کہ کوئی ٹیکسی روک لو۔ میں نے ان صاحب سے کہا، آپ ذرا افتخار عارف صاحب کو بلا لائیں۔ چنانچہ وہ صاحب بھاگے ہوئے گئے اور افتخار عارف اور صہبا اختر کو بلا لائے۔ یہ دونوں حضرات بھی ہانپتے کانپتے پہنچے۔ اتنے میں جوشؔ صاحب ایک ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے۔ ان لوگوں نے جوشؔ صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگی۔ جوشؔ صاحب کہنے لگے جناب میری زندگی سکنڈ کی سوئی کے حساب سے ہے۔ وقت کے مطابق چلتی ہے۔ حضرت خدا کا دیے کا وقت دیا اور اب ڈھائی بج رہے ہیں اور ابھی آپ کا اسٹیج بھی تیار نہیں ہے۔ اب مجھ سے کچھ پڑھا جائے گا۔ کہنے لگے۔ معلوم لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں اور وقت کی پابندی کیوں نہیں کرتے۔ غرض یہ صرف افتخار عارف اور صہبا اختر صاحبان کی کوشش تھی کہ جوشؔ صاحب ٹیکسی سے اتر کر واپس اسٹوڈیو میں آگئے۔ شعرا بھی آگئے۔ سرور بارہ بنکوی نے آکر جوشؔ صاحب کو باتوں میں لگانا شروع کر دیا۔ پھر رئیس امروہوی، جمیل الدین عالی، داور نگار، جون ایلیا، عشرت رومانی، شاعر لکھنوی، رضی اختر شوق، سحر انصاری، محمود شام، شبنم رومانی، محسن بھوپالی بھی آگئے۔ جناب مرشد صدیقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ یہ مشاعرہ تین بجے سے پہلے شروع نہ ہو سکا اور جب ہم گھر واپس آئے تو رات کے نو بج چکے تھے اور جوشؔ صاحب کی عبادت میں خلل پڑ چکا تھا مگر میں ان کو گھر پہنچا کر اپنے گھر آگیا۔

محسن صاحب، اعظم گڑھی:

اس واقعے کے تیسرے دن جمعہ تھا جوشؔ صاحب نے کہا کہ صبح نو بجے آجاؤ تو محسن صاحب، اعظم گڑھی کے گھر جائیں گے۔ چنانچہ میں جمعہ کے دن نو بجے جوشؔ صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوشؔ صاحب تیار بیٹھے تھے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ جوشؔ صاحب کو ان کا مکان ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ قائداعظم کے مزار کے پیچھے حسن جیکب لان میں ایک چھوٹی سی مسجد کے زیر سایہ ان کا کوارٹر تھا۔ وہاں پہنچ کر ایک جگہ میں نے گاڑی کھڑی کی۔ جوشؔ صاحب تو گاڑی میں بیٹھے رہے اور میں مکان ڈھونڈنے لگا۔ کافی تلاش کے بعد ان کا کوارٹر ملا۔ مکان کے

صحن کا احاطہ کانٹوں کی باڑھ سے گھرا ہوا تھا۔ آنگن میں دو چارپائیوں پر قدیم وضع، دو سن سے رسیدہ قدیم خیالات کے چند بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک ضعیف بزرگ دبلے پتلے، کھری ہڈی کے لانبا قد، دبتی ہوئی رنگت، خشخشی داڑھی، سامنے کے چند دانتوں کے علاوہ باقی تمام دانت ندارد۔ لانبا چہرہ، شیعہ عقیدے کے راسخ الاعتقاد مسلمان۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ تھے جناب محسن صاحب۔ محترم گڑھی میں نے کہا جوش صاحب بھی آئے ہیں اور وہ سڑک پر گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہاں بیٹھے ہوئے تمام صاحبان میرے ہمراہ جوش صاحب کے استقبال کے لیے روانہ ہو گئے اور جوش صاحب کو اپنے ساتھ لے کر پیچھے گھر آئے۔ گھر کے آنگن میں فرش بچھا کر اس پر قالین ڈال دیا گیا پھر شام تک محفل شعر و سخن گرم رہی۔ اس دن جوش صاحب نے زیادہ تر مرثیے سنائے۔ غروب آفتاب سے پہلے ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ جوش صاحب نے کہا چلو عرفان کے گھر چلتے ہیں۔ ان کا گھر عشیہ کوارٹرس میں تھا۔ یہ صاحب جوش صاحب کی بھابی جو لاہور میں رہتی ہیں، ان کے صاحبزادے تھے۔ ان کے والد سید مشتاق علی ہاشمی لاہور میں پوسٹ آفس میں کسی بڑے عہدے پر ہیں۔ ان کی تین صاحبزادیاں نہایت ذہین اور قابل ہیں۔ اپنی اپنی جماعتوں میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو کر ہمیشہ حکومت کی طرف سے تعلیمی وظیفہ حاصل کرتی ہیں۔ جوش صاحب ان سب بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ رہ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ عرفان میاں کراچی میں نوکری کرتے ہیں اور عشیہ روڈ کے سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں۔ جب جوش صاحب نے کہا کہ شام کی ڈرنک عرفان میاں کے گھر میں کریں گے تو میں ان کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں جوش صاحب نے پوچھا "دو مرد کا کیا شعر ہے" لکھتے رہے جس کی حکایات خونچکاں "میں نے دوسرا مصرع پڑھا "ہر چند ہاتھ میں ہمارے قلم ہوئے"۔ جوش صاحب کہنے لگے مرزا سے چوک ہو گئی۔ ثانی مصرع اس طرح ہونا چاہیے تھا۔ گو اس خطا میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے"۔ ہر چند ہاتھ میں ہمارے قلم ہوئے۔ یہاں "اس میں" کا اشارہ ذم کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے۔ میں نے کہا یہ آپ لوگ اہل لکھنؤ بھی کس قدر حساس کیوں واقع ہوئے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات میں آپ کا ذہن ذم کا پہلو نکال لیتا ہے۔ کہنے لگے ان شاعروں کی داستانوں سے اہل دل نابلد ہیں۔ اتنے میں

مرزا میاں کا گھر آگیا اور ہم لوگ ان کے مہمان ہو گئے۔ جوشی صاحب نے گرو مندر کی شراب کی دکان سے وہسکی کی ایک بوتل خریدی تھی۔ سوڈا اور گوک کا انتظام مرزا میاں نے کر دیا۔

جوش صاحب جب طرح ہو چکے تو پھر انھوں نے وہی موضوع چھیڑ دیا کہنے لگے مرزا نے کرنیگے نوکریں کہاں ہیں۔ وہ کیا شعر ہے۔

تدریج کاوش غم ہجراں ہوا اسد — سینہ کہ تھا غزانہ گہر ہائے داغ کا

یہاں بھی مرزا سے لغزش ہو گئی میں نے عرض کی۔ نہیں۔ کہنے لگے سینہ میں ہ کا جھٹکا محسوس ہونا چاہیے جبکہ یہاں ہ کے بجائے الف پڑھنا پڑتا ہے۔ سینا کہ تھا غزانہ گہر ہائے داغ کا۔ جو غلط ہے آمر میں - الف - نہیں "ہ" ہے۔ اس کے بعد دیر تک جوش صاحب مختلف شعراء کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے رہے۔ کسی کے ہاں تعقید تھی تو کہیں ذم تھا۔ کہیں دور مرہ کی غلطی تھی تو کہیں فکر کا نقص تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہوا کہ میرے پاس اس وقت ٹیپ ریکارڈر نہیں تھا ورنہ وہ ساری باتیں اس قابل تھیں کہ ان کو ریکارڈ کر لیا جاتا۔ جوش صاحب اس رات مرزا میاں ہی کے گھر رہے اور میں کوئی نو بجے ان سے رخصت ہو کر گھر آگیا۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کل نو بجے تک آ جائیے گا۔ میر صاحب کے گھر چلیں گے۔

اردو ہندی تنازعہ

دوسرے دن صبح وقت مقررہ پر مرزا میاں کے گھر سے جوشی صاحب کو لے کر میں میر رسول بخش ہاپور کی سرکاری قیام گاہ پہنچا جو پہلے وزیر اعلیٰ کا مکان تھا اور اب گورنر ہاؤس ہے۔ میر صاحب بہت اخلاق سے ملے۔ ہم لوگوں کو کوکو کولا پلایا۔ پھر وہ اور جوشی صاحب ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد مجھے بھی اندر بلا لیا۔ میری عدم موجودگی میں ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں مجھے اس کا تو علم نہیں ہے مگر میری موجودگی میں جوش صاحب میر صاحب سے کہہ رہے تھے کہ آج کل جو اردو اور ہندی کا تنازعہ چل رہا ہے اس سے ان کو ہندوستان میں اردو ہندی جھگڑے کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ جوش صاحب کہہ رہے تھے کہ اردو ہی صرف وہ زبان ہے جو انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے اور اس زبان میں مغربی علوم کا خزانہ بھی

موجود ہے۔ علاقائی زبانوں میں تعلیم ضرور دیجیے بلکہ یہ ضروری بھی ہے مگر پہلے علاقائی زبانوں میں وہ علم بھی تو منتقل کیجیے جو ذہنوں کو روشن کر سکے اور قوم کے وسائل کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا ہونے کے لائق بنا سکے۔ یہ بات یاد رکھیے کہ سامراج جب کسی قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے اس کو کمزور کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس قوم میں رہنے کے اختلاف کو ہوا دے کر عصبیت کے جذبات کی پرورش کرتا ہے۔ یہ جو آج کل دیواروں پر اردو اور سندھی کے حق میں اختلافی نعرے لکھے جا رہے ہیں یہ مجھے کسی طوفان کی آمد کی خبر دے رہے ہیں۔ بھٹو صاحب آج اسلامی سوشلزم کی بات کر رہے ہیں اور اسلامی ممالک کا بلاک بنا کر چین کے ساتھ تعلقات استوار کر کے پاکستان کو جوہری توانائی رکھنے والا ملک بنانا چاہتے ہیں، یہ سب باتیں استعمار ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرے گا۔ سندھ میں صابر یک طاقتور عنصر ہے اور شہروں میں تو آپ اس کی اہمیت کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتے۔ ابھی تک تو صابروں میں اپنے علیحدہ تشخص کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے مگر مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ اردو اور سندھی کے تنازعہ نے خدانخواستہ شدت اختیار کر لی تو یہاں بھی اختلافات کی تباہ کن آگ پھیل پڑ جائے گی۔ میرے خیال میں مدت کے بعد پاکستان کو ایک اچھا لیڈر ملا ہے جس کو بین الاقوامی تناظر میں اپنے ملک کے حالات کا صحیح عرفان حاصل ہے۔ اس وقت بھٹو صاحب اور ان کے بےحد ساتھیوں کے تدبر اور فراست کا امتحان ہے۔ ابھی کوئی ایسی تحریک جو کسی قسم کے اختلافات کا باعث بن سکتی ہو، جڑ پکڑنے نہیں دینی چاہیے۔ میر صاحب! خدا دیا کچھ کہے کہ یہ پاکستان اسلام کی سربلندی اور اسلامی مملکت کے قیام کی خاطر وجود میں آیا ہے مگر میری بات اچھی طرح سے یاد رکھیے کہ یہ مسلم ریاست تو ہو سکتی ہے بھی یہاں مسلمان تو حکومت چلا سکتے ہیں مگر دنیا کی اقتصادی طاقتیں اس کو اسلامی مملکت کبھی بننے نہیں دیں گی بھی یہاں قرآن کے اسلامی قوانین کا عمل کبھی نہیں ہونے دیا جائے گا۔ یہ مملکت تو صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے سرمایہ دارانہ ممالک روس میں ریشہ دوانیاں کر سکیں اور تیل کے چشموں کی طرف اس کی پیش قدمی کو روکا جا سکے۔ میر صاحب سانس روکے ہوئے جوشی صاحب کی تقریر سن رہے تھے۔ آخر میں چونک کر کہنے لگے جوشی صاحب آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں بھٹو صاحب سے کہوں گا کہ وہ آپ کو اپنا مشیر تعلیم مقرر

کریں۔ جوش صاحب نے کہا میر صاحب میں نے آج تک کسی حاکم کی مصاحبی نہیں کی۔ بھلا میں کہاں اور یہ وبال کہاں۔ ہمیں تو سرنامے پر یہ بیت کی ہے کہ:

یک بخت اوج نذر سبک باری امد　　سر پر وبالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ

یہ جو میں نے آج آپ سے اتنی باتیں کی ہیں تخیل کیجیے میں بھلا صاحب کی دل سے قدر کرتا ہوں اور آپ تو میرے بھائیوں کی طرح ہیں میں اپنے دل کی بات آپ سے نہیں کہوں گا تو اور کس سے کہوں گا۔ میرے لیے ہندی بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی اردو بلکہ پاکستان کے تمام صوبوں کی زبانیں میرے لیے ملک کی زبانیں ہیں۔ یہ ایک گلدستے میں سجے ہوئے مختلف رنگ کے پھولوں کے مانند ہیں جن کے اختلاف رنگ و بو کے باعث گلدستے کا حسن قائم ہے مگر ان سب کو ایک ہی گلدان میں رہنا چاہیے۔ ان کی وجہ سے گلدان کا ٹوٹنا نہیں ہونا چاہیے۔ میر نے ایک جگہ کہا ہے کہ:

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

کسی ملک کی علاقائی ثقافتیں ہوں یا زبانیں یہ رنگوں کی بوقلمونی اثبات بہار کی علامت ہیں مگر ان میں بہار آفرینی کی کیفیت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کوئی ایک قدر مشترک ان کو ایک مرکز کے ساتھ وابستہ رکھ سکے اور زبان کی حد تک یہ ہندوستان صرف اردو زبان ہی بن سکتی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں انگریزی زبان تمام ہندوستان کی قدر مشترک بنا دی گئی تھی کیونکہ وہ حکمرانوں کی ضرورت تھی مگر پاکستان کی حد تک یہاں کی علاقائی زبانوں کا مزاج صرف اردو زبان کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ ان سب کا رسم الخط مشترک ہے۔ ان کا تعمیر ایک ہے ان میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ آج حکومت کو چاہیے کہ وہ ایسی تنظیمیں قائم کرے جو ملک میں لسانی تعصب کو پیدا نہ ہونے دیں بلکہ ملک کے مستقبل کی خاطر یہاں تک کہیں گا کہ اس قسم کے تعصب کو تعزیری جرم قرار دیا جائے۔ اسی صورت میں پاکستان مستقبل کے خطرات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد بھی لسانی اختلاف ہی سے شروع ہوئی تھی۔ جوش صاحب کی ہر بات پر میر صاحب بار بار کہہ رہے تھے۔ سر کار آپ نے بجا فرمایا۔

جوش صاحب کی سماعت ہی بصیرت افروز باتیں جاری تھیں کہ بہت سے لوگ

میر صاحب سے ملنے کے لیے آ گئے اور ہم دونوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب وہاں سے رخصت ہو جائیں چنانچہ جب جوش صاحب نے چلنے کے لیے اجازت چاہی تو میر صاحب ہم کو گاڑی تک پہنچانے آئے اور بہت تپاک سے رخصت کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر رسول بخش ہاپوڑ سدھی تہذیب اور محبت کی مکمل مثال ہیں۔ میر صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ برسی روڈ آئے وہاں لسی پی اور ایک بجے جوش صاحب کو ان کے مکان پر پہنچا کر میں اپنے گھر آ گیا۔ چلتے وقت جوش صاحب نے اصرار کیا کہ آج شام کو بھی آ جاؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ گھر آ کر میں نے دوپہر کا کھانا کھایا، تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد شام پانچ بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت وہاں راغب صاحب مرزا آبادی اور میاں فراست رضوی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے وہ سب باتیں تفصیل سے بتائیں جو آج جوش صاحب نے میر صاحب سے کی تھیں۔ اس پر راغب نے ایک سوال نامہ مرتب کر کے اس پر جوش صاحب کے جوابات لکھ کر ان کے دستخط لے لیے۔

راغب صاحب نے سوال کیا کہ اگر علاقائی زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دے کر اردو کو صرف رابطے کی زبان کی حیثیت سے باقی رکھا جائے تو اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ جوش صاحب نے کہا ایسا نظریہ تنگ نظری کی بدترین مثال ہو گا۔

راغب صاحب نے پھر دریافت کیا کہ جب اردو کسی صوبے میں پڑھائی ہی نہیں جائے گی تو اس کو رابطے کی زبان کا درجہ دینے سے کیا حاصل ہو گا؟ جوش صاحب کا جواب تھا کہ ظاہر ہے کہ جب پڑھائی نہیں جائے گی تو رابطے کا کام کیا دے گی۔

راغب صاحب نے پوچھا کہ اگر مادری زبان میں تعلیم دی جائے تو وہ انگریزی یا اردو کے مقابلے میں زیادہ مفید ہو گی یا نہیں۔ جوش صاحب نے کہا کہ کسی بھی زبان کے ساتھ تعصب نہیں ہونا چاہیے۔ علم خواہ کسی زبان میں ہو حاصل کرنا چاہیے اور یہ تو بڑی واضح بات ہے کہ اگر تعلیم مادری زبان میں دے جائے گی تو ذہن آگے بڑھے گا اور سترہ تاریخ مرتب ہوں گے بشرطیکہ اس زبان میں علم کا ذخیرہ اور ابلاغ علم کی صلاحیت موجود ہو۔ اتنے میں موسم خراب ہو گیا۔ بے تحاشہ بجایا گیا۔ چنگیری میں چنبیلی کے پھول بھر کر میز پر رکھ دیے گئے۔ بی اے کی اگربتیاں جلا دی گئیں۔ جوش صاحب کی وہ تاثر پیتیں جس میں ایک بلی اشارہ چشم سے

وقت گزرنے کا اعلان کرتی رہتی ہے سامنے میز پر رکھ دی گئی اور جوش صاحب نے "بیاد فلاں بنت فلاں" لکھ کر گلاس منہ کو لگایا اور ایک گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھ دیا۔ جب صاحب نے کلام سنانے کی فرمائش کی تو جوش صاحب نے فرمایا کہ صاحبو! ایک نظم سنیے اور قاضیوں کی داد دیجیے۔ نظم کا عنوان ہے "آگئی جوانی"۔

"آگئی جوانی"

کسی کی شمع کم عمری کی کساہٹ کے دن آئے
ترنگیں کوک اٹھیں سینے میں جناہٹ کے دن آئے
جوانی کی نکیلی سنسناتی کوندتی تیغے
لہو سے آنچ نکلی تن کی اہلاہٹ کے دن آئے
روپہلی سطح پر کھڑے کی دھڑیں جھپٹی کریں
کٹیلی رسس بھری آنکھوں کی کھلاہٹ کے دن آئے
دلائی میں چھپایا گونجتے سینے کے فتنوں کو
جھکائی شوخیوں نے آنکھ شرماہٹ کے دن آئے
کھلونے پن کے کھڑے پر رسس آیا لو جوانی کا
لب و رخسار کی خشکی میں چکناہٹ کے دن آئے
مرے ٹھنڈے عرق آلود لمحوں کو مبارک ہو
کہ اس کے شرمتی پنڈے کی گرماہٹ کے دن آئے
رگ و پے سے دھواں اٹھا دھویں سے لو نکل آئی
نگاہ ناز سے لوہے کی پگھلاہٹ کے دن آئے
نظر پڑنے لگی رنگ منوشش لالہ و گل پر
خدا کا شکر ہے گزریں سے اکتاہٹ کے دن آئے

رہا کرتی تھیں محو خواب جو محراب ابرو میں
تو اتنے سب ان پلکوں کی جھپکاہٹ کے دن آئے
زہے قسمت کہ اس کی بدنامی کے دو کاوش سے
ہمارے بے شکن بستر کی گنجائش کے دن آئے
الٰہی خیر سس طوفان میں بیسب و گریاں کی
کہ اب انگڑائی سے چوں کی مسکاہٹ کے دن آئے
گلک پیدا ہوئی موج نفس کی آمد و شد میں
گہر بھیجے لگا سینے میں گدراہٹ کے دن آئے
خدا کا شکر اب اسے جوش راتوں کے اندھیرے میں
سرہانے کسی کے پاؤں کی آہٹ کے دن آئے

سب نے قوالی کی دل کھول کر داد دی۔ چوتھے پیگ کے دوران میں کھانا آ گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جوش صاحب نے خوب کلیاں کیں۔ راجب صاحب نے کہا جوش صاحب آج کل آپ کی کلیات خوب مشہور ہو رہی ہیں۔ آخر میں جوش صاحب نے ایک کپ دودھ ایک چمچ اسپ غیل کی بھوسی ملا کر پی لیا اور سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں چلے گئے اور محفل برخاست ہو گئی۔

اس واقعے کے تقریباً ایک ہفتے تک میں اپنے کاموں میں مشغول رہا کہ جوش صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔

بابا صاحب اور منصور حلاج:

جمعہ ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء صبح آٹھ بجے جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ کہنے لگے ارے بھئی کہاں غوطہ لگایا۔ ارے بھائی کہاں غائب ہو گئے ہو؟ میں نے کہا کچھ کام تھے اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔ فرمایا اب کب آؤ گے۔ عرض کیا آپ جب حکم دیں۔ فرمایا میں آج دبئی شاید کے وہاں جا رہا ہوں اگر نو بجے تک آ سکو تو تم بھی میرے ہمراہ چلو۔ چنانچہ میں ایک گھنٹے میں تیار ہو کر ٹھیک نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب تیار کھڑے تھے۔

ہمدوش پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی۔ ایچ۔ ایس میں بابا صاحب کے مکان کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ کو بابا صاحب سے واقعی اتنی محبت ہے کہ آپ بار بار ان سے ملتے رہتے ہیں۔ جوش صاحب سچ سچ بتلایئے کہ آپ بابا صاحب کی ذہانت و ذکاوت سے متاثر ہیں یا ان کے حلقۂ ارادت کے حسن و جمال سے؟ جوش صاحب نے میری طرف سماعت معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر فرمایا میاں اب تم بھی دل کے نہاں خانوں میں پہنچ کر چور پکڑنے لگے ہو۔ میں نے کہا یہ بات تو ظاہر ہے کہ بابا صاحب کے حلقہ اور ان کا مبلغ علم آپ کے نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ پھر قدر مشترک یا تو شاعری ہے یا ان کی محفلیں ہیں موسیقی و فلسفہ سے لطف اندوز ہونے کی خواہش یا پھر جمال پری رخاں کی حقیقت مسدی ہے۔ آپ کے اندر کے شاعر نے جذبہ حسن پرستی کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ جوش صاحب کہنے لگے کہ یہ تمام باتیں یعنی بابا صاحب کی ذہانت و ذکاوت، ان کی شاعری، ان کے حلقۂ ارادت کا حسن و جمال و فلسفہ و حال ان سب نے مجھے متاثر کیا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے علاوہ بابا صاحب کی محبت ان کا خلوص، ان کی طلسماتی شخصیت کا سحر ان کی مسحور کن اور ہر ایک شخص کی تکلیف دور کرنے کی خصوصیت ان تمام باتوں نے مجھے بابا صاحب کا گرویدہ بنایا ہے اور میں زیادہ تر بابا صاحب سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اتنے میں بابا صاحب کا آستانہ آ گیا۔ ہم لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ بڑے ہال میں وہ اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب کو دیکھتے ہی محبت سے اٹھ کر گلے ملے اور اپنے قریب بٹھا لیا۔ معلوم ہوا ہے ہمارے آنے سے پہلے بابا صاحب منصور حلاج کے متعلق کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی، انھوں نے فرمایا لوگوں نے منصور حلاج کو بہت غلط سمجھا ہے۔ کوئی شخص اس کے علم کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کی ذہانت و ذکاوت، اس کا شعور ذات بے پناہ بلند تھا۔ منصور نے اپنی روح کو اس کائنات کی روح اعظم کے ساتھ ہم آہنگ محسوس کیا تھا اس نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اسے اپنی انا کی عظمت کا ادراک ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ روح جو مجھ میں ہے وہی اس تمام کائنات کی قوت حیات ہے۔ جب وہ انا الحق کہتا تھا تو اس کا مطلب اسی روح کی حقانیت کا اعلان تھا۔ وہ اپنے وجود کے حق ہونے کا دعویدار تھا۔ اس کے خیال میں اس کائنات میں وجود صرف واجب الوجود کے لیے ہی نہیں

ہے باقی تمام ظاہری صورتیں دھوکا ہیں اور چونکہ میری روح بھی اسی واجب الوجود کا حصہ ہے اس لیے میں بھی حق ہوں۔ بابا صاحب نے ایک کتاب دکھا کر فرمایا کہ یہ ایک فرانسیسی مصنف کی کتاب ہے۔ میں نے بہت محنت سے منصور حلاج کی کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور وہ خود بھی اس کتاب پر کام کر رہے ہیں۔

بابا صاحب نے کہا کہ مسلمان صوفیاء میں وحدت الوجود کا تصور بھی یہی ہے۔ علامہ محی الدین ابن عربی نے بہت تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ "حق" بصورت عینیت میں عدم میں ہے لیکن عالم خلق میں وہ مثال میں ظاہر ہے۔ اس طرح مخلوقیت کے مرتبہ میں وجود یعنی ہستی حق نے کر پیدا ہوئی کیونکہ حقائق خلق، صورت محض ہیں مگر یہ تمام صورتیں دراصل حق ہی کی ہیں اور تمام تخلیق حق ہے۔ یہاں حق دراصل وجود یا ذات کے معنی میں استعمال ہوا ہے صورت کے معنی میں نہیں۔ شیخ اکبر نے فتوحات مکیہ میں وجود اور صورت کی قربت کو ثابت کیا ہے۔ میں نے کہا بابا صاحب ہم لوگ بحیثیت قوم بڑے مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ اب ہم شیخ اکبر اور منصور حلاج کے فلسفے کو لیے بیٹھے ہیں اور جو یہ آپ کے سامنے دور جدید کا منصور ابن الحق حضرت جوش کی شکل میں بیٹھا ہوا ہے آپ اس کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ میرے دل کی معقولات سے بابا صاحب یہ سمجھے کہ ان کی بات چونکہ بہت گہری اور مشکل مسائل سے متعلق تھی اس لیے میری سمجھ سے بالاتر ہے اور میں موضوع بدلنا چاہتا ہوں۔ اس لیے وہ ایک دم خاموش ہو گئے۔ مگر جوش صاحب نے کہنا شروع کیا کہ اردو اور فارسی کے زیادہ تر شعراء نے وحدت الوجود کے فلسفہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ خاص طور سے غالب نے اس پر بہت اچھے شعر کہے ہیں جیسے:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بابا صاحب فکر و استغراق کے عالم میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے جہاں منکر عارفی کائنات کی لطیف ترین شے سے بھی زیادہ لطیف ہو جاتا ہے۔ میرا ایک شعر ہے:

گاہ دل اتنی لطافت میں ڈبوتا ہے مجھے چاندنی کا بدن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے

مگر ایک منزل اس سے آگے اور بھی ہے جہاں منکر، فکر اور عارفی کائنات میں کوئی تمیز

بات ہی نہیں رہتی۔ جیسے غالب نے کہا ہے کہ

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

میری ایک رباعی ہے

عقل و حرف و سوسن و خاشاک و گیاہ — تم دگر و ذرہ و خار و خس و کاہ

جب پردۂ اشکال اٹھایا تو کھلا — میرے سے ہی یہ سب نام ہیں اللہ اللہ

بابا صاحب یہ رباعی سن کر جھومنے لگے۔ فرمایا تیسرے مصرع میں لفظ کھلا اور چوتھے میں اللہ کا جواب نہیں ہے۔ جوش صاحب آپ واقعی محبوب الٰہی ہیں۔ جوش صاحب نے کہا یہاں محبوب کی اضافت محلِ فصاحت ہے۔

بابا صاحب نے مسکرا کر کہا مگر مذہبیت ہے۔

جوش صاحب ..... وہ کیسے؟ بابا صاحب نے کہا تاکہ آپ کو دور سے محسوس کیا جائے۔ بات سمت گیری تک پہنچ گئی تھی۔ دو عظیم صوفی ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ بابا صاحب نے کہا جوش صاحب جس کو آپ فکر کہتے ہیں یہ انسان کو بڑے دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے انسانی فکر کو قرآنی علم کے تابع کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد بابا صاحب نے علم کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بے خاص فلسفۂ فکر سے فرمایا کہ علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک مادی اشیاء کا علم جو انسان اپنی عقل کے توسط سے حاصل کر سکتا ہے لیکن اس کی عقل روح کی ماہیت سمجھنے سے قاصر ہے۔ روح کی حقیقت سمجھنے کے لیے دوسری طرح کے علم کی ضرورت ہے جسے الہام یا وحی کہتے ہیں۔ یہ علم نبیوں اور پیغمبروں کو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور ہم جو کچھ روح کے متعلق جان سکتے ہیں وہ وہی ہے جو نبی نے ہم کو بتایا ہے۔ روح دراصل مراتبی شے ہے اور یہ مرتبہ کن کا حکم ہر وقت جاری رہتا ہے۔ میں نے عرض کیا بابا صاحب یہ بتایئے کہ کیا روح موجود بالذات کوئی الگ شے ہے جو مادے سے ماورا اپنا وجود رکھتی ہے یا یہ صرف ایک توانائی ہے جو ہمارے ادراک میں مادی مظاہر کے توسط سے آتی ہے۔ اسی توانائی کو علم طبیعیات کی رو سے انرجی کہا جاتا ہے اور جس کو ہم عقل کہتے ہیں وہ بھی دراصل انرجی ہی ہے جو ہمارے دماغی خلیات کے توسط سے ظاہر ہوتی ہے ..... اور جس کو ہم الہام کہتے ہیں یہ بھی ہمارے دماغ ہی کا

ایک پیچیدہ عمل ہے جس کے توسط سے خود ہمارا اپنا صحیح علم ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک قدیم غلط نظریہ یہ بھی ہے کہ ہمارا دل عضو فکری ہے حالانکہ علم افعال اعضا (Physiology) کی رو سے اب یہ بات بلا خوف تردید کہی جاتی ہے کہ عضو فکری صرف دماغ ہے اور دل محض ایک پمپ ہے جس کے ذریعے سے خون جسم کے تمام اعضا میں پہنچایا جاتا ہے۔ جوش صاحب میرے سوال کی معقولیت مگر موقع اور محل کی نسبت سے اس کی نامعقولیت کو سمجھ رہے تھے۔ زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ بولے "میاں یہ تمہارا سوال جواب آمیز زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ اس وقت آپ اپنی سائنسی فکر کو لگام دیں اور بابا صاحب سے منصور حلاج کے متعلق سنیں۔ مگر بابا صاحب نے فرمایا۔ "نہیں نہیں ان کو کہنے دو یہ آج کل کے سائنسی فکر رکھنے والے لوگ۔ تو روح کی ماہیت کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ وحی کی حکمت کو۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے روحانی طاقت کو حاصل کرنا پڑتا ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ مگر اس تمام بحث کے دوران بابا صاحب کے چہرے پر ان کی فطری محبت، شرافت اور وقار میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوا۔ وہ سنجیدگی سے یہ کہہ رہے تھے کہ چونکہ میرا علم ناقص ہے اس لیے ان کا فرض ہے کہ وہ میری صحیح راہنمائی فرمائیں۔ مگر جوش صاحب اس گفتگو کا رخ بدلنا چاہتے تھے کہ اتنے میں نے فی لون کی گھنٹی بجی۔

فضل احمد کریم فضلی ـــــ بیت الغزل:

بابا صاحب نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف فضل احمد کریم فضلی صاحب کا نے فی فون تھا۔ انہوں نے کہا بابا صاحب اور جو حضرات ان کے پاس بیٹھے ہیں وہ سب ان کے گھر پہنچ جائیں۔ بابا صاحب نے کہا کہ جوش صاحب اور ان کے دوست خورشید علی خاں بھی میرے ساتھ ہوں گے چنانچہ ہم تینوں فضلی صاحب کے مکان "بیت الغزل" پہنچ گئے۔

فضلی صاحب کچھ علیل سے بیمار ہیں مگر آج خوش دکھائی دے رہے تھے۔ فضلی صاحب اپنے پلنگ پر گاؤ تکیے سے لگے نیم دراز تھے اور انہوں نے بیٹھے بیٹھے ہی ہمارا استقبال کیا۔ کہنے لگے ضعف بہت بڑھ گیا ہے کھڑا ہوتا ہوں تو چکر آنے لگتے ہیں۔ ہم لوگ بیٹھے ہی تھے کہ ماہر القادری صاحب اور ان کے ساتھ ایک اور صاحب آ گئے۔ ماہر صاحب کو

ست دن بعد دیکھا تھا۔ داڑھی پر خضاب لگانے لگے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ بھی کچھ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ خیریت پوچھی اور خاص طور پر حیدرآباد دکن میں میری بہن اور ان کے شوہر پروفیسر اور سابق ایم۔ پی۔ اے اختر حسن صاحب کے متعلق پوچھنے لگے کہ اب کیسے ہیں۔ میں نے کہا ست دنوں سے کوئی خط نہیں آیا مگر سب لوگ خیریت سے ہیں۔ اس کے بعد سب نے فضلی صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ فضلی صاحب ست دیر تک کلام سناتے رہے۔ ایک شعر پر جو یہ تھا،

اثر دل پہ کرتی تو یاروں کی باتیں مگر ان کا ہونا تھا ناحسانہ

ماہر صاحب نے کہا مگر ان کا انداز تھا ناچیزانہ

بابا صاحب نے کہا، کبھی جوشیلہ کبھی ماہرانہ

یہ غضب ہو رہا تھا کہ ایک خاتون سبز چائے لے کر آگئیں اور ہر ایک سے پوچھ کر کہ وہ کتنے چمچے شکر استعمال کریں گے۔ ہر ایک کی پیالی میں کسی میں ایک کسی میں دو چمچے شکر ڈال کر پیالے دیتی رہیں۔ جب ماہر صاحب کی باری آئی تو انھوں نے ایک لطیفہ سنانا شروع کر دیا کہ ایک محفل میں ایک خاتون نے ان سے پوچھا کہ وہ کتنے چمچے شکر پیتے ہیں۔ انھوں نے کہا آپ ڈالتی جائیں تو خاتون نے جب آٹھ چمچے شکر پیالی میں ڈال کر ہاتھ روک لیا تو وہ کہنے لگے کہ میں نے شرم کے مارے مزید شکر مانگنا مناسب نہ سمجھا اور چائے پھیکی ہی پی گیا۔ اس وقت تک ماہر صاحب کی پیالی میں چار چمچے شکر پڑ چکی تھی۔ میں نے کہا ماہر صاحب آپ تو حیدرآباد میں رہ کر کھڑا چمچا پینے کے عادی ہیں مگر اب اس عمر میں شکر کا زیادہ استعمال نقصان دہ ہے اس لیے اب آپ پھیکی چائے ہی لیجیے۔ ماہر صاحب کہنے لگے چچا بھائی آپ کہتے ہیں تو پھیکی ہی چائے پیے لیتا ہوں۔ اس کے بعد پھر شاعری شروع ہو گئی جوش صاحب نے ایک نظم سنائی۔ ماہر صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا۔ بابا صاحب نے بھی کلام سنایا۔ ایک شعر پر سب نے ست داد دی مجھے اور جوش صاحب کو بھی ست پسند آیا۔

تصور مکان حرم میں دل رمیدہ دیر یہاں خدا کے تصور میں بت گری سی ہے

یہ شعر سب کو اتنا پسند آیا کہ کئی دفعہ پڑھوایا گیا

اس کے بعد بابا صاحب نے ایک اور عارفانہ غزل سنائی جس کے دو شعر سب نے پسند کیے۔

نظر سے آپ کا نقشِ قدم جہاں گزرے — وہ بدنصیب ہے مجھ سے جسے گماں گزرے
وہ اہلِ عشق نہ اہلِ یقیں نہ اہلِ ادب — ترے حضور سے خیر کا گماں گزرے

باہر صاحب نے گرہ لگائی،

خدا کرے کہ وہ ساعت بھی جلد آ جائے — جناب جوش پہ جب بوجھ سے گراں گزرے

سب نے تو آمین کہی مگر جوش صاحب نے فوراً کہا۔ انشاء اللہ آپ کی دعا کبھی قبول نہیں ہو گی۔ کیونکہ،

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم — نے بے خبر ز لذتِ شربِ مدام،

غرض ایک بجے تک یہ دلچسپ محفل شعر و سخن جاری رہی۔ پھر سب ایک ایک کر رخصت ہو گئے۔ میں نے بابا صاحب کو ان کے گھر پہنچایا۔ جوش صاحب کو ان کے گھر۔ وہ پھر جلد ملنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر آ گئے۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کہ کل فرصت ہو تو صبح دو بجے تک آ جاؤ میر صاحب کے گھر چلیں گے مجھے ان سے ضروری کام ہے۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

سرکاری وظیفہ کی درخواست:

دوسرے دن صبح دو بجے میں جوشش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہ تیار بیٹھے تھے لہٰذا میرے ساتھ ہو لیے۔ ہم لوگ میر رسول بخش جاپور کی سرکاری قیام گاہ پہنچے۔ دس بج رہے تھے معلوم ہوا کہ مشیر اعلیٰ ابھی تک آرام فرما رہے ہیں مگر ان کے سیکرٹری نے مجھے اور جوشش صاحب کو اندر ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھا دیا۔ جوش صاحب نے ایک پرچے پر اپنا نام لکھ کر سیکرٹری کو دیا تاکہ وہ میر صاحب کو جوشش صاحب کے آنے کی اطلاع دے سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں میر صاحب شب خوابی کے لباس میں چلے آئے اور جوش صاحب سے معذرت چاہی کہ انھیں انتظار کرنا پڑا۔ چائے میں چائے اور بسکٹ وغیرہ بھی آ گئے۔ اس سے پہلے کہ جوش صاحب کوئی بات شروع کرتے میر صاحب نے کہنا شروع کر دیا۔ "صاحب ایسی قوم سے واسطہ پڑا ہے کہ جو ملک میں بدنظمی اور انتشار پیدا کرتی رہتی ہے اور کسی طرح امن و امان کا قیام گوارا نہیں کرتی۔ اب دیکھیے کل ہاکس بے پر چند شرپسند لڑکوں نے اسکول

کی ڈاکیوں کی بے عزتی کی اور انھیں پریشان کیا۔ صدر بھٹو صاحب سخت ناراض ہیں۔ اس کو بھی کوئی سکون سے کام نہیں کرنے دیتا۔ جوش صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر بھٹو صاحب کو کام کرنے دیا گیا تو وہ اس ملک کی تقدیر بدل دے گا۔ جوش صاحب نے کہا کہ میر صاحب اس وقت بھٹو صاحب کو سخت ٹھنڈے دل سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میر صاحب نے کہا۔ سر کار اس وقت کیسے زحمت فرمائی۔ میرے لائق کوئی حکم ہو تو فرمائیں۔ جوش صاحب نے کہا میر صاحب آپ کو تو معلوم ہے کہ روشن علی بھیم جی ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی سے مجھے دو ہزار روپے ماہانہ دیا کرتے تھے مگر اب حکومت نے اس کمپنی کو قومی ملکیت میں لے کر بھیم جی کو الگ کر دیا ہے۔ اس لیے انھوں نے میری ماہانہ رقم بند کر دی ہے۔ میر رسول بخش صاحب نے کہا جوش صاحب آپ بالکل فکر نہ کریں میں آج ہی بھٹو صاحب سے بات کروں گا اور آپ کا ماہانہ وظیفہ سخت جلد جاری ہو جائے گا۔ یہ حکومت کسی کی جاگیر تو نہیں ہے اگر ہم اس حکومت سے لے سکتے ہیں تو آپ کو بھی ضرور دلائے گا۔ میں بھٹو صاحب سے اس معاملے کو طے کرا کے آپ کو خود مطلع کروں گا اور یہ کام انشاء اللہ کچھ دنوں میں ہی ہو جائے گا۔ میر صاحب نے جوش صاحب کو اس طرح مطمئن کیا کہ وہ خوش ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے کہا کہ چلو آغا حسن عابدی صاحب کے گھر چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ کلفٹن روڈ پر واقع آغا صاحب کے گھر چلے گئے۔

آغا حسن عابدی صاحب:

جب ہم ان کے گھر پہنچے تو اس وقت وہ نماز پڑھ رہے تھے معلوم ہوا کہ آغا صاحب کی نماز ہو رہی ہے مگر جب ان کو جوش صاحب کے آنے کی خبر دی گئی تو وہ تیار ہو کر تقریباً ایک گھنٹے میں باہر آئے مگر اس مدت میں آغا صاحب کے ملازمین نے ہم کو بہت لذیذ چائے پلائی اور کھانے کی بہت سی چیزیں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ آغا صاحب کا مکان بہت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ ڈرائنگ روم کا سفید قالین اور اس سے مناسبت رکھنے والے خوبصورت ریشمی پردے بہت جاذب نظر تھے۔ وہاں کی ہر چیز کی سجاوٹ سے مکین کے اعلیٰ ذوق حسن کا پتا چلتا ہے۔ آغا صاحب نے آتے ہی ہمارے انتظار کی زحمت برداشت کرنے پر

حالی، لگی پھر جوشش صاحب کے آنے کا سبب دریافت کیا تو جوش صاحب کہنے لگے کہ ان کو کسٹم کی طرف سے کلیرنگ فارورڈنگ (Clearing Forwarding) کا لائسنس ملا ہے جس پر ان کے ایک عزیز عادل صاحب کام کر رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ آغا صاحب اپنے بینک (یونائیٹڈ بینک) کا کلیرنگ کا تمام کام ان کی ایجنسی کو دیں تاکہ جوش صاحب کی آمدنی کی کوئی سبیل ہو سکے۔ آغا صاحب نے کہا کہ ان کے پاس کام زیادہ نہیں ہے مگر اس ضمن میں ان سے جو کچھ ہو سکے گا وہ ضرور کریں گے۔ اس کے بعد آغا صاحب سے کچھ فلسفیانہ قسم کی باتیں ہونے لگیں۔ آغا صاحب کی شخصیت جس قدر دلکش ہے ان کی قابلیت اور انداز گفتگو بھی بہت متاثر کرنے والا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کائنات ہر آن تغیر پذیر ہے۔ یہ کوئی مکمل شدہ شے (Finished Product) نہیں ہے بلکہ اس میں لامحدود امکانات پوشیدہ ہیں۔ ہم جو اس کل کا ایک جزو ہیں جیسے قطرہ دریا کا جزو بھی ہے اور اس کے صفات بھی رکھتا ہے۔ ہماری صلاحیتیں بھی ترقی کر کے اس کائنات سے استفادہ کر سکتی ہیں۔ انسان کو کبھی بھی موجودہ حالت پر قناعت کر کے بیٹھنا نہیں چاہیے بلکہ اس کو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں لگے رہنا چاہیے۔ میں نے کہا آغا صاحب اقبال نے بھی اسی تصور کو پیش کیا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں — ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاک است

اور غالب نے کہا ہے کہ:

جادادہ نوشی رہ دس سے شش جہت — غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

آغا صاحب بھی ہاں یہی بات ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ چونکہ یہ کائنات (Finished Product) نہیں ہے اور اپنے اندر لامحدود امکانات رکھتی ہے۔ اس لیے یہ کام انسان کا ہے کہ وہ اس ہر آن تغیر پذیر کائنات کو اپنی مرضی کے مطابق (Shape) دے۔ دنیا میں صرف وہی انسان یا اقوام بام عروج پر متمکن ہونے کی حقدار ہیں جو اس تغیر پذیر جہاز کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ میں نے کہا آغا صاحب آپ کو یہ باتیں کہنے کا حق ہے کیونکہ یہی آپ کا عملی فلسفہ حیات بھی ہے۔ راستے میں ملازم نے آ کر کہا کہ آغا صاحب کے لیے اسلام آباد سے ٹیلی فون ہے اور بھٹو صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ آغا صاحب نے

ذکر چلے گئے اور میں اور جوش صاحب آپس میں باتیں کرنے لگے کہ آغا صاحب نہ صرف قلندرانہ فکر رکھتے ہیں بلکہ اس کے مطابق عمل بھی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تقریباً تیسرے گھنٹے بعد آغا صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے کہ بھٹو صاحب نے اسلام آباد بلایا ہے وہ بینکوں کو قومی ملکیت میں لینا چاہتے ہیں۔ میں جا کر ان سے کچھ مہلت لینے کی کوشش کروں گا۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے آغا صاحب سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو انھوں نے کہا آپ کل گیارہ بجے تک، اگر دفتر تشریف لے آئیں تو میں آپ کے سامنے متعلقہ افسر کو بلا کر کہہ دوں گا کہ آئندہ سے بنک کا تمام کلیرنگ فارورڈنگ کا کام وہ آپ کی ایجنسی کو دیا کریں۔ غرض کہ دو بجے ہم لوگ آغا صاحب کے گھر سے رخصت ہو کر اپنے اپنے گھر آ گئے۔

دوسرے دن میں اور جوش صاحب آغا صاحب کے دفتر یونائیٹڈ بینک کے صدر دفتر پہنچے۔ آغا صاحب کسی میٹنگ میں مشغول تھے مگر جیسے ہی ان کو جوش صاحب کے آنے کی اطلاع ملی فوراً ہم لوگوں کو اپنے دفتر میں بلوا لیا۔ جوش صاحب کے کام کے سلسلے میں انھوں نے متعلقہ افسر کو بلا کر ہدایات دے دیں کہ آئندہ کلیرنگ فارورڈنگ کا کام جس قدر ممکن ہو جوش صاحب کی ایجنسی کو دیا جائے ..... چونکہ جوش صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ آغا صاحب سخت مصروف ہیں، ان کو بھٹو صاحب نے اسلام آباد بلایا تھا اس لیے آغا صاحب اپنے مشیروں سے مشورہ کر رہے تھے کہ اگر بھٹو صاحب سے بینکوں کے قومیانے کا مسئلہ اٹھے تو ان کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے ـــــ اس لیے ہم لوگ جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئے اور چونکہ نصرت اللہ خاں کا دفتر بھی پولیس ہیڈ آفس یونائیٹڈ بنک سے بہت قریب تھا اس لیے جوش صاحب نے ان سے ملنے کی خواہش کی تو ہم لوگ ان کے آفس چلے گئے۔ وہاں جیسے ہی جوش صاحب کی آمد کا علم دوسرے پولیس افسروں کو ہوا بہت سے افسر نصرت کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ نصرت نے سب کی توضیع چائے اور بسکٹ سے کی۔ کچھ لوگوں نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی مگر جوش صاحب نے اس مقام کو شاعری کے لیے مناسب نہیں سمجھا۔ وہ صرف نصرت کی خیریت دریافت کرنے کے لیے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم لوگ رخصت ہوئے اور میر رسول بخش تالپور کی قیام گاہ پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ میر صاحب صدر بھٹو سے ملاقات کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب نے ایک پرچہ پر اپنے

آنے کی اطلاع میر صاحب کو دی اور گھر آ گئے۔

دوسرے دن شام کو میں، راغب صاحب اور چند دوسرے احباب جوش صاحب کے مکان پر جمع تھے۔ جوش صاحب نے کہا کہ میں کل بھی چھٹی اپریل کو صبح کی گاڑی سے پٹنہ جا رہا ہوں۔ تیسرے دن میں میر صاحب کا نئے لی لون آیا تھا۔ فضل نے کہا کہ مجھے بھرتو صاحب نے اسلام آباد بلایا ہے۔ میر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ کس نے بلایا ہے وہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو گا۔ اس کے بعد سب نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب نے پہلے کچھ رباعیات سنائیں۔

وہ گرد ہے سب نئے ہوئے ہیں معبود — سب ایک سبق رٹے ہوئے ہیں معبود
ہاں دیکھ کہ اس گنبد زنگاری میں — کتنے احمق ڈسے ہوئے ہیں معبود

جوبن دل سے چمن کو مہکاتا ہے — خود کو پیے آب و رنگ مسرور ہوتا ہے
سوروں کے بغلوں میں پھول بٹ جاتے ہیں — ہاں ہے کہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے

اس کے بعد یہ نظم سنائی

دشمن سے بھی جب تک کہ محبت نہیں ہوتی — تکمیل عروج بشریت نہیں ہوتی
اس درجہ ہے آگاہی رفتار تنفس — دنیا کی کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی
رگ رگ میں بھڑکتے ہی دم فکر جو شعلے — دوزخ کے شراروں میں وہ وحشت نہیں ہوتی
اندر سے جو بھرے وہ حقیقت میں خوشی ہے — باہر سے جو آئے وہ مسرت نہیں ہوتی
افلاس کو مل جائے گر خاطر مجموع — پھر دولت آفاق کی حاجت نہیں ہوتی
آتی ہے وہ شب بھی کبھی آغوش جہاں میں — اللہ کی بندے کو ضرورت نہیں ہوتی

اس کے بعد جوش صاحب جب طرح ہو گئے تو میں نے جوش صاحب کا کلام سنانا شروع کر دیا۔ بہت سی رباعیات اور نظمیں سنا چکا تو جوش صاحب نے کہا اسے میاں تمہیں تو میرا کلام مجھ سے زیادہ یاد ہے۔ اس پر راغب صاحب نے فوراً یہ رباعی فی البدیہہ ارشاد فرمائی۔

عظمت پہ اس انسان کی کیوں رشک نہ آئے — اس عالمِ اس شان پہ کیوں رشک نہ آئے
پڑھتے ہیں کلام جوش کے سے راغب — خورشید علی خان پہ کیوں رشک نہ آئے

غرض رات پونے نو بجے تک شعر و شاعری کی محفل گرم رہی۔ جوش صاحب چوتھا پیگ ختم کر کے کھانا تناول فرما چکے تو دریافت فرمایا۔ صاحبو اب کیا وقت ہوا ہے تو میں نے عرض کیا۔ دو ہی بجے ہیں باقی ہیں۔ جوش صاحب بولے۔ پھر بھی سنتے صبح باقی ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے کون شخص وہاں بیٹھ کر صبح کھلانے کی بے غیرتی برداشت کر سکتا تھا۔ جوش صاحب کو ان کے مداحوں کے حوالے کر کے ہم سب رخصت ہونے لگے۔ چلتے چلتے جوش صاحب نے مجھ سے کہا۔ کل ہمیں گاڑی میں بٹھانا نہ بھولیے گا۔ میں نے وعدہ کر لیا اور گھر آ گیا۔

جوش صاحب کی اسلام آباد روانگی اور ملازمت کی کوشش:

دوسرے دن چھٹی اپریل ۱۹۸۲ء کو میں جوش صاحب کو تیز گام پر سوار کر کے گھر آ گیا اور جوش صاحب پنڈی روانہ ہو گئے۔

جوش صاحب اسلام آباد کس مقصد سے گئے تھے؟ انھوں نے تو سرسری طور پر یہ بتایا تھا کہ بھٹو صاحب نے ان کو وہاں بلوایا ہے مگر یکم مارچ ۱۹۸۲ء کے روزنامہ جنگ میں مولانا کوثر نیازی کا ایک مضمون بہ عنوان "حضرت جوش ملیح آبادی ..... چند یادیں" "شاہدات و تاثرات" کے کالم میں چھپا ہے۔ یہ مضمون مولانا نے جوش صاحب کی دوسری برسی کے موقع پر تحریر فرمایا ہے۔ اس سے جوش صاحب کے اس سفر کے مقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے مولانا کا مضمون یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"۲۲ اپریل ۱۹۸۰ء کی بات ہے میں وزارت اطلاعات کے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ پرسنل سیکرٹری نے ایک پرچہ لا کر دیا۔ اس پر حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنے ہاتھ سے یہ تین رباعیاں لکھ بھیجی تھیں۔

ہاں قطب خرابات مغاں آیا ہے — سلطان بیاں و خوباں آیا ہے
کوثر نواز ہو کہ ساحل پہ ترے — سر حلقۂ رندانِ جہاں آیا ہے

ایک جھلک مجھے بخش گلستاں لے لے — ایک قطرہ پلا بحرِ پر افشاں لے لے
دے دے قرعِ آتشِ سیماں مجھے — اور اس کے صلے میں آبِ حیواں لے لے

اے پیرِ مغاں دستِ ہنر پرور امداد دے — برگشتہ ہے پھر مجھ سے مقدر مدد دے
پھر دے میرے سوئے کو بھر دے — اے حاصلِ ساقی کوثر مدد دے

ناہید برادران جناب میر علی احمد ناہید اور میر رسول بخش ناہید مرحوم جن سے حضرت جوش کے پرانے مراسم تھے اور ادب پروری جو سے پہلے ہی ذکر کر چکے تھے کہ جوش صاحب مجھ سے ملنے کے لیے اسلام آباد آنا چاہتے ہیں مگر اس وقت کسی پیشگی اطلاع یا ان کے بغیر ان کی تشریف آوری میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں کابینہ کے اجلاس میں پیش کرنے کے لیے ایک اہم مسودہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ کوئی اور ملاقاتی ہوتا تو میں اسے شاید ہی مل پاتا لیکن جوش صاحب کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے میں نے کاغذات ایک طرف رکھ دیے اور خود استقبال کے لیے جا کر انھیں اپنے ہمراہ لے آیا۔ جوش صاحب کچھ ہی عرصہ پہلے بھارت کو چھوڑ کر پاکستان آئے تھے اور ہم دوراں[1] کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی معقول ملازمت کی تلاش میں تھے۔ میں نے عرض کیا "فوری طور پر تو میں کچھ نہ کر سکوں گا لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کے حسب حیثیت کوئی صورت پیدا ہو جائے"۔ اس ملاقات میں جوش صاحب نے اپنا تازہ کلام بھی سنایا۔ میرے ساتھ چائے بھی پی۔ ان کی باتوں میں دل شکستگی پائی جاتی تھی اور اشعار میں ناقدری عالم کا گلہ۔ مجھے بار بار یہ شعر یاد آ رہا ہے

یوں پھریں دل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال! افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

مہینہ بھر اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ جوش صاحب کے لیے کیا کیا جائے۔ ادب اور ادیب، دائرہ کار کے اعتبار سے وزارت تعلیم سے متعلق تھے۔ وزیر تعلیم سے بات کی گئی

---

۱ یہاں مراد کو غلط فہمی ہوئی ہے جوش صاحب کراچی آئے تھے
۲ مراد کا یہ تجربہ بھی غلط فہمی پر مبنی تھا جوش صاحب حاصل کم بابل کے ہاتھوں مجبور ہو کر قصہ کے قریب ہوا چاہتے تھے۔

یہ قسمت ہے جوش صاحب کے اول مقام بھی ہے نابغہ محض تھے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ وزیر اعظم سے خصوصی اجازت لے کر میں اپنی وزارت ہی میں "افسر بکار خاص" قسم کی کوئی آسامی پیدا کروں اور اس پر جوش صاحب کو فائز کر دوں کہ ٹھیک ایک ماہ کے بعد ۱۱ مئی ۱۹۶۲ء کو حضرت جوش سے ایک خط کے ذریعے یاد دہانی کرائی۔ انھوں نے لکھا۔

"بندہ نواز آپ نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔ ہر چند آپ خانقاہی ہیں اور میں قلندری لیکن آپ کی غیر معمولی شرافت مردم شناسی نے یکسر ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ دستِ سبو نے ظرف وصو کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔ حوریاں رقص کناں ساغر نگر بدوش"

طوبیٰ صاحب سے میرے قیام لاہور کی علت، میرا پتا اور میرا فون نمبر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مجھ کو جلد سے جلد اپنے جوار شاداب میں بلا لیجیے۔

بیت کر تقاضا آسماں بگردانیم
تقاضا بہ گردش رخش گراں بگردانیم

آپ کی راہ محبت کا صید خورسند

جوش

ممتاز طوبیٰ صاحب جن کا ذکر حضرت جوش نے اپنے خط میں کیا ہے اس زمانے میں وزارت اطلاعات کے سیکرٹری تھے۔ بڑے قابل افسر اور بڑے شریف النفس انسان۔ ابھی چند روز پیشتر اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ وہ بھی جوش صاحب کے مداحوں میں شامل تھے۔ میں نے انھیں بلایا اور ان کے مشورے سے وزارت اطلاعات ہی کے زیر اہتمام جوش صاحب کی تعیناتی طے پائی۔ وزیر اعظم سے بھی میں نے بطور خاص فون پر اجازت لے لی اور جوش صاحب اسلام آباد منتقل ہو گئے۔

سرکاری قیام گاہ، ایک پرسنل سیکرٹری، ٹیلی فون، موٹر اور جوائنٹ سیکرٹری کے برابر مشاہرہ یہ تھیں ان کو ملنے والی مراعات۔ خیال تھا کہ ان کی گزر بسر اچھی طرح ہو جائے گی مگر ان کی شاہ خرچیوں نے انھیں ہمیشہ مقروض ہی رکھا۔ آگے چل کر مولانا

ایک اور واقعہ کا ذکر فرماتے ہیں: "ایک مرتبہ جوش صاحب رات کو دفتر میں تشریف لائے اور مجھے یہ دردناک تحریر لکھوائی۔ "بندہ پرور! پاکستان آ کر میں جس قدر ذلیل و خوار ہوا ہوں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ہندوستان میں میرا یہ عالم تھا کہ محل کے بغیر پنڈت جواہر لال کے وہاں پہنچ جاتا اور وہاں جا کر اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ ابھی تک خواب گاہ میں ہیں تو ان کی خواب گاہ میں پہنچ جایا کرتا تھا اور پاکستان میں اس قدر ہلکا ہو چکا ہوں کہ کئی مرتبہ آپ کی خدمت میں فون کرنے کے باوجود آپ سے ملاقات تو درکنار بات تک نہیں ہو سکتی ہے۔ بندہ نواز میں ناشکرا نہیں ہوں مجھ کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ صرف آپ کی ذات مبارک ہے جس کے کرم کی بنا پر میں آج یہاں اطمینان سے بیٹھا ہوا ہوں۔ میرا دل آپ کا شکرگزار بھی ہے اور آپ کی شرافت کا پرستار بھی۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے دل کے ٹکڑے اڑے جا رہے ہیں کہ آپ مجھ سے غافل ہو چلے ہیں اور نوبت یہاں تک آ چکی ہے کہ حسرت موہانی کا یہ شعر مجھ پر صادق آ رہا ہے کہ:

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاری دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

پی آر ڈی کو ٹھکرا کر اس وقت حاضر ہوا ہوں اور دریافت کر رہا ہوں کہ

عزم دیدار تو دارد جان برلب آمدہ
باز گردد یا برآید چیست فرمان شما

آپ کی قدردانی کا پرستار
جوش مرحوم"

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔

"میں نے پرچہ پڑھا تو ٹرپ اٹھا اجلاس کو تھوڑی دیر ملتوی کر کے خود باہر گیا۔ انہیں تعظیم و احترام سے اندر لایا۔ دل ہلکے کی سعی چاہی۔ چائے پیش کی۔ ان کے حالات نیچے۔ افسر صاحبان اس دوران قائدین نظم میں دبائے پرائیویٹ سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد جوش صاحب رخصت ہوئے تب کہیں جا کر دوبارہ اجلاس شروع ہوا۔"

خیر یہ سب تو بہت بعد کی باتیں ہیں اور چونکہ مولانا کوثر نیازی نے اپنے مضمون میں تحریر فرما دی تھیں اس لیے میں نے یہاں نقل کر دیں۔ ہم ذکر کر رہے تھے جوش صاحب کے اس سفر کے مقاصد کا جو انھوں نے کراچی سے چھٹی اپریل کو مدراس تیز گام سے سلام آباد کے لیے کیا تھا مگر چونکہ جوش صاحب کو بھی تک یہ یقین نہیں تھا کہ کامیابی کے امکانات کتنے فی صد ہیں اس لیے انھوں نے کراچی کے احباب کو کچھ نہیں بتایا۔ جوش صاحب کو پنڈی گئے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے اور ان کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ تو میں نے سوچا کہ خود پنڈی جا کر ان کی خیریت معلوم کی جائے۔

ہاشمی صاحب کا خاندان:

ایک دن جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ خیریت سے ہیں اور مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ منگل کے دن وہ دس اپریل کو عرفان میاں کے والد، والدہ اور تین بہنیں تیز گام کے ذریعے سے کراچی آ رہی ہیں۔ میں کینٹ اسٹیشن سے اس خاندان کو لے کر عرفان میاں کے گھر پہنچا دوں۔ چنانچہ مقررہ تاریخ اور وقت پر میں کینٹ اسٹیشن گیا۔ وہاں عرفان میاں بھی موجود تھے۔ گاڑی وقت پر آئی۔ ان کے والد ہاشمی صاحب ان کی والدہ اور تینوں بہنیں سکینہ، رخسانہ اور فرزانہ ان سب کو لے کر عرفان میاں کے گھر پہنچا کر جب میں چلنے لگا تو ہاشمی صاحب نے میرا شکریہ ادا کر کے کہا کہ وہ لوگ یہاں کراچی کی سیر کرنے کے لیے آئے ہیں اور جوش صاحب نے کہا ہے کہ خورشید علی خاں ہم لوگوں کو یہاں کی سیر کرائیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن میں شام کو ان سب کو لے کر کلفٹن گیا وہاں پہلے کچھ گھر کی سیر کی پھر پلے لینڈ میں جھولوں پر بیٹھے۔ اس کے بعد ساحل سمندر پر جا کر چاٹ وغیرہ کھائی۔ واپسی میں ہندو خاں کے ہوٹل میں کباب تکہ کھا کر گھر واپس آئے۔ دوسرے دن ان کو لے کر میں پورٹ گیا۔ وہاں بلوچستان ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی۔ ان بچیوں میں رخسانہ شاعرہ بھی ہیں اور اردو ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ بی۔ اے کر رہی ہیں اور تفریحی مضامین میں نفسیات میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنا کلام بھی سنایا اور مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کر کے خوشی ہوئی۔ سب سے چھوٹی سمن فرزانہ بھی بہت سمجھدار ہیں اور بہت اچھا گاتی

ہیں۔ آواز بہت سریلی اور دلکش ہے۔ انھوں نے جوش صاحب کی چند غزلیں گا کر سنائیں بہت لطف آیا۔ وہاں سے ہم لوگ میر گئے جہاں ان کے ایک عزیز رہتے ہیں۔ رات گئے واپس آئے۔ ہندو جاں کے ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا۔ پھر ان کو گھر پہنچا کر میں اپنے گھر آگیا۔ دوسرے دن کا پروگرام بکس بے اور منگھو پیر کی سیر کا تھا چنانچہ میں صبح ۹ بجے ہوٹل سے سواری اور نان لے کر ان کے گھر گیا وہ سب لوگ تیار بیٹھے تھے۔ ہم لوگ ساڑھے پانچ بجے بکس بے روانہ ہوئے اور صبح سویرے سمندر کے کنارے پہنچ گئے وہاں ایک بوٹ کے چوکیدار کو کچھ پیسے دے کر بوٹ کھلوائی۔ پھر سب لوگ سمندر میں پال سے کھیلنے لگے صبح کے وقت سمندر پرسکون تھا

آٹھ بجے کے قریب ناشتہ کیا پھر یہ بچیاں وانٹ کی موسیقی کرنے لگیں۔ بارہ ایک بجے وہاں سے نکل کر منگھو پیر گئے وہاں مگرمچھ دیکھے پھر گرم پال کے چشموں میں منہ ہاتھ دھویا ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا تقریباً چار بجے میں لوگوں کو گھر پہنچا کر اپنے گھر آگیا۔

بھنبھور کی سیر:

چلتے وقت ہاشمی صاحب نے کہا کہ اگر کل آپ کو فرصت ہو تو ہمیں بھنبھور کے آثار قدیمہ دکھا دیجیے۔ یہ طے ہوا کہ دوسرے دن صبح پانچ بجے بھنبھور کے لیے روانہ ہوں گے۔

چنانچہ دوسرے دن میں صبح سویرے ان کے گھر پہنچ گیا اور ہم سب لوگ آثار قدیمہ دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھگھر والے پھاٹک سے آگے بڑھے تو صبح کی سرخی افق پر نمودار ہو رہی تھی۔ سندھ کے صحرا میں بادِ نسیم کو خرام ناز تھی۔ رفیقہ نے کہا خورشید صاحب آپ کو بابا جوش صاحب کی طرح فکر کا وہ بند یاد ہے جس میں یہی منظر کس قدر دلکش پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں سنیے

سرخی بڑھی فضاؤں پہ تابندگی کے ساتھ — تابندگی جمال کی رخشندگی کے ساتھ
رخشندگی شمیم کی بالندگی کے ساتھ — بالندگی رباب و دف زندگی کے ساتھ

اور زندگی تصور مطلق لیے ہوئے
انفاس میں خروش انا الحق لیے ہوئے

دھوپ میں لیے رہی کی طرف سرخوشی چلی — احساس کی ترنگ، ہوئے بے حسی چلی
ظلمات کی سمت تو سر تو آگہی چلی — ہونے کا تھال سر پہ لیے روشنی چلی
سارنگیاں چھڑیں چمن روزگار میں
حق سرہ کی گونج اٹھی ظلم زار میں

اور ذرا یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

بازی ہوئے دلوں پہ بلوریں تصورات — پل لیام ذہن نے روشنی کی قنات
چوک لیے ہوئے حرکت کی چلی برات — کوئے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکے لگی حیات
خورشید کے درود سے گل زار جاگ اٹھا
یوسف جو آئے مصر کا بازار جاگ اٹھا

میں نے کہا جوش صاحب نے تو حیات انسانی کے تاریک افق پر حضرت علی کے ورود کا منظر پیش کیا ہے مگر اس وقت اس صحرا میں طلوع صبح کے منظر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بابا نے اسی منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ رخسانہ کہنے لگیں ویسے خورشید صاحب آپ کا کیا خیال ہے یہاں بابا کھل کر اپنے شیعہ ہونے کا اعلان نہیں کر رہے ہیں؟ میں نے کہا تو آپ کے بابا نے حقائق کو چھپایا کب ہے؟ طلوع فکر تو کسی ہی حضرت علی کی شان میں ہے۔ آپ نے گر طلوع فکر پڑھی ہے تو اس کا انتساب بھی ضرور پڑھا ہوگا۔ جس میں جوش صاحب نے پی ایس ایچ مثل ادبی تنظیم کو اس وقت کراچی کے کمشنر سید ابو طالب نقوی (جو اب نقوی کے نام سے مشہور ہیں) کے شیریں ترین نام سے منسوب کیا ہے اور جن کے متعلق انھوں نے شاعرانہ انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔ جن کا تصور میرا فخر سار اور جن کا نسم میری صبح کو سار ہے اور جن کی رگوں میں اسی صدیوں النظیر منکر حکم کا خون پاک گردش کر رہا ہے جو میری اس نظم کا موضوع ہے۔ ..... اب اس انتساب میں کتنی معنی مضمر ہیں۔ میں اگر عرض کروں گا تو شکایت ہوگی۔ مگر اب اس موضوع کو میں ختم کیے کیونکہ ہماری گفتگو کا رخ اس منظر سے مطابقت نہیں رکھتا ..... اتنے میں دعا بے بی آ گئیں اور ہم لوگوں نے وہاں ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ اور اس کے بعد بھنبھور پہنچ گئے۔ وہاں کا میوزیم دیکھا قدیم مسجد کے کھنڈر دیکھے اور ایک کنواں بھی دیکھا جس میں گزشتہ پانچ ہزار سال کی

تہذیبوں کے آثار زمین کی مختلف پرتوں میں نظر آتے ہیں۔ میں نے رضا سے کہا یہ بتلیے ہم لوگ بھی کس تہذیبی سطح پر ہیں۔ پھر میں نے کیفی اعظمی کا ایک شعر پڑھا۔

چلیے اور کھولو زمیں کی تہیں ۔۔۔ میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

سب اس بات پر متفق تھے کہ ہماری تہذیب ابھی کاشتکاری کے دور سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ میں نے کہا آپ کے خیال میں اس کے اسباب کیا ہیں۔ کہنے لگیں اس کے اسباب کثیر الجہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو تقسیم کی تھی۔ معاشرہ پر جاگیردار طبقہ کی مضبوط گرفت پھر جاگیرداروں اور بیرونی استعماری طاقتوں کا گٹھ جوڑ جس سے ہر گروہ اپنے مفاد کا تحفظ کرتا ہے۔ مرغی دس بجے تک ہم لوگ آثار قدیمہ کی سیر سے فارغ ہو کر واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں بھی اسی قسم کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ ان سب منزلوں میں رضا ماشاء اللہ غیر معمولی دین لگی ہے۔ گیارہ بجے ان کو گھر پہنچا کر میں پی آئی اے کے دفتر گیا اور بدھ کی صبح کے لیے پنڈی کا ٹکٹ لے کر گھر واپس آ گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جوش صاحب کو پنڈی گئے ہوئے ست دن ہو گئے تھے اور ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں تھی کہ وہاں وہ کیا کر رہے ہیں اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔ ٹکٹ لے کر گھر پہنچا ہی تھا کہ عرفان میاں کا ٹیلی فون آیا کہ جوش صاحب پنڈی سے آ گئے ہیں اور مجھے بلا رہے ہیں۔ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور جوش صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ میں تو کل کی فلائٹ سے پنڈی آپ سے ملنے جا رہا تھا۔ کہنے لگے اب اپنی سیٹ دوسری کل کے لیے بدلوا لیں۔ میں بھی دوسری کو واپس جا رہا ہوں۔ اب دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔ پھر کہنے لگے آج شام کا کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا آپ جو حکم دیں۔ کہنے لگے سمندر کی سیر کو چلیں؟ میں نے کہا ضرور۔

سمندر کی سیر

اسی شام عرفان میاں، ان کی بیگم اور جوش صاحب ہم سب کیماڑی پہنچے۔ وہاں ہمارے کسٹم کے ایک ساتھی کنور تحسین یونس علی خاں صاحب نے ایک کرنے کی کشتی کا بندوبست کر دیا اور ہم لوگ سمندر کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ سمندر پرسکون تھا۔

شام کا منظر بہت خوبصورت تھا۔ فرزانہ نے جوش صاحب کی کئی غزلیں گائیں۔ جوش صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا۔ رخسانہ بھی شاعرہ ہیں مگر اپنا کلام سناتی ہوئی شرماتی ہیں مگر جوش صاحب کے اصرار پر انھوں نے بھی چند رباعیات سنائیں۔ سورج غروب ہوا تو جوش صاحب نے اپنا شغل شروع کیا۔ ان کو افسوس تھا کہ ہم میں سے کوئی ان کا ہم مشرب نہیں ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں چودھویں کا چاند نیلگوں آسمان و شب کے ساتھ طلوع ہوا

چاندنی رات میں سمندر کی سیر کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب مجھے آپ کی ایک نظم یاد آرہی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کروں مگر مقطع میں جناب خضر کے بجائے آپ ہی کا تخلص استعمال کر لوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا رخسانہ کہنے لگیں۔ مقطع میں شاعر ہی کا نام آنا چاہیے۔ یہ خضر صاحب کہاں سے ٹپک پڑے خیر آپ نظم سنائیے۔ جوش صاحب نے کہا اس نظم کا عنوان تو بتاؤ۔ میں نے کہا اس کا عنوان ہے "راہ طرب" اور یہ آپ کے مجموعہ "حرف و حکایت" میں ہے۔ فرمایا اسے بڑا پرانا بال ہے ہو۔ یہ ۱۹۳۰ء کی لکھی ہوئی ہے۔ خیر تم سناؤ۔ میں نے کہا بال پرانا سہی مگر اس وقت بالکل تازہ ہے۔ سنیے۔

راہ طرب

اللہ رے آج جشن غربت کا فروغ
لرزش میں ہے جو ساز سے گردش میں ہے جو جام

جھلمل ہوئی ہے عرش سے تا فرش چاندنی
رقصندہ آب نہر سے تابندہ سقف و بام

ٹھٹکی ہوئی ہیں سے سدرہ جو ماہ جنگ
اٹھتی ہوئیں پہ ہے نور سے تمام

نکھری ہوئی ہے لمبے سے سمناک چاندنی
ڈوبی ہوئی ہے کیف میں باد سبک خرام

ملتے ہیں آپ چشمہ پنہاں سے ہم کنار
روحیں ہیں ہے مرکز اصلی سے ہم کلام

جبریل سے بھی ٹھہر سکے جس کا ایک حرف
وہ آ رہے ہیں عالم ارواح سے خرام

گردش میں ہیں سروں پہ اٹھائے گلابیاں
ترکان مہ پارہ و خوبان لالہ فام

اب یہ بندہ ذرا توجہ سے سنئے فرمایئے جس میں تخلص کا تصرف کیا گیا ہے۔

آیا ہے کون راہ طرب پوچھتا ہوا
چہرہ تو کہہ رہا ہے کہ ہے رہبر انام

آئے وہ اس بزرگ کو آنے دو دو درود
لازم ہے ہر جوان کو پیری کا احترام

یہ ریش یہ عمامہ یہ حق آشنا نظر — واہ عرب کی فکر میں فقریں ہیں سوئے بام
ہاں اس طرف قریب ذرا اور کچھ قریب — اچھا ... جناب جوش ہیں و علیکم السلام

سب نے اس تصرف کی بے انتہا داد دی۔ خود جوش صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے آج تو تم مجھ پر چوٹ کر گئے مگر تمہاری حس ظرافت کی داد دیے بغیر چارہ نہیں۔ بھئی خوب بہت خوب۔ غرض یہ شام اس قدر حسین اور دلچسپ تھی کہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ تقریباً دس بجے ہم لوگ ساحل پر واپس آئے۔ راستے میں ہمدرد خاں کی ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا اور گھر واپس آ گئے۔ اس رات جوش صاحب نے عرفان میاں ہی کے مکان پر قیام کیا۔ چلتے وقت مجھ سے کہنے لگے کہ کل صبح سویرے سات بجے تک آ جانا بہت کام ہیں۔

چنانچہ دوسرے دن ۲۰ دسمبر کو میں صبح ساڑھے سات بجے جوش صاحب سے ملنے عرفان میاں کے مکان پہنچ گیا۔ سب لوگ ناشتہ کر رہے تھے میں نے بھی ان کے ساتھ چائے پی اور تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں جوش صاحب، ہاشمی صاحب اور ان کی تینوں بچیاں ریحانہ، خسانہ اور فرزانہ بابا ذہین شاہ صاحب کے مکان کے لیے روانہ ہوئے مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بابا صاحب سویرے سے کہیں تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے ہم لوگ پی آئی اے کے دفتر گئے جس نے اپنی سیٹ تبدیلی کے بجائے دوسری ہی کے لیے بدلوائی۔ اس تبدیلی کے لیے ستر روپے ریلوے دینے پڑے۔ جوش صاحب نے اصرار کیا کہ یہ دام وہ ادا کریں گے کیونکہ یہ تبدیلی ان کی وجہ سے کروانی پڑی تھی مگر میں نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ غرض ٹکٹ بدلوا کر ہم لوگ گورنر ہاؤس پہنچے۔

گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور:

میر رسول بخش تالپور ایک دن قبل ہی گورنر سندھ مقرر ہوئے تھے۔ گورنر ہاؤس میں مبارک باد دینے والوں کا مجمع تھا۔ لوگ پھولوں کے ہار میر صاحب کو پہنا رہے تھے۔ ان کے سیکرٹری نے ہم لوگوں کو ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا اور کوکو کولا کی بوتلوں سے ہماری تواضع کی۔ اس کمرے میں ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی جس کے پس منظر میں پیپلز پارٹی کا پرچم تھا جس پر دو تلواریں تھیں اور اوپر ہلال اور بیچ میں بھٹو صاحب کی تصویر تھی۔ جس کے چہرے

کر شکی کے ہمراہ سایاں تھے۔ جوش صاحب نے مجھے بے قریب بلایا اور کہا کہ اس تصویر کو دیکھو اور بتاؤ کہ کیا اثر پیدا ہوتا ہے اور پھر خود ہی کہنے لگے، سب پر اثر پیدا ہوتا ہے۔ چہرے پر حقیقت و صداقت ہے اور اس امر کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، جو غلط ہے۔ ابھی ہم اس تصویر کے تاثرات پر غور کر ہی رہے تھے کہ میر صاحب کمرے میں تشریف لے آئے، سب محبت اور تپاک سے گلے ملے اور ہر ایک کی خیریت پوچھی۔ اس کے بعد جوش صاحب کو الگ کمرے میں لے گئے۔ وہاں ان سے تقریباً آدھا گھنٹہ علیحدگی میں بات کی پھر وہ دونوں باہر آئے پھر میر صاحب ہم لوگوں کو گاڑی تک پہنچانے آئے چلتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ ابھی مولانا کوثر نیازی سے مل لیجیے وہ اس وقت بے دفتری میں ہوں گے۔ چنانچہ ہم لوگ میر صاحب سے رخصت ہو کر قدیم سیکرٹریٹ میں مولانا کے دفتر پہنچے۔ مولانا مرکزی ادارہ نشر و اشاعت تھے۔

مولانا کوثر نیازی سے ملاقات:

جیسے ہی ان کو جوش صاحب کی آمد کی اطلاع ہوئی فوراً باہر آ کر ہمارا استقبال کیا اور اپنے دفتر میں لے گئے۔ چائے منگوائی اور خود اپنے ہاتھ سے بنا کر ہم لوگوں کو پیش کی۔ جوش صاحب نے ہم سب کا تعارف مولانا سے کروایا۔ فروغ کے متعلق جب جوش صاحب نے یہ کہا کہ اس کا گلا بہت اچھا ہے اور خاص طور پر غزل کا جذباتی اثر ابھارنے میں اس کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے تو مولانا کوثر نیازی نے فروغ سے فرمائش کی کہ کوئی غزل سنائے۔ فروغ نے سماعت دلکش انداز میں جوش صاحب کی غزل سنائی۔

برباد نہ تھا کیف جنوں بھول چکا ہوں
ہر جشن کو اے رہبرو نو بھول چکا ہوں
اب حسن کو تکلیف نہ دے ناز و ادا کی
میں عشق کو اے جان وفا بھول چکا ہوں
در پر ترے آ کر نہ صدا دوں گا کہ اب میں
رسم طلب و طرز دعا بھول چکا ہوں

رہتا ہے جہاں عشق دکھاتے ہوئے دھوکا
اس راہ کو اے دل تو بھول چکا ہوں
تھوڑی ہی حسینوں کے دکھاتا تھا جو گل زار
مدت ہوئی وہ رنگ حنا بھول چکا ہوں
اک نقش ہے تیرا کہ مٹائے نہیں مٹتا
ہر چند کہ سب کچھ بخدا بھول چکا ہوں

یہ غزل کافی طویل ہے مگر فرزانہ نے اختصار سے کام لیا اور صرف چند ہی اشعار سنائے مگر اس کے گلے کا سوز اور ادا کی دلکشی نے وہ سماں باندھا کہ مولانا نے دل کھول کر داد دی بعد میں دریافت فرمایا کہ ان بچیوں کی "رہائش" کہاں ہے۔ یا تو جوش صاحب اپنی غزل سن کر محو ہو گئے تھے یا رہائش کا لفظ سن کر لیے اچھلے کہ جیسے ان کے جسم تصور میں کوئی کانٹا چبھ گیا ہو فرمایا "مولانا "رہائش" بدسلیقہ لفظ ہے۔ رہنا ہندی کا لفظ ہے اس میں ی ش لگا کر فارسی کا مصدر رہائش نہیں بنایا جا سکتا اگر اس ترکیب کو ہم جائز قرار دے دیں تو پھر چلنے سے چلائش، کھانے سے کھائش کو بھی درست تسلیم کرنا پڑے گا۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا جوش صاحب اب آپ اسلام آباد تشریف لا رہے ہیں ہم لوگ آپ سے اردو سیکھ لیں گے اس کے تھوڑی دیر کے بعد دوران گفتگو مولانا نے پوچھا۔ جوش صاحب، آپ کی تنخواہ کی "ادائیگی" کراچی میں ہوگی یا اسلام آباد میں۔ جوش صاحب پھر الجھ گئے۔ فرمایا یہ "ادائیگی" کا لفظ بھی پہلے لفظ کی طرح غلط ترکیب سے بنا ہے۔ "ادا" فارسی لفظ اور "ئیگی" ہندی۔ فارسی اور ہندی کی آمیزش سے لفظ نہیں بنانا چاہیے۔ مولانا نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کرے۔ چلتے وقت مولانا نے دریافت فرمایا جوش صاحب آپ اسلام آباد کب تشریف لا رہے ہیں تو جوش صاحب نے فرمایا کہ دوسری مئی کو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ طرحی مولانا کے پاس تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھ کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ میں نے سب لوگوں کو عرفان میاں کے مکان پر پہنچایا۔ جوش صاحب بھی وہیں رہ گئے اور میں اپنے گھر آ گیا۔

نظریہ جبر و قدر

دوسرے دن میری ماموں زاد بہن اختر خانم جنھوں نے سیاسیات میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور اب پی ایچ ڈی کر رہی ہیں، میرے گھر آئیں اور جوش صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ ہم دونوں عرفان میاں کے گھر پہنچے، جہاں جوش صاحب مقیم تھے۔ جب میں نے اختر کا تعارف جوش صاحب سے کروایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ عرفان میاں کی بہنیں بھی آ گئیں۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران جبر و قدر کا مسئلہ زیر بحث آ گیا۔ اختر خانم نے کہا کہ ایک باشعور انسان جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا بے شک آپ جو چاہے کر سکتی ہیں مگر خود چاہنا آپ کے بس میں نہیں۔ انسان کا ہر عمل کسی نہ کسی محرک کا ردعمل ہوتا ہے اور یہ محرک کسی خارجی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور آپ کا ردعمل آپ کی شخصیت کے قوام کا نتیجہ۔ آپ کی شخصیت کا بننا یا بنانا جن اجزا سے بنا جاتا ہے ان میں میراث، تربیت، صحت، علم، تجربہ، جغرافیہ، تاریخ، عقائد ان تمام عوامل سے آپ کی شخصیت کا ہیولا ترتیب پاتا ہے۔ انہی سے آپ کی جذباتی کیفیت مرتب ہوتی ہے۔ یہ سب اجزا مل کر آپ کے ردعمل کا تعین کرتے ہیں۔ پھر آزاد مرضی کہاں باقی رہی۔ ہم بالکل جمادات اور حیوانات کی طرح جبر کے تابع ہیں۔ کوئی بیماری گھیر پکڑ کر ہم سے کام لیتا ہے قوتیں خارجی اور داخلی جبر کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ میں نے کہا تو پھر اس کے یہ معنی ہوئے کہ اگر ہم انسانی کردار میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا چاہیں تو ہم کو اس جبر کا پتا چلانا پڑے گا جو ہمارے اعمال کا اعادہ کیے ہوئے ہے۔ جوش صاحب نے کہا بے شک۔ میں نے کہا کہ داخلی جبر تو وہ ہے جو ہر ذی حیات کی تعمیر میں مضمر ہے۔ جس کو ہم جانے ذات اور جانے نسل کے جبلی تقاضے کہتے ہیں۔ یہ تو ہمارے وجود کی ایسی ضرورت ہے جس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اور در اصل انہی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وہ خارجی ماحول سے متعارف ہوتا ہے۔ جانے ذات کی تکمیل کے لیے وہ اپنے جغرافیائی ماحول کا جائزہ لیتا ہے اور جانے نسل کی خاطر وہ دوسرے ہم جنس سے آشنائی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح نسل انسانی ایک جغرافیائی ماحول میں ایک سماج تشکیل دیتی ہے پھر معاشرتی ضرورتوں کے تحت اور آپس کے تعلقات اور باہمی رشتوں سے اقدار، رسم و رواج، تہذیب، ثقافت اور حکومت جنم لیتے ہیں اور اس طرح وہ خارجی

جبر معرض وجود میں آتا ہے جس کے نتائج سے معاشرے میں انسانوں کے کردار تشکیل پاتے ہیں۔ انسانی کردار کی تشکیل ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس میں ایک طرف اس کی وراثت جس کے ذریعے سے اس کی عضویاتی ساخت تشکیل پاتی ہے۔ دوسری طرف اس عضویہ کی تربیت و پرداخت اس کا قدرتی اور معاشرتی ماحول کرتا ہے۔ قدرتی ماحول میں تو اس کا جغرافیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کوئی انسان رہتا ہے وہ جگہ کرۂ ارض کے کس حصے میں واقع ہے، کیا وہ برفانی علاقہ ہے یا پہاڑی علاقہ، میدانی ہے یا صحرائی، زرخیز زمین ہے یا بنجر، درجۂ حرارت کی نوعیت کیا ہے وہاں کس قسم کی پیداوار ہوتی ہے وغیرہ۔ یہ جغرافیائی ماحول انسانوں کی ضرورتوں کا تعین بھی کرتا ہے اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسائل بھی مہیا کرتا ہے۔ اس جغرافیائی ماحول میں انسانی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ یہ معاشرہ انسانی خیال پر بے انتہا اثرات اپنے معاشرتی اداروں کے توسط سے مرتب کرتا ہے جن میں سیاسی معاشی معاشرتی ثقافتی تمدنی اخلاقی اقدار اور تنظیمیں شامل ہیں۔ یہ تمام عوامل انسانی رویے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس طرح انسانی کردار مختلف سانچوں میں ڈھل کر نکلتا ہے اور پھر انسان اسی کردار کے جبر کے نتائج ہر خارجی اور داخلی سطح پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اب اگر ہم اپنے رویوں میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے سماجی اداروں میں تبدیلی لانا پڑے گی۔ پھر تمام تمدنی اور ثقافتی اقدار کا تجزیہ کر کے ان میں ردوبدل کرنا پڑے گا۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اچھا معاشرہ اچھا آدمی پیدا کرتا ہے اور برا معاشرہ برا آدمی پیدا کرتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا یہ بات بالکل درست ہے مگر یہ بھی ایک نفسیاتی جبر ہے کہ معاشرہ اتنی آسانی سے نہیں بدلا جا سکتا کیونکہ انسانوں کے ذہن کی کایا بہت آہستہ آہستہ کھلتی ہے میرا ایک شعر ہے۔

ہر گام پہ ہے فکر کو قرنوں کی ضرورت
اور عمر کی تقدیر میں ہے برق مزاجی

اور ہمارے معاشرے میں تو ابھی جاگیرداروں سرمایہ داروں چودھریوں وڈیروں، سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کا بہت زیادہ اثر ہے اور ہماری ہیئت حاکمہ بھی اسی اثرات کے نتائج ہے۔ اس لیے تبدیلی بہت آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔

جوش صاحب نے کہا کہ ان تمام باتوں سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انسانی

احوال خارجی اور داخلی جبر کے تابع ہوتے ہیں اور آزاد مرضی یا (Free Will) نام کی کوئی چیز بنا وجود نہیں رکھتی۔ اختر خانم نے کہا جوش صاحب جس کو ہم (Free Will) کہتے ہیں وہ دراصل ہمارا نفسیاتی احساس ہے جو ہماری شخصیت کی خصوصیت ہے۔ ہمارا شعور ذات اپنے احوال سے نظر صورت کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنا احوال اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرنے کی سعی میں لگا رہتا ہے اور گو موزوں حالات میسر آ جائیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس عمل سے اس کو یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے اپنی زندگی بسر کی ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ خود مسرت اور غم کے احساسات بھی تو انسان کی حسیاتی اور نفسیاتی تشکیل کا نتیجہ ہیں۔ ہم دراصل ایک مشین کی طرح ہیں جس کا کنٹرول کسی اور طاقت کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہمارے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کر رہی ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب اس طاقت کا کوئی نام ہے۔ جوش صاحب نے کہا ہم صرف اتنا محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک توانائی ہے۔ آپ اس کا کوئی نام رکھیں لیکن نام کے ساتھ ہی ست سی غلط فہمیوں کا امکان ہے۔ جب کوئی شخص اس قوت حاکمہ کو مشخص کر کے کوئی نام دیتا ہے تو پھر وہ لامحدود توانائی مطلق اس کے فکری حدود کے حصار خانے میں محدود ہو جاتی ہے اور چونکہ ہر انسان کی فکری، علمی اور تخیلی صلاحیت اس کے علم، تجربے اور احساسات کی ست سے محدود ہوتی ہے اس لیے وہ اس کامل تصور ہستی کا جو بھی تصور قائم کرے گا وہ اس کے ذہن کا تراشیدہ صنم ہو گا۔ بقول اقبال

تراشیدم صنم بر صورت خویش ۔۔۔ بہ شکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود بروں رفتم کمال است ۔۔۔ بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اس لیے اس توانائی مطلق کو مشخص کیے بغیر اگر آپ کوئی نام دے سکیں تو آپ کی مرضی۔ لیکن آپ جب بھی مشخص کر کے کوئی نام دیں گے تو وہ انسانی صفات ہی کا چربہ ہو گا اور اس طرح خدا کے بھیس میں خود انسان ہی نوع انسان کی تقدیر کا ناخدا بن جائے گا۔ آج تمام سائنسی علوم انسانی فکر کو اسی اصنام خیال کی گرفت سے نکال کر توانائی مطلق کے بالمقابل تغیر قوانین علت و معلول کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ابھی جس داخلی اور خارجی جبر کی طرف اشارے کیے ہیں، اگر ان کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یقین کیے بغیر چارہ ہی نہیں

رہتا کہ اس تمام انفس و آفاق کو ایک قوتِ مطلق کا جبر کامل اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے جو اپنے اٹل یا ناگزیر قوانین کے ذریعے سے ہر ذرہ وجود پر مسلط ہے۔

سزا و جزا کا تصور

میں نے کہا جوش صاحب اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ اس کائنات میں صرف اور صرف خالق کائنات کا ارادہ ہی موثر ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی اعمال میں بھی اسی کے ارادے کی جلوہ گری ہے تو پھر ہمارے اعمال کی سزا و جزا کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ اس سوال کا ایک سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل علت اور معلول کے قوانین کے تحت اپنا ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے اگر یہ نتیجہ ہمارے لیے مفید ہو تو وہ اس عمل کی جزا ہوگی اور اگر نقصان رساں ہو تو وہ سزا ہے۔ اگر ہم اپنے عمل کے نتیجے سے واقف ہیں اور نقصان دہ اعمال سے اجتناب کریں تو ان کے ضرر رساں نتائج سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ہمارے اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے اثرات ہمارے جسم پر مرتب ہوتے ہیں جیسے کھانا پینا، سونا جاگنا اور ورزش کرنا وغیرہ دوسرے وہ جن کو ہم معاشرتی اعمال کہتے ہیں جن میں ایک انسان دوسرے انسان یا انسانوں کے تعلق سے کوئی عمل کرتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں نتائج تو علت اور معلول کے قوانین کے مطابق ہی مرتب ہوں گے مگر ہمارے معاشرے میں سزا و جزا کے دو نظام رہتے ہیں۔ ایک مذہب کے توسط سے دیا ہوا تصور جس کا تعلق حیات بعد الموت سے بیان کیا جاتا ہے دوسرا کسی مملکت کے تحریری قوانین کے تحت سزا کا تصور۔

جہاں تک مذہب کا سزا و جزا کا تصور ہے اور جس کو مرنے کے بعد کی زندگی سے وابستہ کیا جاتا ہے جس کو مذہب کی زبان میں جنت اور دوزخ سے تعبیر کیا گیا ہے میرے نزدیک یہ قیاسات میں سے ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حساب کے دن ہمارے ہی اعمال کی گواہی جن کا تعلق ہمارے جسموں سے ہے ہمارے حق میں خود دیں گے۔ ہاتھ پاؤں آنکھ، ناک، کان غرض جسم کا ہر عضو ان اعمال کی گواہی دے گا جو اس کے تعلق سے سرزد ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارا کھانا پینا۔ یعنی ہماری ہر قسم کی غذا اور ہر قسم کا مشروب ہمارے جسم پر اپنے کیمیاوی اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اس کے علاوہ ہمارے

تمام اعمال یعنی اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، دوڑنا، ورزش کرنا یا نہ کرنا، سونا جاگنا، مختلف لوگوں سے ملنا، ہنسنا بولنا، ہمارے غم اور مسرت کے احساسات، ہماری نفسیاتی الجھنیں، جذباتی کشمکش، ہمارے تمام خواص ہماری داخلی اور خارجی ہر کیفیت ہمارا معاشرتی اور قدرتی ماحول ہمارے کام کرنے کے اوقات اور طریق کار ہمارے جسم کے مختلف حصوں پر اپنے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور ہمارے اعضا ان اثرات سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اور ان میں ان اعمال کی وجہ سے اچھی یا بری تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ عمل علت اور معلول کے قوانین کے تحت خود بہ خود جاری رہتا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں اس تبدیلی کا علم ہوتا ہے مگر زیادہ تر یہ تغیر غیر محسوس طور پر واقع ہوتا رہتا ہے اور بالآخر ایک وقت وہ آتا ہے جب ہمارا کوئی عضو اس مسلسل عذاب اثر کے باعث بیمار پڑ جاتا ہے اور اس میں تکلیف شروع ہو جاتی ہے تو انسان پریشان ہو کر خدا کو پکارتا ہے اور اس سے شکایت کرتا ہے کہ اے خدا تو نے مجھے کس عذاب میں گرفتار کر دیا تو قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ تو خود تمہارے اعمال تھے جو اب محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ تکلیف ہی دراصل اس حصول کی ان اعمال کی شہادت ہے جو ہم کرتے آئے ہیں۔ اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ مذہب جس کو یوم حساب سے تعبیر کرتا ہے وہ دراصل ہمارے اعمال کے پیکر محسوس میں ظاہر ہونے کا وقت ہے جو واقع تو ضرور ہوتا ہے مگر اس کی مدت کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ مختلف اعمال کے نتائج کی مدت مختلف ہوتی ہے۔ یہ تو رہی مذہبی نقطۂ نظر سے ہمارے اعمال کی سزا و جزا کی توضیح۔

اب دوسرا پہلو سزا کا وہ ہے جو ہمارے مملکتی قوانین تعزیرات کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس مصنوعی تصور سزا کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ یہ سزا انتقامی ہے اصلاحی نہیں۔ اس سلسلے میں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ یہ تمام کائنات جس میں خود انسان اور انسانی معاشرہ شامل ہے، ناقابل تغیر علت اور معلول کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں یہاں ہر معلول علت بدلتا ہے۔ اسی طرح ہر جرم کسی نہ کسی علت کے نتیجہ ہوتا ہے بالکل جس طرح ہر مرض جسم کی کسی نہ کسی خرابی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہے اور جس طرح معالج مرض کو مریض سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے نہ کہ مریض ہی کو ختم

کرنے کی تو اس طرح جرم بھی معاشرتی مرض ہے جس کے اسباب بھی معاشرے کی طرح ہی میں تلاش کرنے چاہئیں۔ مجرم بھی مریض کی طرح معاشرتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں جرم اور مجرم میں فرق کرنا چاہیے اور جرم سے نفرت کر کے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور مجرم کو اس معاشرتی مرض سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری تعزیرات اصلاحی ہوں نہ کہ انتقامی۔ مگر بدقسمتی سے ہماری تعزیرات انتقامی ہیں۔ یہ قدیم دور کی ان روایات کی آئینہ دار ہے جب کسی معاشرے میں وسائل کی کمی اور طاقت کے عدم توازن کے باعث معاشرہ مترفین اور محرومین میں تقسیم ہو گیا اور طاقتور مترفین اپنی جان، مال، عزت اور آبرو کے تحفظ کے لیے ان کے حقوق میں دست اندازی کرنے والوں کو انتقام کے ذریعے سے خوف زدہ کر کے اپنے مفادات کی حفاظت کرنے لگے۔ معاشرتی سزا کا تصور دراصل قبرآشنا مطلق العنان شہنشاہوں، مذہبی پیشواؤں، جاگیرداروں، مغلوب الغضب قبائلی سرداروں، سریع الاشتعال آمروں کی جبلی آخریہ آتش غضب کا انتقامی اظہار ہے کیونکہ یہ مراعات یافتہ طبقہ کبھی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہو سکتا کہ معاشرے میں حقوق کی عدم مساوات کو ختم کر کے محرومیوں اور ناداروں کو جو آبادی کی اکثریت پر مشتمل ہوتے ہیں پرمسرت زندگی بسر کرنے کے وہ تمام حقوق دے دیے جائیں جن کی اس دور کی تہذیب متقاضی ہوتی ہے اور جن سے مراعات یافتہ طبقہ خود محروم ہوتا رہتا ہے۔ اسی عدم مساوات اور محرومیوں کی بنا پر پورے معاشرے میں ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کے حقوق میں مداخلت کرنے لگتا ہے اور یہ مداخلت جب جان، مال، عزت اور آبرو کے حقوق میں ہو تو جرائم جنم لیتے ہیں اور اگر اس معاشرے میں حکومتی عملہ جو جرائم کی روک تھام کے لیے متعین کیا جاتا ہے مگر جو خود بھی محرومین کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے، مجرموں کو تحفظ فراہم کر کے ان کے ذریعے سے خود بھی فوائد حاصل کرنے لگے تو جرائم متعدی وبا کی طرح تمام معاشرے کو اپنے خونی پنجے میں جکڑ لیتے ہیں اور اس معاشرے میں ایک ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو طرح طرح کے جرائم کی تخلیق کا سبب بنتی رہتی ہے اور چونکہ ہمارے تعزیری قانون کی بنیاد انتقامی ہے اس لیے برسر اقتدار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ جرم کرنے والوں کو سزا دے کر وہ جرم کا تدارک کر دے گا حالانکہ حقیقت یہ ہے

بدقسمتی سے جوش صاحب کے اولی مقام ہی سے نابلد محض تھے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ وزیر اعظم سے خصوصی اجازت لے کر میں اپنی وزارت ہی میں "افسر بکار خاص" قسم کی کوئی آسامی پیدا کروں اور اس پر جوش صاحب کو فائز کر دوں کہ ٹھیک ایک ماہ کے بعد، ۱۲ مئی ۱۹۶۸ء کو حضرت جوش نے ایک خط کے ذریعے یاد دہانی کرائی۔ انھوں نے لکھا۔

"بندہ نواز! آپ نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔ ہر چند آپ خانقاہی ہیں اور میں خراباتی لیکن آپ کی غیر معمولی شرافت مردم شناسی نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ دست سبو نے ظرف وضو کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔ حوریاں رقص کناں ساغر شکر ریز ہوئے"

طوبیٰ صاحب سے میرے قیام لاہور کی علت، میرا پتا اور میرا فون نمبر معلوم کیا جا سکتا ہے مجھ کو جلد سے جلد اپنے جوار شاداب میں بلا لیجیے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

آپ کی زلف محبت کا صید خورمند

جوش

ممتاز طوبیٰ صاحب جن کا ذکر حضرت جوش نے پہلے خط میں کیا ہے۔ اس زمانے میں وزارت اطلاعات کے سیکرٹری تھے۔ بڑے قابل افسر اور بڑے شریف النفس انسان۔ ابھی چند روز پیشتر اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ وہ بھی جوش صاحب کے مداحوں میں شامل تھے۔ میں نے انھیں بلایا اور ان کے مشورے سے وزارت اطلاعات ہی کے زیر اہتمام جوش صاحب کی تصانیف طبع پائیں۔ وزیر اعظم سے بھی میں نے بطور خاص فون پر اجازت لے لی اور جوش صاحب اسلام آباد منتقل ہو گئے۔

سرکاری قیام گاہ ایک پرائیویٹ سیکرٹری نے لی فون موٹر اور جوائنٹ سیکرٹری کے برابر مشاہرہ۔ یہ تھیں ان کو ملنے والی مراعات۔ خیال تھا کہ ان کی گزر بسر اچھی طرح ہو جائے گی مگر ان کی شاہ خرچیوں نے انھیں ہمیشہ متردد ہی رکھا۔ آگے چل کر مولانا

ایک اور واقعہ کا ذکر فرماتے ہیں "ایک مرتبہ جوش صاحب رات کو دفتر میں تشریف لائے تو مجھے یہ حوصلہ ناک تحریر دکھائی۔ "بندہ پرور! پاکستان آ کر میں جس قدر ذلیل و خوار ہوا ہوں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ہندوستان میں میرا یہ عالم تھا کہ فون کیجیے پنڈت جواہر لال کے وہاں پہنچ جاتا اور وہاں جا کر اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ ابھی تک خواب گاہ میں ہیں تو ان کی خواب گاہ میں پہنچ جایا کرتا تھا اور پاکستان میں اس قدر بلکا ہو چکا ہوں کہ کئی مرتبہ آپ کی خدمت میں فون کرنے کے باوجود آپ سے ملاقات تو درکنار بات تک نہیں ہو سکتی ہے بندہ نواز میں ناشکرا نہیں ہوں مجھ کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ صرف آپ کی ذات مبارک ہے جس کے کرم کی بنا پر میں آج یہاں اطمینان سے بیٹھا ہوا ہوں۔ میرا دل آپ کا شکر گزار بھی ہے اور آپ کی شرافت کا پرستار بھی۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے دل کے ٹکڑے اڑے جا رہے ہیں کہ آپ مجھ سے غافل ہو چلے ہیں اور نوبت یہاں تک آ چکی ہے کہ حضرت موہانی کا یہ شعر مجھ پر صادق آ رہا ہے کہ

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاری دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

اپنی خودداری کو ٹھکرا کر اس وقت حاضر ہوا ہوں اور دریافت کر رہا ہوں کہ

عزم دیدار تو دارد جان بر لب آمدہ
باز گردد یا بر آید، چیست فرمان شما

آپ کی قدر دانی کا پرستار

جوش مرحوم"

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔

"میں نے پرچہ پڑھا تو ترتیب تھا اجلاس کو تھوڑی دیر ملتوی کر کے خود باہر گیا۔ انھیں تعظیم و احترام سے اندر لایا۔ ان کی سیکرٹری کی سماعت چاہی۔ چائے پیش کی۔ ان کے سامنے بیٹھا رہا۔ افسر صاحبان اس دوران فائلیں بغل میں دبائے پرائیویٹ سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد جوش صاحب رخصت ہوئے تب کہیں جا کر دوبارہ اجلاس شروع ہوا۔"

خیر یہ سب تو ست بعد کی باتیں ہیں اور چونکہ مولانا کوثر نیازی نے اپنے مضمون میں تحریر فرما دی تھیں اس لیے میں نے یہاں نقل کر دیں۔ ہم ذکر کر رہے تھے جوش صاحب کے اس سفر کے مقاصد کا جو انھوں نے کراچی سے اچھی پریس کو بذریعہ تیز گام اسلام آباد کے لیے کیا تھا مگر چونکہ جوش صاحب کو ابھی تک یہ یقین نہیں تھا کہ کامیابی کے امکانات کتنے فی صد ہیں اس لیے انھوں نے کراچی کے احباب کو کچھ نہیں بتایا۔ جوش صاحب کو پنڈی گئے ہوئے ست دن ہو گئے تھے اور ان کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ تو میں نے سوچا کہ خود پنڈی جا کر ان کی خیریت معلوم کی جائے۔

ہاشمی صاحب کا خاندان:

ایک دن جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ خیریت سے ہیں اور چاہتے ہیں کہ خواہش ظاہر کی کہ منگل کے دن ۲۷ ویں اپریل کو عرفان میاں کے والد، والدہ اور تین بہنیں تیز گام کے ذریعے سے کراچی آ رہی ہیں۔ میں کینٹ اسٹیشن سے اس خاندان کو لے کر عرفان میاں کے گھر پہنچا دوں۔ چنانچہ مقررہ تاریخ اور وقت پر میں کینٹ اسٹیشن گیا۔ وہاں عرفان میاں بھی موجود تھے۔ گاڑی وقت پر آئی۔ ان کے والد ہاشمی صاحب ان کی والدہ اور تینوں بہنیں رکشا، رخسانہ اور فرزانہ ان سب کو لے کر عرفان میاں کے گھر پہنچا کر جب میں چلنے لگا تو ہاشمی صاحب نے میرا شکریہ ادا کر کے کہا کہ وہ لوگ یہاں کراچی کی سیر کرنے کے لیے آئے ہیں اور جوش صاحب نے کہا ہے کہ خورشید علی خاں ہم لوگوں کو یہاں کی سیر کرائیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن میں شام کو ان سب کو لے کر کلفٹن گیا وہاں پہلے مچھلی گھر کی سیر کی پھر پلے لینڈ میں جھولوں پر بیٹھے۔ اس کے بعد ساحل سمندر پر جا کر چاٹ وغیرہ کھائی۔ واپسی میں بندو خاں کے ہوٹل میں کباب تکہ کھا کر گھر واپس آئے۔ دوسرے دن ان کو لے کر میں پارک گیا۔ وہاں بلوچ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی۔ ان بچیوں میں رخسانہ شاعرہ بھی ہیں اور اردو ادب کا ست اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ بی۔ اے کر رہی ہیں اور اختیاری مضامین میں طبیعیات میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنا کلام بھی سنایا اور مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کر کے خوشی ہوئی۔ سب سے چھوٹی ست فرزانہ ہے۔ یہ بھی ست سمجھدار ہیں اور ست اچھا گاتی

ہیں۔ آواز بہت سریلی اور دلکش ہے۔ انھوں نے جوش صاحب کی چند غزلیں گا کر سنائیں بہت لطف آیا۔ وہاں سے ہم لوگ ملیر گئے جہاں ان کے ایک عزیز رہتے ہیں۔ رات کے دو بجے آئے۔ سندھ ماں کے ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا۔ پھر ان کو گھر پہنچا کر میں اپنے گھر آگیا۔ دوسرے دن کا پروگرام ہاکس بے اور منگھوپیر کی سیر کا تھا چنانچہ میں صبح ۹ بجے کے ہوٹل سے سواری اور نان لے کر ان کے گھر گیا وہ سب لوگ تیار بیٹھے تھے۔ ہم لوگ ساڑھے پانچ بجے ہاکس بے روانہ ہوئے اور صبح سویرے سمندر کے کنارے پہنچ گئے وہاں ایک بہت کے چوکیدار کو کچھ پیسے دے کر بہت کھلوائی۔ پھر سب لوگ سمندر میں پانی سے کھیلنے لگے صبح کے وقت سمندر پر سکون تھا۔

آٹھ بجے کے قریب ناشتہ کیا پھر یہ بچیاں اونٹ کی سواری کرنے لگیں۔ بارہ ایک بجے وہاں سے نکل کر منگھوپیر گئے وہاں مگر مچھ دیکھے پھر گرم پانی کے چشموں میں منہ ہاتھ دھویا ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ تقریباً چار بجے ان لوگوں کو گھر پہنچا کر اپنے گھر آگیا۔

بھنبھور کی سیر:

چلتے وقت ہاشمی صاحب نے کہا کہ اگر کل آپ کو فرصت ہو تو ہمیں بھنبھور کے ہنگلاج مندر دکھا دیجیے۔ یہ طے ہوا کہ دوسرے دن صبح پانچ بجے بھنبھور کے لیے روانہ ہوں گے۔

چنانچہ دوسرے دن میں صبح سویرے ان کے گھر پہنچ گیا اور ہم سب لوگ ہنگلاج مندر دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھگر ریلوے پھاٹک سے آگے بڑھے تو صبح کی سرخی افق پر نمودار ہو رہی تھی۔ سندھ کے صحرا میں باد نسیم محو خرام ناز تھی۔ رخسانہ نے کہا خورشید صاحب آپ کو بابا اکاش صاحب کی طلوع فکر کا وہ بند یاد ہے جس میں یہی منظر کس قدر دلکش پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ سنیے

سرخی بڑھی افق پہ تابندگی کے ساتھ — تابندگی جمال کی رخشندگی کے ساتھ
رخشندگی شمیم کی باشندگی کے ساتھ — باشندگی رباب و دف زندگی کے ساتھ
اور زندگی تصور مطلق لیے ہوئے
انفاس میں خروش انا الحق لیے ہوئے

وہ ہیں بے رنگ کی طرف سرخوشی چلی — احساس کی ترنگ، سوئے بے حسی چلی
عظمت کی سمت لو سر نو آگہی چلی — سوئے کا تھکن سر پہ لیے زندگی چلی
سارنگیاں چھڑیں چمن روزگار میں
حق سرہ کی گونج تھی لالہ زار میں

اور نواب بند ملاحظہ فرمائیے۔

بدل ہوتے دلوں پہ ملحدیں تصورات — پانی قیام ذہن نے رویت کی ثبات
چلک بے ہوئے حرکت کی چلی برات — کوئے پہ بانو رکو کے تھرکے لگی حیات
خورشید کے درود سے گل زار جاگ اٹھا
یوسف جو آئے مصر کا بازار جاگ اٹھا

میں نے کہا جوش صاحب نے تو حیات انسانی کے تاریک افق پر حضرت علی کے ظہور کا منظر پیش کیا ہے مگر اس وقت اس مصرعہ میں طلوع صبح کے منظر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بابا نے اسی منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ رخسانہ کہنے لگیں ویسے خورشید صاحب آپ کا کیا خیال ہے یہاں بابا کھل کر اپنے شیعہ ہونے کا اعلان نہیں کر رہے ہیں؟ میں نے کہا تو آپ کے بابا نے عقائد کو چھپایا کب ہے؟ طلوع فکر تو کسی ہی حضرت علی کی شان میں ہے آپ نے اگر طلوع فکر پڑھی ہے تو اس کا انتساب بھی ضرور پڑھا ہوگا۔ جس میں جوش صاحب نے اپنی اس بے مثال ذہنی تخلیق کو اس وقت کراچی کے کمشنر سید ابو طالب نقوی، جو سے نقوی کے نام سے مشہور ہیں کے شیریں ترین نام سے منسوب کیا ہے اور جن کے متعلق انھوں نے شاعرانہ انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ "جن کا تصور میرا مطلع بہار اور جن کا تبسم میری صبح کو سعد ہے اور جن کی رگوں میں اسی عدیم النظیر منکر عظم کا خون پاک گردش کر رہا ہے جو میری اس نظم کا موضوع ہے" ..... اب اس انتساب میں کتنی باتیں غور طلب ہیں۔ میں اگر عرض کروں گا تو شکایت ہوگی۔ مگر اب اس موضوع کو یہیں ختم کیجیے کیونکہ ہماری گفتگو کا رخ اس منظر سے مطابقت نہیں رکھتا ..... اتنے میں دھماکے ہی آ گیا اور ہم لوگوں نے وہاں ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ اور اس کے بعد بھنبھور پہنچ گئے۔ وہاں کا سومنات دیکھا۔ قدیم مسجد کے کھنڈر دیکھے اور ایک کنواں بھی دیکھا جس میں گزشتہ پانچ ہزار سال کی

تہذیبوں کے آثار زمین کی مختلف پرتوں میں نظر آتے ہیں۔ میں نے رضا سے کہا یہ مقامی لوگ ابھی کس تہذیبی سطح پر ہیں۔ پھر میں نے کیفی اعظمی کا ایک شعر پڑھا

بچے ہو کھود زمیں کی تہیں میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

سب اس بات پر متفق تھے کہ ہماری تہذیب ابھی کاشتکاری کے دور سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ میں نے کہا آپ کے خیال میں اس کے اسباب کیا ہیں کہنے لگیں اس کے اسباب کثیر الجہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو تعلیم کی کمی، معاشرہ پر جاگیردار طبقہ کی مضبوط گرفت پھر جاگیردروں اور بیرونی استعماری طاقتوں کا گٹھ جوڑ جس سے ہر گروہ اپنے اپنے مفاد کا تحفظ کرتا ہے۔ غرض دس بجے تک ہم لوگ آثار قدیمہ کی سیر سے فارغ ہو کر واپس روانہ ہوئے راستے میں بھی اسی قسم کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ میں سب سے پہلے رضا کو غیر معمولی دبلی لڑکی سے گیارہ بجے ان کو گھر پہنچا کر میں پی آئی اے کے دفتر گیا اور جمعہ کی تاریخ کے لیے پنڈی کا ٹکٹ لے کر گھر واپس آ گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جوش صاحب کو پنڈی گئے ہوئے سات دن ہو گئے تھے اور ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں تھی کہ وہاں وہ کب آ رہے ہیں اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔ ٹکٹ لے کر گھر پہنچا ہی تھا کہ عرفان میاں کا ٹیلی فون آیا کہ جوش صاحب پنڈی سے آ گئے ہیں اور مجھے بلا رہے ہیں۔ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور جوش صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ میں تو کل کی فلائٹ سے پنڈی آپ سے ملنے جا رہا تھا۔ کہنے لگے اب پی ٹی وی سے دوسری سیٹ کے لیے بدلوا لیں۔ میں بھی دوسری کو واپس جا رہا ہوں۔ سب دوست ساتھ ہی چلیں گے۔ پھر کہنے لگے آج شام کا کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا آپ جو حکم دیں۔ کہنے لگے سمندر کی سیر کو چلیں؟ میں نے کہا ضرور۔

سمندر کی سیر

اسی شام عرفان میاں، ان کی بیگم اور جوش صاحب ہم سب کھیاڑی پہنچے وہاں ہمارے کسٹم کے ایک ساتھی کمو حسین یوسف علی خاں صاحب نے ایک کرائے کی کشتی کا بندوبست کر دیا اور ہم لوگ سمندر کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ سمندر پر سکون تھا

یہ کا منظر بہت خوبصورت تھا۔ فراز نے جوش صاحب کی کئی غزلیں گائیں۔ جوش صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا۔ رخسانہ بھی شاعرہ ہیں مگر اپنا کلام سناتی ہوئی شرماتی ہیں مگر جوش صاحب کے اصرار پر انھوں نے بھی چند رباعیات سنائیں۔ سورج غروب ہوا تو جوش صاحب نے پاشل شروع کیا۔ ان کو افسوس تھا کہ ہم میں سے کون ان کا ہم مشرب نہیں ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں چودھویں کا چاند اسمانی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔

چاندنی رات میں سمندر کی سیر کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب مجھے آپ کی ایک نظم یاد آ رہی ہے مگر اجازت ہو تو عرض کروں مگر مقطع میں جناب خضر کے بجائے آپ ہی کا تخلص استعمال کروں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا۔ رخسانہ کہنے لگیں۔ مقطع میں شاعر ہی کا نام آنا چاہیے۔ یہ خضر صاحب کہاں سے ٹپک پڑے خیر آپ نظم سنائیے۔ جوش صاحب نے کہا اس نظم کا عنوان تو بتاؤ۔ میں نے کہا اس کا عنوان ہے "راہ طرب" اور یہ آپ کے مجموعہ "حرف و حکایت" میں ہے۔ فرمایا اسے بڑا پرانا مال دیا ہے۔ یہ ۱۹۳۰ء کی لکھی ہوئی ہے۔ خیر تم سناؤ۔ میں نے کہا مال پرانا سہی مگر اس وقت بالکل تازہ ہے۔ سنیے۔

راہ طرب

افق سے آج جشن خرابات کا فروغ
لرزش میں نغمہ ساز ہے گردش میں دور جام

چھائی ہوئی ہے عرش سے تا فرش چاندنی
رقصندہ آب نہر سے تا بندہ سقف و بام

تھکی سرا حسیں ہیں بے حد و حساب رنگ
اٹھتی جوانیوں پہ ہے یوں حسن تمام

نکھری ہوئی ہے نشے سے سناک چاندنی
ڈولی ہوئی ہے کیف میں یوں سبک خرام

نغمے ہیں اپنے چشمہ پنہاں سے ہم کنار
رقصیں ہیں اپنے مرکز اصلی سے ہم کلام

جبریل سے بھی ٹوٹ سکے جس کا ایک حرف
وہ آ رہے ہیں عالم ارواح سے پیام

گردش میں ہیں سروں پہ اٹھائے گلابیاں
ترکان مہ پیکر و نوجوان لالہ فام

اب یہ بند ذرا توجہ سے ملاحظہ فرمائیے جس میں تخلص کا تصرف کیا گیا ہے۔

آیا یہ کون راہ طرب پوچھتا ہوا
چہرہ تو کہہ رہا ہے کہ ہے رہبر انام

آئے تو اس بزرگ کو لے دو رو رو
لازم ہے ہر جوان کو پیری کا احترام

یہ رنگ یہ محاسن یہ حسن آتشیں نظر — راہ طرب کی فکر میں نظریں ہیں سوئے جام
ہاں اس طرف قریب، ذرا اور کچھ قریب — اچھا ... جناب جوش ہیں وہ حکیم الہام

سب نے اس تصرف کی بے انتہا داد دی۔ خود جوش صاحب بہت ہنسے اور مجھے لگے کہ تو تم مجھ پر چوٹ کر گئے مگر تمہاری حس ظرافت کی داد دیے بغیر چارہ نہیں۔ بھئی خوب سے خوب۔ غرض یہ شام اس قدر حسین اور دلچسپ تھی کہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ تقریباً دس بجے ہم لوگ ساحل پر واپس آئے۔ راستے میں بعد عاص کی ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا اور گھر واپس آگئے۔ اس رات جوش صاحب نے عرفان میاں ہی کے مکان پر قیام کیا۔ چلتے وقت مجھ سے کہنے لگے کہ کل صبح سویرے سات بجے تک آجائیے، بہت کام ہیں۔

چنانچہ دوسرے دن ۲۰ ویں اپریل کو میں صبح ساڑھے سات بجے جوش صاحب سے ملنے عرفان میاں کے مکان پہنچ گیا۔ سب لوگ ناشتہ کر رہے تھے میں نے بھی ان کے ساتھ چائے پی اور تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں، جوش صاحب، باشی صاحب اور ان کی تینوں بچیاں، سکندر، رخسانہ اور فرزانہ بابا ذہین شاہ صاحب کے مکان کے لیے روانہ ہوئے مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بابا صاحب سویرے سے کہیں تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے ہم لوگ پی آئی اے کے دفتر گئے، میں نے پی سیٹ تینوں کے بجائے دوسری صبح کے لیے بدوائی۔ اس تبدیلی کے لیے ستر روپے زیادہ دینے پڑے۔ جوش صاحب نے اصرار کیا کہ یہ دام وہ ادا کریں گے کیونکہ یہ تبدیلی ان کی وجہ سے کروانی پڑی تھی مگر میں نے انھیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ غرض ٹکٹ بدوا کر ہم لوگ گورنر ہاؤس پہنچے۔

گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور:

میر رسول بخش تالپور ایک دن قبل ہی گورنر سندھ مقرر ہوئے تھے۔ گورنر ہاؤس میں مبارک باد دینے والوں کا مجمع تھا۔ لوگ پھولوں کے ہار میر صاحب کو پہنا رہے تھے۔ ان کے سیکرٹری نے ہم لوگوں کو ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا اور کوکو کولا کی بوتلوں سے ہماری تواضع کی۔ اس کمرے میں ایک بڑی سی تصویر لٹکی تھی جس کے پس منظر میں پیلز پارٹی کا پرچم تھا جس پر دو تلواریں تھیں اور اوپر ہلال درمیان میں بھٹو صاحب کی تصویر تھی۔ جس کے چہرے

ہر شکل کے ہیچ مدان تھے۔ جوش صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور کہا کہ اس تصویر کو کچھ اور بتاؤ کہ کیا تاثر پیدا ہوتا ہے اور پھر خود ہی کہنے لگے، سست بڑا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ چہرے پر تھکن، رعونت ہے اور اس امر کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے جو غلط ہے۔ ہم اس تصویر کے تاثرات پر غور کر ہی رہے تھے کہ میر صاحب کمرے میں تشریف لے آئے، سب محبت اور تپاک سے ملے اور ہر ایک کی خیریت پوچھی۔ اس کے بعد جوش صاحب کو الگ کمرے میں لے گئے۔ وہاں ان سے تقریباً آدھا گھنٹہ علیحدگی میں بات کی۔ پھر وہ دونوں باہر آئے پھر میر صاحب ہم لوگوں کو گاڑی تک پہنچانے آئے۔ چلتے چلتے کہنے لگے کہ آپ بھی مولانا کوثر نیازی سے مل لیجیے وہ اس وقت اپنے دفتر میں ہوں گے چنانچہ ہم لوگ میر صاحب سے رخصت ہو کر قدیم سیکرٹریٹ میں مولانا کے دفتر پہنچے۔ مولانا مرکزی اور پر نشر و اشاعت تھے۔

مولانا کوثر نیازی سے ملاقات:

جیسے ہی میں کو جوش صاحب کی آمد کی اطلاع ہوئی فوراً باہر آ کر بڑا استقبال کیا اور اپنے دفتر میں لے گئے۔ چائے منگوائی اور خود اپنے ہاتھ سے بنا کر ہم لوگوں کو پیش کی۔ جوش صاحب نے ہم سب کا تعارف مولانا سے کروایا۔ فرزانہ کے متعلق جب جوش صاحب نے یہ کہا کہ اس کا گلا بہت اچھا ہے اور خاص طور پر غزل کا جو جذباتی تاثر ابھارنے میں اس کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے تو مولانا کوثر نیازی نے فرزانہ سے فرمائش کی کہ کوئی غزل سنائیے۔ فرزانہ نے نہایت دلکش انداز میں جوش صاحب کی غزل سنائی۔

برہم نہ اٹھا کیف جفا بھول چکا ہوں
ہر جشن کو اے رہبرو میں بھول چکا ہوں
اب حسن کو تکلیف نہ دے ناز و ادا کی
میں عشق کو اے جان وفا بھول چکا ہوں
در پر ترے آ کر نہ صدا دوں گا کہ اب میں
رسم طلب و طرز دعا بھول چکا ہوں

رہتا ہے جہاں عشق ہمارے ہوئے دھونی
اس راہ کو اسے ہاتھ بھول چکا ہوں
خلوت میں حسینوں کے دکھاتا تھا جو گل زار
مدت ہوئی وہ رنگ حنا بھول چکا ہوں
اک نقش ہے تیر کر مٹانے سے نہیں بنتا
ہر چند کہ سب کچھ بخدا بھول چکا ہوں

یہ غزل کافی طویل ہے مگر فرزانہ نے اختصار سے کام لیا اور صرف چند ہی اشعار سنائے مگر اس کے گلے کا سوز فرزانہ کی دلکشی سے وہ سماں باندھا کہ مولانا نے دل کھول کر داد دی اور یہ دریافت فرمایا کہ ان بچیوں کی "رہائش" کہاں ہے۔ یا تو جوش صاحب اپنی غزل سن کر جھوم رہے تھے یا رہائش کا لفظ سن کر ایسے اچھلے کہ جیسے ان کے جسم قصور میں کوئی کانٹا چبھ گیا ہو۔ فرمایا "مولانا" رہائش" بدسلا لفظ ہے۔ رہنا ہندی کا لفظ ہے اس میں ی ش لگا کر فارسی کا مصدر رہائش نہیں بنایا جا سکتا اگر اس ترکیب کو ہم جائز قرار دے دیں تو پھر چلنے سے چلائش، کھانے سے کھلائش کو بھی درست تسلیم کرنا پڑے گا۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا جوش صاحب اب آپ اسلام آباد تشریف لا رہے ہیں ہم لوگ آپ سے اردو سیکھ لیں گے۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد دوران گفتگو مولانا نے پوچھا جوش صاحب آپ کی تنخواہ کی "ادائیگی" کراچی میں ہوگی یا اسلام آباد میں۔ جوش صاحب پھر اچھل گئے۔ فرمایا یہ "ادائیگی" کا لفظ بھی پہلے لفظ کی طرح غلط ترکیب سے بنا ہے "ادا" فارسی لفظ اور "ئیگی" ہندی۔ فارسی اور ہندی کی آمیزش سے لفظ نہیں بنانا چاہیے۔ مولانا نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کرے"۔ چلتے وقت مولانا نے دریافت فرمایا جوش صاحب آپ اسلام آباد کب تشریف لا رہے ہیں تو جوش صاحب نے فرمایا کہ دوسری مئی کو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ غرض مولانا کے پاس تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھ کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ میں نے سب لوگوں کو عرفان میاں کے مکان پر پہنچایا۔ جوش صاحب بھی وہیں رہ گئے اور میں اپنے گھر آ گیا۔

نظریہ جبر و قدر

دوسرے دن میری ماموں زاد حسن اختر غلام جنھوں نے سیاسیات میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور اب پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ میرے گھر آئیں اور جوشش صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ ہم دونوں عرفان میاں کے گھر پہنچے جہاں جوش صاحب مقیم تھے۔ جب میں نے اختر کا تعارف جوش صاحب سے کروایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ عرفان میاں کی بیگم بھی آگئیں۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران جبر و قدر کا مسئلہ زیر بحث آگیا۔ اختر غلام نے کہا کہ ایک باشعور انسان جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا بے شک آپ جو چاہے کر سکتی ہیں مگر خود چاہنا آپ کے بس میں نہیں۔ انسان کا ہر عمل کسی نہ کسی سبب کا ردعمل ہوتا ہے اور یہ سبب کسی خارجی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور آپ کا ردعمل آپ کی شخصیت کے قوام کا نتیجہ۔ آپ کی شخصیت کا تانا بانا جن عناصر سے بنا جاتا ہے ان میں میراث، تربیت، صحت، علم، تجربہ، جغرافیہ، تاریخ، عقائد اور تمام عوامل سے آپ کی شخصیت کا ہیولا ترتیب پاتا ہے۔ اسی سے آپ کی جذباتی کیفیت مرتب ہوتی ہے۔ یہ سب عناصر مل کر آپ کے رویے کا تعین کرتے ہیں۔ پھر آزاد مرضی کہاں باقی رہی۔ ہم بالکل نباتات اور حیوانات کی طرح جبر کے تابع ہیں۔ کوئی ہماری گردن پکڑ کر ہم سے کام لیتا ہے قوتِ خارجی اور داخلی جبر کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ میں نے کہا تو پھر اس کے یہ معنی ہوئے کہ اگر ہم انسانی کردار میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا چاہیں تو ہم کو اس جبر کا پتا چلانا پڑے گا جو ہمارے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جوشش صاحب نے کہا۔ بے شک۔ میں نے کہا کہ داخلی جبر تو وہ ہے جو ہر ذی حیات کی تعمیر میں مضمر ہے۔ جن کو ہم بقائے ذات اور بقائے نسل کے جبلی تقاضے کہتے ہیں۔ یہ تو ہمارے وجود کی ایسی ضرورت ہے جس سے کوئی شخص منحرف نہیں ہو سکتا۔ اور دراصل اسی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وہ خارجی ماحول سے متعارف ہوتا ہے۔ بقائے ذات کی تکمیل کے لیے وہ اپنے جغرافیائی ماحول کا جائزہ لیتا ہے اور بقائے نسل کی خاطر وہ دوسرے ہم جنس سے آشنائی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح نسل انسانی ایک جغرافیائی ماحول میں ایک سماج تشکیل دیتی ہے پھر معاشرتی ضرورتوں کے تحت اور آپس کے تعلقات اور باہمی رشتوں سے اقدار، رسم و رواج، تہذیب، ثقافت اور حکومت جنم لیتے ہیں اور اس طرح وہ خارجی

جبر معرض وجود میں آتا ہے جس کے تابع اس معاشرے میں انسانوں کے کردار تشکیل پاتے ہیں۔ انسانی کردار کی تشکیل ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس میں ایک طرف اس کی وراثت جس کے ذریعے سے اس کی جسمانی ساخت تشکیل پاتی ہے۔ دوسری طرف اس جسمانیہ کی تربیت و پرداخت اس کا قدرتی اور معاشرتی ماحول ہے۔ قدرتی ماحول میں تو اس کا جغرافیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کوئی انسان رہتا ہے وہ جگہ کرۂ ارض کے کس حصے میں واقع ہے، کیا وہ برفانی علاقہ ہے یا پہاڑی علاقہ میدانی ہے یا سمندری۔ زرخیز زمین ہے یا بنجر۔ جو جغرافیائی کی نوعیت کیا ہے وہاں کس قسم کی پیداوار ہوتی ہے وغیرہ۔ یہ جغرافیائی ماحول انسانوں کی ضرورتوں کا تعین بھی کرتا ہے اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسائل بھی مہیا کرتا ہے۔ اسی جغرافیائی ماحول میں انسانی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ یہ معاشرہ انسانی اعمال پر اپنے اثرات اپنے معاشرتی قدروں کے توسط سے مرتب کرتا ہے جن میں اس کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، تمدنی، اخلاقی اقدار اور تنظیمیں شامل ہیں۔ یہ تمام عوامل انسانی رویے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس طرح انسانی کردار مخصوص سانچوں میں ڈھل کر نکلتا ہے اور پھر انسان اسی کردار کے جبر کے تابع ہر خارجی اور داخلی سطح پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اب اگر ہم ان رویوں میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے معاشی ادوار میں تبدیلی لانا پڑے گی۔ اسی طرح تمدنی اور ثقافتی اقدار کا تجزیہ کر کے ان میں ردوبدل کرنا پڑے گا۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اچھا معاشرہ اچھا آدمی پیدا کرتا ہے اور برا معاشرہ برا آدمی پیدا کرتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا یہ بات بالکل درست ہے مگر یہ بھی ایک نفسیاتی جبر ہے کہ معاشرہ اتنی آسانی سے نہیں بدلا جا سکتا کیونکہ انسانوں کے ذہن کی کنڈیشنگ آہستہ آہستہ کھلتی ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

ہر گام پہ ہے فکر کو قدموں کی ضرورت
اور عمر کی تقدیر میں ہے برق خرامی

اور ہمارے معاشرے میں تو ابھی جاگیرداروں، سرمایہ داروں، چودھریوں، وڈیروں، سرداروں اور دیہی پیشواؤں کا بہت زیادہ اثر ہے اور ہماری ہیئت حاکمہ بھی اسی وراثت کے تابع ہے اس لیے تبدیلی بہت آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔

جوش صاحب نے کہا کہ ان تمام باتوں سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انسانی

اعمال خارجی اور داخلی جبر کے تابع ہوتے ہیں اور آزاد مرضی یا Free Will نام کی کوئی چیز اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اختر عالم نے کہا جوش صاحب جس کو ہم Free Will کہتے ہیں وہ دراصل ہمارا نفسیاتی احساس ہے جو ہماری شخصیت کی خصوصیت ہے۔ ہمارا شعور ذات اپنے باطن سے لفظ مسرت کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنا عمل اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرنے کی سعی میں لگا رہتا ہے اور اگر مختلف حالات میسر آ جائیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس عمل سے اس کو یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے اپنی زندگی بسر کی ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ خود مسرت اور غم کے احساسات بھی تو انسان کی خصوصیاتی اور نفسیاتی تشکیل کا نتیجہ ہیں۔ ہم دراصل ایک مشین کی طرح ہیں جس کا کنٹرول کسی اور طاقت کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہمارے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کر رہی ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب اس طاقت کا کوئی نام ہے۔ جوش صاحب نے کہا نام صرف اتنا محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک توانائی ہے۔ آپ اس کا کوئی نام رکھیں لیکن نام کے ساتھ ہی ست سی غلط فہمیوں کا امکان ہے۔ جب کوئی شخص اس قوت حاکمہ کو مشخص کر کے کوئی نام دیتا ہے تو پھر وہ لامحدود توانائی مطلق اس کے فکری حدود کے حصار میں محدود ہو جاتی ہے اور چونکہ ہر انسان کی فکری، علمی اور تخیلی صلاحیت اس کے علم، تجربے اور احساسات کی نسبت سے محدود ہوتی ہے اس لیے وہ اس لامحدود قوت کا جو بھی تصور قائم کرے گا وہ اس کے ذہن کا تراشیدہ صنم ہو گا۔ بقول اقبال

تراشیدم صنم بر صورت خویش ۔۔۔ بہ شکل خود خدا را نقش بستم
مرا او خود بروں رفتم کمال است ۔۔۔ بہ ہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اس لیے اس توانائی مطلق کو مشخص کیے بغیر اگر آپ کوئی نام دے سکیں تو آپ کی مرضی۔ لیکن آپ جب بھی مشخص کر کے کوئی نام دیں گے تو وہ انسانی صفات ہی کا پرتو ہو گا اور اس طرح خدا کے بھیس میں خود انسان ہی نوع انسان کی تقدیر کا خدا بن جائے گا۔ آج تمام سائنسی علوم انسانی فکر کو اسی اصنام خیالی کی گرفت سے نکال کر توانائی مطلق کے ناقابل تغیر قوانین علت و معلول کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ابھی جس داخلی اور خارجی جبر کی طرف اشارے کیے ہیں اگر ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ قوانین کے بغیر چارہ ہی نہیں

رہتا کہ اس تمام انفس و آفاق کو ایک توانائی مطلق کا جبر کامل اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے جو ہے مشیئ ناآشنا قوانین کے ذریعے سے ہر ذرہ وجود پر مسلط ہے۔

سزا و جزا کا تصور

میں نے کہا جوش صاحب اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ اس کائنات میں صرف اور صرف خالق کائنات کا ارادہ ہی موثر ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی اعمال میں بھی اسی کے ارادے کی جلوہ گری ہے تو پھر ہمارے اعمال کی سزا و جزا کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ اس سوال کا ایک سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل علت اور معلول کے قوانین کے تحت ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ اگر یہ نتیجہ ہمارے لیے مفید ہو تو وہ اس عمل کی جزا ہوگی اور اگر نقصان رساں ہو تو وہ سزا ہے۔ اگر ہم اپنے عمل کے نتیجے سے واقف ہوں تو نقصان دہ اعمال سے اجتناب کریں تو ان کے ضرر رساں نتائج سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ہمارے اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے اثرات ہمارے جسم پر مرتب ہوتے ہیں جیسے کھانا پینا سونا چلنا، ورزش کرنا وغیرہ دوسرے وہ جن کو ہم معاشرتی اعمال کہتے ہیں جن میں ایک انسان دوسرے انسان یا انسانوں کے تعلق سے کوئی عمل کرتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں نتائج تو علت اور معلول کے قوانین کے مطابق ہی مرتب ہوں گے مگر ہمارے معاشرے میں سزا و جزا کے دو نظام ملتے ہیں ایک مذہب کے توسط سے دیا ہوا تصور جس کا تعلق حیات اور موت سے بیان کیا جاتا ہے دوسرا کسی مملکت کے تعزیری قوانین کے تحت سزا کا تصور۔

جہاں تک مذہب کا سزا و جزا کا تصور ہے اور جس کو مرنے کے بعد کی زندگی سے وابستہ کیا جاتا ہے جس کو مذہب کی زبان میں جنت اور دوزخ سے تعبیر کیا گیا ہے، میرے نزدیک یہ قیاسات میں سے ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حساب کے دن ہمارے اپنے اعمال کی گواہی جن کا تعلق ہمارے جسموں سے ہے ہمارے اعضا خود دیں گے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک، کان غرض جسم کا ہر عضو ان اعمال کی گواہی دے گا جو اس کے تعلق سے سرزد ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارا کھانا پینا یعنی ہماری ہر قسم کی غذا اور ہر قسم کا مشروب ہمارے جسم پر اپنے کیمیاوی اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اس کے علاوہ ہمارے

ہمارے اعمال یعنی اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا، دوڑنا، ورزش کرنا یا نہ کرنا، سونا جاگنا مختلف لوگوں سے ملنا جلنا، ہمارے غم اور مسرت کے احساسات، ہماری نفسیاتی، الجھنیں، جذباتی کشمکش، ہمارے تمام امراض، ہماری داخلی اور خارجی ہر کیفیت، ہمارا معاشرتی اور قدرتی ماحول، ہمارے کرنے کے اوقات اور طریق کار، ہمارے جسم کے مختلف اعضاء پر یہ اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور ہمارے جسم ان اثرات سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اور ان میں ان اعمال کی سمت سے اچھی یا بری تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ عمل علت اور معلول کے قوانین کے تحت خود بخود جاری رہتا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں اس تبدیلی کا علم ہوتا ہے مگر زیادہ تر یہ تغیر غیر محسوس طور پر واقع ہوتا رہتا ہے اور بالآخر ایک وقت وہ آتا ہے جب ہمارا کوئی عضو اس مسلسل ضرب اثر کے باعث بیمار پڑ جاتا ہے اور اس میں تکلیف شروع ہو جاتی ہے تو انسان پریشان ہو کر خدا کو پکارتا ہے اور اس سے شکایت کرتا ہے کہ اے خدا تو نے مجھے کس عذاب میں گرفتار کر دیا تو قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ تو خود تمہارے اعمال کے جواب محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ رہے ہیں۔ تکلیف ہی دراصل اس عضو کی ان اعمال کی شہادت ہے جو اس کرتے آئے ہیں۔ اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ مذہب جس کو یوم حساب سے تعبیر کرتا ہے وہ دراصل ہمارے اعمال کے عکس محسوس میں ظاہر ہونے کے وقت سے جو واقع تو ضرور ہوتا ہے مگر اس کی مدت کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ مختلف اعمال کے نتائج کی مدت مختلف ہوتی ہے۔ یہ تو رہی مذہبی نقطہ نظر سے ہمارے اعمال کی سزا و جزا کی توضیح۔

اب دوسرا پہلو سزا کا وہ ہے جو ہمارے مملکتی قوانین تعزیرات کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس معصومی تصور سزا کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ یہ سزا انتقامی ہے اصلاحی نہیں۔ اس سلسلے میں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ یہ تمام کائنات جس میں خود انسان اور انسانی معاشرہ شامل ہے ناقابل تغیر علت اور معلول کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں یہاں ہر معلول علت بداماں ہے۔ اسی طرح ہر جرم کسی نہ کسی علت کے نتیجہ ہوتا ہے بالکل جیسے طرح ہر مرض جسم کی کسی نہ کسی خرابی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہے اور جس طرح معالج مرض کو مریض سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے نہ کہ مریض ہی کو ختم

کرنے کی تو اسی طرح جرم بھی معاشرتی مرض ہے جس کے اسباب بھی معاشرے کی خرابی میں تلاش کرنے چاہئیں۔ مجرم بھی مریض کی طرح معاشرتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں جرم اور مجرم میں فرق کرنا چاہیے اور جرم سے نفرت کر کے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور مجرم کو اس معاشرتی مرض سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری تعزیرات اصلاحی ہوں نہ کہ انتقامی۔ مگر بدقسمتی سے ہماری تعزیرات انتقامی ہیں۔ یہ قدیم دور کی ان روایات کی آئینہ دار ہے جب کسی معاشرے میں وسائل کی کمی اور طاقت کے عدم توازن کے باعث معاشرہ طرفین اور محرومین میں تقسیم ہو گیا اور طاقتور طرفین اپنی جان، مال، عزت اور آبرو کے تحفظ کے لیے ان کے حقوق میں دست اندازی کرنے والوں کو انتقام کے ذریعے سے خوف زدہ کر کے اپنے مفادات کی حفاظت کرتے تھے۔ معاشرتی سزا کا تصور دراصل قبرآشنا مطلق العنان فسطائیوں، مذہبی پیشواؤں، نوابوں، جاگیرداروں، منصب النصب قبائلی سرداروں، سریع الاشتعال آمروں کی جبل آلودہ آتش غضب کا انتقال محض ہے کیونکہ یہ مراعات یافتہ طبقہ کبھی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہو سکتا کہ معاشرے میں حقوق کی عدم مساوات کو ختم کر کے محرومیوں اور ناداروں کو جو آبادی کی کثرت پر مشتمل ہوتے ہیں پرمسرت زندگی بسر کرنے کے وہ تمام حقوق دے دیے جائیں جن کی اس دور کی تہذیب متقاضی ہوتی ہے اور جن سے مراعات یافتہ طبقہ خود مستفید ہوتا رہتا ہے۔ مسلسل عدم مساوات اور محرومیوں کی بنا پر پورے معاشرے میں ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کے حقوق میں مداخلت کرنے لگتا ہے اور یہ مداخلت جب جان، مال، عزت اور آبرو کے حقوق میں ہو تو جرائم جنم لیتے ہیں اور اگر اس معاشرے میں حکومتی عملہ جو جرائم کی روک تھام کے لیے متعین کیا جاتا ہے مگر جو خود بھی محرومین کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے، مجرموں کو تحفظ فراہم کر کے ان کے ذریعے سے خود بھی فائدہ حاصل کرنے لگے تو جرائم متعدی وبا کی طرح تمام معاشرے کو اپنے خونی پنجے میں جکڑ لیتے ہیں اور اس معاشرے میں ایک ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو طرح طرح کے جرائم کی تخلیق کا سبب بنتی رہتی ہے اور چونکہ ہمارے تعزیری قانون کی بنیاد انتقامی ہے اس لیے ہر سرمایہ دار طبقہ سمجھتا ہے کہ جرم کرنے والوں کو سزا دے کر وہ جرم کا تدارک کر دے گا حالانکہ حقیقت یہ ہے

پہ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ میں نے کہا میں اس بات کو خوب سمجھتا ہوں کہ آپ دونوں مجھے بیچ میں رکھ کر دراصل ایک دوسرے سے مخاطب ہیں مگر شعری کمزوری کے تحت اتنی تعریف پر خوش ہونا بھی یک طرفی امر ہے۔

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوش قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہاشمی صاحب گرم گرم کبابوں کی قاب لے آئے۔ میں نے دیکھے تو واقعی ست لذیذ تھے۔ میں نے جوش صاحب سے کبابوں کی تعریف کی تو وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ کباب کے بعد بالائی آ گئی وہ بھی اس قدر لذیذ تھی کہ ضرورت سے زیادہ کھا گئے۔ مرض کھانے سے فارغ ہوئے تو جوش صاحب نے کلیاں کر کے منہ صاف کیا اور کہا کہ ہم آرام فرماتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد گر زندہ رہے تو آپ لوگوں سے ملاقات ہو گی۔ مجھ سے کہا دیر بھاگ مت جانا۔ میں نے کہا آپ آرام فرمائیں میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ جوش صاحب تو سو گئے اور ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ موضوع گفتگو رہا تو انسانی نفسیات کے مسائل ہی رہے۔ ان باتوں میں چار بج گئے۔ جوش صاحب بیدار ہو گئے، غسل ثانی فرمایا۔ پھر ہاسے پیچھے تک پانچ بج گئے۔ سمن اور ان کی سمن جدت نے کر رخصت ہو گئیں۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کل ضرور آ جانا ہم لوگ چھ بجے نکل جائیں گے۔ دونوں نے آنے کا وعدہ کر لیا۔ اتنے میں شوکت حسین رضوی صاحب آ گئے۔ اور مجھے اور جوش صاحب کو لے کر پہ گھر چلے گئے۔

شوکت حسین رضوی کے گھر دعوت:

ان کا مکان ماہور اسٹوڈیو کے ایک حصہ میں واقع ہے۔ شوکت صاحب نے ہم کو اپنا اسٹوڈیو دکھایا۔ اس وقت کوئی شوٹنگ نہیں ہو رہی تھی۔ اسٹوڈیو ست بڑے علاقے میں پھیلا ہوا ہے اور ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ شوکت صاحب کی موجودہ بیگم یاسمین صاحبہ بھی وہیں تشریف لے آئیں اور بہت عقیدت اور محبت سے جوش صاحب سے ملیں۔ اسٹوڈیو کی سیر کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

شوکت صاحب نے بلیک لیبل کی بوتل کھولی۔ ایک گلاس میرے سامنے بھی رکھ دیا۔

جوش صاحب نے کہا No He is not a gentleman رضوی صاحب نے میرے لیے کوکا منگوایا۔ ادھر سورج غروب ہوا اور جوش صاحب و رضوی صاحب طلوع ہو گئے۔ گرگ میں نمکین کا جو نمکین پستے اور بادام تھے۔ نمکین کا جو جوش صاحب کو بہت پسند ہیں دوسرے تیسرے پیگ کے بعد یاسین صاحب نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی پھر دیر تک جوش صاحب کلام سناتے رہے۔ شغل سے فوشی ختم ہوا تو کھانے کی میز پر پہنچا گئے بہت لذیذ اور پرتکلف کھانا تھا۔ شام بہت دلچسپ رہی۔ کوئی دس بجے رضوی صاحب نے جوش صاحب کو ہاشمی صاحب کے گھر اور مجھے اختر میاں کے گھر پہنچایا۔ اور اس طرح آج کا دن ختم ہوا۔

چھانگا مانگا کی سیر:

دوسرے دن صبح ہی صبح میرے پاس رضا کا فون آیا کہ سب لوگ چھانگا مانگا جانے کے لیے تیار ہیں اور بابا آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ جلد آ جائیے اور ناشتہ ہمارے ساتھ ہی کیجیے۔ چنانچہ میں آدھے گھنٹے میں ہاشمی صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ سب لوگ ناشتے کی میز پر تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم لوگ گاڑیوں میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ مسعود اور ان کی بہن بھی آ گئیں۔ ان کو دیکھ کر جوش صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ مسرت ان کے ہر رگ و ریشے سے ابل رہی تھی۔ میں نے کہا اب چلیے تاکہ

بدمست گھٹاؤں کی طرح دشت میں گھومیں
چھلکائیں مے ہوش ربا جام کو چھو میں
کیا دہر و دو عالم کو کریں غرق مے و میں
مستی سے گزر جائیں چھاتے ہوئے دھومیں

کچھ تک

اس رت میں عبادت ہے حسینوں کی ملاقات

میں نے کہا میر صاحب بھی موسم بہار میں حسینوں کے لیے صبح ہی کا رخ کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

میرا سب بہار آتی صحرا میں چل جہیں کر نادان فصل گل میں کوئی بھی گھر رہے ہے

اتفاق سے ان دنوں چند روز سے لاہور پر بڑے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور جس روز ہم لوگ چھانگا مانگا کے لیے روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ غرض تمام رستے شعر و شاعری کرتے ہم لوگ چھانگا مانگا کے ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ وہاں تھوڑی دیر آرام کیا پھر ہرے نے سب کو چائے پلائی۔ جہاں موسم اس قدر حسین ہو اور ماحول اتنا رنگین تو کوئی شخص کمرے میں کیسے بند ہو سکتا ہے۔ چھانگا مانگا کے جنگلوں میں ایک چھوٹی سی ریل گاڑی چلتی ہے چنانچہ ہم سب لوگ ریل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے کہا جوشش صاحب آپ کو تو ویسے بھی ریل کا سفر سب سے پسند ہے پیچھے کئی سال دن سی ریل میں گھومتے ہیں۔ بعض بعض تو آگے درختوں کے بیچ سے ریل گزرتی رہی۔ ایک مہر ہی جنگل کے بیچ سے گزرتی ہے جس میں کئی قسم کے آلی پرندے بھی ہیں۔ غرض دو تین گھنٹے کی سیر کے بعد جب ریل رک گئی تو اس کا عملہ دوپہر کے وقفے میں کھانا کھانے چلا گیا تو ہم لوگ ریسٹ ہاؤس آ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کیا۔ شام کو ریسٹ ہاؤس کے سامنے میز کرسیاں ڈال دی گئیں۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر پھر سیر کو نکل گئے اور غروب سے تھوڑی دیر قبل ریسٹ ہاؤس آ گئے۔ اس دفعہ جوشش صاحب نے ریسٹ ہاؤس کے ملازم سے کہہ کر نہر کے کنارے میز کرسیاں ڈلوا دیں اور وہیں سامان سے لوٹی بھی منگوا لیا۔ اسے میں سورج غروب ہو گیا اور جوشش صاحب طلوع ہو گئے۔ جوشش صاحب نے اپنی کتاب "یادوں کی برات" میں اپنی دو سابقہ محبوباؤں کے ساتھ ایک شام کا ذکر کیا ہے۔ آج بھی بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ریکشن ری پلے (Action Replay) ہو رہا ہے یعنی وہ منظر دہرایا جا رہا ہے۔ بہتر ہے کہ اس منظر کو جوشش صاحب ہی کی زبان سے سنیے۔

"اب شام ہو گئی۔ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے کے تھیلے میں گلاس، سوڈے اور بوتل رکھوا کر ہم نہر کے ایک ریتلے کنارے پر جا کر بیٹھ گئے جدھر کوئی آ جا نہیں سکتا۔ سامنے وہ رنگین شام، سامنے وہ گل فام، وہ چھلکتا جام، وہ آنکھوں آنکھوں میں کلام، وہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، وہ آسمان پر ابر کے ہلکے ہلکے لگے، وہ افق پر ڈوبتے سورج کا سونا سونا چادر، وہ بھری نگاہوں میں جادو تھا۔" جب جوشش صاحب نے اس علاقے پری جمال میں وہ پیگ ختم کر کے تیسرا پیگ بنا کر

سامنے رکھ لیا تو سمن نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کر دی۔ جوش صاحب نے اپنی ایک غزل سنائی۔

تو جو چاہے تو عرف کو در خلاص کر دے
پھر چھلکائے تو گونگوں کو غزل خواں کر دے

چلنے پر آئے جو شوخی تیری
کوہ کو کاہ کے مانند پریشاں کر دے

رسما کر کبھی انگڑائی جو لے وقت سحر
خلوۂ خواب کو ورنگ سلیماں کر دے

تو اٹھا کر کبھی تہجد پرستی رات میں
یوں کھنکائے تو قطبین کو رقصاں کر دے

انگڑیوں سے جو چھوئے کبھی آیات جہاں
مرد زندیق کو پیغمبر دوراں کر دے

تو کسی مرتد و کافر کو بھی دے زہرہ جبیں
بڑھ کے سینے سے لگا لے تو مسلماں کر دے

مسکرا کر جو کھینچے میں چھو دے مکھڑا
قیس کو جلوۂ لیلیٰ سے گریزاں کر دے

پنہ دانتوں میں دبائے جو دوپٹے کا سرا
حکمت جوش کو انگشت بہ دنداں کر دے

جوش صاحب غزل ختم کر چکے تو سب کی فرمائش پر مجبوراً انہیں یہی غزل گا کر سنانی۔ قدرت نے اس بچی کے گلے میں موسیقی اور راگنی کی مٹھاس اس قدر کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کہ ہر شخص غزل سن کر جھومنے لگا۔ میں بار بار سمن کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت کو دیکھ رہا تھا۔ جوش جیسا عظیم شاعر بھی اگر کسی لڑکی کے سامنے اس کے حسن کی دلکشی کا اعتراف کرے تو اس وقت اس کے چہرے کے بشاشت قابل دید ہوتے ہیں۔ حسن کی کامرانی کا احساس نسوانی شرم و حیا کا غلاف بن کر سرخ رنگیں کی دلکشی میں صبح بہاراں کا جلال و جمال پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت بقول مخدوم محی الدین "خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے"۔ جوش صاحب نے سمن بیکر کے چہرے پر التفات کا یہ رنگ دیکھا تو دل کا نذرانہ قبول کرنے پر مبارکباد پیش کی۔ جوش صاحب پر اس وقت دوگونہ سرور کی کیفیت طاری تھی۔ التفات حسن و شباب اور سرمستی بادۂ ناب اس عالم کیف میں جوش صاحب نے ترانۂ مبارک باد کی نغمگی شروع کی۔

آسودگی حشر و ترکانہ مبارک
اے شمع، جگر سوزی پروانہ مبارک

تیرے کف گل رنگ کو یہ جرعۂ جوانی
میرا یہ چھلکتا ہوا پیمانہ مبارک

اک مرد نوا سنج حقائق کے لبوں پر
افسون تمنا کا یہ افسانہ مبارک

ہاں ہیں وہ خلوتیں ہیں مرے حسن کے دیپک — یہ حسن یہ گرانیش کاشانہ مبارک
ہیں جلوہ سرا میں کہ تاباں کا وطن ہے — یہ فکر کا انداز طربخانہ مبارک
خود گھر بنتے معانی کی طرف سے — اٹھے ہوئے دامن کا یہ نذرانہ مبارک
ہے پرتو فسانہ ہیں مجھے لوگ یہ کہتے — یہ عقل میں ڈوبا ہوا دیوانہ مبارک
رقصاں ہے غزلیات میں خود محتسب شعر — ساقی ۔ یہ فکر مندی سے خانہ مبارک
یوں بنا مملکت نجد میں شامل — یہ فتح مبیں جلوہ جانانہ مبارک

چوکھٹ پہ مرد مہر ہیں قدموں پہ سر جوش
یہ دبدبہ یہ شوکت شاہانہ مبارک

میں نے کہا جوش صاحب خدا آپ کو یہ جلوہ جانانہ مبارک کرے اور ہمیشہ حسینوں کی رفاقت سے لوجوان رکھے شاعر بھی بڑا خوش قسمت انسان ہوتا ہے وہ جو دل کی بات کھری محفل میں جس کو سنانا چاہتا ہے سنا سکتا ہے اور کوئی اس کی زبان نہیں پکڑ سکتا نہ اس پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے بقول میر تقی میر:

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس مرنے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑکے کھری محفل میں یہ اسرار کہتے ہیں

خود خود آپ کا بھی تو یہ شعر ہے

قربان ترے کرک نگہ التفات نے — دل کی جھجک کو جرأت رندانہ کر دیا

کسی نے کہا جوش صاحب یہ غزل سنائیے۔ جوش صاحب نے کہا اسی غزل کا تو وہ مقطع ہے کہ

آواز دو کہ جنس دو عالم کو جوش نے — قربان یک تبسم جانانہ کر دیا

کسی نے پھر یہ غزل سنانے کی فرمائش کی تو جوش صاحب نے وہ غزل بھی سنائی۔

رقص و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا — رندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا
اے حسن داد دے کہ تمنائے عشق نے — تیری حیا کو عشوہ رندانہ کر دیا
قربان ترے کرک نگہ التفات نے — دل کی جھجک کو جرأت رندانہ کر دیا
صد شکر دس حکمت ناحق شناسیوں کو — ہم نے دہان غمزہ مستانہ کر دیا
دنیا نے جو فسانہ حقیقت بنا دیا — ہم نے حقیقتوں کو بھی افسانہ کر دیا

آواز دو کہ جنس دو عالم کو جوش نے
قربان یک تبسم جانانہ کر دیا

اب اندھیرا زیادہ ہو گیا تھا۔ جوش صاحب کا چوتھا مجموعہ ختم ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر ریسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ وہاں کھانا کھایا پہلے تو یہ رائے ہوئی کہ وہ رات وہیں گزاری جائے مگر سمن نے اس کی بہن سے کہا کہ ان کے والدین پریشان ہو جائیں گے اس لیے سب وہاں سے رخصت ہو کر اپنے اپنے گھر سدھارے۔

دوسرے دن شوکت حسین صاحب نے آ کر کہا کہ وہ اسی منگل کی شب ان کے ایک دوست حفیظ اللہ حسن صاحب کے وہاں جوش صاحب کی شام کی دعوت ہے۔ مجھے اور باقی صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ چونکہ فلم انڈسٹری کی بہت سی معروف شخصیتیں بھی مدعو ہیں اس لیے یہ ذمہ داری حفیظ صاحب نے شوکت صاحب کو سونپی ہے کہ وہ جوش صاحب کو مطلع بھی کریں اور ان کو اپنے ساتھ لے کر بھی آئیں۔ جوش صاحب کسی اور کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر یہ بات شوکت صاحب سے نہ کہہ سکے۔ ان کے چلے جانے کے بعد مجھ سے کہا۔ حفیظ صاحب نے چونکہ خود آ کر ان کو دعوت نہیں دی ہے اس لیے وہ اس دعوت کو ٹال جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا جوش صاحب اگر آپ کو اعتراض تھا تو آپ شوکت صاحب سے کہہ دیتے۔ اب تو شوکت صاحب دوسرے صاحبوں کو بھی اطلاع کر دیں گے اور حفیظ صاحب کو بھی مطلع کر دیں گے کہ آپ نے دعوت قبول کر لی ہے۔ جوش صاحب کہنے لگے میری جوتی ہے۔ کر کہہ دیں گے تو کہہ دیں۔ ارے ہم کوئے جاناں چھوڑ کر تو صدر کے گھر بھی نہ جائیں گے۔ شوکت صاحب یا حفیظ صاحب کی کیا حیثیت ہے۔ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اُدھر حفیظ اللہ صاحب بول رہے تھے اور جوش صاحب سے بات کرنا چاہتے تھے۔ حفیظ صاحب نے پہلے تو اپنا تعارف کروایا تو وہ جوش صاحب کے خیم دوستوں میں سے نکلے۔ پھر انھوں نے معذرت چاہی کہ چونکہ ان کو جوش صاحب کی قیام گاہ کا پتا معلوم نہیں ہے اس لیے وہ ٹیلی فون کر رہے ہیں اور انھوں نے شوکت صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ آپ تک ان کی دعوت پہنچا دیں۔ جوش صاحب نے کہا کہ شوکت صاحب نے ان کا پیغام پہنچا دیا ہے مگر وہ بھی تو اپنا دیدار کروا دیں۔ یہ کہہ کر ٹیلی فون

ہاشمی صاحب کو دے دیا۔ انھوں نے حفیظ صاحب کو پتہ گھر کا پتا سمجھا دیا۔

شام تقریباً پانچ بجے حفیظ صاحب جوش صاحب سے ملنے آگئے۔ اس وقت سمن اور ان کی سمن اور ہاشمی صاحب کی لڑکیاں سب جوش صاحب کو گھیرے ہوئے تھیں۔ جوش صاحب نے میرا تعارف بھی حفیظ صاحب سے کروایا۔ حفیظ صاحب نے کہا جوش صاحب آپ تمام خواتین و حضرات کل شام میرے غریب خانے پر تشریف لائیے میں نے موسیقی کا بھی اہتمام کیا ہے۔ مزید خانم بھی آئیں گے اور اگر اقبال بانو بھی لاہور میں ہوئیں تو وہ بھی آئیں گی میں نے میاں اور حسن کو بھی مدعو کرنا چاہا تھا مگر چونکہ اس محفل کے مہتمم شوکت حسین صاحب رضوی ہیں اس لیے وہ ان کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔ میں کے علاوہ ست سے ملی ستارے ہمارے گھر کے آنگن میں آپ کے دیدار کے لیے تڑپ جائیں گے۔ جوش صاحب نے سمن کی طرف اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ بھئی کیا حکم ہے سرکار، دعوت قبول کروں یا رد کر دوں مگر سب بچیوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم بھی ضرور جائیں گے۔ چنانچہ دعوت منظور کر لی گئی اور حفیظ صاحب تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

حفیظ اللہ حسن صاحب کے گھر جوش صاحب کی دعوت:

دوسرے دن ۱۰ مئی ۱۹۷۲ء منگل کی شام پانچ بجے شوکت صاحب تشریف لے آئے اور جوش صاحب اور میں ان کے ہمراہ حفیظ اللہ حسن صاحب کی کوٹھی پہنچے۔ گلبرگ میں واقع ہے۔ کوٹھی کی شان و شوکت دیکھ کر مکین کی دولت مندی کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ کوٹھی کو بجلی کے قمقموں سے اس طرح سجایا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شادی کی تقریب کا اہتمام ہے۔ میں نے یہ حسن آرائش دیکھ کر کہا۔

گلشن میں ہے دولت رنگ و گر ہے آج قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

جوش صاحب نے شوکت صاحب سے دریافت کیا کہ "کیا یہاں آج کوئی شادی ہے"۔ شوکت صاحب نے کہا آپ کے استقبال کا اہتمام ہے۔ کسی بڑے بڑے ہال تھے ایک ہال پر پنڈال سا بہت شاندار اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ بڑے بڑے تخت بچھے تھے۔ ان پر سایت قیمتی ایرانی قالین، بچھے گاؤ تکیے۔ تخت کے تین طرف خوبصورت پھولوں اور بجلی کے قمقموں سے

منتظم بنایا گیا تھا۔ حفیظ اللہ حسن صاحب استقبال کے لیے صدر دروازے پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی ہماری گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی۔ صاحب حامد نے بڑھ کر دروازہ کھولا جوشش صاحب کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے گاڑی سے نیچے اتارا اور لے جا کر صدر نشین پر مدعو افروز کر دیا۔ مجھے بھی ان کے ساتھ ہی تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ہمارے گاڑی سے اترنے کے بعد شوکت صاحب ہاشمی صاحب اور ان کی بچیوں کو لیے چلے گئے اور تھوڑی دیر میں وہ لوگ بھی آ گئے۔ جوشش صاحب کے ایک ملنے والے جو خاص لاہور ہی میں رہتے تھے، خورشید صاحب فریدہ آپا بھی کسی طرح اس محفل میں شریک ہو گئے اور جوشش صاحب کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ ست سے مہمان تو پہلے ہی آ چکے تھے تھوڑی دیر میں باقی لوگ بھی آ گئے۔ فریدہ خانم پہلے سے موجود تھیں۔ اداکار محمد علی اور ان کی بیگم زیبا۔ اسلم پرویز اور ان کے علاوہ ست سے فلمی ہیرو ہیروئنیں موجود تھیں۔ جیسے ہی سورج غروب ہوا، شراب کا دور شروع ہو گیا۔ ست اعلیٰ قسم کی شراب اس قدر وافر مقدار میں موجود تھی کہ اگر بادہ کش خم کے خم لنڈھا جائیں تو بھی کم پڑے۔ یہ دیکھ کر مجھے ست تعجب ہوا کہ ست سے ایسے حضرات و خواتین جن کے متعلق شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا، ان کے ہاتھوں میں بھی جام تھا۔ بقول جوشش صاحب "چمن میں صبح ہر گلبانگ نوشا نوش ہے ساقی"۔

ادھر گردش میں جام آیا، ادھر لرزش میں ساز آیا اور مغنیہ آتش نفس فریدہ خانم کے لب گلنار پر نغمہ دلنواز آیا۔ ان کی رنگ برنگی نشستوں پر حسینان گل اندام چہرہ فروغ سے گلستاں کیے ہوئے تو بین سازاں کا عزم لیے ہوئے تھیں۔ نکھرا ہوا شباب اور اس پر ہوائے شام کی گل باریاں۔ پیشانیوں پر کاکلوں کی فسوں کاریاں۔ دل بسمل پر ٹھکرائیاں۔ بظاہر سادگی میں بھی پرکاریاں۔ اس شبستان چمن کے ہر غنچہ پر نزول رحمت پروردگار تھا۔

فریدہ خانم نے مطلع چھیڑا، فیض صاحب کی غزل تھی:

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شب تنہائی کا

مگر اس بزم میں تو ہر جانب چاند اور سورج ہی جلوہ افروز تھے۔ اس کے باوجود فریدہ خانم اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھیں۔ فریدہ خانم کے بعد اور کچھ لوگوں نے گانا سنایا۔

جب تمام محفل نغمہ و مے سے سرشار ہو گئی تو دعوت کام و دہن کا اعلان ہوا۔ جوش صاحب کے لیے ہر چیز وہیں تخت پر مہیا کر دی گئی۔ میں بھی ان کے ساتھ وہیں شریک طعام ہو گیا۔ فرید آبادی صاحب کچھ اس قدر مست ہوئے کہ ان کو تن بدن کا ہوش ہی نہ رہا۔ کھانا ست لذیذ اور وافر مقدار میں تھا۔ کئی قسم کے تو کباب ہی تھے۔ جوشش صاحب کو کباب ست پسند آئے۔ پھر طرح طرح کے میٹھے تھے۔ ناز و نوش سے فارغ ہوئے تو سب نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب اس وقت انفاس گل رواں کی مثل بیز اضافاں میں اور بادہ عنبر چکاں کی مستی میں اس عالم میں تھے کہ

گو نہ میکدہ ام لیک وقت مستی ہیں — کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

میں تو گو نہ میکدہ ہوں لیکن یہ دیکھو کہ مستی کے عالم میں فلک پر ناز اور ستاروں پر حکمرانی کر رہا ہوں!

جوش صاحب نے مجھ سے پوچھا موٹا مال پیش کروں یا باریک مال۔ شوکت صاحب جو قریب ہی بیٹھے تھے، کہنے لگے جوش صاحب، آپ کا ایک ست پرانا مال ہے جس کا عنوان ہے "آج کی رات" وہ سنائیے۔ جوش صاحب نے اپنی ایک بیاض کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا کہ وہ بیاض دیکھیے۔ جوش صاحب نے بیاض کھولی، پھر نظم سنانی شروع کی:

آج کی رات

دیدنی ہے مری محفل کا سماں آج کی رات — موج مستی میں ہے رقص دو جہاں آج کی رات

گل گیا ہے کوئی اس طرح گل افشانی پر — ذرے ذرے پہ ہے جنت کا گماں آج کی رات

لالہ و گل سے بکھرے ہوئے پھولوں کی سماں — ہر شکن فرش کی ہے کاہکشاں آج کی رات

یک مجسم سا تبسم ہے جہاں ارض و سما — ایسا اک دائرہ ہے رطل گراں آج کی رات

اڑ رہے ہیں ہے پگھلا ہوا سونا گویا — عرق آلودہ رخ سیم بر ہیں آج کی رات

پرتو ماہ و شمس سے ہے گرد و خیز — افق عرصہ رہرو و شاں آج کی رات

کاخ عالم میں فطرت خوباں اس وقت — قادر بود شمس طبع بیاں آج کی رات

شمع ہے قابل پروانۂ تابندہ خراج — حسن ہے مائل صاحب نظراں آج کی رات

جوشے کہسار کے مانند گردِ جام سے
یہ ہے فرمانِ جہاں گرداں آج کی رات

اف ندی ساحل پہ غزل بانے رواں کی بلبل
اک تلاطم ہے سرِ آب رواں آج کی رات

غلغلہ ساز کا ہے دیر مغاں سے لے کر
تا بہ خلوت گہِ خوبانِ جہاں آج کی رات

جیسے بھیگی ہوئی زلفوں کی مہک ہو ہمراہ
نفسِ شام ہے یوں مشک فشاں آج کی رات

خانہ دار و ساقی کے سروں پر ہے
کلسے جو آج کون و مکاں آج کی رات

حلقہ باندھے ہوئے میخوار ہیں سرگرمِ طواف
جوش ہے قبلہ رندانِ جہاں آج کی رات

لوگ ہر شعر پر داد دے رہے تھے لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سوائے چند کے باقی سب لوگ خصوصاً خواتین کی اکثریت صرف تکلفاً واہ واہ کر رہی تھی۔ جوش صاحب اس معاملے میں بے انتہا حساس واقع ہوئے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے کلام ضائع ہو گیا۔ مجا نہیں آئی۔ مزہ نہیں آیا۔ اس کے بعد خواتین کی طرف سے فرمائش ہوئی کہ گل بدنی سنائیے۔ چنانچہ جوش صاحب نے جب گل بدنی شروع کی تو ہر گل بدن مجسم داد بن گئی اور ہر ٹیپ کے بند پر تمام محفل نے جوش صاحب کے ساتھ کورس میں کہنا شروع کر دیا۔

"کیا گل بدنی گل بدنی گل بدنی ہے"

گل بدنی اختتام کو پہنچی تو "حسینۂ خانقاہ" کی فرمائش ہوئی۔ وہاں بزمِ نگاراں میں ہر حسینہ خانقاہ سے کم نہ تھا۔ جوشؔ صاحب تو حسینۂ خانقاہ کی تصویر لفظوں میں ترش رہے تھے۔ مگر اہلِ محفل ان کی ہر لفظی تصویر کو اپنی نگاہوں کے سامنے بیکر محسوس میں دیکھ رہے تھے۔ جوشؔ صاحب کہہ رہے تھے۔

آنکھوں میں آگ عشوۂ آہن گداز کی
لہریں ہر ایک سانس میں سیلابِ ناز کی

پلکیں ہوا کے دوش پہ زلفِ دراز کی
کنپٹی میں دمک رخِ آئینہ ساز کی

آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گھلی ڈھلی ہوئی

ساعدِ کا ہے کاکلِ مشکیں کے دام میں
جو ہیں شراب سرخ کی آنکھوں کے جام میں

رنگِ طلوعِ صبح رخِ لالہ فام میں
چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں

انساں تو کیا یہ بات پری کو بھی نہ تھی
ایسی تو چال کبک دری کو بھی نہ تھی

ڈوبی ہوئی تھی جنبش مژگاں شباب میں
یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق کہ نمی تھی گلاب میں
یا اوس سو رہی ہے شب ماہتاب میں

آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یوں جھیلتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

اور جب جوش صاحب نے یہ بند پڑھا کہ

ہر چیز ہیچ اٹھا ترے ساتھ جائیں گے
اے حسن تیری راہ میں دھونی رمائیں گے
اب اس جگہ سے اپنا مصلیٰ اٹھائیں گے
قربان گاہ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے

کھاتے رہے فریب بت خانہ میں
اب سجدہ ریز ہوں گے تیری بارگاہ میں

تو وہاں موجود تمام حضرات نے جوش صاحب کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہا۔ ہم بھی ترے ساتھ جائیں گے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جوش صاحب اپنے اشعار کے ذریعے وہاں موجود ہر شخص کے دل کی آواز بن گئے تھے..... ایک نظم ختم ہوتی تو دوسری کی فرمائش شروع ہو جاتی تھی۔ صرف رات دو بجے تک محفل بہار خاں اور بزم گئی بدستور میں جوش صاحب اپنے کلام کا جادو جگاتے رہے..... ناظم جب یہ محفل برخاست ہوئی تو سب ہی لڑکیوں نے جوش صاحب کو آ کر گھیر لیا اور آٹوگراف لینے لگیں۔ ان سے بڑی مشکل سے فارغ ہوئے تو حفیظ اللہ صاحب نے جوش صاحب کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں بٹھا کر رخصت کیا۔ ہم لوگ تقریباً چار بجے رات اپنے گھر پہنچے

لاہور سے پنڈی واپسی:

دوسرے دن کلام خاں صاحب کا فون پنڈی سے آیا کہ مولانا کوثر نیازی جوشش صاحب کو یاد کر رہے ہیں اس لیے وہ پنڈی آ جائیں۔ چنانچہ لاہور کی دلچسپ محفلیں ختم ہوئیں اور جوشش صاحب اور میں مدعی کو واپس پنڈی پہنچے۔ پنڈی میں جوش صاحب تو

ہوٹل فلیش مین چلے گئے اور میں ان سے رخصت ہو کر اپنے بیٹے سے ملنے رسالپور چلا گیا جو پاکستان ایئر فورس رسالپور اکیڈمی میں ریڈ ٹریبیت تھا۔ وہاں مجھے تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا۔ ۲۲ مئی کو میں پنڈی واپس آیا اور کلام خان صاحب کے گھر گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ جوش صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خوشی سے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ کہنے لگے اتنے تم اتنے دن تک ایسے غائب ہو گئے کہ میں سمجھا کہ مجھے چکر دے کر کراچی واپس چلے گئے ہو۔ تم نے ٹیلی فون پر اپنے آنے کی اطلاع بھی نہ دی۔ میں اور کلام خان بس کے اڈے پر تم کو لینے آ جاتے۔ میں نے کہا کہ وہاں موقع ہی نہیں ملا کہ آپ کو فون کر سکتا۔ پھر بیٹھ کر باتیں ہونے لگیں۔ رات کو جوش صاحب نے بھی کلام خان ہی کے گھر قیام کیا۔

دوسرے دن میں نے جوش صاحب سے کہا کہ میں کراچی جانا چاہتا ہوں۔ رحمت اللہ خان کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ پہلے تو جوش صاحب کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے کہ میں جوش صاحب کو چھوڑ کر کراچی چلا جاؤں مگر جب میں نے رحمت کا ذکر کیا تو بادل ناخواستہ راضی ہو گئے۔ پھر ہم لوگ پی آئی اے کے دفتر گئے اور ۲۲ مئی کی شام کی سیٹ بک کرا کر اسلام آباد گئے۔ جہاں دو تین مکان دیکھے پھر گھر آ گئے۔

دوسرے دن صبح وزارت اطلاعات کے دفتر گئے۔ علوی صاحب سے مل کر اظہار احمد خان سیکشن آفیسر منسٹری آف ورکس کے دفتر میں ان سے ملے اور جو مکان دیکھے تھے ان کی تفصیل سے ان کو آگاہ کیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ بہت جلد جوش صاحب کے لیے مکان کا بندوبست کر دیا جائے گا۔

۲۲ مئی آج پنڈی کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ صبح ہی سے گھرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور وقفے وقفے سے بارش ہو رہی ہے۔ شام کی فلائٹ سے میری سیٹ بک تھی۔ شام پانچ بجے سے موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ جوش صاحب نے خوش ہو کر کہا تم میرا دل توڑ کر کراچی جا رہے ہو کچھ تمھارا جہاز کراچی جانے کا ہی نہیں۔ میں نے کہا خود میرا دل جانے کو نہیں چاہ رہا ہے مگر کیا کروں مجبوری ہے۔ اب یہاں بہت دن ہو گئے۔ وہاں بھائی بیمار ہے۔ غرض اسی بارش میں کلام خان اور جوش صاحب مجھے ایئرپورٹ پہنچانے آئے۔ بارش کے باعث جہاز تاخیر سے روانہ ہوا اور میں تقریباً ۹ بجے رات کو اپنے گھر کراچی پہنچ گیا۔

کراچی آنے کے بعد میں اپنے کام میں مشغول ہو گیا مگر جوشش صاحب سے دوسرے تیسرے دن ٹیلی فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ ہوٹل فلیٹس میں سے کام خان صاحب کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے اب یہاں ہمارے کام میں تو ہے لگ گئے ہیں نہ تو مکان کا انتظام ہو رہا ہے اور نہ کسی دفتر کا۔ دن بھر بے کار پڑے رہتے ہیں میں نے پوچھا کہ آپ نے کوئی حلقہ احباب بھی بنایا ہے یا نہیں۔ کہنے لگے شام کو کچھ احباب جمع ہو جاتے ہیں مگر کراچی والوں کی بات کہاں۔ آنکھیں چاروں طرف ڈھونڈھتی ہیں وہ میرا راجب نظر نہیں آتا۔ وہی شاعرانہ جملہ۔ اب کہاں ہے میرا پرس عالمگیر قدر۔ یہاں سلامت علی خاں ہے نہ خورشید علی خاں نہ منور عباس اب کس کس کے نام گنواؤں۔ شام ہوتے ہی جی چاہتا ہے کہ تم سب میرے اطراف جمع ہو جاؤ۔ میں نے کہا کیا لاہور میں بھی کراچی کے احباب یاد آتے ہیں۔ کہنے لگے اب کس مقام کا نام لے لیا خورشید علی خاں تم نے

لاہور کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ۔۔۔ اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

میں نے پوچھا اب آپ کو نے جاناں کب تشریف لے جا رہے ہیں۔ کہنے لگے یہاں کے حالات قابو میں آ جائیں تو پھر لاہور چلا جاؤں گا۔ اس کے کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ جوش صاحب لاہور میں ہیں۔

پھر دوسری جنگ کو لان کا ٹیلی فون آیا کہ تیسری کو وہ تیز گام سے کراچی تشریف لا رہے ہیں۔ میں، راجب صاحب اور فراست رضوی کینٹ اسٹیشن وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ گاڑی کچھ تاخیر سے پہنچی۔ مگر جوشش صاحب ہم لوگوں کو اسٹیشن پر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہر ایک کو گلے لگایا پھر ہم سب ان کے گھر فیڈرل بی ایریا گئے جہاں جوش صاحب نے قیام کیا۔ ہم لوگ چلنے لگے تو جوشش صاحب نے کہا شام کو وقت پر آ جانا اور سلامت علی خاں کو بھی لے آنا۔

مجھ سے پوچھنے لگے تمہارے بھائی کی طبیعت اب کیسی رہتی ہے۔ میں نے کہا اب بہتر ہے۔ فرمایا اگر وہ آ سکیں تو شام کو ان کو بھی لے آنا۔

چنانچہ شام پانچ بجے میں اور نعمت جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ سلامت علی خاں کو بھی جوش صاحب کے آنے کی اطلاع کر دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ بھی آ گئے۔ راجب صاحب اور

فرمت رضوی بھی آ گئے۔ جب تمام احباب جمع ہو گئے تو جوش صاحب نے اسلام آباد کے قصے سنانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا اور جوش صاحب اور سلامت علی خاں پیالہ بکف طلوع ہو گئے۔ پھر فرمائش پر پہلے جوش صاحب نے کچھ رباعیات سنائیں اس کے بعد کچھ تازہ کلام سنایا۔ چوتھے پیگ کے بعد جوش صاحب کو کھانا کھلا کر ایک کپ دودھ میں اسپ غول کی بھوسی ملا کر پلا دی اور جب وہ لیٹ گئے تو ہم سب احباب دوسری شام وعدہ کر کے اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔

حکیم نصیر الدین صاحب!

ساتویں جون بدھ کے دن صبح نو بجے میں جوش صاحب کے گھر پہنچا تو وہ تیار بیٹھے تھے کہنے لگے چلو حکیم نصیر الدین صاحب سے ملنے ان کے مطب لکشمی دوا خانے چلتے ہیں چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے تو حکیم صاحب نے سب محبت سے ہمارا استقبال کیا۔ ان کے صاحبزادے ناصر میاں بھی حکیم ہیں وہ بھی آ کر جوش صاحب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک اسلام آباد اور لاہور کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ حکیم صاحب واقعی اگلی شرافت کے نمونے ہیں جوش صاحب کو بہت قیمتی معجون کے تحفے بھی دیے۔ جوش صاحب نے کہا کہ ان کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے جس سے چلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ حکیم صاحب نے بادشاہ کے تیل دیا۔ معجون اور تیل لے کر ہم لوگ حکیم صاحب کے مطب سے رخصت ہوئے تو جوش صاحب نے کہا چلو میر رسول بخش صاحب سے ملتے ہیں وہ آج کل گورنر ہاؤس میں منتقل ہو گئے ہیں۔

میر رسول بخش تالپور گورنر سندھ

میں جوش صاحب کو گورنر ہاؤس لے گیا وہاں ہم دونوں کو گیٹ پر روک لیا گیا اور انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ جب فون پر گورنر صاحب کے پی اے مسٹر اللہ یار نے اجازت دی تب ہم لوگ گورنر ہاؤس میں داخل ہو سکے۔ گورنر ہاؤس کے وسیع و عریض برآمدے میں بہت سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر بہت سے حاجت مند بیٹھے تھے

عرضیاں لیے ہوئے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ باری باری سے گورنر صاحب کے قریب کرسی پر بیٹھتے اور اپنی عرضی پیش کرتے اور زبانی اپنی شکایت بیان کرتے۔ میر صاحب ہر شخص کا حال نہایت ہمدردی اور سکون سے سنتے اور پھر ان کی درخواست پر احکامات جاری کر کے اپنے ماتحتوں کو اس کے متعلق ہدایات دیتے جا رہے تھے۔ ہم دونوں کو ان کے پی اے نے خاص مہمانوں کے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ جب وہاں بیٹھے بیٹھے دیر ہو گئی تو جوش صاحب حسب عادت بے چین ہونے لگے۔ آخر کار ایک پرچے پر حسب ذیل عبارت انگریزی میں لکھ کر مجھے دے دیا کہ جا کر میر صاحب کو دے آؤں۔ جوش صاحب نے لکھا تھا۔

My dear younger brother of yesterday and my Lord of today how long should I wait ?

یہ پرچہ لے کر میں میر صاحب کے قریب کھڑا ہو گیا تو میر صاحب کے ملٹری سیکرٹری نے مجھ سے وہ پرچہ لے کر پڑھا اور جوش صاحب سے جا کر کہا کہ گورنر صاحب تھوڑی دیر میں آپ سے ملنے تشریف لائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ جوش صاحب کا پرچہ گورنر صاحب کو دے دیجیے۔ اس کو آپ نے کیوں روک لیا؟ تب انھوں نے وہ چٹھی میر صاحب کو دی۔ میر صاحب پرچہ دیکھتے ہی اپنے پی اے کو کچھ ہدایات دے کر وہاں سے اٹھ گئے اور جوش صاحب کے پاس آ کر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ سرکار معاف فرمائیے میں ذرا مشغول تھا۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کیجیے۔ جوش صاحب نے کہا اسلام آباد سے آنے کے بعد آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہو گیا مگر مجھے اندر آنے میں بڑی زحمت اٹھانا پڑی۔ میر صاحب نے جوش صاحب کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہہ کر ایک پاس بنوا دیا تاکہ وہ جب چاہیں بلا روک ٹوک گورنر ہاؤس تشریف لا سکیں۔ میر صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ برنس روڈ آ گئے۔ وہاں ایک ایک گلاس لسی کا پیا اور گھر آ گئے۔ اس کے بعد یہی جمعہ کے دن میں اور جوش صاحب صبح دس بجے آغا حسن عابدی صاحب کے گھر کلفٹن پہنچے۔ معلوم ہوا کہ آغا صاحب ابھی تک سو رہے ہیں۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں آغا صاحب تشریف لائے۔ جوش صاحب سے انتظار کی زحمت

برداشت کرنے کی معافی چاہی۔ جوشش صاحب نے پوچھا کہ بھٹو صاحب نے ان کو جس مقصد کے لیے اسلام آباد بلایا تھا اس کا کیا ہوا؟ آغا صاحب نے کہا کہ ان کے مشورے سے بینکوں کو قومیانے کا مسئلہ کم از کم ایک سال کے لیے ٹل گیا۔ آغا صاحب کو چونکہ کسی ضروری میٹنگ میں شریک ہونا تھا اس لیے وہ جوشش صاحب سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ ہم وہاں سے اٹھ کر جمیل فشر صاحب سے ملنے ان کے دفتر نیشنل بینک گئے مگر وہ میٹنگ میں مصروف تھے تو ملاقات نہ ہو سکی مگر جوشش صاحب نے ان کو پی آر سے ایک پرچی کے ذریعہ سے مطلع کر دیا اور وہاں سے نکل کر بولٹن مارکیٹ پر عبدالخالق صاحب سگریٹ والے کی دکان پر پہنچے۔ وہاں عبدالخالق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ عبدالخالق صاحب بڑے علم دوست اور عام نوازی کے انسانوں میں سے تھے۔ جوش صاحب کو بہت چاہتے تھے۔ مجھ سے ان کی واقفیت ست پہلے کی تھی۔ وہ میرے بہنوئی محمود علی خان صاحب کے جو پولیس کے محکمہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے، دوست تھے۔ محمود بھائی کے گھر میں عبدالخالق صاحب سے میں کئی مرتبہ مل چکا تھا۔ حسن نظم بھی ہیں اور غالب کے طرف دار بھی۔ اکثر ان سے غالب کے اشعار پر گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اہل علم کے بڑے قدردان تھے۔ اکثر ان کے گھر پر خلاف دعوتوں میں پاکستان کے بڑے بڑے ادیب شاعر اور مفکر حضرات اور خواتین سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت جوشش صاحب نے چند رباعیات سنائیں اور پھر ہم لوگ تقریباً دو بجے گھر آ گئے۔

اس کے دوسرے دن میں اور جوش صاحب آغا حسن عابدی صاحب سے ملنے کے لیے یونائیٹڈ بینک کے صدر دفتر گئے۔ جب اوپر جانے کے لیے لفٹ پر پہنچے تو لفٹ اوپر گئی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نیچے انتظار کرنے لگے تھوڑی دیر میں جب لفٹ نیچے آئی تو اس میں سے بہت لوگ نکل کر باہر آئے۔ جوشش صاحب نے یہ دیکھ کر کہا "اوہ کس قدر بڑا فاسد جمع ہو گیا تھا اس لفٹ میں"۔ خیر ہم لوگ اوپر عابدی صاحب کے دفتر میں گئے۔ جیسے ہی عابدی صاحب کو جوشش صاحب کے آنے کی اطلاع ملی باہر آ کر ان کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ وہاں چائے سے تواضع کی۔ اتنے میں کسی صاحب کا ٹیلی فون آ گیا وہ صاحب آغا صاحب کے بینک ہی کے کوئی افسر تھے۔ آغا صاحب نے ان کو ہدایت دی کہ

حکومت کے قرضوں میں بینک کی زیادہ رقم نہ لگائی جائے بلکہ جس قدر ممکن ہو کم سے کم رقم لاوسٹ کی جائے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہدایات اس لیے دی جا رہی ہیں کہ ایک سال کے بعد بینک حکومتی تحویل میں جانے والے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ رخصت ہونے لگے۔ میں پہلے باہر آ گیا مگر جوش صاحب وہیں رک گئے اور پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آغا صاحب جوش صاحب کی مالی امداد بھی فرماتے تھے۔

آغا صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ روشن علی بھیم جی صاحب کے مکان گئے۔ بھیم جی صاحب تو گھر پر موجود نہ تھے مگر ان کی بیگم صاحبہ نے بڑا استقبال کیا۔ چائے اور بسکٹ سے تواضع کی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ شام کو جوشش صاحب کے گھر جب تمام احباب جمع ہوئے تو جوش صاحب نے بتایا کہ اسلام آباد میں ان کے مکان کا کوئی بندوبست نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے جوش صاحب سے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں کوشش کروں گا۔

عزیز الرحمٰن خاں صاحب کا جوش صاحب کے لیے مکان کا بندوبست:

میرے ایک عزیز کسٹم میں چیف آفیسر تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے اشفاق الرحمٰن خان صاحب ایبٹ آباد میں کاروبار کرتے تھے ان کا ایک مکان اسلام آباد میں تھا جو خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے عزیز الرحمٰن خان صاحب سے جب جوشش صاحب کے لیے مکان کی ضرورت کا ذکر کیا تو وہ اس بات کے لیے تیار ہو گئے کہ اپنے بیٹے سے بات کر کے وہ مکان جوشش صاحب کو دلوا دیں گے۔ اور یہ بات طے ہو گئی کہ اب کے جب جوشش صاحب اسلام آباد جائیں گے تو میں اور عزیز بھائی بھی وہاں پہنچ جائیں گے اور اگر وہ مکان جوشش صاحب کو پسند آ جائے تو متعلقہ وراثت سے کہہ کر جوش صاحب کو دلوا دیا جائے۔ میں نے جب اس بات کا ذکر جوشش صاحب سے کیا تو وہ بہت خوش ہو گئے۔ کہنے لگے کہ میں پندرہویں کو لاہور جا رہا ہوں وہاں تین چار دن قیام کروں گا اور اسیویں جون کو راولپنڈی پہنچوں گا۔ آپ دونوں کے فلیش مین ہوٹل میں مل جائیے۔ اس طرح مسئلہ حل ہو گیا۔ تیرہویں جون کو میرے ایک عزیز دوست جو عزیز الرحمٰن خان صاحب کے خالہ زاد بھائی بھی تھے مجھ سے کہنے لگے کہ

مجھے جوشش صاحب سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔ سب کے جب تم جوشش صاحب کے گھر جاؤ تو مجھے بھی لے چلو۔ ان کا نام سید حیات شاہ تھا اور وہ بھی میرے ساتھ کسٹم افسر تھے۔ شاہ صاحب بڑے عالم فاضل اور ہفت زبان انسان تھے۔ عربی فارسی بے تکلف لکھتے پڑھتے اور بولتے تھے۔ مادری زبانوں میں پشتو، ہندکو اور پنجابی زبانیں شامل تھی۔ اردو میں تو وہ عالم اور فاضل تھے ہی۔ بعد میں انگریزی بھی سیکھ لی تو اس پر بھی عبور حاصل کر لیا۔ جب انھوں نے جوشش صاحب سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں ان کو لے کر اسی شام جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ سورج کے غروب ہونے میں تھوڑی دیر تھی۔ جوش صاحب لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب راحب صاحب مراد آبادی تشریف فرما تھے۔ کاغذ قلم ہاتھ میں تھا جوشش صاحب سے کچھ مراقبت کر رہے تھے اور جوش صاحب جو جواب دیتے وہ اسی طرح لکھ لیتے۔ میں نے شاہ صاحب کا تعارف کروایا۔ جوش صاحب یہ میرے بہت بے تکلف دوست ہیں سید حیات شاہ عربی فارسی انگریزی پشتو، پنجابی، ہندکو اور اردو زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مذہب اور عربی، فارسی اور اردو ادب کا وسیع مطالعہ ہے۔ آپ سے ملنے کے خواہش مند تھے اس لیے آپ کو پہلے سے اطلاع کیے بغیر ہی میں یہیں لے آیا۔ امید ہے آپ خیال نہ فرمائیں گے۔ جوش صاحب کہنے لگے ارے بھئی تم اتنے قابل آدمی کو میرے گھر لائے ہو یہ تو میرے لیے بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ مگر یہ بتاؤ Is he a gentleman? میں نے عرض کی کہ اس معاملے میں یہ بہت مذہبی اخلاق کے حامل ہیں۔ اس پر راحب صاحب نے فوراً ایک کاغذ پر یہ رباعی لکھ کر مجھے دے دی۔

مرد صاحب نگاہ کو کہتے ہیں — صبا کشش والا کو کہتے ہیں
خورشید علی خان یہ میخانہ جوش — ہر لوحیات شاہ کو کہتے ہیں

قلم برداشتہ ۔ ۔ ۔

جوشش صاحب نے تیسرے مصرع میں یہ تبدیلی فرما دی۔ "خورشید علی خان یہ گرانمایہ جوش" جوش صاحب نے "شاہ" کی نسبت سے "گرا" کا لفظ استعمال کیا حالانکہ راحب صاحب نے حقیقت حال بیان کی تھی کیونکہ اس وقت واقعی یہ خانہ سجا ہوا تھا اسی لیے انھوں نے دوسرے مصرع میں "صبا" کا لفظ استعمال کیا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ

رب صاحب، جوش صاحب کے دو دوست کے لیے گھر جانے کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے تھے اس لیے راجب صاحب نے کہا جوش صاحب یہ لفظ بھی "گھرانا" صرف آپ ہی استعمال کر سکتے تھے۔ خاکسار یہ جرأت کیسے کر سکتا ہے؟

اس کے بعد راجب صاحب جو سوالات لکھ کر لائے تھے اور اس کے جواب میں جوش صاحب نے جو کچھ کہا تھا وہ لکھوا لیا تھا۔ ان میں کچھ سوالات اور ان کے جوابات حسب ذیل ہیں۔

جیسا کہ میرے علم میں ہے موجودہ حکومت کے سربراہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے حسب ایما حکومت پاکستان نے آپ سے تحریری درخواست کی ہے کہ آپ وزارت اطلاعات میں "نگران مطبوعات پاکستان" کا عہدہ قبول فرمالیں۔ کیا یہ صحیح ہے

جوش صاحب۔ "جی ہاں"۔

س۔ حکومت آپ کی خدمات جلیلہ کے سلسلے میں کیا مظاہرہ پیش کرے گی؟

جوش صاحب۔ "سردست دو ہزار"

س۔ کیا اسلام آباد کی دربار اصغا کراچی کے مقابلے میں دماغی کام کرنے والوں کے لیے زیادہ سازگار ہے؟

زیادہ سازگار ہے (اس کے بعد جوش صاحب نے اپنے قلم سے یہ جملہ بڑھایا) "اور پھر قرب جیسا بھی ہے"۔

ان کے علاوہ اور بھی کچھ سوالات تھے مگر میں نے وہ نوٹ نہیں کیے۔ شاہ صاحب کے اصرار پر جوش صاحب نے کچھ اشعار سنائے۔

ہاتھ میں اسباب دیکھ لیں
اسباب کی نقاب اٹھاتے رہیں گے ہم

بھر بھر کے کھولیوں میں گہر پائے بحر علم
دامن کی کارگاہ میں لاتے رہیں گے ہم

جتنی ملے گی خوان جہاں سے غذائے علم
اتنی ہی اور بھوک بڑھاتے رہیں گے ہم

جتنی عطا کرے گا تفکر بلندیاں
کچھ اور بھی سروں کو جھکاتے رہیں گے ہم

اس حد پہ آسماں سے نہ شرما کرے زمیں
تجھ کو دلہن کی طرح سجاتے رہیں گے ہم

اس کے بعد یہ رباعی سنائی:

جب ان میں افکار مل جاتے ہیں تو قالب افلاک میں ڈھل جاتے ہیں
دیکھا ہے کہ بارہا خیالات کے پاؤں آفاق کی چادر سے نکل جاتے ہیں

اس کے علاوہ جوش صاحب نے کچھ اور رباعیات سنائیں ... جب چوتھا مجموعہ ختم ہوا تو جوش صاحب نے کھانا منگوایا تو میں اور شاہ صاحب نے جوش صاحب سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ جوش صاحب نے سخت کہا کہ اب کھانا کھا کر جاؤ مگر ہم دونوں معافی مانگ کر رخصت ہوگئے۔ چلتے وقت جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ کل صبح نو بجے تک آجانا میں پرسوں یعنی پندرہویں کو لاہور جانا چاہتا ہوں۔ کل آجاؤ گے تو ریلوے اسٹیشن چل کر ٹکٹ کروا لیں گے۔ میں نے دوسرے دن وقت پر پہنچنے کا وعدہ کر لیا اور وہاں سے رخصت ہو کر جوش صاحب اور میں سے اپنے گھر چلے گئے۔ ہنستے ہنستے کس طرح لکھوں کہ میرے عزیز ترین ساتھی شاہ صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ رہیں کہاں گئی آسماں کیسے کیسے

دوسرے دن میں جب جوش صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں محسن صاحب عظیم گوہی بھی موجود تھے وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیے ... جب ہم کریم آباد کے پل کے قریب پہنچے تو ایک ٹرک غلط رخ سے میری گاڑی کے اتنا قریب آگیا کہ اگر میں گاڑی روک نہ لیتا تو وہ میری گاڑی سے ٹکرا جاتا۔ ٹرک ذرا پیچھے سے بھی گاڑی آہستہ کر کے اس کا رخ دوسری طرف موڑ لیا جوش صاحب نے جب ٹرک کا رخ دوسری طرف دیکھا تو ارشاد فرمایا

یہ دیکھو ادھر یہ جادہ مرے آشیاں کا ہے اسے برق و تلوار ارادہ کہاں کا ہے؟

میں نے کہا سبحان اللہ جوش صاحب کیا تیور ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آخری بیشان موت کو للکار رہا ہے۔ "یہ دیکھو ادھر یہ جادہ مرے آشیاں کا ہے"۔ واہ واہ عظمت کو دعوت دینا اور اس شان کے ساتھ دعوت دینا صرف آپ ہی کی شان ہے اور پھر برق کو دلیر کہا ہے جیسے موت دلیر کھلونا ہو۔ اس وقت جوش صاحب کا شعر اس قدر بامعنی تھا کہ میں دل کھول کر اس کی تعریف کر رہا تھا۔ محسن صاحب نے بھی ایک شعر سنایا جو مجھے اس وقت یاد نہیں ہے۔ مگر میں نے کہا بھی نہیں اس شعر میں بات اتنی تو نگیز نہیں ہے اور پھر انداز بیان بھی ناقابل ہے۔ محسن صاحب مجھ سے اس جواب کی توقع نہ رکھتے تھے کہنے لگے خورشید صاحب

پر شعر ہے۔ میں نے کہا۔ تو کیا ہوا صرف اس وجہ سے کہ یہ آپ کا شعر ہے میں اس کی تعریف کرنے سے تو رہا۔ بیچارے محسن صاحب کھسیانے ہو کر خاموش ہو گئے مگر جوشی صاحب نے یہ بات محسوس کر لی اور کہا میں اتنی بات میں نے محسن صاحب کے شعر میں بھی خوبیاں ہیں آپ نے غور نہیں کیا۔ میں نے کہا جی تو میں آپ کے شعر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں گھر جا کر محسن صاحب کے شعر پر غور کروں گا۔ بیچارے محسن صاحب اتنے بے مزہ ہوئے کہ مجھ سے کہنے لگے آپ مجھے قائداعظم کے مزار کے پاس اتار دیجیے مگر میں نے کہا نہیں میں آپ کو آپ کے مکان تک پہنچاؤں گا۔ چنانچہ میں نے ان کو ان کے گھر پہنچایا پھر ہم لوگ کینٹ اسٹیشن گئے وہاں جوشی صاحب کے لیے کوارٹر موجود کیا کہ ڈاکٹر عالیہ امام صاحبہ کے گھر چلے گئے جو کینٹ اسٹیشن کے قرب میں تھا۔ وہاں ڈاکٹر صاحبہ اور ان کے شوہر کاظم امام صاحب نے جوشی صاحب کا استقبال کیا ان کے گھر ہم لوگ شام تک رہے۔

دوسرے دن میں صبح ساڑھے سات بجے جوشی صاحب کے گھر پہنچ گیا اور ان کے ساتھ بابا ذہین شاہ تاجی کے گھر گیا۔ بابا صاحب نے جوشی صاحب کی ناشتے کی دعوت کی تھی۔ جس کا انہوں نے سخت پر تکلف اہتمام کیا تھا۔ اصلی گھی کے سمایت خستہ پراٹھے تھے خستہ ایسے کہ منہ میں ڈالتے ہی گھل جائیں۔ ان کو چبانے یا دانت لگانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی انڈے کئی قسم سے پکے ہوئے ہم برشت بھی اور حلوے کی شکل میں بھی۔ گھی، گڑ کا سالن قیمہ دہی بڑے ہر چیز بے حد لذیذ۔ ہم لوگوں نے خوب سیر ہو کر ناشتہ کیا اس کے بعد کڑے ہوئے دودھ کی رس پیش کی گئی وہ اس قدر خریدار تھی کہ باوجود پیٹ میں گنجائش نہ ہونے کے خوب کھائی۔ آخر میں کشمیری چائے پیے سے تمام کھانا ہضم ہو گیا۔ چائے کے بعد پان اور پان کے ساتھ بابا صاحب کا انتخابی حوشبودار عطر تھا تمام ان تمام تکلفات کے بعد علمی یا یوں کہیے کہ روحانی گفتگو کا آغاز ہوا۔

بابا صاحب تعدد شخصیت:

بابا صاحب نے فرمایا کہ تعدد شخصیت ممکن ہے۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ ایک شخص بیک

وقت کئی مختلف مقامات پر دیکھا جا سکے۔ مگر اس کے لیے ایک مشق کرنی پڑتی ہے۔ پہلے پہ
دونوں سانس برابر کرنے پڑتے ہیں۔ پھر ایک تاریک مقام پر لیٹ کر سانس پر کنٹرول کر کے
اندر کے سانس میں اسم ذات یعنی "اللہ" اور باہر کے سانس میں "ہو" کہا جائے۔ یہ عمل
چالیس (۴۰) دن تک کیا جائے۔ دوران وظیفہ صرف بھلوں اور کچی ترکاریوں کا استعمال کیا
جائے اور اس مدت میں جھوٹ، ہر قسم کی برائی، مباشرت یا کسی قسم کی ہیجانی کیفیت پیدا
کرنے والی باتوں سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔ اس وظیفے کے دوران میں ابتدا میں دس بارہ دن
تک تو شدید کمزوری محسوس ہوگی مگر اس کے بعد جسم ہلکا ہونا شروع ہو جائے گا اور وظیفے
کے اختتام پر آپ اتنے ہلکے پھلکے ہو جائیں گے کہ ایک ہی وقت میں آپ کئی کئی مقامات پر
دکھائی دے سکیں گے۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ اس عمل کے بعد وہ ایک رات میں دو دو
میل چلیں چلے ہیں۔ میں اور جوش صاحب حیرت سے بابا صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ میں
نے کہا بابا صاحب آج ٹی وی کے ذریعے سے تو تعدد شخصیت کی بات آتی ہے مگر کسی روحانی
وظیفے کے ذریعے سے بھی یہ بات ممکن ہو سکتی ہے بظاہر عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی لیکن
بات یہ ہے کہ جب تک تجربہ کر کے کسی بات کو تسلیم یا رد نہ کیا جائے یہ بھی درست معلوم
نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ یہ میں نے
آپ کو اپنا تجربہ بتایا ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کی مرضی۔ جوش صاحب اس تمام
گفتگو کے دوران خاموش رہے۔ پھر انھوں نے بابا صاحب سے کہا کہ وہ آج تیز گام سے لاہور
جا رہے ہیں۔ وہاں سے پنڈی چلے جائیں گے اس لیے اب اجازت چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم
دونوں بابا صاحب سے رخصت ہو کر جوش صاحب کے گھر آ گئے۔ شام کو جوش صاحب کے
گھر راجہ صاحب بھی آ گئے۔ چنانچہ میری گاڑی میں کینٹ اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ راستے میں
میں نے جوش صاحب کو بتایا کہ میں اور عزیز الرحمٰن خان صاحب اسی مہینے یعنی جون کی
انیسویں تاریخ کو پنڈی بذریعہ ہوائی جہاز پہنچ رہے ہیں۔ وہاں جوش صاحب کو ان کا اسلام آباد والا
گھر بھی دکھا دیں گے اگر انھیں پسند آ گیا تو متعلقہ محکمہ سے ضروری کارروائی بھی مکمل کر لی
جائے گی۔ جوش صاحب نے کہا کہ وہ بھی اسی دن لاہور سے پنڈی پہنچ جائیں گے۔ اسٹیشن پر
جوش صاحب کو ان کے ڈبے میں بٹھا کر ہم لوگ لوٹ آئے۔

دوسرے دن میں نے اور عزیز بھائی نے پنڈی کے لیے پی آئی اے سے انیسویں تاریخ کے لیے اپنی سیٹیں بک کروالیں۔

جوش صاحب کئی سال تک سلام آباد میں عزیز الرحمٰن خان صاحب کے کرایہ دار رہے۔ خان صاحب نے ہر طرح ان کے آرام کا خیال رکھا۔ اس لیے ضروری ہے کہ قارئین سے عزیز الرحمٰن خان صاحب اور ان کے صاحبزادے اشفاق الرحمٰن خان صاحب کا ایک سرسری تعارف کروا دوں۔

عزیز الرحمٰن خان:

عزیز الرحمٰن خان صاحب کا تعلق صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ سے ہے۔ یوں تو سرحد کا تمام صوبہ خوبصورت پہاڑوں اور سبز پوش وادیوں پر مشتمل ہے لیکن اس کی حسین ترین وادی جو بجا طور پر جنت ارضی کہلانے کی مستحق ہے وہ وادی کاغان ہے۔ اس کی خوبصورت جھیل جسے لولوک کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں پریاں رہتی ہیں۔ اسی علاقے سے متعلق گیتی گلی اور شہزادہ سیف الملوک کی رومانی داستان مشہور ہے۔ اس جھیل کے قریب انتہائی شریف النفس، مہمان نواز اور مردانہ وجاہت سے مزین پٹھانوں کی ایک بستی سرید ہے۔ ہمارے عزیز الرحمٰن خان صاحب جو ایام جوانی میں شہزادہ سیف الملوک سے کم وجیہہ نہ تھے اسی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خان صاحب کے بڑے بھائی مطیع الرحمٰن خان صاحب جو علوم دینی پر عبور رکھنے کے سبب سے مولوی صاحب کہلاتے تھے، حیدرآباد دکن میں آکر آباد ہو گئے تھے وہیں شادی کی اور محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہو گئے۔ عزیز الرحمٰن خان صاحب نوجوانی میں اپنے بھائی کے پاس حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہاں انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور آبکاری کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ میرے والد، چچا، ماموں اور دیگر بہت سے عزیز بھی اسی محکمے سے وابستہ تھے۔ اور یوں ہماری ملاقات عزیز بھائی سے ہو گئی۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کے ظاہری اور باطنی حسن نے مجھے اس قدر مسحور کیا کہ پھر عمر بھر ہم دست بوش بن گیا ہے طوق گردن کا۔ عزیز الرحمٰن خان صاحب گو ہمارے بزرگوں کے ساتھیوں میں سے تھے مگر ان کا برتاؤ ہم بھائیوں کے ساتھ اس قدر محبت اور شفقت کا رہا ہے

کہ ہم سب، انھیں عزیز بھائی کہتے ہیں۔ نہایت صحت مند و سفید رنگ، سرو قد و جاہت و مردانگی کا مجسمہ۔ مضبوط جسم میں فولادی اعصاب اور اس میں دردمند دل جیسے سنگلاخ پہاڑوں میں ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ۔

میں اور میرا چھوٹا بھائی رحمت اللہ خاں، بچپن سے ان کو اپنا ہیرو سمجھتے تھے۔ عزیز بھائی کی شخصیت اس قدر سحر انگیز تھی کہ مشکل ترین وقت میں بھی ان کو اپنے قریب پا کر ہمارا حوصلہ بلند ہو جاتا تھا اور ہم خود کو ناقابل شکست سمجھنے لگتے تھے۔ عزیز بھائی کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ مسرت، طمانیت اور رعانیت سے معمور ہوتا تھا۔ بقول سرور بارہ بنکوی،

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ سے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

عزیز بھائی پی ٹی کی نوکری کے سلسلے میں شہر حیدر آباد سے باہر اضلاع پر رہتے تھے مگر جب شہر میں آ کر رائل ہوٹل میں قیام کرتے تو ہم دونوں بھائی ان کے پاس پہنچ جاتے اور ہماری کوشش یہ ہوتی کہ وہ جتنے دن حیدر آباد میں رہیں ہم بھی ان کے ساتھ ہی رہیں۔ عزیز بھائی کی مہمان نوازی ان کے دوستوں اور واقف کاروں کے حلقے میں ضرب المثل تھی۔ کوئی ضرورت مند ان کے پاس سے مایوس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اپنے محکمے میں ایک مثالی افسر سمجھے تھے اور ان کے ساتھی عملہ وہ ان کو اپنا ہیرو سمجھتے تھے۔ انھوں نے حیدر آباد کے ایک معزز گھرانے کے رکن جناب سردار خان صاحب کی صاحبزادی سے شادی کی۔ حیدر آباد میں عام طور پر شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھیں مگر عزیز بھائی کی شادی تو ایک یادگار شادی تھی۔ کئی ہفتے تک پرتکلف دعوتیں اور رقص و موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتی رہیں۔ ایک میلے کا سماں رہتا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد وہ حیدر آباد کی ملازمت ترک کر کے مع اہل و عیال کراچی منتقل ہو گئے اور اب تک کراچی ہی میں ہیں۔

کراچی میں وہ بحری کسٹم کے محکمے سے وابستہ ہو گئے اور اپنی سعادت، صلاحیت اور قانونی مہارت کی وجہ سے بہت جلد چیف لا آفیسر کے عہدے پر متعین کر دیے گئے۔ نوکری کے دوران ہی انھوں نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور جس جانفشانی، جرأت اور قابلیت

کے ساتھ اصل سے اس نوزائیدہ مملکت پاکستان کی باقیاتی سرحدوں کے تحفظ میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ اسی کی وجہ سے وہ فکر کے سربرآوردہ افسروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہاں بھی بہت نوازا مگر ایک نوجوان اور بہادر بیٹے کی بے وقت شہادت نے ان کی بیگم کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ بالآخر اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکیں اور عزیز بھائی جو صبر، تحمل اور قوت برداشت کا کوہ گراں تھے بظاہر تو مسکراتے رہے مگر اندر ہی اندر دل کے مریض ہو گئے۔

اشفاق الرحمٰن خان:

ان کے چار بیٹوں میں تیسرے نمبر پر اشفاق الرحمٰن خان تھے جن کو ہم لوگ محبت سے چھوٹو بھائی کہتے تھے۔ خلوص، محبت، بڑوں کی عزت، ماں باپ کی خدمت اور انکسار کے پیکر تو اگر کوئی انسانی پیکر میں دیکھنا چاہے تو چھوٹو بھائی سے بہتر مثال شاید ہی اس کو نہیں مل سکے۔

کھلتا ہوا گندمی رنگ، گھنے بال، بڑی بڑی مونچھیں، درمیانے سے ذرا نکلتا ہوا قد، جسم مناسب کی طرف مائل، ہر وقت چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ۔ جب بھی آپ سے ملیں گے نگاہیں نیچی، ہر خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار۔

چھوٹو بھائی نے اپنے ماں باپ کی جس طرح خدمت کی اس کی نظیر ملنا ناممکن ہے۔ انہوں نے ماں نندی کے جذبے کو حقیقت بنا دیا اور اپنے والدین پر قربان ہو گئے۔ آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، چھوٹو بھائی اس دنیا میں نہیں ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

میں بھی خیالات میں سمٹ کر کہاں سے کہاں نکل گیا۔ یہ تو ست بھر کے واقعات ہیں ہم پھر ۱۰ جون ۱۹۸۲ء کی صبح کو واپس چلتے ہیں جب میں اور عزیز بھائی پی آئی اے کی پرواز سے پنڈی روانہ ہوئے۔ پنڈی ایئرپورٹ پر چھوٹو بھائی اپنی کار میں ہمارا انتظار کر رہے تھے وہ ایبٹ آباد سے وہاں پہنچے تھے۔ ایئرپورٹ سے ہم لوگ ٹیکسلا مین ہوٹل گئے اور کمرہ نمبر ۱۱ میں

قیام کیا۔ سامان کمرے میں رکھ کر ہم لوگ ریلوے اسٹیشن گئے جہاں جوش صاحب لاہور سے آنے والے تھے۔ ہم لوگ جب اسٹیشن پہنچے تو تھوڑی ہی دیر میں ریل گاڑی آ گئی۔ میں نے جوش صاحب سے عزیز الرحمٰن خاں صاحب اور ان کے صاحبزادے اشفاق الرحمٰن خان صاحب کا تعارف کروایا۔ جوش صاحب نے کہا کہ وہ ایبٹ پاکستان گیسٹ ہاؤس میں قیام کریں گے۔ چنانچہ ان کو وہاں پہنچا دیا گیا۔

جوش صاحب کے لیے مکان کا بندوبست

دوسرے دن ہم لوگ جوش صاحب کو لے کر اسلام آباد کے شالیمار سیکٹر پہنچے جہاں عزیز بھائی کا مکان تھا۔ جوش صاحب کو وہ مکان پسند آ گیا۔ چنانچہ وہاں سے ہم لوگ اسٹیٹ آفس گئے جہاں متعلقہ حکام سے مل کر ضروری کارروائی کے بعد جوش صاحب کو اس مکان میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ حکومت نے اس مکان کا کرایہ سو روپے مقرر کیا جو خود حکومت ادا کرے گی۔

دوسرے دن میں اور جوش صاحب کلام خاں صاحب کے ساتھ علوی صاحب سے ملنے منسٹری آف انفارمیشن گئے۔ جوش صاحب نے ان کو بتایا کہ انھوں نے مکان کا انتخاب کر لیا ہے۔ اب منسٹری ضروری کارروائی کر کے اس کا قبضہ ان کو دلوا دے۔ علوی صاحب نے ڈپٹی سیکرٹری صاحب کو بلا کر کچھ ہدایات دیں۔ ڈپٹی سیکرٹری صاحب نے تمام کارروائی مکمل کرنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت طلب کی۔ جوش صاحب راضی ہو گئے۔ علوی صاحب نے چائے پلائی اور تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر ہم لوگ واپس آ گئے۔

ایبٹ آباد کی سیر

عزیز بھائی کو جب میں نے بتایا کہ منسٹری والوں نے مکان تیار کرنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت مانگی ہے تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک ہفتہ یہاں ہوٹل میں گزارنے کے بجائے جوش صاحب کو لے کر ایبٹ آباد کیوں نہ چلیں؟ جب ہم نے جوش صاحب کو یہ بات بتائی تو وہ تیار ہو گئے۔ چنانچہ ہم لوگ ۲۲ دسمبر جن کو چھوٹو بھائی کی مرسیڈیز کار میں ایبٹ آباد

روانہ ہو گئے اور وہاں ان کے گھر قیام کیا۔

وہاں مرزا بھائی کی روایتی مہمان نوازی اور چھوٹے بھائی کی دلداری نے جوشش صاحب کو بے حد متاثر کیا۔ اس زمانے میں صوبہ سرحد میں مفتی محمود صاحب کی حکومت تھی اور انہوں نے وہاں شراب کا استعمال ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ ویسے بھی مرزا بھائی خود شراب کے استعمال کو سخت برا سمجھتے تھے۔ جب جوشش صاحب کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ متفکر ہوئے۔ ہم لوگوں کو جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا وہ مکان کی بالائی منزل میں تھا اور وہاں عام طور پر گھر والوں کی آمد و رفت کا امکان کم رہتا تھا۔ اور اس کمرے کی کھڑکی سے باہر پہاڑیوں کا منظر بہت ہی دلفریب تھا۔ میں شام کو مغرب کے وقت سے کا دروازہ بند کر کے کھڑکی کھول دیتا تھا اور جوشش صاحب کسی کی مداخلت کے بغیر پیاسے بلبل طرح پیتے تھے۔ ایک شام جوشش صاحب نے کہا جب وہ بھی میں تھے تو وہاں کی حکومت نے بیگم اپریل سے شراب نوشی پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس پر جوشش صاحب نے یہ شعر کہا تھا

بیگم اپریل ہی کو صبح سے کا حکم ہوتا ہے
یہ دن کیا ہے دو قول کے لیے کچھ چاہیے ساقی

میں نے کہا جوشش صاحب آپ یہ شعر مفتی محمود صاحب کو لکھ کر بھیج دیجیے۔ جوشش صاحب نے کہا جناب آپ دیکھنا ہم رندوں کی آہ کے اثر سے مفتی صاحب کی حکومت زیادہ دن نہیں چلے گی۔ میں نے پوچھا کہ کیا بھٹو صاحب ان کی حکومت کو ختم کر دیں گے۔ جوش صاحب نے کہا جی نہیں، مفتی صاحب خود چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس وقت تو میں جوش صاحب کی یہ بات مذاق سمجھتا تھا مگر حیرت انگیز طور پر ان کی یہ پیش گوئی جلد ہی درست ثابت ہوئی۔

بیت آباد کوئی زیادہ بڑی بستی نہیں ہے۔ وہاں مرزا الرحمٰن خان صاحب کے ملنے والوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ ان کے گھر جوش صاحب ملیح آبادی ٹھہرے ہوئے ہیں چنانچہ دوسرے دن سے لوگ جوشش صاحب سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ ایک شام بیگم سرور اور ان کی بیگم بھی ملاقات کے لیے آ گئیں۔ بیگم سرور نے بتایا کہ وہ لیفٹ صاحب کی حرم ہیں

اور جب بھی فیض صاحب ایبٹ آباد آتے ہیں انہی کے گھر قیام کرتے ہیں اور یہ جب بھی جاتی ہیں تو فیض صاحب کی مہمان ہوتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی کی گفتگو ست ہی سلی ہو ہی بڑاتی لیے ہوئے تھی اور عام طور سے جوش صاحب ایسی ذاتی نوعیت کی گفتگو میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی یہ گفتگو غیر دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی طویل ہو گئی تھی کہ مغرب کا وقت قریب آنے لگا۔ جوش صاحب بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر عزیز بھائی نے ان دونوں کو نیچے بلوایا اور جوش صاحب نے گہر اطمینان کا سانس لے کر یہ شعر پڑھا

الف ہست تھت بور جوڑا تھا ایک گھوڑی تھی ایک گھوڑا تھا

دوسرے دن عزیز بھائی نے یہ طے کیا کہ جوش صاحب کو ایبٹ آباد کے قریبی مقامات دکھائے جائیں۔ ظاہر ہے جوش صاحب کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ صبح ناشتہ کر کے چھوٹو بھائی کے ساتھ ان کی کار میں ایبٹ آباد سے روانہ ہوئے۔ پہلے مانسہرہ گئے۔ وہاں عزیز بھائی کے ایک دوست کے گھر تھوڑی دیر کے لیے رکے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ جوش صاحب ان کے گھر آئے ہیں تو ہم لوگوں کی بڑی خاطر تواضع کی اور بہت اصرار کیا کہ یہ رات ان کے گھر رک جائیں تاکہ وہ اپنے دوستوں کو جمع کر کے ایک شعری نشست کا اہتمام کر سکیں مگر جوش صاحب نے معذرت چاہی اور ہم لوگ وہاں ان کی میزبانی سے تقریباً ایک گھنٹہ لطف اندوز ہو کر مانسہرہ کے آثار قدیمہ دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں بڑی بڑی چٹانوں پر شوکت اعظم کے فرامین لکھے ہوئے ہیں جو مہاتما بدھ کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ یہ کتبات دیکھتے ہوئے اور پہاڑی علاقوں کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم لوگ ڈھاڈ پہنچے جو ایبٹ آباد سے تیس (۳۰) میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ علاقہ بڑے بڑے خوبصورت درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اس قدر صحت افزا ہے کہ یہاں حق کے مریضوں کے لیے سینی ٹوریم بنایا گیا ہے۔ اور سیاحوں کے لیے گیسٹ ہاؤس بہت خوبصورت مقام پر واقع ہے۔ وہاں ہم لوگوں نے بیٹھ کر چائے پی اور جنگل کی سیر کو پیدل چل پڑے۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک شخص درخت کی شاخیں کاٹ کر ہاتھ میں پکڑنے والی چھڑیاں بنا رہا ہے۔ اس کی لکڑی نہایت مضبوط ہوتی ہے اور صبح کی سیر کے وقت ہاتھ میں رکھنے کے

لیے سہولت بھی بنک کا کام دیتی ہے۔ میں نے ایک چھڑی ہوائی اور جوش صاحب نے ایک چھڑی لی۔ غالباً دس دس روپے میں ایک ایک چھڑی خریدی گئی تھی۔ جوش صاحب اس تفریح سے بہت خوش ہوئے۔ وہاں بارہ ایک بجے تک گھوم کر گھر واپس آ گئے۔

اس شام کو جوش صاحب نے کہا آج ایک رباعی کہی ہے تم بھی سن لو۔

عاشاک کو اسمان بنا دیتا ہے　　پھولوں کو کلیجے سے لگا لیتا ہے
کھوتی ہیں عاقلے کی تختی پہ جو بات　　سسی بات کو سیان بھلا دیتا ہے

مرحوم تین چار دن مرزا الرحمن خان صاحب اور اشفاق الرحمن خان صاحب کی میزبانی سے لطف اندوز ہو کر ہم لوگ مرزا بھائی کی کار میں ایبٹ آباد سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ ہم لوگوں نے گلیات کے راستے سے سفر کیا۔

اسلام آباد واپسی:

صبح سویرے ناشتہ کر کے ایبٹ آباد سے روانہ ہوئے تھے اور تقریباً دس گیارہ بجے تھیا گلی پہنچے۔ وہاں اشفاق خان صاحب کا ایک مکان ہے جہاں بیٹھ کر ہم لوگوں نے چائے پی اور روانہ ہو گئے۔ راستہ نہایت پیچ پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہے اور کٹر جگہ نہایت خطرناک موڑ آتے ہیں اس کے علاوہ راستے کے اندر چڑھائی ایسی ہیں کہ صرف بہت ماہر ڈرائیور ہی ان راستوں پر گاڑی چلا سکتا ہے مگر ہمارے چھوٹے بھائی نہایت مہارت سے بالکل ان خطرناک راہوں پر گاڑی چلاتے رہے۔ راستے میں ایوبیہ، مری، گھوڑا گلی، کوہ مری اور نہایت خوبصورت وادیوں اور سرسبز و شاداب شاہ بلوط اور صنوبر کے درختوں سے لدے ہوئے پہاڑوں کی سیر کرتے ہوئے سہ پہر کے قریب راولپنڈی آ گئے اور جوش صاحب کو ایبٹ پاکستان گیسٹ ہاؤس پہنچا کر میں، مرزا بھائی اور اشفاق خان صاحب ہوٹل فلیش مین آ گئے۔

دوسرے دن جوش صاحب کے ساتھ مرزا الرحمن خان صاحب اور ان کے صاحبزادے مسٹر کاف انفارمیشن پہنچے وہاں معلوم ہوا کہ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ والوں نے کرنے کے تعلق سے تمام دستاویزات تیار کر لی ہیں چنانچہ مرزا الرحمن خان اور اشفاق الرحمن خان نے کاغذ

کارروائی مکمل کی۔ اس کے بعد اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ والوں نے مکان کو فرنش کرنے کے لیے ایک رقم کی منظوری دی۔ جس پر جوش صاحب راضی ہو گئے۔ اب چونکہ ہم لوگوں کا کام ختم ہو چکا تھا اس لیے جوش صاحب تو پنڈی ہی میں رہ گئے اور میں اور عزیز بھائی کراچی واپس آ گئے اور اشفاق خاں صاحب واپس ایبٹ آباد چلے گئے۔

گل کھسارہ

کراچی واپس آ کر میں اپنے کاموں میں ایسا الجھا کہ سات دنوں تک جوشی صاحب کے ساتھ نامہ و پیام نہ ہو سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پہلی جولائی ۱۹۷۲ء کو جوشی صاحب نے مکان F-200 شالیمار ۲ اسلام آباد میں منتقل ہو گئے تھے۔ ایک روز جب ہم لوگ پنڈی میں تھے تو جوشی صاحب نے عزیز الرحمٰن خاں صاحب سے پوچھا تھا کہ ان کے مکان کا نام کیا ہے تو خاں صاحب نے کہا تھا کہ گو ابھی تک انھوں نے اس مکان کا کوئی نام نہیں رکھا مگر ان کے ذہن میں اس کا ایک نام ہے اگر جوش صاحب اس کو مناسب خیال فرمائیں تو وہی رکھ لیں۔ جوش صاحب نے کہا وہ کیا نام ہے؟ خاں صاحب نے کہا "دھرگل"۔ جوش صاحب نے دریافت کیا اس کے کیا معنی ہیں۔ عزیز بھائی نے کہا یہ پشتو زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "پہاڑی پھول"۔ جوش صاحب نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ شلوار پہنے کھڑا ہوا ہے اور اے بھائی آپ نے "گل کھسار" کو خواہ مخواہ شلوار پہنا دی"۔ چونکہ یہ مکان سرفراز کی پہاڑیوں کے قریب میدان میں واقع تھا اس لیے سب نے اس کا نام "گل کھسار" پسند کیا اور پھر اسی نام سے یہ مکان معروف ہوا۔

خیر یہ تو بیچ میں ایک خیال آ گیا جس کا میں اس سے پہلے ذکر کرنا بھول گیا تھا تو میں نے عرض کر دیا تھا کہ کراچی آ کر میں کچھ تو اپنے کاموں میں اور کچھ اپنے بھائی نعمت اللہ خاں کی بیماری کے سلسلے میں مصروف ہو گیا۔ اسی مدت میں نعمت اللہ خاں کی بڑی صاحبزادی نے کراچی یونیورسٹی سے فلسفیات میں ایم۔ اے پاس کر لیا تو ان کی شادی عزیز الرحمٰن خاں صاحب کے بھتیجے عطاء الرحمٰن خاں صاحب سے طے ہو گئی اور دوسری جولائی کو یہ شادی ہو گئی۔

جوش صاحب کا پہلا خط

دو ہر ایک عید تک، انتظار کرنے کے بعد جوش صاحب نے ۲۱ جولائی ۱۹۷۱ کو مجھے یک
لکھا جو حسب ذیل ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ نے تو کمال کر دیا خورشید صاحب۔ بے صبری اور وہ بھی اس قدر بھرپور۔ یہاں سے
گئے تو پھر کروٹ ہی نہیں لی۔ ایک دفعہ پتا خط بھی نہیں لکھا۔ میرے تصور میں بھی یہ بات
نہیں تھی کہ آپ اس قدر بے مروت انسان ہیں۔

جفائیں دیکھ لیں، بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب، یہاں دیکھیں

خورشید کی قلمت فقا نہیں کا صید رہیں

جوش

لفافہ پر یہ پتا تحریر ہے۔

خورشید علی خاں فراموش کنندہ دوستاں

B.N.15 کراچی

یہ خط مجھے دوسری اگست کو ملا اور دوسرے دن یعنی تیسری اگست کو میں نے اس کا
جواب لکھوا دیا۔

[illegible]

[illegible] ناظم آباد

[illegible]

قبلہ صاحب قبلہ ان ـــ تسلیم

آپ کا ۲۱ جولائی کا تحریر کردہ خط مجھے دوسری اگست کو ملا اور بقول غالب
لفافہ نہ تھا مجھے خط پر گماں تسلی کا ـــ سامنے دیدار دیدار ہو تو کیونکر ہو؟

صمد والا آپ قمر و قرطاس و قلم اور بیان و معنی کے بلا شرکت غیرے حکمراں علم کے مدبر، فکر کے شہریار۔ تحریر آپ کی لونڈی قلم آپ کا غلام اور مجھ وجود بے بود پر یہ قہر۔ رہا تھوڑا فرمایئے کہ جو شخص آپ کی دوری کے غم میں پہلے ہی عدم آباد میں رہتا ہو وہ آپ کی نظر التفات کا محتاج ہے یا چشم عتاب کا۔

مگر مجھے دیکھیے:

میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں
یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

اس لیے کہ

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ ہجراں
مجھے وہ دن کرے جو تم سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

آپ سے جدا ہو کر میں یہاں اس شہر آشوب آفات و فسادات کے ایک کنج تنہائی میں بیٹھا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا ہوں۔ میری تنہائی کا سرمایہ حیات آپ کا تصور ہے جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ صبح پانچ بجے بیدار ہوتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ آپ قریب کے پلنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ منہ میں پان ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور دماغ عالم بالا کی لامحدود بلندیوں پر محو پرواز۔ چہرہ نور علم سے منور ہر سانس میں عروض اپنا حق لیے ہوئے۔ آپ کے اطراف ایک نور کا ہالہ ہے اور اس ہالے میں بخط جواہر یہ الفاظ کندہ و تابندہ ہیں۔

مجھ کو تو پیغمبری دے نور نہ شاہنشاہ کر
ہو سکے تو سر موجودات سے آگاہ کر
اپنے اصل حال و حد سے آشنا کر دے مجھے
بندگی کی جہل مطلق سے جدا کر دے مجھے

اس عالم محویت میں آپ نہ جانے کب سے ہیں اور کب تک رہتے اگر میں دخل در معقولات کر کے آداب بجا نہ لاتا۔ میری آواز سن کر آپ عالم بالا کی سیر سے اس کرۂ خاکی پر لوٹ آتے ہیں۔ میرے دریافت کرنے پر کہ آپ کیا مطالعہ کر رہے تھے آپ فرماتے ہیں "میں کیا بتاؤں خورشید علی خاں، طلب العلل کی تلاش ہے جو ابھی تک فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ میں عرض

کر رہا ہوں کہ حضور والا یہ کام اب قسط کا نہیں رہا اس کو سامعین نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اب ہم کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے اور ہمارا اس وقت تک ہم کہاں رہیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ ہی نے تو کہا ہے کہ

مجھ کو نہ ملا تو اسے دنگر آفاق بچ کر مری اولاد سے جائے گا کہاں

آپ فرماتے ہیں، اچھا اب چلو قریب کے باغ میں ٹہل کر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آپ اور میں نسیم صبح کی فرحت بخش آغوش میں قدم گن رہے ہیں۔ تین ہزار قدم ہو گئے۔ اب بائیں کی ورزش ہوئی۔ بیس دفعہ ہاتھ اوپر نیچے کیے گئے۔ پھر پیٹ پر لیٹ کر ٹانگوں کی ورزش ہوئی۔ چہل قدمی اور ورزش ہو چکی۔ گھر لوٹ آنے اور شوق کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں بھائی میں غسل کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ ناشتے کے لیے کہہ دیجیے۔ غسل ہوا ناشتے سے فارغ ہو کر کپڑے تبدیل کیے۔ اب حضور کہاں تشریف لے چلیے گا؟ چلو امین شاہ صاحب نابی کے گھر چلتے ہیں۔ میں گاڑی چلا رہا ہوں، آپ ساتھ بیٹھے ہیں۔ دکن ہوا میں پر ہے۔ آپ سے گفتگو ہو رہی ہے۔ آپ علم کی دولت لٹا رہے ہیں اور میں سمیٹ رہا ہوں۔ فلسفہ، ادب، اخلاقیات، الہیات، غرض ہر موضوع پر آپ اظہار خیال فرما رہے ہیں۔ میں سماعت کر رہا ہوں آپ جواب کے موتی لٹا رہے ہیں۔

نگہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

ستنے میں بابا صاحب کا مکان آ جاتا ہے۔ آپ بے تکلف ظلمت کدہ شاہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور میں آپ کا دامن پکڑے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہوں۔ اللہ اللہ کیا خنک ہے۔ ایک طرف پر کشش شعر چل رہا ہے تو دوسری طرف حسن عمل قدم مراتب طے کرا رہے ہے۔ ہماری آمد پر بزم نگاراں دوبارہ مرتب ہوتی ہے۔ اب شمع محفل آپ ہیں۔ اور موضوع سخن بھی بدل گیا ہے۔ اب عرش و فرش کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا اور رسول کی باتیں، حیات اور موت کی باتیں، عدم اور وجود کی باتیں، کمرہ جنت نگاہ تو باتیں فردوس گوش پھر شاعری کا دور شروع ہوتا ہے۔ بابا صاحب اپنا کلام سناتے ہیں۔ پھر آپ کا کلام نور علی نور۔ عرض دو تین گھنٹے سے گزرتے ہیں کہ یہ پتا نہیں چلتا کہ کب آئے تھے کہ رخصت ہونے لگتے ہیں۔

بابا صاحب کے آستانے سے رخصت ہو کر میں عرض کرتا ہوں کہ چلیے رس روڈ کی لسی پیتے ہیں۔ ہاں بھئی خوب یاد دلایا چلو۔ لیجیے رس روڈ پر پھلوں کے ٹھیلوں سے لی ہوئی لسی کھڑی ہے۔ دوکاندار نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔ اس نے فوراً ایک چھوٹی سی داڑھی والے شخص کے ہاتھ سے آپ کے لیے ایک گلاس میں گلی کو پانی منگوایا۔ اور جب آپ نے کلیاں کر لیں تو وہ دو گلاس لسی لے آیا۔ لسی پی۔ پان کھایا۔ اب ایک بج رہا ہے۔ چلو بھئی اب گھر چلیں حضور اب آپ اپنے گھر کہاں جائیے گا پہلے خاکسار کے مکان وہاں کمرہ خالی ہے آپ وہیں آرام فرمائیے گا۔ اچھا بھئی چلو۔ اس غریب خانے کی قسمت جاگی۔ آپ کمرے میں آرام فرما رہے ہیں۔ تین بجے آپ بیدار ہوئے۔ غسل خانے فرمایا اور کمرے سے باہر تشریف لائے۔ مجھے دیکھ کر فرمایا۔ غسل کے بعد اب آپ کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا ہے اس کے بعد چائے اور پھر علم کے غزلے لگانے جا رہے ہیں۔ شام ہو رہی ہے اور احباب جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ رعب صاحب، فراست رضوی، ڈاکٹر عالیہ امام، سرور بارہ بنکوی، سلامت علی خاں دیکھیے سب جمع ہیں کہ آفتاب غروب ہوا چراغ جام روشن ہوا۔ سلامت علی خاں آپ کا ساتھ دے رہے ہیں۔

کیا میکدے کا رنگ عالی ہے مرحبا — مسند پہ نیسا تو پس خم ملک
صلائے عام ہے فضا میں گہر بار و دلفشاں — گلی ہے و مشک ریز و جنوں خیز و دے چکاں

میں نے دو گلاس بھرے ایک آپ کے سامنے رکھا دوسرا سلامت علی خاں کے سامنے۔ رعب صاحب فرما رہے ہیں۔

خورشید علی خاں ہیں ساقی راعب — اور حضرت جوش بادہ خواروں کے امام

ایک دو تین پچیس پچیس منٹ میں ایک ایک جام ختم کر کے آپ چوتھے جام پر پہنچے ہیں۔ میں کھانا لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ جوشش صاحب یہ کباب لاکھنیت کی چورنگی والے کبابی کی دوکان کے ہیں۔ بھئی واہ واہ یہ آپ نے خوب کام کیا۔ ..... کھانا ختم ہوا۔ آپ کلیوں سے فارغ ہوئے ایک کپ دودھ میں ایک چمچہ اسپ غول کی بھوسی ڈال کر آپ پی رہے ہیں۔ اب چلیے حضور آرام فرمائیے۔ اچھا بھئی اب ہم انتقال فرماتے ہیں۔ سوبت کی بے یک بات آؤ سو جائیں۔ سب احباب رخصت ہو جاتے ہیں۔ وہ دیکھیے آپ محو خواب ہیں اور

میری بیمہ دیتی ہوتی ہے ڈرتا ہوں کہ آنکھ جھپکی اور دامن خیال ہاتھ سے چھوٹا۔ بھلا بتائیے اس حسین و رنگین دنیا سے کون باہر آنا چاہے گا۔ آپ کو خط تو اس وقت لکھوں جب آپ کو پیار سے جدا محسوس کروں اور میرے لیے جدائی اور موت ایک ہے مگر آپ نے مجھے جھنجھوڑ کر اس حقیقت سے بیدار کر دیا ہے مگر اس احساس مسرت کا کیا ٹھکانا کہ میں آپ کو یاد تو رہا۔

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

حضور والا! دراصل مدت سے میں آپ کے خط کا منتظر تھا یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آپ نے مکان میں کس تاریخ کو منتقل ہونے فرنیچر کا کیا ہوا نوکر کا کوئی انتظام ہوا یا نہیں۔ نئے ٹیلی فون لگا یا نہیں اگر لگ گیا ہے تو نمبر کیا ہے۔ یہ ساری باتیں میں آپ سے پہلے معلوم کرنا چاہتا تھا اور پھر آپ کے نئے پتے پر خط لکھنا چاہتا تھا یہاں تو اس مدت میں کراچی میں قدر ہنگاموں کی آماجگاہ بنا رہا کہ گھر سے نکل ہی نہ سکا۔ ویسے بھی کرفیو کی وجہ سے گھر میں قید رہنا پڑا۔ اسی لیے عزیز الرحمٰن خان صاحب سے بھی ملاقات نہ ہو سکی اب جبکہ آپ اپنے مکان میں منتقل ہو چکے ہیں تو خط پابندی سے لکھتا رہوں گا۔

اگر کوئی خدمت کام ہو تو ضرور ارشاد فرمائیے۔ کلام خان صاحب کو میرا سلام فرما دیجیے۔ کراچی تو آپ کے جانے سے بالکل سونا ہو گیا ہے

اپنی ہی تلاش کا شکار اور آپ سے روشنی کا طلبگار

طالب دید

خورشید

اس خط کے بعد جوش صاحب کا دوسرا خط ۲۲ ستمبر ۸۰ء کا لکھا ہوا کسی صاحب کے ذریعہ دوسرے دن مجھے ملا۔ لفافے پر یہ پتہ تحریر ہے۔

خورشید علی خان کرام دل ملتانی
B-151 بلاک ۲ ناظم آباد
کراچی

۲۰۸.۶

شالامار ۵

اسلام آباد

۲۲.۹.۰۴

سہ پہر

تابندہ باد حضرت خورشید۔ کئی بار آپ کو خط لکھنے کی ترنگ پیدا ہوئی اور ہر بار یہ سوچ کر رک گیا کہ قدرت اللہ شہاب آپ کے باب میں کوئی آخری بات کہہ یا لکھ کر دیں تو خط لکھوں۔ اسی کم بخت اسمبلی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ شہاب صاحب کو لاکھوں بار لوٹ کر چکا ہوں کہ ان سے مل کر آپ کے مشن کو حسب مراد طے کر دوں لیکن ہر بار جواب آیا کہ اسمبلی کے ہوئے ہیں۔ بہرحال سعی میں لگا ہوا ہوں۔ تو میری سعی کو مشکور فرمائیے۔ جنہیں فرمائیے آپ یاد اور بہت یاد آتے ہیں۔ جی چاہتا ہے یا تو خود کراچی پہنچ جاؤں یا آپ کو یہاں بلا لوں مگر اس عالم کون و فساد میں جی چاہنے سے کیا ہوتا ہے اور آسمان سے آواز آتی ہے۔ تمہارے گرد عادی اہل کامل "۔ ہے یہاں سے جو سب ہی اچھے آدمی ہیں میرا سلام کہیے۔ اب ان کی صحت کا کیا حال ہے اور ذرا پتا چلائیے سلامت علی خان کا۔ ان کے سر پر جو مصیبت آئی تھی ٹل کر نہیں۔ ان کا پتا بھی لکھیے۔ اور ان کی بیگم اور ان کے بچوں سے میری دعا کہیے۔

رضیہ بی بی کے پاس ہونے کی مبارک باد کا دلی شکریہ قبول کیجیے۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ اس کی صحت روز بروز گر رہی ہے اور الرجی کی بنا پر ڈاکٹر جو دوا دیتا ہے اس کے استعمال سے بے پروائی بھی برتتی ہے۔ ایک حشر ہے کے بعد لاہور جا کر اس کو سمجھاؤں گا کہ اپنی جان سے اس قدر غفلت نہ برتے۔ کل ٹیلیفون میں ہوٹل کی طرف سے گزرتے ہوئے آپ کی معشوقہ کو دیکھا۔ بڑی تنک کے ساتھ ٹھمک ٹھمک کر قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ بے ساختہ جی چاہا کہ اس کو بھٹ سے اٹھا کر اپنی موٹر کار میں ڈال لوں اور عمر حیدر کے مانند اس کو دنبیل میں ڈال کر اس کی زبان میں "سوزن" لگا کر آپ کے نام پارسل کر دوں اور جب وہ چلم سے آپ کے خلوت کدے میں قدم رکھے اسی آن آپ کی بیگم دم سے کود پڑیں چھت

سے اور عاشق و معشوق دونوں کی پشت پر دھماد دھم کے پڑنے لگیں اور پھر آپ کی چیخ اور اس کا پیشاب نکل جائے۔

آپ کی سن اختر نے بھولے سے بھی یاد نہیں کیا لیکن ان تک میری شکایت نہ پہنچائیے گا

آپ کا چاہنے والا

جوش

اسلام آباد میں الحاد ستان کا سفیر

جب بھی کانٹوں نے پاؤں برسائے — تیری نگری کے پھول یاد آئے

جی ہاں یہ بڑا دردناک سوال ہے کہ:

دل کا طوفاں دماغ تک پہنچا — گھپ اندھیرا چراغ تک پہنچا

دل حکمت میں چھپ گیا جاتا — کیا کرے اب تو بھس گیا سالا

جوش صاحب نے اس خط میں جس "معشوق" کا ذکر فرمایا ہے اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جب پہلی مرتبہ جوش صاحب پنڈی میں فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے تو میں کلام حال صاحب کے گھر مقیم تھا تو شام کو میں جوش صاحب سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ کمرہ جوش صاحب اپنے کمرے کے سامنے والے برآمدے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک شام تھی۔ میں اور جوش صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اس شام پنڈی کا موسم مست خوشگوار ہو گیا تھا۔ بادل چھا رہے تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اتنے میں ایک کرسچین خاتون جو اس ہوٹل کی دیکھ بھال پر متعین تھیں نہایت دلکش انداز میں ٹہلتی ہوئی ہماری طرف آنے لگیں۔ ہوا کی وجہ سے ان کی زلفیں بار بار چہرے پر پڑ رہی تھیں اور وہ ایک ادائے دلربائی کے ساتھ جھٹک جھٹک ہاتھوں سے بار بار انہیں ہٹا رہی تھیں میں نے کہا جوش صاحب آپ نے جو فتنہ قیامت کا شعر کہا ہے وہ دیکھیے سامنے چلی آ رہی ہے۔

اس تمکنت نازک کی سرشاریاں نہ پوچھ — نکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں نہ پوچھ
رخ پر ہوائے شام کی گلبازیاں نہ پوچھ — کاکل کی ہر قدم پہ فسوں کاریاں نہ پوچھ
عالم تھا وہ خرام میں اس گلعذار کا
گویا غزل، رعنائیِ پروردگار کا

جوش صاحب نے یہ سنتے ہی ایک نعرہ لگایا "وہ مارا" تو آپ پر بھی حسن کا اثر ہونے لگا۔ میں نے کہا کہ اب تک تو مجھے کسی حسن نے اتنا متاثر نہیں کیا کہ میں یہ کہوں کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے البتہ کبھی کبھی کسی کی کوئی ادا بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ ہاں البتہ میں آپ کے ذہن اور فکری حسن کے گرویدہ کے دام میں ضرور اسیر ہو چکا ہوں۔

کل دل کہ رم کنندہ از خوبرو جوانان — دیرینہ سال پیر ہے بدوش بہ یک نگاہے

اتنے میں وہ خاتون ہمارے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ جوش صاحب نے ان سے نوش کی دعوت دے دی۔ اس نے نہایت دل کو لبھا مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہم کو ڈیوٹی پر ڈرنک کی اجازت نہیں ہے۔ شکریہ۔ میں تو معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھی کہ آپ کو یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" جوش صاحب نے کہا "ارے سخت تکلیف ہے۔ یہاں مجھے اکیلے ڈرنک کرنا پڑتا ہے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا "آپ کیسے کہاں ہیں یہ آپ کے دوست آپ کے ساتھ بیٹھے تو ہیں۔" جوش صاحب نے کہا "ارے بی بی تم کو نہیں معلوم یہ کتنے ملا آدمی ہیں۔" اس نے پھر اسی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف اشارہ کر کے کہا "آپ میری طرف سے جوش صاحب کا ساتھ دیجیے تاکہ ان کو آئندہ خیال کا شکوہ نہ ہو۔" اور یہ کہہ کر کمر لچکاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ اس وقت سے جوش صاحب نے اسے میری معشوقہ کہنا شروع کر دیا۔ بس اتنی بات تھی۔

جوش صاحب نے اس خط میں قدرت اللہ صاحب شہاب کا جس کام کے سلسلے میں ذکر کیا ہے وہ ذرا تشریح طلب ہے۔ ہوا یوں تھا کہ میں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک تفصیلی اسکیم مرتب کی تھی۔ وہ اسکیم جوش صاحب کو بہت پسند آئی تھی۔ پنڈی کے قیام کے دوران میں کئی لوگ جوش صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے ان میں فیض احمد فیض اور قدرت اللہ شہاب بھی تھے۔ شہاب صاحب مرکزی وزارت تعلیم کے سیکرٹری تھے۔

جوش صاحب نے شباب صاحب سے میرا تعارف کروایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے ایک تعلیمی سکیم مرتب کی ہے۔ پھر شباب صاحب کی فرمائش پر میں نے وہ اسکیم ان کو دے دی۔ انہوں نے کہا کہ آج کل حکومت ایک تعلیمی پالیسی مرتب کر رہی ہے اگر آپ کی یہ سکیم اس قابل ہوئی کہ اس کو اس پالیسی کا حصہ بنا لیا جائے تو پھر میں آپ کو رخصت دوں گا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو کر اس پالیسی کی ترتیب میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ دوسرے دن شباب صاحب نے حکومت کی تعلیمی پالیسی کا مسودہ مجھے دیا اور کہا کہ آپ اس پر غور کر کے مجھے بتائیں کہ آپ کی اسکیم سے یہ پالیسی کس حد تک مطابقت رکھتی ہے اور کہاں کہاں مختلف ہے۔

میں نے دو تین دن میں اس پر اپنے رائے لکھ کر ان کو دے دی۔ میں نے اپنی اسکیم میں تعلیمی پالیسی کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک پروگرام دیا تھا اور ایک مثالی اسکول کے قیام کے لیے تفصیل بیان کی تھی، اور یہ عرض کیا تھا کہ اگر حکومت ایسا کوئی مثالی اسکول کراچی یا اسلام آباد میں قائم کرنا چاہے تو میں اپنی صلاحیت پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جوش صاحب نے بھی شباب صاحب سے کہا کہ اگر حکومت اسلام آباد میں ایسا اسکول قائم کرے تو وہ خود بھی اس میں کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر جوش صاحب کی کوششوں کے باوجود حکومت نے اپنی کسی اسکیم کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

نعمت اللہ خاں کا انتقال:

اکتوبر ۷۲ء میں میرے بھائی نعمت اللہ خاں کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی اور ان کے دل کے دوروں میں شدت پیدا ہو گئی۔ وہ دراصل بے حد فرض شناس، محنتی اور دیانت دار پولیس افسر تھے۔ پولیس کے افسر بھی قانونی مشوروں کے لیے ہر وقت ان کو بلاتے رہتے تھے۔ عاملان عدالت بھی بہت مشکل اور الجھے ہوئے مقدمات میں ان سے قانونی مشورے طلب کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں رات دن اس قدر مشغول رہتے تھے کہ مشکل سے چوبیس گھنٹوں میں دو تین گھنٹے آرام کرتے ہوں گے اس کے علاوہ اسی طرح پر مشغول رہنے کی وجہ سے ان کی صحت بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ میں نے فکر جتایا کہ چند ماہ

کے بے چین لے کر آرام کر لیں مگر احساس فرض داری نے انھیں آرام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰ اکتوبر کو رات تین بجے شدید دل کا دورہ پڑا۔ بیوی اور بیٹی نے کہا کہ مجھے نے ہی فون کر کے بلا لیں گی تاکہ ان کو امراض قلب کے ہسپتال میں داخل کروا دیا جائے تو یہ کہہ کر انھیں منع کر دیا کہ اس وقت بھائی جان سو رہے ہیں انھیں پریشان مت کرو۔ میں حسب عادت صبح اٹھ کر ٹیلے چلا گیا اور جب آٹھ بجے گھر لوٹا تو بیوی سے بتایا کہ نصرت کی بیٹی کا نئے ہی فون آیا تھا ان کی طبیعت خراب ہے اور مجھے بلایا ہے۔ میں فوراً ان کے گھر جو ناظم آباد پولیس اسٹیشن میں واقع تھا پہنچا۔ جیسے ہی میری گاڑی کی آواز سنی وہ فوراً باہر آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہم لوگ جناح ہسپتال کے امراض قلب کے وارڈ میں پہنچے وہاں ڈاکٹر حامد شفقت صاحب نے جو ان کے معالج تھے معائنہ کیا اور ان کو ہسپتال میں داخل کر لیا۔ ہسپتال میں ان کو انجکشن لگا کر سلا دیا گیا مگر سینے کا درد کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ اسی طرح دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن درد کم ہوا اور طبیعت میں کچھ سنبھلنے کے آثار پیدا ہوئے۔

ڈاکٹروں نے مجھ سے ایک انجکشن منگوایا جو بہت مہنگا تھا مگر دل کے دورے کے وقت لگایا جاتا ہے۔ وہ انجکشن مہنگا ہونے کے علاوہ اس زمانے میں مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ میں نے اپنے ایک مستقل ہی محبت کرنے والے دوست قیوم صاحب سے درخواست کی جو انفیکشن اسٹریٹ پر اسٹینڈرڈ میڈیکو کے مالک تھے۔ انھوں نے کوشش کر کے وہ انجکشن فراہم کر دیا۔ میں نے نصرت کو وہ انجکشن دیتے ہوئے کہا کہ اس کو سخت حفاظت سے اپنے پاس رکھیں تاکہ اگر دوبارہ خدانخواستہ پھر تکلیف ہو تو کام آئے۔ اب نصرت کی طبیعت سنبھل گئی تھی اور آہستہ آہستہ بہتر ہوتی جا رہی تھی مگر وہ ابھی تک فالج سے پوری طرح باہر نہیں ہوئے تھے۔ چوتھی منزل پر ایک مریض دل کے دورے کی حالت میں ان کے کمرے کے ایک پلنگ پر لا کر لٹایا گیا۔ وہ غریب آدمی تھا اس کی بیوی رو رہی تھی اور بہت پریشان تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو بھی وہی انجکشن لانے کے لیے کہا تھا مگر اس کے پاس اتنے پیسے تھے اور نہ کوئی آدمی بازار جا کر بھاگ دوڑ کر کے انجکشن ڈھونڈ کر لا سکے۔ جب نصرت کو معلوم ہوا تو انھوں نے خود اپنے پاس رکھا ہوا انجکشن اس کو دے دیا۔ اس شخص کو جب وہ انجکشن لگا اس کی حالت سنبھلنے لگی اور وہ ٹھیک ہو گیا۔

مگر دوسرے دن یعنی ۵ نومبر کی رات کو جب ایک بجے صحت کو دوبارہ دورہ پڑا تو ان کے لیے کوئی علاج نہ تھا۔ میرے ایک عزیز رات کو ان کے ساتھ ان کی دیکھ بھال پر مامور تھے، جب تک وہ ڈاکٹر کو بلاتے، ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے آکر وہ انجکشن طلب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو ایک رات قبل ہی ان کے ساتھی مریض کو لگایا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر بھی ان سے جو کوشش ہو سکتی تھی اصحاب نے کی مگر دنیا کا مدد پہ دل میں رکھنے والے ہی اللہ کی نعمت کے دن پورے ہو چکے تھے۔ یہ بانکا مجاہد مسکراتا ہوا رات ایک بجے خالق حقیقی سے جا ملا مگر کون کہتا ہے کہ میرا بھائی مر گیا وہ آج بھی ہر لمحہ میرے ساتھ رہتا ہے۔

ہر گز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ انہی دنوں جوشش صاحب کے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں کا بھی بیچ آباد میں انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے جوشش صاحب کو ان کے بھائی کے پرسے کا خط لکھا تو صمت اللہ خاں کے انتقال کی خبر بھی لکھ دی۔ اس کے جواب میں جوش صاحب نے لکھا

اسلام آباد

۱۰-۱۱-۷۳

ہمنے عزیز شبیہ علی خاں، ہم دونوں پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ ہم دونوں کے چھوٹے بھائی وہاں چلے گئے ہیں، جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا ہے۔

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست کہ وہ عاشق زار بجز کار زاریست

اس وقت میرے دل کا یہ عالم ہے کہ آپ کو بات سنبھال سنبھال کر خط لکھ رہا ہوں لیکن قلم ہے کہ قابو میں نہیں ہے۔ حروف کی شکلیں بگڑی چلی جا رہی ہیں۔

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ سناٹا ہر طرف چھایا ہوا ہے اور دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا ہے کہ اس کی کھٹ کھٹ کانوں میں گونج رہی ہے۔

ہم دونوں کے بھائی ہم سے منہ موڑ کر چلے گئے اور سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ہم بھی اسی بے حسی میں اپنی زندگی سے پشیمان ہیں۔ خورشید علی خاں، آخر میں کب تک سہمی رہوں گا۔

اس ہول ناک کرب میں موت سے زیادہ کوئی چیز تلخی و تلخی نہیں ہے۔ یہ دنیا بھی بوچڑ خانہ ہے اور اس بوچڑ خانے کا چلانے والا ایک ایسا قصاب ہے کہ اگر اس کو بزید و شمر کہا جائے تو بزید و شمر تو بے حیثیت حرفی کا دھوبی دار کر دیں۔

آخر ہم یہاں ایک سب سے الگ تھلگ اور سب سے بے پروا مسافر کی طرح کیوں نہیں رہتے۔ آخر یہ کیا پاگل پن ہے کہ ہم یہاں اقربا اور احباب سے محبت کرتے ہیں اور

بیں اگر نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد خوشا روانی عمرے کہ در سفر گزرد

پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ لیکن ہم نامرادوں کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو محبت کے بغیر دھڑک ہی نہیں سکتا۔ ہم کسی سے بھی دل نہیں لگاتے۔ دل لگانا نہیں چاہتے مگر یہ سرکش و نامرادوں ہمارے ہی اندر ہم دوسروں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ حیف صد حیف ہماری سادگی پر۔ بہرحال ہم دونوں اس وقت تنہا ہیں۔ گو ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے تو شاید کچھ بٹ جاتا ہمارا غم آپ پھر بھی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ہیں جن کی معیت سے کچھ۔ کچھ غم بٹ ہی جاتا ہو گا۔ میں نامراد یہاں بالکل تنہا ہوں۔ بیوی، بیٹی، بیٹا کوئی بھی میرے پاس نہیں دن بھر تو لکھنے پڑھنے میں وقت گزر جاتا ہے لیکن غروب کے وقت دل ڈوبنے لگتا ہے۔ بائے میں کیا کروں کدھر جاؤں۔

آپ ہی کی طرح آپ کا تنہا دوست

جوش

یہ خستہ خط بابائے دین شاہ کے حوالے کر دیجیے۔ ان کا پتا یاد نہیں۔

بابا دین شاہ صاحب تابی کو جوش صاحب نے لکھا۔

نامہ کفر نہ اسلام آباد

۲۴۔۸۔۶۷ء

قبلہ دین شاہ بابا۔ ڈھائی بجے رات کو حسب معمول بیدار ہوا تھا۔ اب چار بجے

ست بانی ہیں ہوا سے پر ہول کر اور عمل کا حقیقی رنگ بھی گھپ اندھیرا زمین و آسمان کا سلاد کیے ہوئے ہے اور پچھلے پہر کا اتھاہ سناٹا بول رہا ہے۔

میں آج گھر میں تنہا ہوں، اپنا خاندان بیوی سمیت کراچی میں ہے اور میں چند کے ساتھ مجھ الرسیاب پر بیٹھا نوحت بجا رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں خلوت پسند آدمی ہوں مگر شام کے بعد بہت کوئی چاہنے لگتا ہے اور اسی بنا پر جب آفتاب غروب ہونے لگتا ہے تنہائی کی بوجھل میں میرا دل ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ خدا کی بے پایاں رحمت نے آنکھ ایسے پیدا کر دیے ہیں کہ مجھ پر اللہ اللہ کیا سمیں تو کل اور کل سمیں تو پرسوں دل کا دورہ ضرور پڑے گا۔ حقائق ہی کچھ لے رہیں گا اور پھر سر جاتا کا خس کم جہاں پاک۔ پلکیں کر آنکھیں بند کر لیں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا لیکن آنکھیں کھول کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ حیات انسانی ایک حسرت ناک زندگی اور کرہ خاک ایک ہول ناک منزل ہے۔

جہاں بسمل گر درد ست آسائش کہ دید یں جا
جفد تنست جانی ہر کسے بر خود تپید یں جا

آسمان و زمین اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ مرحلہ حیات کا واحد علاج موت ہے۔

حزیں از پائے دہ پیسا بے آشفتگی دہم
سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید یں جا

(کلیات حزیں)

بابا صاحب، حقائق بے نہایت تلخ ہیں۔ کون ان سے منہ موڑ سکتا ہے۔ اقوال و اساطیر سے عام لوگ فریب کھائیں، اور ناچیز اوہام آبائی کے سامنے سر جھکائیں۔

لیکن دیکھیے آپ بڑے مزے میں ہیں، رومی و غزالی آپ کے سامنے پاسری بجا رہے ہیں تحقیقات اور تدقیقات کی بوجھاں دیواریں آپ کا حاطہ کیے ہوئے ہیں آپ کے خدا کا احترام عقل کی پاسداری آپ کے سر پر تلے ہوئے ہیں اور دنیا نے کرم آپ کو اور بل دے رہے ہیں اور اس بنا پر آپ اس وقت زندگی میں بیٹھے جنت کی ہوا میں کھا رہے ہیں۔ لیکن میں بامراد عشق کے تپتے صحرا اور دلائل کے چمکتے نیزوں کے سامنے سینہ عریاں کیے کھڑا ہوں۔ مجھ سے بس مجھ سے پوچھیے کہ یہ کارخانہ عالم کیا ہے اور اس کارخانے کا جزو بلیغ کیا ہے۔

این سر سید کہ بر قالب ناکام چہ رفت
می توان گفت کہ این بندہ خداوند نہ داشت

کہتے ہیں کسی بادشاہ کے ملک پر اس کے حریف نے چڑھائی کی۔ بادشاہ نے دوسری پلٹنوں کے ساتھ ساتھ لمبے تڑنگے ہیجڑوں کی بھی ایک پلٹن بنائی اور اس کو میدان جنگ میں بھیج دیا۔ دشمن کی فوج ان ہیجڑوں کے قد و قامت دیکھ کر ہراساں ہو گئی۔ سالار فوج نے جب سماں دیکھا تو اپنے سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لیے اس نے گرجتی آواز میں نعرہ لگایا کہ "ساتھیو، نگارے اڑا کر رکھ دو دشمن ہیجڑوں کے۔" دشمن کے سپاہ سالار کو یہ مطلق پتا نہیں تھا کہ وہ اصل ہیجڑے ہیں۔ اس نے تو یہ لفظ بزدلوں کے معنی میں استعمال کیا۔

ہیجڑوں نے جیسے ہی یہ نعرہ سنا۔ تلواریں پھینک دیں، پلو سر پر ڈال لیے اور تالیاں بجا بجا کر ناچنے گانے لگے "قربان جاؤں پہچان لیا" "قربان جاؤں پہچان لیا" "قربان جاؤں پہچان لیا"۔

اس طرح لشکر کی زمین پر کھڑے ہو کر جب میں نگاہ بلند اٹھاتا اور چلاتا ہوں کہ یہ سب دھوکا ہے تو آسمان سے آواز آنے لگتی ہے "قربان جاؤں پہچان لیا" "قربان جاؤں پہچان لیا" "قربان جاؤں پہچان لیا" "قربان جاؤں پہچان لیا"۔

میں ہوں آپ کی ذات اور صرف ذات سے محبت اور بے پناہ محبت کرنے والا

جوش

روز اتوار نوش

تعزیت موت بابا صاحب کے خیالات:

دوسرے دن جب میں جوشش صاحب کا یہ خط لے کر بابا صاحب کے گھر گیا تو قید لمبے کمرے میں کسی خاتون کو دیوان غالب کے رموز سمجھا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بہت محبت اور تپاک سے ملے۔ خاتون کو رخصت کیا۔ صوفے سے اٹھ کر تخت پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ رہتے میں اور لوگ بھی آ گئے۔ بابا صاحب نے مجھ سے آنے کا سبب دریافت کیا تو میں نے جوشش صاحب کا خط دے دیا۔ بابا صاحب خط لے کر پڑھنے لگے پڑھتے

جاتے اور مسکراتے جاتے۔ غلط پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا اور یوں گویا ہوئے۔ انسان کی یہ
مجبوری ہے کہ وہ حیاتی راز اپنی محدود عقل اور اس سے زیادہ محدود حواس کے توسط سے سمجھنا
چاہتا ہے۔ انسانی عقل اس کائنات کی لامحدود حقیقتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح علت
تخلیق کو بھی کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفی یا سائنس دان کیوں نہ ہو، نہیں سمجھ سکتا۔ ہم
کسی شے کی ماہیت کو تو سمجھ سکتے ہیں مگر وہ شے ویسی کیوں ہے اس کا جواب عقل انسان کے
بے بس ہے۔ مثلاً ہم پانی، ہوا یا کسی پتھر کے اجزائے ترکیبی تو عقل کے ذریعہ معلوم کر سکتے
ہیں مگر پانی کو سیال، ہوا کو لطیف اور پتھر کو سخت کیوں بنایا گیا ہے یا انہیں تخلیق ہی کیوں کیا گیا
ہے یہ معلوم نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اس کائنات میں تغیر کو ایک ابدی اور اٹل قانون کے طور
پر کیوں نافذ کیا گیا اور تخلیق حسن کو قانون تغیر کا کیوں پابند کیا گیا یہ سب امور مرضی الٰہی
سے متعلق ہیں اور خالق کائنات اپنے ارادے اور اس کے اظہار میں وحدہ لاشریک ہے۔ یہ
مادی کائنات مستثنیٰ یا ماورا قانون تغیر کے تابع ایک تخلیقی سلسلہ میں رواں دواں ہے اور ہم جسے
بے ثباتی یا موت سے موت سمجھتے ہیں، وہ حیات نو کا پیش خیمہ ہے۔ حیات کا سلسلہ
کبھی ختم نہیں ہوتا ہر لمحہ ہم نیا وجود تخلیق کرتے رہتے ہیں جو پچھلے وجود کی موت پر تعمیر ہوتا
ہے جب یہ سلسلہ انسان کی پیدائش سے پہلے سے چل رہا ہے تو مرنے کے بعد کیسے ختم سمجھا
جائے اور یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ حیات کسی اور منزل میں داخل ہو گئی ہے۔ جس کی ماہیت
ہم ہی اس عقل کے ذریعہ سے نہیں سمجھ سکتے۔ جب بچہ باپ کی کمر سے ماں کے پیٹ میں
منتقل ہوتا ہے تو باپ کی پیٹھ میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ ماں کے
پیٹ سے نکل کر دنیا میں آتا ہے تو ماں کے پیٹ میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے پھر
بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپا اور اس دوران میں ہر آن تبدیلیوں سے گزرتا رہتا ہے اور
بظاہر اس کے اس ظاہری وجود میں ایسی تبدیلی آ جاتی ہے کہ وہ دنیا والوں کی نگاہوں سے
اوجھل ہو جاتا ہے جسے ہم موت سمجھتے ہیں۔ مگر یہ موت خود نہ معلوم کس زندگی کی ابتدا ہے مگر
چونکہ ہم عقل سے جو صرف ظاہری حواس کے ذریعہ سے ادراک کر سکتی ہے اس کو نہیں دیکھ
سکتے اس لیے سمجھتے ہیں کہ زندگی کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن وہ لوگ جو روح کی ابدیت کے
قائل ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ روح اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حکم ایک دفعہ

نازل ہو کر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ روح کا ظاہری پیکر جب اس سے جدا ہو جاتا ہے تو وہ حکم پھر ارادہ خداوندی کی طرف لوٹ جاتا ہے اور خدا کے ذہن میں وہ حکم محفوظ رہتا ہے۔ قرآن اسی بات کو بیان فرماتا ہے جب وہ کہتا ہے "انا للہ و انا الیہ راجعون" یعنی۔ ہم اللہ ہی کے ارادے اور حکم سے عالم وجود میں آئے اور پھر اسی کی طرف لوٹ جائیں گے"۔ کبیر داس نے اسی مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے "مرمرے تو ہم مریں جنی مرے بلا"۔

بابا صاحب ذرا رکے تو میں نے کہا۔ قطع کلام کی معافی چاہتا ہوں۔ خود جوش صاحب کی بھی ایک رباعی اسی مفہوم کی ہے۔ بابا صاحب نے فرمایا سنایئے۔

میں نے رباعی سنائی،

ہر دور بپا جشن کریں گے اے جوشؔ
پیمانہ سر خوشی بھریں گے اے جوشؔ
کیا موت کی ہستی ہے کہ دامن چھوئے
اللہ مر تو ہم مریں گے اے جوشؔ

بابا صاحب نے فرمایا جی ہاں یہ کبیر داس ہی کے الفاظ جوش صاحب نے دہرائے ہیں مگر جوش صاحب مجموعہ الضداد ہیں ایک طرف فلسفی کا دماغ رکھتے ہیں جو حقائق کی معرفت رکھتا ہے۔ دوسری طرف شاعر کا دل رکھتے ہیں جو ذرا سی تغیر سے پریشان ہو جاتا ہے۔ بابا صاحب کی دلچسپ باتیں بارہ بجے تک چلتی رہیں۔ اس دوران مٹھائی پھل اور چائے سے سب کی تواضع ہوتی رہی اور کئی خواتین پاؤں پر دم کروا کروا کے لے جاتی رہیں ایک خاتون نے بابا صاحب سے ہاتھ ملایا اور کچھ نوٹ ان کی مٹھی میں دبا دیئے۔ بابا صاحب نے فرمایا۔ تم اتنے برس سے ملنے آتی ہو آج تک ایسا نہیں ہوا۔ اب ایسا کیوں ہے؟ وہ خاتون کوئی بیمار تھیں۔ انھوں نے التجا کی کہ بابا صاحب یہ میری خواہش ہے اسے آپ قبول فرمائیں اور اگلی اتوار کی شام ہمارے گھر نکاح کی تقریب ہے اور میری خواہش ہے کہ نکاح آپ پڑھائیں۔ بابا صاحب نے فرمایا دیکھوں گا اگر کوئی ضروری کام نہ ہوا تو نکلوں گا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی اس لیے بابا صاحب سے اجازت طلب کی اور رخصت ہو کر پروفیسر محمد علی صاحب کے گھر چلا گیا۔

پروفیسر احمد علی صاحب

احمد علی صاحب کا مکان بہادر آباد میں بابا صاحب کے مکان کے قریب ہی واقع ہے۔ بڑے محبت اور اخلاق سے ملنے جیسا کہ ان کا دستور ہے۔ پروفیسر صاحب ترقی پسند تحریک کے اولین قافلہ سالاروں میں سے ہیں۔ انگریزی اور اردو ادب دونوں پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ شاعر کے طرفدار بھی ہیں اور تھی فہم بھی۔ میرے دریافت کرنے پر ہی ایک تازہ تصنیف سے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے اور امریکہ میں زیر طباعت تھی۔ اس کتاب میں محولہ بالا اردو کے کلاسیکی شعرا جیسے میر تقی میر، غالب اور ان کے ہم عصر شعرا کا کلام اور ان کی شاعری کے مواد کا معاشرتی پس منظر بیان کیا ہے اور ان حالات کا تجزیہ سائنٹیفک اور محققانہ انداز میں کیا ہے جن حالات میں ان بڑے شعرا کی فکر پروان چڑھی۔ اسی سلسلے میں پروفیسر صاحب نے "غزل" کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "غزل دراصل غزال کی وہ چیخ یا کراہ" ہے جو وہ اس وقت نکالتا ہے جب زخمی ہونے کے بعد بھاگتے بھاگتے کہیں ایسی جگہ پھنس جائے جس کے آگے اس کے لیے سوائے موت کے اور کہیں جائے فرار باقی نہ رہے تو اس وقت آواز میں جو ناامیدی، غم اور کرب کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں، اس کو غزل کہتے ہیں۔ اسی طرح محبوب کے جفا کردہ غم جو غم دوراں سے مل کر شاعر کے حساس دل سے کراہ بن کر لب فریاد تک آ جاتے ہیں ادب میں غزل کے نام سے موسوم ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے کہ

نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے

اور پھر کون ہے نالے کو رسا کہتے ہیں

پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ میر نے جس عطار کے لونڈے کا ذکر کیا ہے وہ خود بھلا معاشرہ ہے۔ ہم بھی کیا سادہ لوگ ہیں کہ جس معاشرے سے ہمیں غم ملتے ہیں، ہم اسی معاشرے سے ان کے علاج کی توقع رکھتے ہیں۔

غالب کے متعلق پروفیسر احمد علی صاحب کا خیال ہے کہ غالب کوئی فلسفی نہ تھا بلکہ سچا عاقل اور زمانے کا گہرا دیدہ ور تھا۔ اس لیے اس کا ہر شعر حقیقت سے ہم آہنگ

ہے۔ پروفیسر صاحب کے خیال میں غالب کسی ذہنی پرعاشق نہیں تھا بلکہ سادات خاندان کے محلات میں سے کسی بیگم پر عاشق تھا۔ غالب کا ایک شعر ہے کہ،

سے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

کے متعلق انھوں نے فرمایا کہ اس شعر کے دوسرے مصرع میں آمد آمد کے بعد اضافت نہیں ہے بلکہ طوفان کی آمد کا اعلان ہے۔ چونکہ فصل بہار ہے اور بہار کے موسم میں ہر قسم کا جوش اور طوفان آتا رہتا ہے اس لیے جوش بہار میں جب طوفان کی شکل پیدا ہو جائے گی تو آشیانے کا تنکا بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے سے عندلیب بھی سے ایک مٹھی تنکے سے آشیانے کے لیے محفوظ کر لے۔

غرض پروفیسر صاحب سے دو بجے تک بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف انگریزی کتاب کے جستہ جستہ حصے پڑھ کر سنائے۔ میں دو بجے ان سے رخصت ہو کر کوٹی تھیں پہنچ گیا۔

میں نے دوسرے دن جوش صاحب کے خط کا جواب لکھ کر سپرد ڈاک کر دیا اور بابا صاحب سے جو گفتگو ہوئی تھی اس کی تفصیل بھی لکھ دی۔ مگر ست دن تک جوش صاحب کا کوئی خط نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے مزاج پرسی کا ایک خط لکھا۔ بالآخر فروری کے پہلے ہفتے میں ان کا یکم فروری ۶۲ء کا لکھا ہوا خط ملا۔

---

۱ دوسرے مصرع میں پہلی آمد کے بعد وقف اور دوسری آمد کی دال کو مکسور ہونا چاہیے ورنہ مصرع کسر سے ناموزوں ہو جائے گا۔

۱۹۷۳ء کے واقعات

کتب خانہ

از

اسلام آباد

۱۰۔۱۔۷۳ء

سرنام

حضرت خورشید، سورج ڈوبنے والا ہے اور میں کانپتے ہاتھوں سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ کل صبح کشتہ دور خورشید نظام داؤد بیماری سے اس قدر نڈھال ہوں کہ بات جا جا کر لکھ رہا ہوں۔ پھر بھی حروف کی شکلیں بگڑتی چلی جا رہی ہیں۔ اب لکھا نہیں جاتا۔ اگر خدا نخواستہ زندہ رہا تو کل لکھوں گا۔

لیجیے تاریخ بدل گئی۔ آج دوسری فروری ہے اور حضرت اکبر الہ آبادی کے الفاظ

افسوس ہے کہ زندہ ہوں کہنا پڑا ہے حال

کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا

کے مطابق آپ سے اپنا حال بیان کر رہا ہوں۔ آج حالانکہ معمول دیر اور سست ہی دیر سے بیدار ہوا۔ رات کو سوا سات بجے تکیے پر سر رکھ دیا تھا۔ بہت دیر میں نیند آئی۔ رات سوتے میں تمام رات باتیں کرتا رہا اور میرے آخری مجموعہ کلام "محمل و جرس" کا دیباچہ لکھتا رہا۔ نیند کا رشتہ بار بار ٹوٹتا اور جڑتا رہا۔ اب خدا خدا کر کے سات بجے بیدار ہوا اور کراہ کراہ کر خط

لکھ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرے دن اب آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہے۔ آواز بند ہو چکی ہے۔ سانس کھینچ کھینچ کر لیتا ہوں۔ ناتوانی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ جی اس قدر اداس ہے کہ خوش مزاجی مفقود ہو چکی ہے۔ خالی کی طرح چپ چپ اور مغموم رہنے لگا ہوں۔ خون اور پیشاب کا امتحان اور ایکس رے سے کسی خاص مرض کا پتا نہیں چلتا۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپ کے اعضائے رئیسہ نارمل ہیں لیکن اسے کیا معلوم کہ میں آہستگی کے ساتھ ختم ہوتا اور بجھتا چلا جا رہا ہوں۔ چوں قضا آید طبیب ابلہ شود۔ اس انحطاط کے باوجود ارادہ کر رہا ہوں کہ ہفتہ عشرے میں کراچی آ کر آپ سب سے مل لوں اور آخری بار سب کو گلے لگا لوں۔ بہت دن سے دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ۱۹۶۰ء میرا آخری سال ہوگا۔ سو بحمداللہ کہ اس کے آثار اب ظاہر ہو چکے ہیں۔ بائے میری لمبی آخر الزماں بھی تقریباً ایک سال سے بیمار ہے اور اس کی بیماری کا تسلسل گھن کی طرح میری زندگی کو چاٹے جا رہا ہے۔ ہم تبرک ہیں بس اب کرے زیارت مجنوں"

آپ کا چاہنے والا

جوش مرحوم

جوش صاحب کی آمد اور گورنر ہاؤس میں قیام

چھٹی فروری ۱۹۶۰ء کو جوش صاحب کانے لی لون پنڈی سے آیا کہ وہ دسویں فروری بروز ہفتہ بذریعہ تیز گام کراچی آ رہے ہیں اور مجھ سے کہا کہ میں راجب صاحب کو ساتھ لے کر کینٹ اسٹیشن ضرور آؤں۔ چنانچہ میں اور راجب صاحب مردہ آبادی تقریباً دس بجے دسویں فروری کو اسٹیشن پہنچ گئے۔ تیز گام دس بج کر ۴۰ منٹ پر کینٹ اسٹیشن پہنچی ہم نے جوش صاحب کا استقبال ان کے کوپے میں جا کر کیا اور جب ہم لوگ اسٹیشن کے باہر آئے تو دیکھا کہ جوش صاحب کے لیے گورنر صاحب کا عملہ کھڑا ہوا ہے اور گورنر ہاؤس کی گاڑی سیڑھیوں سے لگی کھڑی ہے۔ میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے تو انہوں نے کہا کہ اس وقت میرے دوست بخش صاحب تالپور نے مجھ کو ٹیلی فون کر کے خاص طور پر بلایا ہے اور یہ بھی خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ اسی کے مہمان ہوں۔ جوش صاحب نے اپنا سامان تو

گورنر ہاؤس کی گاڑی میں رکھوا کر اس کو رخصت کیا اور خود میری گاڑی میں بیٹھ گئے اور کہا کہ گورنر ہاؤس چلیے۔ چنانچہ ہم تینوں گورنر ہاؤس پہنچے گیٹ پر سیکورٹی والوں نے جب جوش صاحب کو دیکھا تو فوراً ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اس طرح جب ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو وہاں کے محافظ نے ہم لوگوں کو گورنر ہاؤس میں شاہی مہمان خانے کے ایک عالیشان کمرے میں پہنچا دیا جہاں جوش صاحب کا سوٹ کیس اور بستر پہلے سے موجود تھا۔ جوش صاحب نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے ہی تھے کہ چائے، بسکٹ، سموسے اور پھل وغیرہ آ گئے۔ ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ میر رسول بخش صاحب تالپور گورنر سندھ تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ ملٹری سیکرٹری اور محافظ کے دوسرے ارکان بھی تھے۔ میر صاحب نے نہایت احترام اور محبت سے جوش صاحب سے معانقہ کیا اور دریافت کیا کہ ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف یا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ جوش صاحب نے تو کہہ دیا کہ نہیں وہاں کیا تکلیف ہو سکتی ہے مگر میں نے کہا میر صاحب، ہم لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ جب تک جوش صاحب کراچی میں قیام کریں ہم ان کے ساتھ ہی رہیں مگر آپ نے ان کو گورنر ہاؤس میں ٹھہرایا ہے جہاں کی سیکورٹی کی وجہ سے ہمارا ہر وقت آنا جانا مشکل ہو گا اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں اپنے غریب خانے پر لے جاؤں اور آپ سے ملنے تو جوش صاحب ہر وقت آتے ہی رہتے ہیں

میر صاحب نے فرمایا سائیں، جب تک میں یہاں ہوں یہ گورنر ہاؤس بھی غریب خانہ ہی ہے پھر اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ جوش صاحب سے ملنے کے لیے جو صاحب خواہ کسی وقت آئیں ان کو نہایت احترام سے لا کر ملایا جائے۔ پھر فرمایا سائیں کبھی مجھ فقیر کو بھی تو جوش صاحب کی خدمت کا موقع دیجیے۔ اس پر راقم صاحب نے فی البدیہہ یہ قطعہ گورنر ہاؤس کے پیڈ کے ورق پر لکھ کر میر رسول بخش صاحب کو دیا

مدح جاہل ہیست بس بی رسول بخش
حق سدا بادا مسرت کے پھول بخش
منصب گورنری کا جو بخشا ہے سندھ کی
اس منصب جلیل کی مدت کو طول بخش

ہاپڑ صاحب تلملا پڑے کہ مسکرائے اور بولے رجب صاحب اس وقت آپ کی دعا قبول ہوتی دکھائی نہیں دیتی مجھے سخت تعجب ہوا کہ میر صاحب نے یہ بات کیوں کہی۔ مگر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس واقعے کے تیسرے دن یعنی ۲۰ دسمبر فروری کو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ میر رسول بخش ہاپڑ کو استعفیٰ دینا پڑا۔ بہرحال یہ تو بعد کی بات ہے۔ اس وقت جوش صاحب سفر کی تھکان کی وجہ سے آرام کرنا چاہتے تھے اس لیے ہم لوگوں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا اور گھر آ گئے۔

مغرب سے کچھ پہلے میں اور رجب صاحب گورنر ہاؤس پہنچے تو میر صاحب بھی جوش صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دنوں میں جو باتیں ہو رہی تھیں ان سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ بھٹو صاحب کے تعلقات میر صاحب کے بڑے بھائی میر علی احمد تالپور سے سخت خراب ہو گئے ہیں اور بھٹو صاحب علانیہ علی احمد صاحب کو برا بھلا کہنے لگے ہیں جو رسول بخش صاحب کے لیے سخت تکلیف دہ ہے۔ چنانچہ میر صاحب نے کہا کہ مجھے اپنے بڑے بھائی کی عزت اور شرافت گورنری کے منصب سے زیادہ عزیز ہے اس لیے میں نے گورنری کو خیرباد کہنے کا دوٹوک فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ممتاز بھٹو صاحب کا رویہ بھی ان کے لیے ہمدردیہ نہیں ہے۔ مگر ہمارے پہنچنے کے بعد گفتگو کا رخ شعر و شراب کی طرف مڑ گیا۔ صبح خروب اور جوش صاحب طلوع ہو گئے ... اور شاعری شروع ہو گئی۔ ساتھ میں کچھ اور احباب بھی آ گئے۔ جوش صاحب کے توسط سے بھی ان سے ملنے آ گئے۔ جوش صاحب نے کہا کہ اسلام آباد میں بڑی تعداد ہے اور کراچی کے احباب بھی بہت یاد آتے ہیں۔ اس رات ہم سب گورنر صاحب کے مہمان تھے۔ انھوں نے نہایت پرتکلف کھانے کا اہتمام فرمایا تھا۔ جوش صاحب نے میری طرف دیکھ کر فرمایا خورشید علی خاں! کیا بات ہے تم پر تو ہٹ کر جوانی آ رہی ہے؟ میں نے کہا جوش صاحب یہ آپ کی محبت کی نظر ہے بلکہ آپ کا حسن نظر ہے اور بقول ماہر القادری صاحب:

میرے حسن نظر کی بدولت کوئی رہرو حسین بن گیا ہے

راجب صاحب نے اسی وقت گورنر ہاؤس کے پیڈ پر ایک رباعی لکھ کر پڑھ دی:

کس درجہ وجیہ و خوبصورت ہوں گے شایان محبت و رفاقت ہوں گے

اس وقت بھی شعلہ ہیں تو کچھ میں ضرور خورشید مل خاں بھی قیامت ہوں گے

فی البدیہہ موجودگی حضرت جوش ملیح آبادی مدظلہ

راجب مراد آبادی ۔ ۱۔ ۲۔ ۱۹۹۰ء

غرض اسی قسم کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں اور ہم لوگ تقریباً ۹ بجے جب جوش صاحب بستر پر لیٹ گئے، اپنے گھر لوٹے۔ دوسرے دن جوشش صاحب اپنے گھر والوں سے ملنے ویلس لی ایریا کے مکان آئے اور یہاں شام تک ٹھہر کر شام کو گورنر ہاؤس کی گاڑی میں واپس چلے گئے۔

اس کے دوسرے دن بارہویں فروری کو میں، راجب صاحب، خرامت وصوی اور ڈاکٹر ہلیہ ہم سب لوگ دن ہی سے جوش صاحب کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ اس دفعہ میں اپنا ٹیپ ریکارڈر بھی ساتھ لے گیا اور جوشش صاحب نے جو کچھ سنایا وہ ٹیپ کر لیا۔ پہلے تو انھوں نے کچھ رباعیات سنائیں پھر اپنی تازہ نظمیں "انتظار دوشیزگی" اور "دو شمعوں کے درمیان" سنائیں۔ اس کے بعد ایک "مکالمہ" جو شیر حسن خاں آفریدی اور جوشش ملیح آبادی" سنایا۔ یہ مکالمہ دراصل "ای گو اور سوپر ای گو" (Ego and Superego) کے درمیان کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ شیر حسن خاں آفریدی علامت ہیں ایک منطقی فلسفی اور دانشور کے ضمیر کی اور جوشش ملیح آبادی ایک حسن پرست اور رومانی جذبات رکھنے والے شاعر کی بنیادی جبلتوں کے آئینہ دار ہیں۔ اس مکالمے سے جوشش صاحب کی شخصیت کی داخلی کشمکش کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

آئیے آپ کو بھی رندان پختہ مغز کی اس بزم خاص میں لیے چلتے ہیں۔ آپ بھی بقدر ظرف اس سے لطف اٹھائیے۔

پہلے رباعیات سنیے۔

تاریخ نے کی حق کشی کیا کیا ماضی نے جھلک اپنی دکھائی کیا کیا
نکلا جو صدف شکل سلاطین کا جلوس شاعر کی گھوانی مسکرائی کیا کیا

راجب صاحب نے کہا جوش صاحب یہ بہت پرانا مال ہے۔ ہاں ۱۹۴۰ء کی رباعی ہے جوش صاحب نے کہا جی ہاں مال تو پرانا ہے مگر تاثیر ہمیشہ نئی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

کم کی خرد باز کر دیا ست روز گار چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

اسکے بعد یہ رباعی پڑھی

شادی یکسر آں کا ہے پیغام نشاط
پھر موت کے دم تک اک مسلسل مسرت
گزرے گا دھرے کی جنازے کا جلوس
جس روز گزر کے آج نکلی ہے برات

ہو بی بی یہ کو تڑپائیں گی رخصت جو ہوئیں تو پھر نہیں آئیں گی
اتنی ہے جنھوں نے آج مکھڑے سے نقاب مو دلھا سب کے یک دن چلی جائیں گی

ہو بی بی تمھیں یہ رلائیں گے دولہا صاحب بڑے ستم ڈھائیں گے
گھوڑے پہ جو بیٹھ کر یہاں آئے ہیں بھوت میں لپٹ کر چلے جائیں گے

دلشاد ہیں تمھیں تو بیکر سخن کیا حسن صدا شکن ہے اللہ غنی
زلفیں ترے مکھڑے پہ جو آجاتی ہیں خود طور سے آتی ہے صدائے ارنی

چکھتا ہوں زبان گل سے شہد کو کو پیتا ہوں تمھیں کے سبو میں پی ہو
احساس پہ ناچتا ہوں طفل الوان انفاس پہ تولتا ہوں دن خوشبو

اس رباعی کے تخیل کی نزاکت کی سب نے دل کھول کر داد دی۔
اس کے بعد جوشش صاحب نے پی تازہ نظمیں سنائیں۔ پہلی نظم کا عنوان ہے
"انتظار دوشیزگی"۔

فشار دوشیزگی

یہ ازل سے ہے عشق کا دستور
فرش سے بام عرش تک جائے

ہے یہ پھول میں یہ گل چٹکے
اور سارا نگر مہک جائے

قاصد نظروں میں خود ہیں باتیں ہوں
پھر بھی آواز دور تک جائے

یہ صدا کس حسینہ کی آنکھ
جب کبھی غیر سے اٹک جائے

پھر تو اس نازنیں جسارت کی
پل میں ہر کان تک بھنک جائے

ان میں فرق صالحین کرام
حسن کے یہ ماجرا چٹک جائے

وہ شرمندگی سے کچھ کا
سر جھکے اور منہ لٹک جائے

ہر رہی ہر مکاں سے اٹھ اٹھ کر
مشہور تشنیع دور تک جائے

حسن جھوں کے دل چلے پھر بھی
سیکڑوں کو سس تک دھمک جائے

بخشش قہر کشتگان رسوم
یہ دھمک سنتے ہی بھڑک جائے

متقیان زہد کے صبر کا جام
شدت جہل سے چھلک جائے

ہمیں کی گمان تنگ نداز
فرق معصوم پر کڑک جائے

ایک کب دو سیاہ کی پہلی
شوق تسخیر سے بھڑک جائے

مبتلائے فریب کے طعنوں سے
دل ناز صاد پک جائے

یاں کی غولت سے وہ کوشاں ہے
کہ نہ آنسو کوئی ٹپک جائے

ڈر رہی ہے کہ وقت تمرائیش
نہ کہیں کانی کہیں بڑک جائے

میں جب آؤں تو جھٹ سے مکھڑے پر
نہ کہیں چاندنی چٹک جائے

کہیں ایسا نہ ہو دم گفتار
کہ گلے میں صدا اٹک جائے

کہیں ایسا نہ ہو کہ سسکی سے
شیشہ راز دل دھڑک جائے

دل آشفتہ کار کا پتلا
نہ کہیں آنکھ میں ٹپک جائے

پھر بھی کیوں کر چھپے حدیث دہاں
جب کسک دل کی آنکھ تک جائے

کیا چھپیں الجھنیں کہ جب سر سے
بار بار اوڑھنی ڈھلک جائے

بھول سوتے تو فرط حیرانی سے
رخ پہ کانٹا سا اک کھٹک جائے

رہ سے سانس لے تو خونِ جگر
جلد رخسار سے چھلک جائے

انھیں ملے کے دیکھنے آنکھیں
اور فضا میں نظر بھٹک جائے

جب نسیم لبوں پہ کھنچ کے رہے
غرہ نم آنکھ میں چمک جائے

چپ رہے تو نگاہ بیچ سے ٹوٹے
اور چلے تو قدم سرک جائے

لب ہلائے تو ہاتھ کانپ انھیں
لب ہلائے تو دل دھڑک جائے

ضبط کرے جو ایک بھیگی بھی
سو جگر سے قبا مسک جائے

تمام حاضرین محفل نے یک یک شعر کی دل کھول کر داد دی۔ ہر شعر بار بار پڑھوایا گیا اور ہر یک نے مصرع اٹھایا۔ اور جب یہ نظم ختم ہوئی تو دوسری نظم جو دراصل ان کی تلخ واردات عشق کی منظوم تفصیل ہے سنائی۔

دو شعلوں کے درمیاں

پھر وہی شغل تو و رازی ہے
پھر وہی زندگی ہماری ہے

گنبد شیب میں بصد ارمان
گونج اٹھا ہے شباب کا طوفان

دن کو چھپے ہوئے ہے آدھی رات
شور افگن ہے جیٹھ میں برسات

کل سے جب رہا تھا جو صحرا
آ گئی ہے اسے وہاں سیب

دن کے قبضے میں آ چکا ہے وداع
گھپ اندھیرے کی جیب میں ہے چراغ

آہ بوسب ہے لیلیٰ اور کسک
کاسۂ سر میں اڑ رہی ہے خاک

ہو رہے ہیں شرح ذات و صفات
غرق حیرت ہیں فکر کے لمحات

موگ میں ہو چکی ہیں اب ٹھنڈی
چڑیاں تو حروس حکمت کی

دوشش پر تجربوں کا اثاثہ ہے
جوشش صاحب یہ کیا تماشا ہے

کس طرف ہے دماغ کی شاہی
سب کہاں ہے وہ باز آگاہی

ہو گئے ہیں خشک اور آنکھیں نم
غیرت تو ہے قبلۂ عالم

مجھ پر آنسو سا اسے یاد
سنگ دل ہو تو کنکریں مارو

ہیں یہ موقع ہے صوفیانِ کرام
جلد لوٹو ثواب غیبت کا
کج مساوی تھو پہ تقسیم
کر یہ حکمت الو و فکر پناہ
تو بیٹھا ہے رشتہ دارین
کیوں کہ اسے کم نظر عقول و علوم
کہ یہ سرکار دفترِ قمر
اسے عرفانِ علم و عقل پناہ
کہ کوں گل مرغ و سراپا ناز
ہنگ آنکھوں سے جب ساقی ہے
بیشتر سے گلان علم و نظر
بنگری جب پہاڑ نمائی ہے
کیا کھل دل مر ہے کیوں ہے بیچین
جو خدا ہیں قمر سلمی ہیں
اوک دونوں کٹاریاں دونوں
لچاتے ہیں بہکتی چال
جو آتے ہیں اور ٹیڑھی بانگ
کپکپاتی کمان پنڈوں میں
جب ہوا میں ہوا سنکتی ہے
ساس لیتی ہیں جب یہ مرمر تو
جو کھڑوں پہ جب لچاتا ہے
ہاتھوں میں غضب کی وہ ہمکان
ہنسے کوفوں کا ہر قدم پہ گھمو
کہ ہنسنی بوال ہے

شہر بھر میں کرو مجھے بدنام
ہاں یہی دلست ہے عبادت کا
سس لطا پر چلا نظر کے تیر
بلند سر بلند سفر بلند نگاہ
دو نگران فرغ کے مابین
تم کو یہ بات ہو سکے معلوم
کیا گزرتی ہے قلب شاعر پر
تم ہو اس ماہ سے کب آگاہ
دوشش پر ڈال کر ردائے بیاض
نو ستاروں کی تھرتھراتی ہے
تم کو اس بات کی سمجھ ہے خبر
نبض آفاق ڈوب جاتی ہے
دو نگران فرغ کے مابین
ہائے میں کیا کہوں کہ وہ کیا ہیں
غیر سے ہیں کہوریاں دونوں
سیپ دیکھے کمر سے نیچے ہیں
انگڑی اپسرائیں اوسٹ پٹانگ
رسالی اٹھان پنڈوں میں
فن میں کم سی جھلکتی ہے
دور جاتی ہے دور تک خوشبو
خال و خد سے عبیر ملتا ہے
جیسے حبابوں کی آب جو میں اٹھان
ڈگمگاتے بھنور میں جیسے ناؤ
آگ پر کم سی کا پالی ہے

جلدی جلدی جو بات کرتی ہیں
لعل لب سے ہوا کترتی ہیں

جھولتی ہیں جو صحن گلشن میں
کوکب اٹھتی ہیں کوئلیں تن میں

زیر دل آج مضطرب ہے
عمر گاہوں میں جھن جھنتی ہے

مسکراتی ہیں جب یہ ناز و ادا
چیخ اٹھتا ہے رنگ کھڑوں کا

ہائے کیسی پڑی ہے یہ افتاد
صید ہے ایک اور دو صیاد

پہلے تھی ایک ہی سے آنکھ لڑی
دوسری آ کے دم سے کود پڑی

جس نے آ کے اٹھائے وہ طوفان
کہ غش ہو گئے مرے دوسان

پل آئی ناز و سرمستی
دوسری پل پڑی بدمستی

میں نے اس سے کہا کہ اے اختر
تجھ کو زلفوں کے دام میں نہ پکڑ

ایک گل رخ کے نام اے نادان
کر چکا ہوں میں رہن دل کا مکان

میرے دل پر پڑا نہ تیر نگاہ
حملہ آور نہ تجھ پہ ہو اللہ

سن کے یہ بھیجا بصد افسوس
اس نے منہ پھیر کر کہا دو سو

اتنا سو کتنا دوستوں میں
ہاتھ کا وہ گھماؤ دوستوں میں

دل مرا ہو گیا تھا وہ بالا
اف کتنی کے لوچ کا بھالا

پھر چلا ہو گیا وہی ٹھٹھا
آج سے تیس سال پہلے کا

ہائے دل کا نہ کیوں ہو کام تمام
ایک میں حلم ایک میں چنچل

ایک میں شاعری کا سوز و گداز
ایک میں رنگیلی کا عشوہ و ناز

اس کے کھڑے پہ ہے جمال شعور
اس کے چہرے پہ شوخیوں کا وفور

ایک شیدا ہے شعر و حکمت پر
ایک جھاں ہے شرارت پر

اس طرف داستاں میں دبی بولی کہو
انگلیوں کی ادھر چٹکی پہ

صبح صادق کا ایک میں ہے رنگ
صبح کلاب کی دوسری میں امنگ

رہن تبرک ابھی ہیں اس کے بان
اور یہ کرتا رہی ہے سر پہ کمان

اس طرف کھل رہے ہیں نام خدا
اس طرف کھل رہے ہیں بند قبا

اس طرف شرم کی بجتی شہنائی
اس کو دیکھو تو یہ بگڑتی ہے
ایک کہتی ہے جی جلاتے ہو
ایک کہتی ہے ظلم کرتے ہو
ایک کہتی ہے رند مست ہو تم
رسم راہ وفا کے تارک ہو
تو تو دونوں کے درمیاں اصلا
دونوں الزام کچھ پہ دھرتی ہیں
تولتی ہیں نظر سے باہوں کو
اس کشاکش میں ایک کو بھی آہ
دم بدم ٹوٹتی ہیں جڑتی ہیں
اس پہ محبت ہے ایک پل جو نظر
یوں نگاہوں میں ہے مردد و مجبور
ہیں بدھر جاتی یا اُدھر جاتی
جان مضطر ہے دل مشوش ہے
ہر نفس قہر آسمانی ہے
اپنی پہلی کا دل نہ چھوڑوں گا
اس کو رکھوں گا قلب سوزاں میں
دوسری پر جہان واروں گا

ایک طرف جس جلی چٹاخ پٹاخ
اس کو دیکھو تو وہ تھرکتی ہے
اس کو سینے سے کیوں لگاتے ہو
کیوں جی اب دوسری پہ مرتے ہو
ایک کہتی ہے بت پرست ہو تم
تم موحد نہیں ہو مشرک ہو
کھل کے ہوتا نہیں کبھی جھگڑا
آنکھوں آنکھوں میں طے کرتی ہیں
جھکتی ہیں مری نگاہیں کو
دیکھ سکتا نہیں جھکے دیکھ
وابستہ باتیں نظریں ملتی ہیں
آنکھ سے ملتی ہے وہ نظر
جیسے بادلوں سے ہو اس طرح
یا دھرے ہے پہ گھٹ کے مر جاتی
کر دیا ہے بڑی کشاکش ہے
کچھ بھی ہو دل میں اسے یہ گماں ہے
دوسری کا بھی دل نہ توڑوں گا
اور اسے جملہ رگ جان میں
اور پہلی پہ جان واروں گا

اس واردات قلبی کے ہر شعر بلکہ مصرع پر لوگوں نے حیرت زدہ ہو کر داد دی کیونکہ اس شکل میں انھوں نے پہلی مرتبہ کھل کر اعتراف حقیقت کیا ہے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے ایک اور نظم سنائی۔

جیسے پہ چل رہی ہیں دھندلکے میں گوریاں
یوں کھا رہی ہیں نیند میں انگڑائیاں

بھیگی ہوئی ہیں دھوم سے دھرتی میں بیلیاں
اور ہو رہی ہیں دھوم سے دھرتی میں بیلیاں

بند قبا سے ہیں ہے ترنگوں کی چھیڑ چھاڑ
گویا گلی سے باد سحر کی شمیمیں

کھڑکی کی گرد و پیش میں چنگاریوں کے جھنڈ
زلفوں کی چھاؤں میں ہیں گھٹاؤں کی بوئیں

ہیں ایک آنکھ بیچ کے کام کتر نہ کہہ
تیروں سے بھر گئی ہیں نگاہوں کی جھولیاں

مرد حجاب سے ہیں ترنگیں دبی ہوئیں
جس طرح شال ہاتھ میں پالوں کی دھجیاں

گالوں پہ ہے وہ رنگ کی چھلکا وقت صبح
جس طرح گالوں بن میں پرستاں کی لالیاں

پھر جوش صاحب نے فرمایا کہ آنگن میں بیٹھی چاند دیکھ رہی تھی

یوں جا رہی ہیں مست نگاہیں سوئے قمر
پریوں کی جیسے دوش ہوا پر ٹھٹولیاں

نکہت سے یوں تن میں ہیں لہریں پڑی ہوئیں
انگڑائیوں میں جیسے مسکتی ہیں چالیاں

جوش صاحب نے نظم ختم کی تو میں نے کہا۔ جوش صاحب آپ کی ان تمام واردات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشقی کا کوئی موسم نہیں ہوتا اور انسان خواہ عقل و شعور کی کتنی بلندی پر کیوں نہ پہنچ جائے اور عمر کی خواہ کسی منزل میں کیوں نہ ہو وہ جنسی جذبات کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بقول غالب

خار و خس و خاشاک سے گھبرائے گے کیوں
ہیں گرمئ رفتار وقار رواں سے گھبرائیں گے کیا

جوش صاحب۔ مگر یہ بری بات بہت بری بات ہے۔

میں۔ جی نہیں۔ یہ بری بات نہیں ہے۔ دراصل فطرت کے ملتے کا بھید ہے آپ ان کو بد نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو آپ ان جذبات کو بد کہہ رہے ہیں تو ماحول کی قدروں کا خیال فرما رہے ہیں۔ جب آپ ان کیفیات کو شعر میں بیان فرماتے ہیں تو بلا جھجک تمام جزیات تک بیان کر جاتے ہیں اور فن شاعری کے سہارے عشق و محبت کے جذبات کو رنگ کی اعلیٰ ترین تصور کے طور پر پیش کر کے ان ہی باتوں کو قابل فخر بنا دیتے ہیں۔ تو سچی بات یہ ہے فطرت کے تقاضوں میں وہ حقیقت کوئی برائی نہیں ہے۔

جوش صاحب۔ جی ہاں مگر عقل منہ پر تھوکتی ہے۔

جی۔ یہاں دراصل عقل احوال سے ڈر جاتی ہے۔ وہ مروجہ معاشرتی قدروں سے گریزاں ہو جاتی ہے۔ جسے آپ عقل کا منہ پر تھوکنا فرما رہے ہیں۔

جوش صاحب۔ مگر صاحب، جو کچھ بھی ہو عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی۔

راقم صاحب۔ جوش صاحب کیا آپ "یادوں کی برات" کے نئے اڈیشن میں ان واقعات کا اضافہ فرمائیں گے۔

جوش صاحب۔ جی ہاں ضرور۔

جی۔ یہ تو اضافہ ہوگا بلکہ اس کو نہیں (الف) اور نہیں (ب) کہنا چاہیے کیونکہ ان دونوں واقعات کو ایک بریکٹ میں لکھنا چاہیے۔

جوش صاحب۔ جی ہاں، جی ہاں۔ مگر صاحب یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ ضمیر لعنت کرتا ہے مگر دل اس کی پروا نہیں کرتا۔ اس کشمکش کو میں نے ایک مکالمے کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس میں میں نے اپنی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک شبیر حسن خاں آفریدی ہیں جو ضمیر کی آواز ہیں کہ معاشرتی اخلاقی اقدار کی وکالت کرتے ہیں اور منطقی استدلال کے ذریعے نے دانائی اور علم کے علمبردار ہیں۔ دوسرے جوش ملیح آبادی ہیں جو حسن پرست شاعر ہیں دل کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اب آپ یہ مکالمہ سنیے۔ اس میں میں نے بہت کچھ سے بچنا کام کیا ہے۔

مکالمہ

مابین شبیر حسن خاں آفریدی اور جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خاں صاحب فرماتے ہیں۔ "ہائیں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ ارے یہ کس گلی میں دیکھنے لگے اور دھڑکتے دل کے ساتھ ٹہل رہا ہے۔ او باغی اور بھگوڑے جوش، ارے مبارک پر اور سل کے یہ ساز اور چشم بد دور یہ طلعت رنگین۔ اللہ اللہ یہ غروب کا ہنگام اور نام خدا یہ کوچہ طرح میں خرام۔ یہ خارستان ضمحلال اور گلگشت کوچہ گل عذار۔ تجھ کو گیسوؤں کے پیچ و خم سے نکلا اور حلقہ ہائے کائنات کے سلجھانے کی ہوا پر ڈالا۔ تجھ کو افلاک کے، حواس پھیر لیے دل

چکا چوند کے میدان سے بچایا اور ثوابت و سیار کے آنکھیں کھول دینے والے دائرے میں لایا
تیرے ہنسوں فروش دل کو بجھایا اور تیرے حلق میں آفتاب داغ جگایا۔ تجھ کو مجنوں کے
گلی ونما کھیلنے کے میدان سے ہٹا کر سقراط کی دانش گاہ میں داخلہ دلایا اور چاروں میں سفینے کی
طرف بڑھانے والی کالی رسموں کی خواب آور چھاؤں سے اٹھا کر تجھ کو علم و نظر کے دبی میلے
میں بٹھایا لیکن اے رامش و رنگ کے رسیا کھلنڈرے جوش تو پھر بھی راہ راست پر آتا نظر
آیا۔ پھر اٹھا کر کیا ہے محنتی کے ساتھ اور ایک اعزاز صرف ایک سوچ تم کی پاکیزگی کے
اعزاز پچھاڑی جا کر جادہ حکمت سے پل بھر میں بھاگ کھڑا ہوا اور بالکل اس بوڑھے کی طرح
جو استاد کا تھپڑ کھا کر مکتب سے اس بری رفتاری سے دیدار کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے کہ اس کی
ایڑیاں اس کی کمر پر بجنے لگتی ہیں۔ حیف صد حیف کہ تیری ماسوں اور گوداں پر جان چھڑکنے
والی شاعری نے تجھ کو تجھ سے چھین لیا۔ اللہ یہ کم بخت شاعری۔ یہ بلبلے سی شاعری یہ
بلبلیں چھلتی، دھنانی کودتی، دوانی، پھاندتی، پھاندتی، شگفتگی بھرتی ہوا میں کی طرح اڑتی،
تتلوں کی طرح گھومتی اور گیندوں کی مانند لڑھکتی شاعری یہ چھیل چھبیلی شسال چھچھور چھنچھی،
چھلاوا، چھال چھکا اور دوانی چھوکری شاعری جو ہر صبح کو سی سی وادیوں میں جھومتی ہر رات
کو سے چاندوں کو چومتی۔ ہر آن سے سے کلیوں کے بوسوں کو لبوں کے بیچ میں توڑتی۔ سے
سے ساحلوں پر منڈلاتی چھواتی سی سی پاپیلوں کو جھٹکاتی سی سی گلیوں میں دھومتی ساتی ہے
جب اس چلتے پھرتے کو چلنے بیٹھنے کا اشارہ دیا جاتا ہے تو آسمان کی طرف اشارہ کر کے
گانے لگتی ہے

ہے یہ مقام نہ گزرو یہ ہے رنگ نہ بھولے یہ بھولے ہوا از رنگ یہ رنگ

ہنسوں اس متواتر دھمال اور مسلسل دھما چوکڑی سے کبھی نہ تھکنے والی اور ہر لمحہ عمر کے
بعد تازہ دم ہونے والی چھوکری کے مزاج کی افتاد ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو اس کو
رنگینیوں کی غذا سے محروم کر دیا جائے تو وہ جان تھوک کر مر جائے۔ اور اس مذاق کو اگر ایک
آن کے لیے بھی رنگ بھنگ کے ہم بھول رنگینیوں کے رنگوں، چڑیوں کی چوں چوں،
مارنگیوں کی مدھ روں، شراب کے پیالوں، اعزازوں کے گالوں، پھولوں کی کلیوں، رنگ
رلیوں، تانوں کے بکھیروں، طبلے کی گھمکیوں، گوریوں کی ہولیوں، گوریوں کی ٹولیوں، بازاروں میں

جیسے کتوں، بلیوں کی مکھیوں کے کھٹکے، دھوں اور مکھیوں، مچھر، چمگادڑیں، چمچم چمچمائیں، نقشیں، قلقلیں، قلقلیں، بیکلیں اور باسیں بوسیں، کھا کے گھٹیں پیٹ کی رتیں، ناکھیں و شکلیں اور میلیں تھیلیں سے دور کر دیا جائے تو یہ چھوکری دریا سے نکل ہوئی مچھلی کی مانند ساحل حیات پر تڑپ کر دم توڑ دے گی۔ کاش اسے ہوش تو نہیں ہوتا۔ مسخرہ ہوتا مجذوب ہوتا، مرثی ہوتا، مستری ہوتا، مداری ہوتا، مالشیا ہوتا، مالی ہوتا، موچی ہوتا، مہتر ہوتا، مولوی یا ملنگ ہوتا جو کچھ بھی ہوتا لیکن شاعر نہ ہوتا

جوش اللہ اللہ آپ کے سے حلیم کی زبان اور جیسے تکلف الفاظ کا طوفان۔ آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں جو کچھ بھی میں کہتے کہ لیجیے پھر بھی خطا معاف اتنی دقیقہ سنجی کے باوجود آپ اس بات کو پا نہیں سکے کہ اس سر پا ہنر کی بیانِ مدار صرف قسم کی پکار پر یک بیرے سے شاعر نہ مزاج رکھنے والے کا تاب حکمت سے فرار مطلق ارادی نہیں لفظاً اضطراری عمل تھا اور کسی اضطراری عمل پر احتساب و سزا جائز نہیں۔ بندہ پرور مجھ سے کہیں زیادہ آپ اس بات ناقابل حقیقت کبریٰ سے واقف ہیں کہ یہ پورا نظام ارض و سماوات اور یہ تمام ناقابل شمار اشیاء کائنات بے سابقہ سختی اور استثنیٰ دشمن بے مروتی کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں۔ علت و معلول کی ناشکستنی زنجیر میں ہو کسی فرد کو خواہ وہ کتنا ہی بے پناہ شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو یا سب سے بڑا مجرم یا زمان ہی کیوں نہ ہو یہ مجال نہیں کہ علت و معلول کی اس زنجیر کو توڑ یا اس کو توڑنے کا تصور بھی کر سکے۔ اس بے دردانہ حلقہ جبریت میں اس طفلانہ معروضے کی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی کہ انسان چونکہ مادہ قدرت کا سب سے چھوٹا اور اس بنا پر سب سے ناتواں پرزہ ہے اس لیے قدرت سے مادہ نہ شفقت کے جوش میں آ کر اپنے اس دھاتے کو نظام شمسی کے حلقہ جبر سے نکال کر میدان قدرت میں گلگشت فرمانے کی اجازت دے دی اور اس سوئیلی دنیا میں اسے میرے منگے بیٹے جو جی چاہے سو کر کی اجازت دے دی ہے۔ آپ خود اس بات کو جانتے اور مانتے ہیں کہ ہر فرد کے دماغ کی انفرادی ساخت اس کے حالات کی تنگی و فراخی میں بھرے ہوئے مسائل کی کمیت و کیفیت، عناصر ترکیبی کی مقدار و عدد یعنی عقل و تحمل کا عدم توازن، فرد کا ذاتی میلان، قوام کی پختگی و خامی، فطری مرغوبات و کراہات کی کشمکش اور نسلی، عائلی، ملکی، موسمی جغرافیہ کے پیدا کردہ مزاج کی نوعیت ہی

انسان پر حکومت کرتی ہے۔ جو عربی چاہتی ہے اس کو لے جاتی ہے۔ جھوٹ پی سرکار دولت کے خوشامد خورے یہ دعوی کرتے چلے جاتے ہیں کہ ہم جو چاہیں سو کر سکتے ہیں۔ کاش ان بھولوں کو یہ معلوم ہوتا کہ چاہنا ہی سرے سے ہمارے اختیار میں نہیں۔ ہمارے غضب ہمارا ترس کھانے کے بدلے آپ اس نامراد کو ذلت پہنچا دیتے ہیں۔ جس بدبخت کے سر پر قہر آدم کل گر چکی ہو جس کی عقل کے بخیے ادھیڑ ڈالے گئے ہیں، جس کے حواس کو مختل کر دیا گیا ہے، جس کی عقل اس کی بصری سے دخ کر ڈالی گئی ہے جو تمام یونان کے سیاحوں کی فہرست سے خارج کر کے بھد کے بیدردیوں کے رجسٹر میں درج کر دیا گیا ہے اور جس کو اس دوشیزہ کی خرنگیج شاعری نے جس کی ذات خود موضوع شعر ہے مرکز حواس سے اس طرح گر دیا ہے کہ اور تو اور اب وہ خود اپنے سے بھی آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ گھروں کے گزند رسیدہ مظلوم پر سب و شتم فرمانا آپ جیسے دانا کے شایان شان ہیں

شیر حسن خاں ہمارے اس قدر مظلوم۔ دکھا اپنے کو۔ یہ عذاب جو تجھ پر نازل ہے تو نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر لادا ہے۔ اس آگ کو جو تیرے خاطر کیے ہوئے ہے تو نے ہزاروں جتن کر کے خود سلگایا ہے۔ تجھ کو پتا چل چکا ہے نے ہوش کہ جب کبھی یہ تقاضا نے بشریت تجھ پر حقیقت درماندگی یا خواب گراں کی کیفیت طاری ہوئی ہے تو نے معاشقے سے ہی سر کر لانے اٹھایا ہے اور اس نادان کے دل کو موم کرنے کی نیت سے اس کو مجسم مجسم کر اپنا کلام سنایا تو نے اس کی نوصورت کھوری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سوز و گداز سے دیکھا ہے جو سنگ و آہن تک سے لو نکال دے سکتی ہے۔ تو نے اس نادان کو اپنے سینے سے لگایا اور بھینچ بھینچ کر سینکڑوں بار دبایا اور یہاں تک کہ تو نے اپنے دھڑکتے دل کے ضربات اس کی رگ رگ میں دوڑا دیے ہیں۔ تو نے اپنی شدید چسپیدگی سے اس کو موم سدا سے پہلے ہی پگھلا دیا ہے اور اس عمل کے تواتر سے تو نے اپنی دانائی اور اس کی نادانی دونوں پر ظلم ڈھایا ہے اور اس دوہرے ظلم کے باوجود یہ کو مظلوم کہہ رہا ہے۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

جوش غصے سر پیٹ کر سر جانے کی بات ہے۔ آپ کا یہ خیر تکیہ ارشاد کہ میں دیدہ و دانستہ اس ہلاکت بے پناہ میں گرفتار ہوا اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اپنی طینت و سرشت

پر حاوی ہو کر اپنے ارادے سے اقدامات کیے ہیں حالانکہ انسانی افکار و کردار و گفتار تمام کے تمام طینت و سرشت کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں اور ہمارا ارادہ ایک اضطرار سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہم اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے خالق نہیں ہیں۔ ہماری تمام خواہشوں اور تمام آرزوؤں اور تمام تمناؤں اور تمام ترنگوں، اور تمام ولولوں کا سرچشمہ ہمارے وجود کی گہرائیوں میں ہے۔ ہماری طینت کے گوشے فرمان سے اور ہمارے دلوں سے خود بہ خود پھوٹتا ہے اور جس وقت کسی ولولے کا چشمہ پھوٹتا ہے بارگاہ عقل میں گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اس وقت عقل اپنے حجرے سے باہر آ کر ہماری خواہش کے خط و خال کو پرکھتی ہے۔ اگر عقل کے نزدیک وہ خواہش جائز ہوتی ہے تو وہ اس کو پروانہ راہداری دے دیتی ہے اور اگر اس کے نزدیک وہ خواہش ناجائز ہوتی ہے تو وہ اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے۔ جس آدمی کے جسم میں اگر عقل قوی تر ہوتی ہے تو وہ خواہش کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کو بے بس کر دیتی ہے اور اگر خواہش عقل سے زیادہ طاقتور ثابت ہوتی ہے تو وہ عقل کو دھکا دے کر اس کو اس کے حجرے میں بند کر دیتی ہے اور ارادے کو جو چپراسی کی وردی پہنے برآمدے کے اسٹول پر بیٹھا ہوتا ہے آواز دے کر بلاتی ہے اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر عمل کے دائرے میں لے آتی ہے۔

مجھے تمام صورت حال سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم سو فی صد مقہور ہیں اور ایک فی صد بھی قادر نہیں۔ آپ اس جبریت کے قانون سے واقف ہوتے ہوئے بھی مجھ سے فرما رہے ہیں کہ میں اپنی اس آشفتگی کا خود ذمہ دار ہوں۔ یہ تو ایسی بات ہے گویا جولیس سیزر کا جگری دوست بروٹس اس پر تلوار سے حملہ کر رہا ہے اور سیزر حیرت سے اچھل کر کہہ رہا ہے Ono Brutus ۔ خان صاحب! کسی بڑے سے بڑے دیوتا کی بھی یہ مجال نہیں کہ حسن اپنے طلعت ناز کو بدل کر اور لباس نیاز پہن کر اس کے سامنے آئے اور سرمگیں آنکھوں سے آنسو بہائے اور وہ پگھل کر نہ رہ جائے۔ خان صاحب! انصاف سے کام لیجیے اور حد لگنی چاہیے۔ جب وہ شیریں لہجے اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے سوگوار ہو کر آئی تو کیا میں اس فتنۂ آخر الزماں کی طرف سے منہ پھیر کر جھپٹ پڑتا وضو کے بہانے کی طرف۔ کیا میں بیٹھ جاتا مصلے پر نمازیں پڑھنے۔ بھن لیتا چادر احرام اور کرنے لگتا کعبہ کا طواف اور دبک کر بیٹھ

جانا کسی منطق کے دائرے کی مقدس چھاؤں میں۔

شیر حسن خاں۔ تو میرے بیٹھے ہوئے اسطوے مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔

کس بیا موخت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

میں ان بتقیدوں سے دکھی ہونے والا نہیں۔

جوش صاحب۔ خان صاحب سادہ خفہ آ چکا ہے آپ کو اور اس بنا پر آپ منطق سے ملو پھیر چکے ہیں۔

شیر حسن خاں۔ بس چھا چھا کر باتیں۔ کر نہیں کرنے گا میرے سامنے نہیں ترک کرے گا دلیلوں کی چھاؤں کو اور نہیں باز آئے گا تو حسن ہے۔

جوش۔ منع مکن رہ منطق کہ اے منطق داں معذور دار مست کہ تو ہوش نہ دیدہ ای

آپ جس چیز کو میر حسن فرما رہے ہیں وہ اس کے بعد جمال نہیں۔

یا حسنش ایں جہاں کہ تو بینی تمثل است

یا ہمچنانکہ ایں نا شکیب

شیر حسن خاں۔ بچا کچھ گیا اس لونڈیا کا دہر تجھ پر پوری طرح چڑھ چکا ہے تجھ پر۔ تجھ حکمت کے نمک حرام پر۔ تو پھر اے خیرہ سر جوش۔ دیکھ میرے ہاتھ کے گرد گراں کو۔ ہوشیار، خبردار۔

جوش۔ بچ گیا بنھوں کی رگ پھڑک چکی ہے منہ سے کف نکل رہا ہے اس پیشانی پر شکنیں پڑ چکی ہیں جس سے حکمت کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں۔ سچ کہا ہے کسی دانائے روزگار نے کہ پٹھان حکیم و پیغمبر ہی کیوں نہ ہو جائے اندر سے رہتا ہے پٹھان ہی۔

طینت گرگ را رہ گرگ شود گرچہ با آدمی بزرگ شود

اور اس کے خوابوں اس طرف گر چلے کی آواز اور اس طرف سر سے دھل دھل خون بہنے آغاز۔ خدا کا شکر ہے یہیں خاتمہ بالخیر ہوتا تھا۔

بروز پیر ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء بوقت شب

گھر زہاؤس۔ کراچی

میر رسول بخش تالپور کا استعفیٰ

اور اسی کے ساتھ ہی یہ دلچسپ محفل بھی اختتام کو پہنچی اور نہ صرف یہ محفل بلکہ اختتام کو پہنچی بلکہ اسی کے دوسرے ہی دن یعنی تیرہویں فروری ۱۹۶۸ء کو میر رسول بخش صاحب تالپور کی گھر واپسی کا بھی خاتمہ بالخیر ہو گیا اور وہ اپنے گھر اور جوش صاحب لیکسی میں اپنے گھر واقع لیڈس لین پر آ گئے۔

شام کو جب میں جوشش صاحب سے ملنے گھر پر بازوں جانے کی تیاری کر رہا تھا تو ان کا ٹیلی فون آیا کہ وہ اپنے گھر منتقل ہو گئے ہیں اور شام کو میں ان کے گھر پر ہی ان سے ملوں۔ جوش صاحب نے راجب صاحب اور دوسرے احباب کو بھی ٹیلی فون پر یہ منتقل کی اطلاع دے دی تھی چنانچہ ہم سب احباب ان کے گھر پر جمع ہو گئے۔ پھر جوشش صاحب نے میر صاحب کے استعفے کی تفصیل بتائی۔ میر صاحب کو شکایت تھی کہ بھٹو صاحب کا رویہ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ بہت آمیز ہو گیا تھا اور ان جیسے خوددار آدمی کا بھٹو صاحب کا ساتھ دینا بہت دشوار تھا۔ اس کے علاوہ ممتاز بھٹو صاحب جو سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے میر صاحب کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے تھے اس لیے میر صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ جوشش صاحب چونکہ بھٹو کی فہم و فراست کے قائل تھے، اس لیے محفل نے میر صاحب کے استعفے پر زیادہ گفتگو نہیں کی اور بات چیت کا رخ ادب اور شاعری کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس کے بعد شام کی محفلیں جوشش صاحب ہی کے گھر پر منعقد ہوتی رہیں یہاں تک کہ تیسویں فروری کی صبح جوشش صاحب تیز گام سے لاہور روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد جوش صاحب دوسری اپریل پیر کے دن کراچی واپس تشریف لائے اور زیادہ تر میرے گھر قیام کیا۔ پہلے دن تو وہ اپنے ہی گھر ٹھہرے مگر جب میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے بتایا کہ ان کا ٹیلی فون خراب پڑا ہے اور چونکہ ان کی کوٹھی، سلام آباد بھیج دی گئی ہے اس لیے اب ان کو سوئی کی بھی دقت ہو رہی ہے۔ تو میں نے کہا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے گھر چلیے وہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ اس طرح دوسرے دن سے جوش صاحب میرے گھر منتقل ہو گئے۔ میں نے جوشش صاحب کو بتایا کہ نفسیات کے مضمون کا مطالعہ کرنے کے لیے میں نے جامعہ کراچی کے شعبہ نفسیات میں ایم اے کی کلاس میں داخلہ لے لیا

ہے۔ جوش صاحب سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ حصول علم میں جو بھی وقت گزرے وہ عین عبادت ہے اور پھر یہ ایک رباعی سنائی۔

یہ عالم انسان کی سب طرح کی ہے — کب وقت گزارنے کی بیماری ہے
انسوس کہ ہے معرفت راز حیات — جینا کتنی شدید ہے کاری ہے

اس مرتبہ جوش صاحب تین دن میرے گھر رہے۔ ہر روز صبح سویرے بیدار ہو جاتے اور دور تک ٹہلنے چلے جاتے۔ اس دوران میں ہمارا موضوع گفتگو علم نفسیات ہوتا۔ میں نے جوش صاحب کو بتایا کہ ایک دن مجھے خیال آیا کہ انسانی نفسیات کا مطالعہ کروں۔ چنانچہ میں نے نفسیات کی چند کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ شروع کر دیا مگر جلد ہی یہ محسوس کیا کہ جب تک اس علم کی اصطلاحات سے کچھ طرح واقفیت نہ ہو یہ مضمون سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ چنانچہ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔ ساتھ ہی میں نے جوش صاحب کے یہ گوش گزار کر دیا کہ میری جماعت میں چالیس لڑکے اور لڑکیاں اور مجموعی صرف چار لڑکے ہیں۔ جوش صاحب کو اس بات سے خوشی ہوئی کہ لڑکیوں میں طلب علم کا جذبہ اور خواہش لڑکوں سے بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس ملک کی دیویاں تعلیم یافتہ ہو جائیں اس ملک کا مستقبل یقیناً محفوظ ہو جاتا ہے۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ آج کل شعبہ نفسیات کی صدر ایک سابقہ قابل طالبہ ڈاکٹر فرخ رضا احمد ہیں۔ ان کے علاوہ تمام اساتذہ سابقہ طالب اور اپنے اپنے مضامین میں ماہر ہیں۔ اساتذہ چونکہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اس لیے وہ سب دوستوں کی طرح میرا خیال کرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں کچھ لڑکے میرے بہت قریبی دوست بن گئے تھے۔ طالب علم ساتھیوں میں سید ساجد علی ساجد میرے ہم جماعت تھے۔ محبت، شرافت، ہمدردی اور خلوص کو انسان دیکھنا ہو تو ساجد صاحب کو دیکھ لیجیے۔ ساجد خود بھی اچھے شاعر ہیں۔ نوجوان، خوبصورت اور صحت مند ہیں اور ہر شخص کی مدد کے لیے حق الامکان تیار رہتے ہیں اس لیے کلاس کے ہیرو ہیں۔ ان کے علاوہ جاوید ایف ایم خان اور سعید خان گو ایم اے فائنل کے طالب علم ہیں مگر وہ بھی میرے دوستوں میں شریک ہیں۔ یونیورسٹی کے میرے حلقۂ احباب میں کچھ پروفیسروں کے بھی نام ہیں مگر میں نے ان کا ذکر جوش صاحب سے نہیں کیا۔ البتہ جاوید، سعید اور ساجد کو جوش صاحب سے ملوایا۔ جوش صاحب نے جاوید خان

کلام سن کر ان کے کلام اور گلے دونوں کی داد دی۔ جاوید ترنم سے پڑھتے ہیں اور جب کلام سناتے ہیں تو معنی آتشیں نوا بن جاتے ہیں۔

غالب لائبریری:

اس مرتبہ جوش صاحب کو مرزا ظفر الحسن صاحب نے غالب لائبریری میں مدعو کیا اور تیئس اپریل بروز جمعہ ان کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا۔ میں، جاوید، سعید، ساجد اور رقیب صاحب جوش صاحب کے ساتھ ٹھیک پانچ بجے غالب لائبریری پہنچے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ مرزا ظفر الحسن نے جوش صاحب کا استقبال کیا۔ ان کے ہمراہ اور یادگار غالب کے نائب صدر جناب محمد انصاری، مسلم ضیائی صاحب، محسن صاحب، بھاپن، ثابت علی صاحب شاعر اور بہت سے شعرا اور ادیب موجود تھے۔ سب نے جوش صاحب کو خوش آمدید کہا۔ مرزا صاحب نے جوش صاحب کو کرسی صدارت پر بٹھا کر جلسے کی کارروائی کا آغاز فرمایا۔

انھوں نے ان مشکلات کا ذکر کیا جو اس لائبریری کے قیام کے سلسلے میں انھیں پیش آئیں۔ پھر اس کی وجہ تسمیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب نہ صرف اپنے دور کا بلکہ آنے والے ادوار میں بھی فکر کا منارہ نور ہے۔ جن سے آنے والی تمام نسلیں رہنمائی حاصل کرتی رہیں گی۔ انھوں نے کہا کہ اس لائبریری کے قیام کا مقصد اس نسل کو غالب کی فکر سے متعارف کرانا ہے۔ اسی لیے انھوں نے یہ لائبریری غالب کے نام سے موسوم کی ہے اور ان کی یہ کوشش ہے کہ غالب پر شائع ہونے والی کوئی کتاب ایسی نہ رہے جو اس لائبریری میں موجود نہ ہو۔

ان کے بعد جوش صاحب نے غالب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب حیات انسانی کا بہت بڑا نباض تھا۔ وہ بہت بڑا مفکر اور فلسفی تھا۔ اس کو اہل بیت سے سخت محبت تھی اور اسی محبت کی بنا پر وہ خدا پر بھی اعتراض کر گزرتا ہے۔ وہ خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تم ہماری شکلیوں سے مسرت حاصل کرتے ہو اور یہ کہ ہم تمہارے وجود کو تسلیم کرتا ہے یعنی یہ کہ تم Social ہو۔ لوگوں نے پوچھا۔ جوش صاحب آپ کو غالب کا کون سا شعر پسند ہے؟

جوش صاحب نے کہا۔ یوں تو اس کے سب سے اشعار پسند ہیں مگر ایک شعر ان کے خیالات کا ترجمان ہے۔

زندگی پی جو اس طور سے گزری ساقی ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ایک صاحب نے پوچھا۔ جوش صاحب آزاد شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

جوش صاحب نے کہا ہر صنف سخن اچھی ہے اس میں اظہار خیال کے لیے سب وسعت ہے مگر ابھی تک اس کو کوئی ایسا شاعر نہیں ملا جو اس صنف میں اظہار کا حق ادا کر سکے۔

اس کے بعد جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی پہلے تو انھوں نے کچھ رباعیاں سنائیں۔ پھر "عظمت انسانی" پر اپنے مسدس کے چند بند سنائے۔ اس کے بعد ایک نظم "دو فنکار بن شوخ کے ہاتھ" سنائی۔ یہ جوش صاحب کی تجدد وارادت عشق کی تفصیل ہے۔

نظم ختم ہوئی تو محسن صاحب بھوپالی ایک پرچہ لے۔ پہلے تو انھوں نے جوش صاحب کا لائبریری تشریف لانے پر شکریہ ادا کیا اس کے بعد ان سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے بندوں سازے میں بہت سی قول نظمیں کہی ہیں۔ نگریزوں کے خلاف بھی کہا ہے۔ ہندوستان میں جو بھی اہم واقعہ ہوتا تھا وہ آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرواتا تھا مگر گزشتہ پچیس ۲۵ برس سے اور خاص طور پر آج کل کچھ دنوں سے پاکستان میں ایسے ایسے انقلابات آئے مگر آپ نے ان پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا اس کی کیا وجہ ہے؟

جوش صاحب نے کہا۔ اب میری توجہ زیادہ تر آفاقی مسائل کی طرف ہے اور فکر کے ایسے موضوعات جو بین الانسانی اور زیادہ گہری فکر کے متقاضی ہیں میری توجہ کا مرکز ہیں

محسن بھوپالی نے کہا یہ جو نظم آپ نے ابھی سنائی ہے جس میں دو فنکاروں کے ساتھ آپ کے عشق کی تفصیل ہے یہ کون سا آفاقی مضمون ہے۔

جوش صاحب نے کہا "محبت آفاقی موضوع ہے"

راجہ صاحب نے پوچھا۔ جوش صاحب اسماعیل میرٹھی کے بعد کسی نے بچوں کے لیے کچھ ادب پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ آپ جیسے بڑے آدمیوں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

جوشش صاحب مسکرا کر کہنے لگے، آپ کا مطلب ہے ہم بچوں کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوئے۔ اس پر سب لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ ایک صاحب نے جوش صاحب کی کتاب "یادوں کی برات" کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجازت چاہی اور جوش صاحب نے خوشی سے اجازت دے دی۔ اس کے بعد مرزا ظفر الحسن صاحب نے جوشش صاحب کو لائبریری کا معائنہ کروایا اور ان کی تمام کتابوں پر ان کے دستخط لیے۔ پھر انھوں نے سب کا شکریہ ادا کیا اور یہ محفل برخاست ہو گئی۔

میں اور جوشش صاحب وہاں سے رخصت ہو کر بیالیس آباد کی چورنگی گئے اور وہاں ایک کباب کی دوکان سے کباب خرید کر اپنے گھر آ گئے۔ راستے میں جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ ساتویں تاریخ کو بھی دوسرے ہی دن لاہور واپس جا رہے ہیں تو ایک رات اپنے گھر قیام کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کو ان کے گھر پہنچا دیا اور چونکہ میرے گھر کچھ مہمان آئے ہوئے تھے اس لیے جوشش صاحب سے اجازت لے کر اپنے گھر آ گیا۔

دوسرے دن میں اور راجب صاحب صبح ہی جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے اور ان کو لے کر کینٹ اسٹیشن گئے جہاں سے وہ بذریعہ کراچی ایکسپریس لاہور روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد کئی مہینے تک جوش صاحب سے نہ کوئی خط و کتابت ہو سکی اور نہ اس کا کوئی امکان ہوا۔ میں کچھ تو اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ کچھ اپنے بڑے بیٹے مسعود علی خاں کی شادی اور کچھ چھوٹے بیٹے پرویز علی خاں کی ایرفورس میں پاسنگ آؤٹ پریڈ کے سلسلے میں رسالپور اور پشاور میں رہا۔

کراچی یونیورسٹی کا مشاعرہ

اس دوران میں پانچویں جولائی ۱۹۷۲ء کو جامعہ میں ہفتہ طلبہ منایا گیا اور ایک مشاعرے کے سلسلے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں طلبہ اور طالبات نے حصہ لیا۔ مولانا ماہر القادری صدر تھے اور جناب راجب مراد آبادی جج کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میں اس جلسے میں شریک تھا۔ اس وقت میرا لباس شلوار قمیص، قراقلی ٹوپی اور پشاوری چپل پر مشتمل تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ طلبہ اور طالبات مجھے سخت مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ابھی

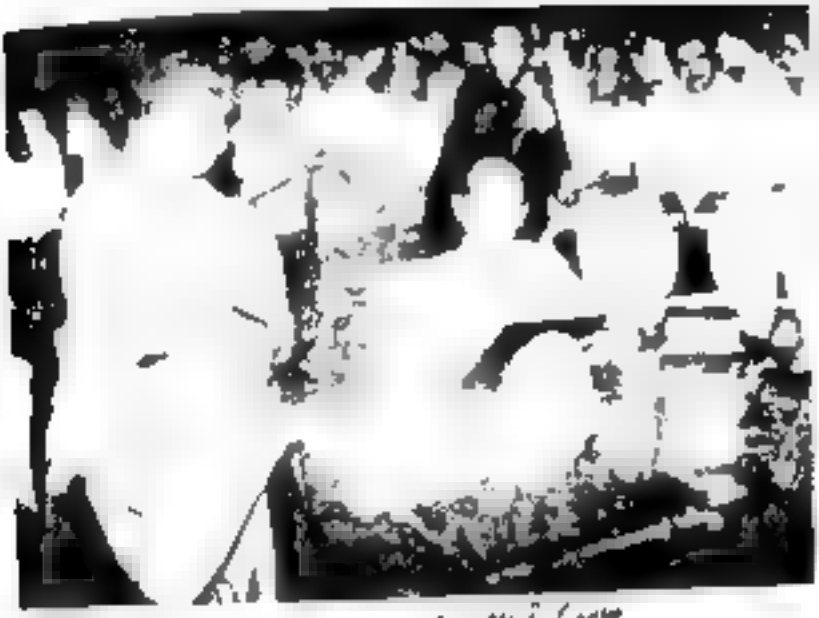

جامعہ کرتی نام عمرہ
خورشید علی خاں اور راجہ حیدرآبادی

اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ طلبہ کی انجمن کے نائب صدر میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ جناب! آپ کا تعلق سی آئی اے سے تو نہیں ہے۔ میں سخت ہنسا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو کیسے اس بات کا شک ہوا۔ کہنے لگے آپ کا لباس بالکل سی آئی اے والوں کا سا ہے اور آپ شکل سے بھی سی آئی اے کے ایجنٹ معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا آپ میرے ساتھ آئیے۔ میں انھیں لے کر راغب صاحب اور باہر صاحب کے پاس گیا اور ان کو سارا واقعہ سنایا تو وہ بھی ہنسنے لگے۔ راغب صاحب نے فی البدیہہ ایک قطعہ ان صاحب کو سنایا۔

یہ منظر ہم نے دیکھا جاسد میں — کہیں اس کو حقیقت سب کہ شش
یہ تھا ملبوس کا فیضان خورشید — ہے سی آئی اے کے کوچ ایجنٹ

باہر صاحب نے کہا۔

کسی کو وہم کسی کو گمان دیتا ہے — لباس ہی کبھی دھوکے میں ڈال دیتا ہے

پھر جب میں نے انھیں بتایا کہ میں اسی جاسد کا طالب علم ہوں تو انھیں سخت تعجب ہوا۔ اتنے میں جاوید خاں معید خاں اور ساجد بھی آ گئے۔ اور جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی تو سب نے قہقہہ لگانا شروع کر دیا اور نائب صدر معافی مانگتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اسی دن کی بات ہے کہ کوئی چالیس پچاس طالبات نے راغب صاحب کو گھیر لیا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں آٹوگراف بک تھی اور ہر طالبہ راغب صاحب سے آٹوگراف لینا چاہ رہی تھی۔ راغب صاحب کا کمال یہ تھا کہ ہر ایک سے اس کا نام پوچھتے اور ہر لڑکی کی شکل و صورت اور حسن و ادا کے لحاظ سے کسی کی بک پر ایک شعر، کسی پر رباعی اور کسی پر قطعہ لکھ دیتے اور اس لڑکی کا نام ایک شعر میں ضرور استعمال کرتے۔ اس دن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ راغب صاحب پر اشعار کی بارش ہو رہی ہے اور آمد کا یہ عالم تھا کہ بقول غالب

کسے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غرض رات دیر تک یہی حالت رہی اور بڑی مشکل سے ہم لوگ راغب صاحب کو اس محفل حسینان سے بچا کر گھر لائے۔

غالب صاحب سے جب بہت دنوں تک کوئی خط و کتابت نہ ہو سکی تو آخر ان کا ایک

نہایت مختصر دو سطروں کا خط آیا۔ یہ خط ان کی مشنری کے پیڈ پر تھا۔

GOVERNMENT OF PAKISTAN

MINISTRY OF INFORMATION & BROADCASTING

AUQAF AND HAJ

208 Shahrah-e-Iqbal Islamabad

۱۰-۸-۹۳

میاں کچھ تو منہ سے بولیے، سر سے کھیلیے۔ گم چپ کے لڈو کھاتے کب تک بیٹھے رہیں گے۔ اس نہیں میں جانے یہ خاموشی

جوش

اس خط کے جواب میں میں نے جوش صاحب کو لکھا۔

کراچی

بی۔ ۱۰۰ ین۔ شمالی ناظم آباد

۱۰-۸-۹۳

قبلہ صاحب خلوص، تسلیم۔ آپ کے دو سطری تحریر نے دماغ کی چولیں ہلا دیں مگر بھولا نہیں اپنے کو

گرچہ دور ہم بود تو قلبی بی توشیم بعد منزل نہ بود در سفر روحانی

جب سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے پڑھائی میں بے حد مصروف ہو گیا ہوں اور فلسفیات کے مطالعہ سے جیسے جیسے واقفیت بڑھتی جا رہی ہے انسانی رویوں کی پیچیدگیاں واضح ہوتی جا رہی ہیں اور اس قدر لطف آ رہا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ افسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے اتنے سال ضائع کیے اور مستند بنیادی علم سے ناواقف رہے اور اب تو جی چاہتا ہے کہ جیسے تمام عمر یونیورسٹی میں اس علم کی تحقیق و تفتیش میں گزار دوں۔

بار ہر زبانی نہ کند صبح اسیر خود افسوس بمانے کہ گرفتہ نہ بود

لیکن آج سے تیس (۳۰) سال پہلے جب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا اس زمانے میں علم نفسیات کا تعلق فلسفے کے شعبے سے تھا مگر اب وہ سائنس کے شعبے میں داخل ہے اور اس میں تحقیق اور تجربوں کا طریقہ وہی ہے جو سائنسی مضامین کے تجربوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ موضوع اس قدر دلچسپ اور حسن گیر ہے کہ جب آپ کراچی تشریف لائیں گے تو آپ سے تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

جلیس لکھتے ہیں کہ آپ بہت یاد آتے ہیں۔ یہاں یونیورسٹی میں جب دوستوں سے ہر وقت آپ ہی کا ذکر خیر ہوتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں کی مشغولیت کے باعث آپ کو لکھ سکا گیا

بے تاب از نظر کہ شدی ہم نشین دل لی جنت عیاں و دوای فرقت

آپ بتائیے۔ کوچہ جاناں کا طواف جاری ہے؟ یا خود اسلام آباد میں نزول رحمت پیدا گار ہو رہا ہے؟ اس مدت میں اگر کوئی تازہ کلام ہوا ہو تو ضرور عنایت فرمائیے۔ یہاں سب احباب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ جاوید، ساجد، سعید اور سب ہی طالبات جن کو آپ سی جانتے۔ آپ کی خدمت میں سلام شوق پیش کر رہی ہیں اور اس خواہش کے ساتھ کہ اگر قبول افتد زہے عزو شرف۔

جواب کا منتظر

طالب دید خورشید

اس کے جواب میں جوش صاحب کا خط وصول ہوا۔ انھوں نے لکھا۔

اسلام آباد۔

۱۰۔۸۔ ۶۰ء

صبح کو چار بج کر چھ منٹ پر یہ خط شروع کر رہا ہوں۔ دور دور تک اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا ہے۔ آپ کے طلوع ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی میدان

کے تمام پودے اور کیڑے مکوڑے ٹوٹ پڑے ہیں مجھ پر۔ تمام میز بھری ہوئی ہے حشرات الارض سے۔ اللہ اللہ کتنے جانوں کے لشکر پوشیدہ گھاس پھوس میں۔ ۱۹۶۲ء میں ایک غزل کہی تھی اس کا ایک شعر بے ساختہ یاد آ رہا ہے

یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ذرّے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

ان تمام حشرات میں بالکل وہی نظام کار فرما ہے جو میری زندگی پر حاوی ہے اور ان سب کے وظائف اعضاء بھی میرے ہی سے ہیں۔ فرق صرف شعور کا ہے۔ میرا شعور دولت بیدار ہے اور ایک زبردست آگاہی بھی۔

کل سارا دن "اس" کے ساتھ گزرا۔ اس کی بڑی بہن نے کہا بھی کہ اب جوش صاحب کو آرام کرنے دو۔ اپنے کمرے میں چلی جاؤ لیکن وہ ہفتہ روز بعد میرے پہلو سے نہیں گئی اور عشرہ و نازک کے خبر لاتی رہی۔

روز بعد سے مجھ پر اس بیسٹ عمر میں دو کمسن چھوکریوں کو مسلط کر دیا ہے۔ ہر چند میرے چہرے پر ۸۰ سال کی شکنیں دوڑ چکی ہیں اور میرے خط و خال کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن روح کائنات نے خدا جانے ان لونڈیوں پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ میری دل داری پر کمر باندھے رہتی ہیں۔ وہ میرے چہرے کے بھیانک پن کو دیکھتی ہی نہیں۔ وہ کہتی ہیں ہم کو حسین چہرے کی نہیں حسین ذہن کی ضرورت ہے۔ اور سے کروڑوں کم سنوں میں ایک آدھ چھوکری اسی مزاج کی بھی نکل آتی ہے جو شاعر کے خروب کی تیرگی کو طلوع کی جگمگاہٹ میں تبدیل کر دیتی ہے۔

ان لڑکیوں سے متاثر ہو کر ایک نظم کہی ہے۔ آپ بھی سن لیں۔

ترانۂ شکر

دیارِ خال و خط کے حکم راں ہیں — کہ ہم محبوب قوم گل رخاں ہیں
کبھی کرنوں کا منہ اترا ہوا ہے — کبھی زلفوں کے ہم پر سائباں ہیں
نہ کیوں نازاں ہوں اپنی قسمت پر ہم — کہ ہم لجائے نیچے دلبراں ہیں

رہے قسمت ہماری آزمانے میں — کسی کی آنکھ سے جنوں رواں ہیں
بڑی حسرت سے حوریں تک رہی ہیں — خدایا ہم یہ کس کے میزباں ہیں
ابھی تک ہیں حکایت در حکایت — ابھی تک داستاں در داستاں ہیں
برہمن ہیں مگر ایسے برہمن — کہ شاہنشاہ اقلیم بتاں ہیں
بھر اللہ کہ ہم اس عمر میں بھی — تمنائے دل و شیریں کاں ہیں

حسینوں کی رفاقت سے ہم اے جوش
اے قسمت کہ اب تک نوجواں ہیں

ملاحظہ فرمائیں آپ نے ایک بوڑھے کھوسٹ کی یہ نظم؟ حوریں رقص کناں ساغر و بادہ بردار آپ نے حضرت واعظ کا یہ شعر تو بارہا سنا ہوگا

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر — کہ مرا گرمی رفتار تو جواں بر خیزد

شاید یہ جواں برخیزم کا کھیل اس غرض سے کھیلا جا رہا ہے کہ میری شدت عقل کا لوہا پگھل کر رقت قلب کے سانچے میں ڈھل جائے اور میں حقیقی شاعری کی مانگ کو صندل سے بھر سکوں۔ کوثر صاحب جاری تو مجھ کو کراچی لے جانا چاہتے ہیں لیکن وہ قسیم ذی نفس کہہ رہی ہے کہ میرا بھی ریزرویشن ہو جائے تو ساتھ چلنا۔ اب دیکھیے اس کا ریزرویشن کب ہوتا ہے۔ آج کوثر صاحب شام کو میرے گھر آ رہے ہیں۔ ان سے کہوں گا کہ اس کے سفر کا بھی بندوبست کر دیں ورنہ میری جاتی جائے گی کراچی۔

آپ کا چاہنے والا
جوش لب نوش

جوش صاحب نے لفافے پر یہ پتہ لکھا۔

سید نا خورشید علی خاں، معلم رہنمائیاں
حالی / ایس
ہارٹھ ہاؤس آباد۔ کراچی

پی۔ ایچ۔ ڈی
شمالی ناظم آباد
کراچی

۱۲۔ ۱۰۔ ۸۲ء

حضرت پیر و مرشد۔ آداب۔ آپ کا محبت نامہ وصول ہوئے تقریباً ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے مگر میں اس مدت میں یہ امید کر رہا تھا کہ آپ کسی دن کراچی ضرور تشریف لے آئیں گے مگر ؎ ہے جب آرزو کہ خاک شدہ ۔ اللہ تعالیٰ آپ کے جوش عشق اور عالم شباب کو ہر لمحہ بیدار و آسودہ اور محبوب و بہتر رکھے ۔ میں نے چونکہ سقراط کے مکتب میں داخلہ لے لیا ہے اس لیے معمولی بحث سے رخصت ہو کر اپنے گریبان کے چاک کو رفو کر لیا ہے۔

قدرت جنسی طلب بے شک حیات انسانی میں ایک نہایت طاقتور جذبہ ہے لیکن بعض تحقیق و تجسس کی دنیا بھی اس قدر رنگین، حسین اور محو کن ہے کہ اس کا ہر کن سے لے روپ میں جلوہ گر ہونے والا حسن دامن دل کو اپنی طرف کھینچ کر کہتا ہے کہ بس اسی جگہ تمام عمر بسر کر دو۔

رہ رو تا بہ قدم ہر کہ بیا کرد نگرم کز سر دامن دل می کشد کہ جا این جاست

آج کل نفسیات پر یورپ، امریکہ، جرمنی، روس اور جاپان میں بے انتہا تجربے ہو رہے ہیں اور یہ معلوم کیا جا رہا ہے کہ کس قسم کے سیج (Stimulus) کا ہمارے کردار (Behaviour) پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے اور کوئی انسان کن محرکات (Motivation) کے تحت ایک خاص قسم کا عمل کرتا ہے۔ یہ تجربے کیے جا رہے ہیں کہ مختلف انسانوں پر بھوک، پیاس، جنسی محرومی اور بے گرانی کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ اگر ایک انسان اور دوسرے انسان کے ردعمل میں فرق ہے تو اس کے داخلی اور خارجی اسباب کیا ہیں؟ خارجی اسباب میں جغرافیائی اور معاشرتی ماحول، تاریخی ورثہ، حکومتی سیاسی، معاشی، معاشرتی گروہی، رسوم و رواج اس شخص کا طبقاتی مقام، اس کی تعلیم اور تمدنی اقدار، اس کا علم، اس کے تجربات۔ اسی طرح اس کی داخلی کیفیات مثلاً اس کی جسمانی صحت، مختلف قسم کے ہارمونز اور اعضاء کا عمل اور ردعمل، غذا کی کمی یا زیادتی، کسی مرض کی کیفیت، حساسیت کی شدت یا کمی، جذباتی کیفیت، اعصابی نظام

کی بات یا گزری۔ غرض یہ تمام خارجی اور داخلی عوامل کس حد تک انسان کے کردار اور اس کے رویوں (Behaviour) کو متاثر کرتے ہیں۔ ہم علم نفسیات میں انفرادی اور اجتماعی طور پر مختلف قسم کے مسیجات کے ذریعہ سے انسانی اعمال میں تبدیلی کے عمل کا مطالعہ کرتے ہیں یہ مصنوعی یا قدرتی ماحول میں مختلف قسم کے مسیجات کی کمی یا زیادتی کے اثرات کا رویے کی تبدیلی سے متعلق قوانین معلوم کرتے ہیں۔

معاف فرمایئے میں اپنی دھن میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا اور یہ بھول گیا کہ میں کس سے مخاطب ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ کراچی میں جب میں نے آپ سے یہ عرض کی تھا کہ "بیشک جنسی جذبہ انسانی کردار و عمل کا ایک طاقتور محرک ہے مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ میرے نزدیک حصول علم اور سی سی معلومات حاصل کرنے کی خواہش جنسی جذبے سے زیادہ پرکشش ہے۔ تو آپ نے یک دل کش ادا کے ساتھ مسکرا کر یہ شعر پڑھا تھا۔

ز نقص تشنہ بی دل بہ عقل خویش مناز
دلت فریب گر از جلوہ سراب نخورد

آپ کراچی کب تشریف لا رہے ہیں۔ جلد آیئے۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے" سب احباب آپ کو بے حد یاد کرتے ہیں۔

آپ کا چاہنے والا
خورشید

اس خط کے جواب میں جوش صاحب نے لکھا۔

"دوست باد حضرت خورشید۔ آپ کا نفسیات میں الجھا ہوا اور بجھا ہوا خط پڑھ کر جی گھبرانے لگا۔

ایک بجے رات سے جاگ رہا ہوں مجھ کو اور دے حساب اٹھنا چاہیے تھا وہاں بجے صبح کو ڈیڑھ گھنٹہ قبل تو بیدار ہو گیا۔ کچی نیند میں بیدار ہو جانے کے باعث دماغ سلا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا کسی بوڑھی عورت کے آغوش میں بھیگا ہوا لوبیا اور بھی ماسیں ملے ہوئے ہوں۔

کچھ پوچھیے کہ یہ گزشتہ پہاڑ سے چھ مہینے کیسے گزارے۔ ان چھ مہینوں میں بالکل تنخواہ نہیں ملی اور وہ بکرنی عالم ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ میری جگہ دوسرا ہوتا تو لوگوں کو دھیلے بانٹنے لگتا۔

بارے خدا خدا کر کے اب بھٹو صاحب نے تعلیمات کی وزارت میں تقرر کر دیا ہے اور پچھلی تنخواہ بھی مل گئی ہے۔

یہاں ایک "اکادمی آف لیٹرز" قائم کی جانے والی ہے۔ میں نے قدرت اللہ صاحب شہاب سے کہا ہے کہ وہ اس سلسلے میں آپ سے کام لیں۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں آپ سے اس کی سکیم لکھوا کر انھیں دکھاؤں تاکہ کام آگے بڑھ سکے۔ اب آپ اس اکادمی کے تمام مقاصد اور ضوابط لکھ کر مجھے جلد بھیج دیں۔

اس وقت دماغ سویا ہوا ہے۔ قلم نہیں چل رہا ہے۔ ذہن پر ایک ڈھکن سا رکھا ہوا ہے۔ آپ نے شہاب صاحب کو جو سکیم دی تھی اسی لائن پر دوسری اسکیم مرتب کر دیجیے۔ یہی کرنے کا قصد نہیں ہے۔ "ص" کا لائن آیا تھا بنانے کا لیکن کیسے جاؤں۔ چھ مہینے سے لاہور بھی نہیں گیا۔ اسی سے آپ میری مجبوری کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسے بڑی گھٹن سے طبیعت میں۔ کانوں میں دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی ہے۔ سناٹا سائیں سائیں کر رہا ہے۔

نیاز مند

جوش

اسلام آباد

۲-۱۰-۶۴ء

چار بجے ہیں گیارہ منٹ باقی ہیں ..... والسلام

اس خط کے جواب میں میں نے جوش صاحب کو لکھا کہ قدرت اللہ شہاب نے اکادمی آف لیٹرز قائم کرنا چاہتے ہیں کا مقصد کیا ہو گا؟ ویسے ممکن ہے قدرت اللہ صاحب اس اکادمی کے قیام میں سنجیدہ ہوں مگر مجھے ہرگز یہ امید نہیں کہ حکومت کوئی ایسا ادارہ قائم کرے جس ان سے تعاون کرے گی جس کے ذریعے سے ترقی پسند افکار مگر معاشرے میں رائج

ہو سکے۔ صبر والا بد قسمتی سے ہمارا ملک اس خطہ میں واقع ہے جہاں ست ماتو ریں اقوامی جوتوں کا سایہ ہے اور ہمارے معاشرے کی تعمیر میں اتنی خرابیاں مضمر ہیں کہ نہ معلوم ان جوتوں کے اثرات سے نکلنے میں ہمیں کتنی دہائیاں لگ جائیں۔ لیکن پھر بھی ہمارا کام کوشش کرنا ہے، ناامید ہو کر بیٹھ جانا نہیں۔ اور پھر جب آپ جیسا مفکر، عظیم شاعر انقلاب اس طرف متوجہ ہو تو ہم کیا کچھ نہیں کر سکتے؟ آپ کے جواب کا منتظر۔

خاکسار

خورشید

اس کے جواب میں جوش صاحب نے لکھا۔

الٰہی خلوص کے تابش خورشید — پائندہ و تابندہ و رخشندہ باد[1]

آپ کالج کا مقصد دریافت کرنا چاہتے ہیں، سو بندہ پرور اس کا مقصد انتہائی جہل اور انتہائی علم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر فلموں، ڈراموں، رسالوں، کتب خانوں، درس گاہوں، مشاعروں، جلسوں، تقریروں، تالیفوں اور ترجموں سے کام لیا جا سکتا ہے۔

پاک صوفیوں اور مجذوب شاعروں نے قوالیوں کی آبیاری اور مشاعروں کی سامان اندوزی کی وساطت سے عشق و جنون کو ابھار اور عقل و شعور کو بھینچ کر بالعموم ہند اور بالخصوص ہندوستان و پاکستان کو جذبات کی افیون پلا پلا کر نیم خلیل کر رکھا ہے۔ اس عرصہ سے لوگوں کو جگانا اور حکمت و منطق کی راہ پر چلانا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اقوال و اساطیر نے ہماری عقل کا گلا گھونٹ رکھا ہے اور ہمارے دماغ کو ایک ایسے دھترے پر ڈال دیا ہے کہ ہم بے بنیاد بیان کو اوڑھنا بچھونا بنا چکے اور عقائد کا دودھ پی پی کر تجسس و تحقیق کو ایک شیطانی عمل سمجھنے لگے ہیں۔ ان خرافات کے جادو گھر سے انسان کا نکلنا سب سے بڑا شرف و مجد ہے۔

آپ ان باتوں پر نگاہ کر کے اکادمی آف لیٹرز کا ڈھانچا تیار کریں اور ایک ہفتے کے بعد مجھے یاد کریں تاکہ میں آپ کو یہاں بلا لوں۔

جی ہاں اب وہ آگ سے مطمئن باقی نہیں رہی ہے۔ بال و پر نکل آئے ہیں۔ [illegible]

[1] رخشندہ کی وہی اشتباہ کا صیغہ ہے۔ جوش

جانے کی طاقت آ گئی ہے۔ ام الشعرا کی آمد کا انتظار ہے۔ وہ آئیں تو لاہور جا کر کوئے جاناں کا طواف کر آؤں۔ اس سفر میں آپ میرے تصوری ساتھی ہوں گے۔ اور جب چلنے لگوں گا تو چپکے ہوں۔ فلیش بیک۔ جا کر آپ کی معشوقہ طناز کو بھی آنکھوں میں رکھ کر لاہور سے جاؤں گا تاکہ اثنائے سفر میں آپ کا دل بلتا رہے۔

کل رات ایک شعرا و حسن اور ناؤ نوش کی محفل میں شریک ہوا تھا۔ سامعین عام تھے۔ داد تو سب نے مست چیخ چیخ کر دی مگر ان کی آنکھوں میں چاہ کر حسن کی دمک نہیں پائی۔ اس لیے اہل بمبئی کے بقول "مجا نہیں آیا"۔ رات کو دیر سے گھر پہنچا۔ سے لحاف میں لیٹا روٹی کی گرمی سے جسم کو تو آرام پہنچا لیکن حال روٹی سے کیا ہوتا ہے جب تک کہ "روٹی" نہ ہو۔ بستر کو ٹٹولا کسی چہکا دینے والے پتے کو پہلو میں نہیں پایا کروٹوں پر کروٹیں لیں لیکن لیٹے کے باوصف دیر تک نیند نہیں آئی۔

میں شاید مرتے دم تک بوڑھا نہیں ہوں گا۔ میر انیس نے فرمایا ہے کہ جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ "جو آ کے نہ جائے وہ جوانی دیکھی"۔ چھا اب ٹیلے کا وقت آ گیا ہے۔ آسمان کی سیاہی پر بلکی سی گلابی سفیدی آ چلی ہے۔

آپ کا جوش

۲۰۰۰ ایف شاہ بلاک

اسلام آباد ۱۲۔۱۔۷۴

معجزہ خوباں خورشید علی خاں

B-5 Block "N"

جاوید ہاشم آباد کراچی

ہر چند یہ قلم غریب ہے لیکن سلام چل نہیں رہا ہے۔ بار بار انگلیوں سے چھوٹ رہا ہے حرام زادے کو۔

اکاڈمی آف لیٹرز کا دستور

پی۔ ایم بلاک این
شمالی ناظم آباد۔ کراچی

۲۰۔ ۵۔ ۱۹۸۲ء

حضرت پیر و مرشد۔ آداب! آپ کا محبت نامہ ملا۔ آپ کا خلوص اور محبت میرے لیے باعث افتخار ہے۔

ہے تجلی تری سامان وجود ذرہ ہے پرتو خورشید مبیں

سبحان اللہ! چار لفظوں میں آپ نے جو "اکاڈمی آف لیٹرز" کا مقصد بیان فرمایا ہے وہ بلاغت کی صریح ہے۔ معنی کی ایک کائنات آپ نے ان چار لفظوں میں بند فرما دی ہے۔ یہ بلاغت اور معنی آفرینی صرف آپ ہی فرما سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی "اکاڈمی آف لیٹرز" کا نصب العین اس سے زیادہ اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس اکاڈمی کا کوئی دستور بنایا گیا تو اس کے صفحہ اول پر صرف یہ چار الفاظ۔

"انتباہ، حل و انتشار علم"

لکھ دینا ہی اس کے نصب العین کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گے۔ آپ نے مقصد بیان فرمانے کے بعد اس کے حصول کے طریقوں کی بھی توضیح فرما دی ہے۔ یعنی "اس مقصد کے حصول کی خاطر خطوط، ڈراموں، رسالوں، کتب خانوں، درس گاہوں، مکتبوں، جلسوں، نمائشوں، تالیفوں اور ترجموں سے کام لیا جا سکتا ہے"۔

جناب والا! اگر آپ اس اکاڈمی کو قدرت اللہ صاحب شہاب کی اعانت سے قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ پاکستان کا مستقبل محفوظ ہو گیا۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک کی تعمیر و ترقی، ہماری حکومتوں کی تشکیل، ان کا نظام، ان کا جائزہ، ان کا دستور، ہماری داخلی و خارجی حکمت عملی، ہماری معاشی اقتصادی و تعلیمی پالیسی، ہماری سیاسی جماعتوں کی شکست و ریخت، ہماری مذہبی جماعتوں کی تشکیل اور فکری تعمیر میں ان کے اثرات، ہمارا سماجی اور معاشرتی ڈھانچا اور سیاسی سماجی اور جمہوری

ادارے سیاسی گروہ بندیاں یہ سب کے سب حالات جن سے کسی قوم کی تعمیر اور ترقی کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔ خود ہمارے ملک کے محب وطن باشعور تعلیم یافتہ افراد کی دسترس سے باہر ہیں۔ جنگ وہ ہار ملک بین الاقوامی طاقتوں کے ہاتھوں ادا ہو چکا ہے آج ہم اقوام عالم کے مالی مقاصد کے حصول کے آلہ کار بن کر رہ گئے ہیں۔

جب ہم نے پاکستان بنایا تھا تو ہمارا مقصد اس ہی مملکت کی تشکیل سے ایک ایسا اسلامی معاشرہ قائم کرنا تھا جہاں تمام انسان بلا تفاوت ادیان و لسان، محبت اور اخوت کے رشتوں میں منسلک ہوں۔ جہاں تعلیم مفت اور عام ہو جہاں عدل و انصاف ہو جہاں شخصی اثرات کے بجائے قانون کی حکمرانی ہو۔ امن و خوشی حاوی ہو۔ کوئی شخص بے روزگار نہ ہو بھوکا نہ ہو جہاں جامعات اور درس گاہیں تحقیق و تجسس، علم و فکر کے گہوارے ہوں۔ جہاں معاشرے میں سفلی عمل کے تحت نہ مزارعین ہوں اور نہ مزدور ہمارے عسکری ادارے مستحکم اور ہمارا دفاعی نظام ناقابل تسخیر ہو۔ ہم نہ صرف اپنے لیے بلکہ تمام دنیا کے لیے عام طور پر اور اپنے پڑوسی ملکوں کے لیے خاص طور پر امن بھائی چارے اور تعاون کے علمبردار ہوں ہم دنیا کے کسی ملک کی طرف جارحانہ عزائم نہ رکھیں اور نہ کسی ملک کو اپنے ملک کی جغرافیائی حدود کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی اجازت دیں۔ ہم نے ایک ایسی جنت ارضی کا خواب دیکھا تھا جہاں قرآن کے الفاظ میں "و من دخلہ کان آمناً" اور جہاں امن کا یہ حال ہو کہ "ولا خوف علیہم ولا ہم یحزنون" نہ کسی شخص کو کسی قسم کا کوئی خوف ہو اور نہ کہیں کوئی داخلی حزن و ملال ہو۔ مگر

باور چہ خیالیم و فلک در چہ خیال است

اور فلک کس خیال میں تھا؟ اسے علامہ اقبال کے الفاظ میں سنیے:

اثر یہ بھی ہے اک سیر کے جنون فتنہ سامانی کا
مرا آئینہ دل ہے فضا کے رازداروں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑیں باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغ باغاں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

جب علامہ اقبال ہم کو ان تباہ کن نتائج سے آگاہ کر رہے تھے تو کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ہماری بربادیوں کے کیا مشورے "آسمانوں" میں ہو رہے ہیں۔ مگر جوش صاحب آپ نے دیکھا کہ پاکستان بنے کے صرف چوبیس سال کے اندر ہمارے ملک میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا۔ پاکستان کی تخلیق کے وقت کشمیر کے مسئلہ کو متنازع چھوڑ دینا، لیاقت علی خاں کو قتل کروا دینا، غلام محمد جیسے مطلوب شخص کی بادشاہی، خواجہ ناظم الدین کی برطرفی، امریکہ میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ کا وزارت عظمیٰ پر تقرر یہ سب کارروائی اس لیے کی گئی کہ پاکستان کو معاہدہ بغداد کے ذریعہ سے روس کے اطراف وقائی حصار میں شریک کیا جا سکے۔ اور ساتھ ہی اس لیے سے جرمنی تک شمالی اٹلانٹک کی تنظیم (NATO) کے ذریعہ سے جو دائرہ روس کے اطراف یورپ میں کھینچا گیا اس کو ترکی، عراق، ایران کے بعد پاکستان کی شمولیت کے ذریعہ سے جنوب وسطی ایشیا میں مکمل کیا جائے۔ اس وقائی تنظیم کے مقاصد کی تکمیل کے لیے پاکستان میں فوجی آمریت کا قیام اور ان طویل المیعاد آمریتوں کی تقویت کے لیے جاگیرداروں، وڈیروں، سرداروں، نوابوں، سرمایہ داروں اور مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی۔ ملک میں سیاسی انتشار یہ تمام ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ بقول کیفی اعظمی:

میرے مرنے پر فرشتہ موت کا بدنام تھا
وہ بھی دو پہلے آگ بیٹھے تھے جن کا کام تھا

یہ داستان ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ سول بیوروکریسی کو خوف زدہ کرنے کے لیے سرکاری ملازمین کو جبری طور پر وظیفہ دے کر سبکدوش کیا گیا اور ان کی جگہ نااہل اور ایسے سفارشی لوگوں کو بھرتی کیا گیا جو سیاسی حاکموں کی مرضی کے مطابق ہر غیر قانونی کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ملک میں قانون کی حکومت کو ختم کر کے رشوت اور سفارش کا بازار گرم

کر دیا گیا اور سب سے بڑی خرابی یہ ہو گئی کہ علم اور ہنر کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ بار بار دستور ملک کی دھجیاں اڑ کر سیاسی اور جمہوری اداروں کو پنپنے نہیں دیا گیا۔

تعلیمی اداروں کو علم و تحقیق کے مراکز کے بجائے سیاسی گروہ بندیوں، مذہبی، علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے اڈوں میں تبدیل کر کے نوجوان نسل کے ذہنوں کو زہر آلود کر دیا گیا اور ہمارے تعلیمی اداروں میں نفرت اور تشدد کی ایسی فضا پھیلائی گئی کہ نئی نسل کے لیے حصول علم ناممکن ہو کر رہ گیا۔

پھر جب جاگیردار، نواب، سردار اور وڈیرے حکومتی ایوانوں پر قابض ہو گئے تو انھوں نے سرکاری خزانے کو ذاتی مفاد اور اپنے سیاسی استحکام کی خاطر دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور جب خزانہ خالی ہو گیا تو مالی اداروں کے سامنے کاسۂ دریوزہ گری لے کر بھیک مانگنے لگے۔ آج پوری قوم ان بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ہاتھوں میں گروی ہے۔ ہماری معاشی، اقتصادی، سیاسی اور دفاعی ضرورتوں کی تکمیل ان کی مرضی کی تابع ہوتی ہے۔ ہم اپنی قومی آمدنی کا بیشتر حصہ قرضے کے سود ہی ادا کرتے ہیں اور اس طرح اقوام عالم کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالے پھر رہے ہیں۔

حصہ دار ان تمام باتوں کو آپ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ حقائق بے نہایت تلخ ہیں۔ ہم پانی کے بلبلوں کی طرح سطح حیات پر ابھرتے اور فنا ہو جاتے ہیں۔ نہ ذوق ارتقا پسندی نہ شوق تعمیر۔ صرف محکوم حوادث۔ نہ ماضی سے عبرت نہ حال پر قدرت۔ مستقبل پر حکومت۔ یہ ہے ہماری قوم کا المیہ بقول غالب:

ہے وہ بالائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
ہے کسی بالائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

گلہ یہ قوم عجیب و غریب وحشت و ترویع
ہے کہاں روز مکافات سے خدائے دیر گیر؟

لیکن ان تمام باتوں کا شعور رکھ کر اور اپنی قوم کو تباہی کے راستے پر سرپٹ دوڑتے ہوئے دیکھ

کہ ہمیں شترمرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا کر حقائق سے منہ نہیں موڑنا چاہیے کیونکہ ہمیں آپ کے

ہماری تباہیوں سے کیوں ہے دل گیر
کاکل میں بدل جائے گی کل یہ زنجیر
ہیں آدم فرسودہ کے درپے تخریب
اک آدم نو کی ہو رہی ہے تعمیر

تو جناب والا، اگر ہم اس "دانش گاہ فکر و علم" کے ذریعے سے اس آدم نو کی تعمیر میں حصہ لے سکے، اپنے عوام کے شعور کو بیدار کر سکے اور ان کو اپنے معاشرے کی ساخت کا احساس دلا کر ان کے بنیادی مسائل کی طرف متوجہ کر سکے تو یقین مانیے ہماری زندگی کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ مگر میں یہ بھی خوب سمجھتا ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اول تو جلدی سے سکیم کو حکومت کی تائید حاصل نہیں ہو سکے گی کیونکہ یہ بات نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ ہماری حکومت کی ترجیحات بالکل دوسری ہیں لیکن اگر کسی حکومت نے اتنی جرأت دکھائی بھی تو پھر وہ حکومت باقی نہیں رہے گی لیکن بہرحال اس وقت آپ اور قدرت اللہ صاحب مل کر اس اکادمی کی بنیاد ڈال ہی دیجیے اور مجھے قدرت اللہ صاحب سے یہ قوی امید ہے کہ وہ آپ کو اس اکادمی کا صدر بھی بنا دیں گے۔

اس طرح اگر یہ اکادمی آف لیٹرز قائم ہو جائے تو اس کا دفتر اسلام آباد میں ہو گا اور یہ ادارہ گو پہلے مالیاتی امور میں وزارت تعلیم سے منسلک ہو گا مگر تمام انتظامی امور میں یہ خود مختار ہو گا۔ آہستہ آہستہ اس کی شاخیں صوبائی مراکز میں قائم کی جائیں گی۔ اس طرح کراچی، لاہور، پشاور اور کوئٹہ میں اس کی ذیلی شاخیں قائم کی جائیں گی۔ ان شاخوں کے لیے صدور کا انتخاب مرکز کرے گا جو ایسے مقامی دانشوروں میں سے ہو گا جو اپنے ملک کے تمام مسائل کا حقیقی ادراک رکھتے ہوں۔ جن کا جذبہ حب الوطنی ہر قسم کے شبہے سے بالاتر ہو اور جو علم اور تحقیق کی طرف معروضی اور سائنسی نقطہ نظر رکھتے ہوں اور جن کے ذہن ہر قسم کی توہم پرستی اور تعصب سے پاک ہوں۔ جو تحریر و تقریر پر عبور رکھتے ہوں۔ پھر ہر ادارہ اپنے اپنے علاقے کے ادبی پسند باشعور ادیبوں، شاعروں، ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں، ماہرین تعلیم، صحافیوں، کالم نگاروں، اخبار کے ایڈیٹروں، ٹی وی اور ریڈیو کے پروڈیوسروں اور فلمی دنیا کے ڈائریکٹروں کو اپنے حلقے کی اکادمی کا رکن بنائے گا۔

مرکز ان تمام صوبائی مدارس کے کام کی نگرانی کرے گا اور ان کو ہدایات جاری کرے گا کم از کم سال میں ایک مرتبہ مدارس کے صدور مرکز میں جمع ہوں گے اور آپس میں تبادلہ خیالات کر کے اگلے سال کی پالیسی کا تعین اور گزرے ہوئے سال کے کام کا جائزہ لیں گے۔

جب یہ ادارے کافی تعداد میں اشخاص کے ذریعے سے مستحکم بنیادوں پر استوار ہو جائیں تو آہستہ آہستہ اس علاقے کے تمام تعلیمی ادارے ان کے کنٹرول میں دے دیے جائیں ان اداروں میں ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو اپنے علاقے کے تعلیمی مرکز کی نگرانی کرے ہر مرکز کے معیار تعلیم کو جانچے اور ان مدارس کو غیر معیاری اور نااہل اساتذہ سے پاک کر کے ایسے اساتذہ کا تقرر کرے جو بہترین کردار، اچھی صحت اور درس و تدریس کا اعلیٰ ذوق اور صلاحیت رکھتے ہوں جن کے ذہن ہر قسم کے تعصب سے پاک ہوں اور علم کی طرف معروضی اور سائنٹفک نقطہ نظر رکھتے ہوں اور جو اپنے مضمون میں مہارت اور تحقیق رجحان رکھتے ہوں۔ ہر مدرسے میں تعلیم جبری طور پر لازمی اور حق الامکان مفت ہونی چاہیے۔ یہ ادارے مدارس میں ہر جماعت کا نصاب تعلیم مقرر کریں۔ جس حد تک ممکن ہو نصاب کی کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کروائیں اور اس مقصد کے لیے اعلیٰ ترین صلاحیتوں اور علمی معیار کے اصحاب کا انتخاب کریں اور ان کو اپنی لیاقتوں کا مستقل معاوضہ ادا کریں۔ اساتذہ کو ان اقدار سے بے فکر کر دینا چاہیے اس کو معاشرے میں حمایت عزت اور احترام کے مقام پر فائز کرنا چاہیے۔

تمام تعلیمی اداروں کو ہر قسم کی سیاسی یا فرقہ وارانہ جماعتوں کے اثرات سے پاک کر کے طلبہ کو صرف اور صرف حصول تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہیے کسی طالب علم یا کسی استاد کے لیے کسی سیاسی یا فرقہ وارانہ جماعت سے وابستگی کو سنگین جرم قرار دینا چاہیے۔

بہرحال یہ ایک سرسری سا خاکہ جو میرے ذہن میں آیا وہ میں نے عرض کر دیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس موضوع پر خود آپ کا ایک تفصیلی مضمون غالباً دس بارہ سال قبل کسی رسالے میں چھپ چکا ہے اگر اس کی کوئی کاپی آپ کے پاس ہو تو وہ حضرت اللہ صاحب کو دے دیجیے اور ایک نقل مجھے بھی ارسال فرما دیجیے۔ یہ خاکہ طویل ہو گیا ہے مگر چونکہ موضوع ہی ایسا ہے اس لیے مجبوری ہے۔ آپ کراچی کب تشریف لا رہے ہیں۔ ہم

دارالعلوم سعید کراچی میں مجھے راجب مراد آبادی نکال رہے تھے جو جس کے سرپرست حضرت مولانا تھے

ہی بے صبری آپ کے منتظر ہیں۔ آپ کے بغیر کراچی کی ساری رونقیں ختم ہو گئی ہیں۔

آپ کا چاہنے والا

خورشید

اس خط کا کوئی تحریری جواب تو جوش صاحب نے نہیں دیا مگر فون پر مجھے بتایا کہ انھوں نے میرا پورا خط ہی قدرت اللہ صاحب کو دے دیا مگر انھوں نے بھی اس کا کوئی جواب اس وقت تک نہیں دیا۔ اور جیسا کہ میں نے خدشہ ظاہر کیا تھا ایک فارسی محاورے کے مطابق اس دفتر بے معنی کو گلے کھا گئی اور گلے کو قصائی نے کاٹ دیا اور اس طرح یہ قصہ ختم ہو گیا۔

سلامت علی خان، حضرت جوش، اور خورشید علی خان،
بی۔ ای۔ ڈاک بنگلہ میں۔

خورشید علی خان اور حضرت جوش ملیح آبادی

۱۹۷۴ء کے واقعات

اس کے بعد جوش صاحب کا ۲۲۔۱۔۷۴ء کا لکھا ہوا حسب ذیل خط وصول ہوا۔

لیے خورشید علی خاں میں یہاں سے پانچویں فروری کو تیج گام سے کراچی روانہ ہو رہا ہوں۔ نویں فروری کو کینٹ اسٹیشن پر موٹر لے کر آ جائیے گا۔ میں اپنے یہاں نہیں آپ کے گھر قیام کروں گا۔ کھانا آپ کے ذمے ہو گا اور پینے کا بار میں خود اٹھاؤں گا۔

اپنے یہاں اس لیے نہیں ٹھہروں گا کہ وہاں نہ سواری ہے اور نہ نوکر چاکر۔ یہی مقصد بے تکلفی کے ساتھ مطلع فرمایئے کہ میرے قیام سے آپ یا آپ کی بیگم کو کوئی الجھن تو نہیں ہو گی۔

آپ کا مخلص

جوش

۲۲۔۱۔۷۴ء

اسلام آباد

جوش صاحب کی کراچی آمد

میں نے اسی دن جوش صاحب کو مطلع کر دیا کہ آپ نے اپنے آنے کی خوشخبری دے کر بے چینیاں بڑھا دی ہیں اور یہ مژدہ جانفزا سنا کر کہ آپ غریب خانے کو عزت و رونق

بخشیں گے۔ میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ

میں اور جذبۂ وصل ہو ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

میں انشاء اللہ آپ کے تمام مشاق کے ساتھ چھٹی فروری کو کیسٹ اسٹیشن پر آپ کا منتظر رہوں گا۔

چھٹی فروری کو میں، راغب صاحب، سرور اقبال اور فراست رضوی کیسٹ اسٹیشن گئے۔ اور جوش صاحب بذریعہ تیز گام گیارہ بجے کیسٹ اسٹیشن پہنچے اور میں تمام احباب کے ساتھ جوش صاحب کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔

اس دفعہ جوش صاحب کوئی دس دن کراچی میں میرے ساتھ رہے۔ ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی۔ روزانہ احباب جمع ہو جاتے دنیا کا کون سا موضوع ہے جو موضوع گفتگو نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عالی امام، سرور بارہ بنکوی، راغب مراد آبادی، فراست رضوی، سرور اقبال، سلامت علی خاں تمام احباب جوش صاحب کو گھیر لیتے۔ میں اور جوش صاحب روزانہ سورج نکلنے سے پہلے بیدار ہو جاتے اور دور تک ٹہلنے چلے جاتے۔

ایک مرتبہ رات دیر تک جاگے۔ دوسرے دن صبح دیر سے بیدار ہوئے تو جوش صاحب نے اسی دن ایک نظم کہی جسے میں نے جوش صاحب کی آواز میں ٹیپ کر لیا۔

صبح دیر سے بیدار ہونے پر

خانۂ تاباں خورشید علی خاں

بلاک نمبر ۱ اعظم آباد، کراچی

آج سوتا رہا میں دیر تک روبہ خیمہ پر صدا کی ہا

آج بھی پی سکا نہ آنکھوں سے بادۂ ناب صحت افگار

آج بھی روح میں نہ گونج سکی دف و چنگ شعور کی جھنکار

آج بھی ڈھونڈتی رہی مجھ کو غازۂ صبح کی چمکار

آج بھی حیف ہو گیا برخاست محفل رقص و رنگ کا دربار

آج بھی حیف تا بہ دیر صبح کھنکھناتے رہے در بیدار

آج بھی دامن میں جھٹک نہ سکا — مفت اندھیرے کی حاشی کا ستار
آج بھی نیند نے تلف کر دی — حسن فطرت کی وہ نعمت بیدار
آج بھی سرنگوں رہا مجھ بن — نغمہ الوان و عشوہ انصار
آج بھی کنج میں اداس رہی — نکہت زلف دلبران سار
جیب و دامن گلان مشرق سے — آج بھی ہو سکا نہ بوس و کنار
آج بھی کھل نہ پائے بیچے میں — طرہ ہائے ثوابت و سیار
آج بھی سن سکا نہ مجھ کو کھل سے — لب ہائے پیمبران کبار
آج بھی دل میں چبھ گئی برچھی — آج بھی سر پہ چل گئی تلوار
آج بھی تا بہ شام دائے نصیب — سخ جو دست رہے گی بیکار
چاہ ظلمت سے ہائے کب نکلا — لٹ گیا جب یہ مصر کا بازار
حسن کے قافلوں پہ قافلے آئے — نور جاگا نہ قافلہ سالار
دل تھیں گو دو کر جنھیں تاریں — حیف گردن میں پڑ سکے نہ وہ ہار
جل رہے ہیں الاؤ سینے میں — وقتا رہنا عذاب انتظار
نہ کیا کعبہ سحر کا طواف — تف بجائے جوش حسن کے خمار
تجھ پہ اے بخت نارسا لعنت — تجھ پہ اے خواب ناز بیکار
تو نے اچھا کیا سمت اچھا — اے سپاہ صباح رہزن ہار
کہ سر جوش بے بصیرت پر — ٹھوکروں کے لگا دیے انبار

گریہ سحر گاہی:

ایک رات تین بجے میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جوش صاحب کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ میں نے آہستہ سے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جوش صاحب مسہری کے سرہانے کا ٹیکا لیے نیم دراز حالت میں بیٹھے ہوئے ہیں، آنکھیں بند ہیں اور روتے روتے ہچکی بندھ گئی ہے۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں اندر داخل ہو گیا۔ میں نے پوچھا جوش صاحب خیریت تو ہے، آپ کا مزاج کیسا ہے؟ کہیں خدانخواستہ کوئی تکلیف تو نہیں؟

میری آواز سن کر جوش صاحب کسی گہرے اضطراب سے چونکے۔ مجھے دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ رومال سے آنسو پونچھ کر کہنے لگے۔ ارے آپ کب آگئے؟ میں نے کہا کہ اتفاق سے میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ آپ کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ جب میں کمرے میں آیا تو یہ دیکھ کر سخت گھبرا گیا کہ آپ رو رہے ہیں۔ کہنے لگے اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مجھ پر اس قسم کی کیفیت اکثر طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو کہنے لگے ارے خورشید علی خاں، تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کس عذاب میں ہوں۔ جب میں نے بار بار دریافت کیا تو کہنے لگے "علت اعلل" کی تلاش ہے۔ ارے بھائی ہمارے حواس اس قدر محدود کیوں بنائے گئے ہیں کہ ہم خالق کائنات و حیات کا کماحقہ ادراک نہیں کر سکتے۔ پھر اس محدودیت پر روتے روتے مرجانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ بھی کیسا ستم ہے کہ وہ جس قدر ہمارے حواس کی گرفت سے دور دکھائی دیتا ہے، اس کے ساتھ عشق کی شدت میں اسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

میں نے کہا جوش صاحب آپ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا مکالمہ یاد ہے۔ جب خدا دریافت فرماتا ہے۔ اے جوش دل میں ہے کہ جگر میں، کہاں ہے درد؟

آپ فرماتے ہیں۔ اے واقف بطون دل عالم ... کہیں نہیں

خدا۔ کیا دل تڑپ رہا ہے مرے وصل کے لیے

جوش۔ اللہ رے عارفانہ تجاہل کہیں نہیں

اور پھر آپ کی وہ دعا

مجھ کو تو بلبلی دے دو ... شاہنشاہ کر
ہو سکے تو سر عرفان سے آگاہ کر
اپنے اصلی حال و خد سے آشنا کر دے مجھے
بندگی کب حسن مطلق سے جدا کر دے مجھے

جوش صاحب اگر میں آپ کی فکر کو کچھ سمجھ سکا ہوں تو کیا آپ کے ذہن نے، تخلیق کا جو بہت تراش "رکھا ہے اس کے دید کی آرزو میں آپ کی یہ کیفیت تو نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ جذبہ عشق کے دائرہ پذیر ہونے کے لیے کسی نہ کسی ملکہ محسوس کا ہونا ضروری ہے اور جب

تب اس بات کے قائل ہیں کہ یہ تمام کائنات اپنی بے مثال پوشیدہ اور ظاہرہ صفتوں کے ساتھ خود توانائی مطلق کا صفاتی مظہر ہے اور اس صفاتی مظہر میں تپ اور میں بھی شامل ہیں تو پھر تپ کا جذبہ عشق مجازی تو ہو سکتا ہے حقیقی نہیں ہو سکتا۔ جوش صاحب سب سے بڑی مرکزی شخص سے پیدا ہوتی ہے خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی۔ جب ہم اس توانائی مطلق کو مشخص کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ اس کے وجود کو کائنات سے الگ کر دیتے ہیں حالانکہ کسی شے کا وجود بے پرتو خورشید ممکن ہی نہیں۔ عالم خلق جو صرف صفاتی مظہر ہونے کی وجہ سے الگ الگ صورتیں رکھتا ہے اپنی حیثیت میں اسی وحدت کی تجلی کا مظہر ہے۔ بقول غالب

ہے مستعار وجود صور پر نمود بحر — یاں کب ادھر ہے قطرہ و موج و حباب میں

اس حقیقت کو آج جس طرح علم طبیعیات نے واضح کر دیا ہے اس سے پہلے فلسفہ کے ذریعے سے ممکن نہیں تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک نظریہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمام اجسام کائنات میں کیمیں یا مالیات پر مشتمل ہیں اور مالی کیمیں یا مالیات جسم یا باہر سے مل کر بنے ہیں اور جو ہر توانائی کا مشخص ہے تو اس توانائی کو کائنات سے جدا تصور کر کے اس کے عشق میں آنسو بہانا میری فہم سے بالاتر ہے۔

صاحب فرمانے لگے میں آپ ہی کے دلائل سے آپ سے گفتگو کرنے لگا۔ ہماری ان باتوں میں صبح نمودار ہو گئی۔ جوش صاحب مسکراتے ہوئے پلنگ سے اٹھے اور منہ ہاتھ دھو کر فرمایا چلو اب صبح کی سیر کا وقت ہو گیا ہے۔ باہر نکل کر آئیں اور ہم دونوں سیر صبح کے جھونکوں میں ٹہلتے ہوئے دور نکل گئے۔ ایک مقام پر رک کر ہم لوگوں نے ورزش کی اور ایک گھنٹے کی تفریح کے بعد گھر آئے۔ جوش صاحب نے شیو اور غسل کیا۔ تب میں ناشتہ آ گیا۔ ہم ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ سلامت علی صاحب آ گئے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نہیں پہنچے سبط حسن صاحب کے دفتر گئے۔ وہاں جوش صاحب نے "یادوں کی برات" کے تعلق سے قدیم اور جدید کا حساب لیا۔ سبط حسن صاحب نے حساب کر کے جو آمدنی ہوئی تھی اس کا چیک جوش صاحب کو دے دیا۔ وہاں سے پوتا تھیٹر بینک گئے وہاں برلی صاحب سے ملے کے بعد بابا دین شاہ صاحب تاجی کے آستانہ پر پہنچ گئے۔

بابا صاحب جوش صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ کامل مٹھائی اور چائے سے

تواضع کرنے کے بعد شاعری شروع ہو گئی۔ بابا صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا ایک شعر مجھے بہت پسند آیا۔ جوش صاحب نے بھی مکرر سنانے کی فرمائش کی۔ شعر یہ تھا۔

تھمنے سکا۔ حرم میں دل رمیدہ دیر
یہاں خدا کے تصور میں بت گری سی ہے

کوئی دو بجے تک یہ محفل شعر و سخن گرم رہی۔ پھر ہم گھر آ گئے تقریباً روز کا یہ معمول تھا کہ صبح ناشتہ کر کے ہم دونوں نکل جاتے۔ کبھی تو احسن صاحب عابدی کے ہاں کبھی مشفق خواجہ صاحب یوسفی کے دفتر اور کبھی روشن علی بھیم جی کے گھر تھوڑی دیر گزار کر بابا صاحب کے مکان چلے جاتے اور وہیں پھر گھر آ کر ایک گھنٹہ آرام کرتے اور شام کو تمام احباب ہمارے گھر میں جمع ہو جاتے اور اس وقت رخصت ہوتے جب جوش صاحب اپنی خواب گاہ میں چلے جاتے۔

بیگم کرنل نذیر کے گھر جوش صاحب کی دعوت:

چودھویں فروری کو جوش صاحب کی دعوت بیگم کرنل نذیر نے کی۔ ہم لوگ بابا صاحب کے گھر سے ڈاکٹر عالیہ امام اور ان کے شوہر کاظم امام صاحب کے ہمراہ بیگم صاحبہ کے مکان واقع ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی پہنچے۔ بابا صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے کرنل صاحب کے انتقال کے بعد بیگم صاحبہ اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔ موسیقی کا ست فوقی سے خود بھی اچھا گاتی ہیں گو عمر کافی ہے اور آواز میں جوانی کا رچاؤ کم ہو گیا ہے مگر راگ راگنی سے خوب واقف ہیں ڈاکٹر عالیہ امام خود بہت اچھا گاتی ہیں اور موسیقی کے فن سے بھی واقف ہیں سب کی فرمائش پر انھوں نے چند گیت سنائے۔ اتنے میں ٹی وی کے اداکار قاضی واجد آ گئے وہ اس گھر کے ایک بے تکلف فرد معلوم ہوتے ہیں انھوں نے بیگم صاحبہ کی موسیقی سے واقفیت کی بہت تعریف کی۔ پھر سب حضرات کی فرمائش پر بیگم صاحبہ نے ہارمونیم سنبھالا اور گیت شروع کیا۔

بیگم صاحبہ۔ بھگوتی مہری سادی سے ـــــ دیکھو بھیگے نہ چولی
دیکھو جی ـــــ بلم نہ مارو پچکاری

گیت کی لے، اس کا راگ، اس کے الفاظ اور بیگم صاحبہ کی رت بھی چاہتا تھا یہ بھی کا کبھی کبھی ختم نہ ہو۔ سب نے دل کھول کر داد دی اور ہر شعر کی کئی دفعہ گوایا گیا۔ جیسے جیسے گیت آگے بڑھ رہا تھا بیگم نذیر کی آواز اور ان کے سارنگی موسیقی سے وہ سماں باندھا کہ معلوم ہوتا تھا

بساط عشرت پہ گویا کنول کھلائے ہوئے
کھڑی ہوئی ہے جوانی نقاب اٹھائے ہوئے

گیت ختم ہوا تو غزل کی فرمائش ہوئی۔ بیگم صاحبہ یوں غزل سرا ہوئیں،

کب دل وہ مل گئے تھے سر رہ گزر کہیں
پھر دل نے مجھے نہ دیا عمر بھر کہیں

ڈاکٹر عالیہ نے مصرع اٹھایا پھر دل نے مجھے نہ دیا عمر بھر کہیں۔

جوش صاحب نے داد دی۔ واہ واہ واہ

بیگم صاحبہ نے دوسرا شعر شروع کیا۔

انداز اعتبار محبت تو دیکھیے
میری نظر کہیں ہے تو ان کی نظر کہیں
ان دوستوں کی کار گزاری تو دیکھیے
دل سے لگا لگا کے ادھر کی ادھر کہیں

غرض بیگم نذیر نے گائیکی کے سحر سے وہ سماں باندھا کہ ہر شخص خود فراموشی کے عالم میں وجد کر رہا تھا۔ اگر آپ آنکھیں بند کر کے انہیں سنیں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی بیگم اختر قبر سے ہیں۔ غرض یہ محفل جو فردوس گوش تھی، نہ معلوم کتنی دیر کے بعد قدرت کلام زبان پر ختم ہوئی۔

کینٹ پبلک ہائی اسکول میں جوش صاحب کا خطاب ۔ طالبات:

دوسرے دن بیگم بہ جناب، پرنسپل پبلک ہائی اسکول برائے خواتین کینٹ نے جوش صاحب سے مل کر یہ استدعا کی کہ وہ سولہویں فروری صبح کو ان کے مدرسے کے جلسہ تقسیم اسناد

میں شرکت فرما کر اپنے ہاتھ سے لڑکیوں کو اسناد تقسیم فرمائیں۔ جوشش صاحب نے جلسہ میں شرکت کا وعدہ فرمایا اور اس تقریب کے لیے ایک خطبہ بھی تحریر فرمایا۔ دوسرے دن یعنی سولھویں فروری کو میں اور جوشش صاحب صبح آٹھ بجے بیگم نور جہاں کے مکان پہنچ گئے انھوں نے بہت پرتکلف ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہم لوگ نو بجے تک ناشتے سے فارغ ہو کر مدرسے پہنچ گئے۔ جوشش صاحب کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ تقسیم اسناد کی کارروائی شروع ہوئی۔ جوشش صاحب نے اسناد تقسیم کیں اور اس کے بعد بچیوں سے یوں خطاب فرمایا۔

"اے بچیو، پیاری بچیو، سراج والی بچیو! میں مردوں کے کارنامے نہایت سے واقف اور ان کی عظمت کا لوہا ماننے والوں میں سے ہوں لیکن تم میں اور مردوں میں یہ فرق ہے کہ وہ لوہے کی چادریں ہیں تم ریشم کے پلو ہو۔ وہ کڑی دھوپ ہیں تم سہانی چاندنی ہو۔ وہ صحرا ہیں تم باغ محل ہو۔ وہ تلوار ہیں تم شمع بالے گلی ہو۔ وہ شعلے ہیں تم شب نم ہو۔ وہ چمن کا ہیں تم سر سے پاؤں تک چمن ہو۔ ہاں یہ تم اور صرف تم ہو جنھوں نے اس وحشی جانور یعنی مرد کو رام کیا ہے اور اس کو دیوانوں میں گھومنے والے کے پاؤں میں حاردار زنجیریں ڈال دی ہیں۔ مردوں کے گلے میں زمانہ حال کے پھندے پڑے ہوئے ہیں۔ تمھاری گودوں میں زمانہ مستقبل ہنک رہا ہے۔ تمھارے لیے تمھارے نشست و برخاست کے طریقے اور تمھاری فطرت ہے خاموش مدرسے ہیں جن کے سایے میں داخل کر کے سیمیں پردوں پر چڑھیں گی اور تمھارے کلمات زندگی بھر ان کے خون میں دوڑتے رہیں گے

اے بچیو میں چاہتا ہوں تم اپنی اہمیت سے آگاہ ہو جاؤ اور ابھی سے تیاری شروع کر دو ان فرائض کی جن کا بار تمھارے شانوں پر آنے والا ہے۔ چاہو تو پکڑ لو وقت دوڑ کو اور یاد رکھو کہ یہ زندگی چھوٹے چھوٹے لمحوں کے موتیوں کا ایک گتھا ہوا ہار ہے اگر تم نے اس کا ایک دانہ بھی ضائع کر دیا یا ایک موتی بھی توڑ ڈالا تو یہ ہار بدصورت ہو کر رہ جائے گا اور ایک موتی کے بعد تمھاری زندگی گھٹ جائے گی۔

وقت کا دھارا بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہر آن دھڑا دھڑ بہتا چلا جا رہا ہے اور ہر سانس ایک نئی تبدیلی پیدا کر رہی ہے۔ یہ تبدیلی کا کاروبار اس سرعت سے جاری ہے

کر دیتے ہیں تم اپنے چہرے کو دوبارہ دیکھ نہیں سکتیں۔ اس لیے کہ تمہارا چہرہ اور آئینہ دونوں تغیرات کے دھارے میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس کم سن کے موڈ کو غنیمت جانو اور اپنا رہنے کے واسطے مسلح ہو جاؤ۔ بیشک یہ تمہارے کھیل کود کے دن ہیں لیکن کھیل کود کی بے کوئی قدر بڑھے۔ روکو کہ وہ تمہارے حصول علم کے رستے کو کاٹ دے۔

بچو، گھبرا گھبرا کر علم حاصل کرو۔ اپنے دماغوں کے دریچوں کو کھولو اور اپنے شعور کی لاس کو ہر آن اکساتی رہو۔ میں تم کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ علم سے بے پروا کر کے تم ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھو گی تو تمام عمر دھوپ تمہارا تعاقب کرتی رہے گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ قدرت نے تم کو مردوں کی طرح قوی بنانے میں بخل سے کام لیا ہے لیکن ان کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ تمہاری ذہانت کے اندر وہ تخلیق ہے جو مردوں کی فطرت کے دبے کو کھا جاتی ہے۔ اگر تم نہ ہوں تو یہ کرۂ ارض تاریک رہتا۔ انسانیت و شرافت اور شاعری کو فروغ حاصل نہ ہوتا۔ اگر تم تعریف سنا نہیں سکتیں نہ چھوتیں تو انسان کے دل سے فاسد مادہ نکل نہ سکتا اور نوع بشر کی تلافی محبت کا چرخ حشر کے دن تک نہ چل سکتا۔

تم پر مردوں کو ترجیح دینے والے کہتے ہیں کہ قدرت نے آج تک تم میں سے کسی کو پیغمبری کا مرتبہ عطا نہیں کیا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس کو پیغمبری کی حاجت کیا ہے جس کو ہر تخلیق بخش کر حق کا منصب عطا فرما دیا گیا ہے۔"

خطاب ختم ہوا تو بچیوں نے تالیوں کی گونج میں جوش صاحب کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا اور اس طرح تقریب تقسیم اسناد اختتام کو پہنچی۔

اس کے دوسرے دن یعنی ۱۰ فروری کو جوش صاحب صبح تیز گام سے لاہور روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد ۲۲ اپریل ۱۹۷۰ء کا لکھا ہوا خط راحت صاحب کے توسط سے ۲۹ اپریل کو ملا۔ جوش صاحب نے لکھا تھا:

"مجھ افشاں، حسان و حنا بیاں، خورشید علی خاں کے پھر زندہ اجل ہو رہا ہے میرا کراچی میں۔ انتیسویں اپریل کو تیز گام سے چلوں اور اکتیسویں کو شہر کراچی پہنچوں گا۔ کیل کانٹے سے درست ہو کر، منشی آ جائے گا۔ سعادت علی خاں اور میاں رجب کو بھی اطلاع

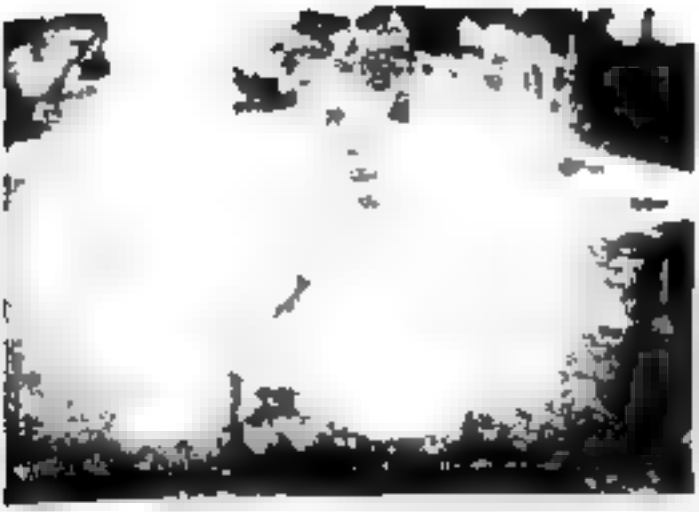

"ماہن" میں
حضرت خوش سلیع آبادی

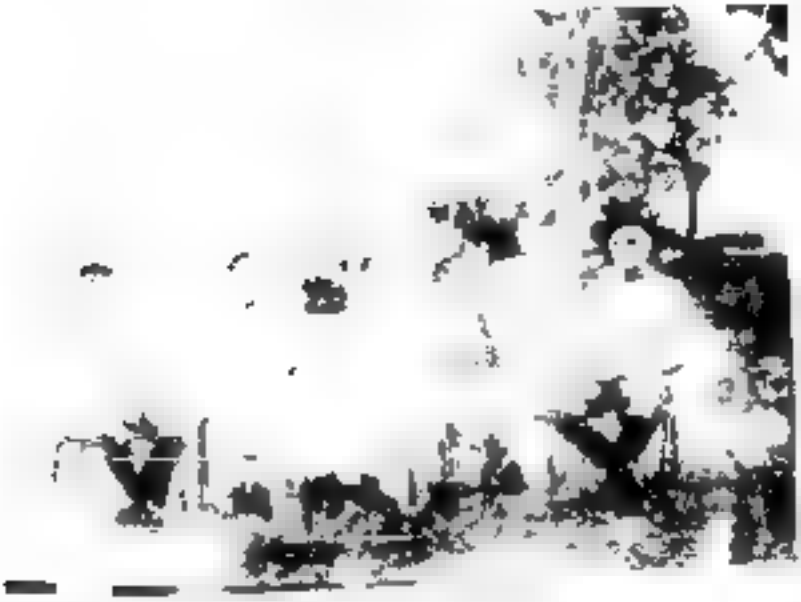

"ماہن" میں
خورشید علی خان، رائف صاحب، خوش صاحب، نسیم احمد صاحب، اور فرزند خان (دائیں سے بائیں)

دے دیجیے گا اور شعرائے امروہہ کو بھی۔

نیاز کوش

مرحوم جوش

۱۲۔۱۔۱۹۸۰

۲۵ [illegible]

منتظم [illegible] ایجنسیز

[illegible] اسٹریٹ اسلام آباد

ضروری۔ خورشید علی خاں کا پتا یاد نہیں رہا۔ یہ خط آج ہی ان تک پہنچا دیجیے

۱۰ ماس ۱۰ میں جوش صاحب کا قیام:

چنانچہ اٹھاسیویں پریل کو میں سلامت علی خاں، رضا صاحب مراد آبادی، فراست رضوی اور مرحوم اقبال کیفیت شیش پہنچ گئے اور جوش صاحب کو ہمراہ لے آئے۔ اس دوران جوش صاحب کے قیام کا انتظام ماہین میں کیا گیا جو بلڈنگ ناظم آباد کے بلاک ایک میں واقع ہے۔ یہ مکان میرے چچا جناب عبدالقیوم خاں صاحب کے (جو ریاست حیدرآباد کی طرف سے پاکستان میں بحیثیت سفیر تھے) انتقال کے بعد وراثتاً مجھے ملا تھا اور اس وقت خالی تھا۔ وسیع ان کشادہ کمرے اور ہر طرح سب سہولتیں مہیا تھیں۔ جوش صاحب یہاں کے قیام سے بہت مطمئن اور خوش تھے۔ اس کے علاوہ ہم سب احباب ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ صبح سویرے میں اور جوش صاحب لان پر ٹہلتے، ایک گھنٹہ بعد باتھ کی ورزش کرتے پھر جوش صاحب تو شیو اور غسل میں مشغول ہو جاتے اور میں ناشتے کا بندوبست کرتا۔ پھر دونوں ساتھ ناشتہ کرتے۔ اتنے میں کثر سلامت علی خاں یا رضا صاحب آ جاتے۔ اکثر ڈاکٹر عالیہ امام بھی سن ہوا اور شوہر کا نام ہم صاحب کے ساتھ آ جاتیں۔ اگر کسی دن دس بجے تک کوئی نہ آتا تو میں اور جوش صاحب مختلف احباب سے ملاقات کے لیے چلے جاتے۔ شام کو ہم لوگ لان پر کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ اس وقت تقریباً تمام احباب جمع ہو جاتے۔ ایسی ہی ایک شام کو راز صاحب مراد آبادی، راغب صاحب مراد آبادی، سلامت علی خاں، صفدر بلگرامی، ڈاکٹر عالیہ امام، فراست رضوی اور

سرور اقبال جب سب جمع ہو گئے تو شاعری شروع ہوئی۔ راز صاحب اور راجب صاحب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد تاش صاحب نے ایک نظم سنائی، جس کا عنوان ہے

اور اس کے باوجود

نوحِ انساں ہے گو تہہ و بالا شیشۂ تمدن ہے سر چھپا
چہرۂ زندگی ہے مٹیالا دم گھٹے میں ہے آگ کا ہالا
اور نہیں کوئی پوچھنے والا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

سیل کا شور ہے بیاباں میں رات لرزاں ہے بادو باراں میں
ناؤ ہے غرقِ غم فراواں میں موت جولاں ہے موجِ طوفاں میں
اور ناخدا بھی ہے گم صم سا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

ہر ترنم رواں ہے جانب آہ ہر ترنم کے دوش پر ہے کراہ
حادثوں کی ہے زندگی پہ نگاہ خیر سے دیو مرگ ہے نوشاہ
اور نوحِ جبر ہے شہ بالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

بیک فریاد کم سنوں کی نحوست رہبر کے راستے پہ بیٹھے بول
دودھ دیتی ہیں جزاریں کھول گھونسلوں میں ہیں ناؤ نوالوں
گھپ اندھیرے کے منہ میں اجیالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

گاہ دیپک بجھا گئی صرصر گاہ آندھی سے اڑ گیا چھپر
جل گیا آگ سے کبھی گھر بھر ناگ نے گاہ ڈس لیا آ کر
اور بس سے کبھی کچل ڈالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

گاہ بیوی بنی اجل کا شکار　　گاہ بیٹی پہ چل گئی تلوار
گاہ ماں کو کھا گیا آزار　　گاہ بابا پہ گر پڑی دیوار
گاہ بیٹے پہ چل گیا بھالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

بند ہیں رقص و رنگ کی راہیں　　بن ہیں پہلو تو سرد ہیں باہیں
زمزموں پر سیاہ ہیں آہیں　　شہر ہیں موت کی پرچھائیں
دہر سے آسماں کا پرچھا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

ہر نفس سے فروش دعوت شر　　جانب خیر کیا اٹھائیں نظر
صبح کو توبہ کی جو شرما کر　　تو بنے بیٹھے ہے بکم قدر
شام کو آ گئی مدھو بالا

اس مصرع پر سب حاضرین ایک ساتھ بول اٹھے۔
جوش صاحب پھر تو ضرور سبحان ربی الاعلیٰ ۔
جوش صاحب اس داد پر مسکرائے اور گلا بند سنایا۔

ہو گئے خوش بھی سوال و جواب　　مر کے بھی جھیلنا پڑیں گے عذاب
کج تربت کی توڑ کر محراب　　پیش رب جانے کا رہا نہ حساب
جبر قدرت کی گود کا پالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

اس طرح یہ محفل شعر و سخن رات دیر تک جاری رہی۔ اور سب نے مل کر یہ طے کیا کہ ہر ماہ جمعہ جمعہ تیسری سی کو دن میں ۱۰ بجے سے ایک شعری نشست منعقد کی جائے جس میں دیگر شعرا کے علاوہ بابا ذہین شاہ صاحب تاباں کو بھی مدعو کیا جائے اور تمام احباب کے لیے باہر کے کھانے کا بھی بندوبست کیا جائے۔ شعرا کا انتخاب اور ان کو مطلع کرنے کا کام راجب صاحب اور فراست رضوی کے ذمے کیا گیا۔ بابا صاحب کو خود جوش صاحب نے مدعو کیا۔

"ضامن" میں

حضرت ماہ ذہن شاہ تاجی اور جوش ملیح آبادی صدا جباب کے ساتھ

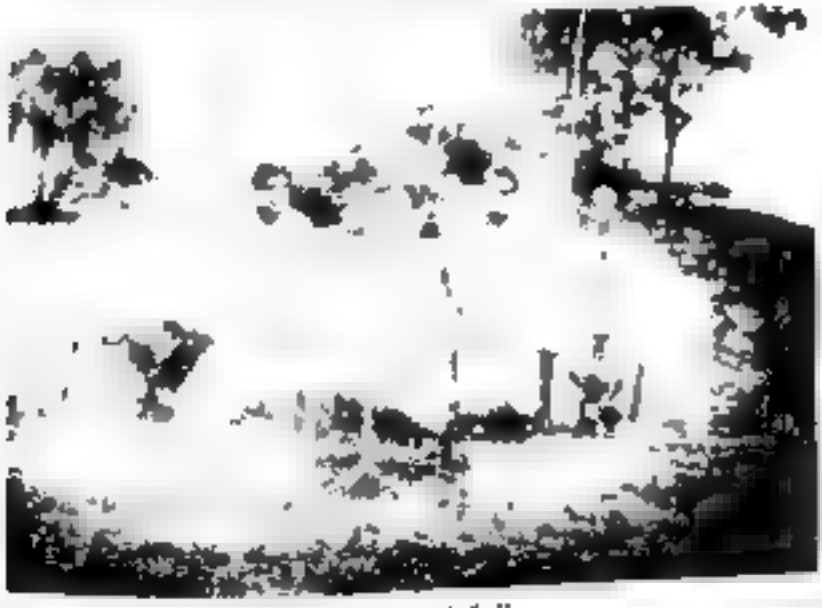

"ضامن" میں

رعب صاحب، جوش صاحب، اسیم احمد صاحب۔ اور فرخ جمال نواسہ جوش

"مامن" میں

واعظ صاحب، خورشید علی خان، جوش صاحب، میم، محمد صاحب

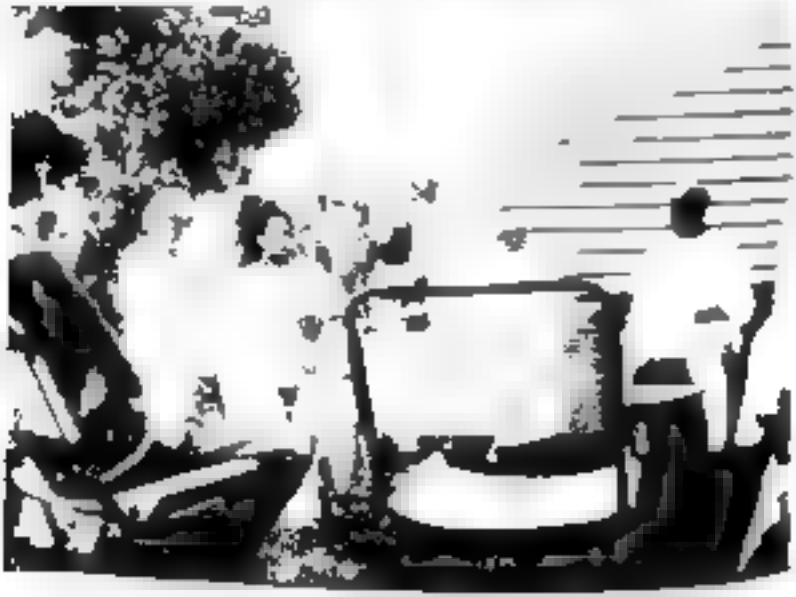

"مامن" میں

سلامت علی خان صاحب، واعظ صاحب، بابا صاحب اور جوش صاحب

"مامن" میں

بابا دین شاہ تاجی صاحب اور جوش صاحب مصروف گفتگو ہیں، خورشید علی خان، سجاد حیدر صاحب
رقیب صاحب، منور عباس صاحب اور نسیم احمد صاحب

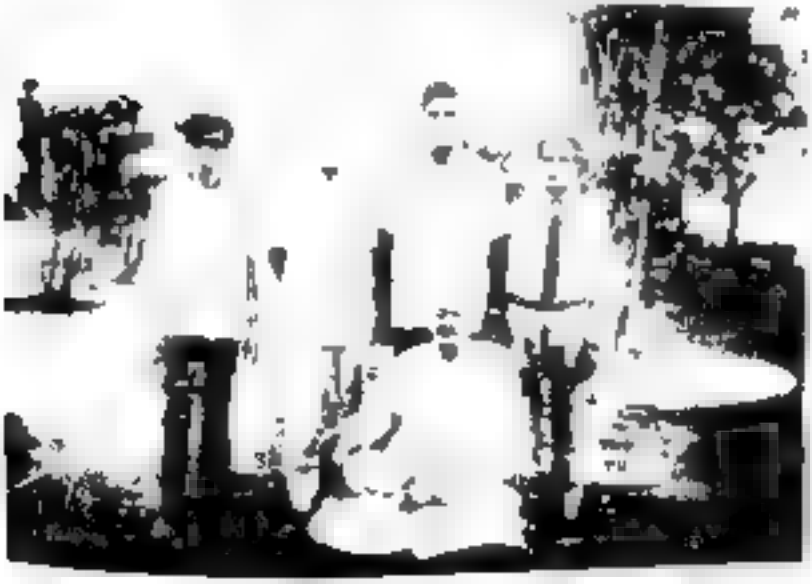

"مامن" میں

رقیب صاحب، خورشید علی خان، نسیم احمد صاحب اور فرخ جمال (نواسہ جوش)
جوش صاحب کے ساتھ

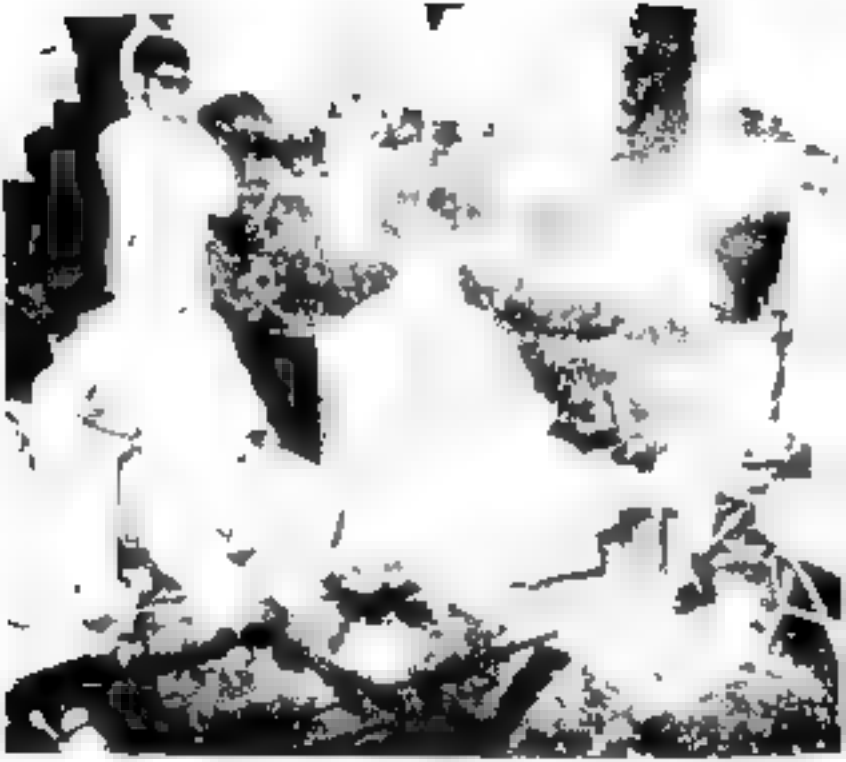

رغب صاحب با باذهین شاه تاجی صاحب در خوش صاحب

تیسری مئی کو تمام حضرات دو بجے ہی سے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی، راز مرادآبادی، سرور بارہ بنکوی، راغب مرادآبادی۔ دس بجے کے قریب بابا صاحب بھی تشریف لے آئے۔ فرحت رضوی اور سرور اقبال بھی آ گئے۔ ڈاکٹر علیم اللہ، اسلام مل خاں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مہمان گرامی تھے جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہے ہیں۔ تقریباً دس بجے جوش صاحب کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ سب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ جب بابا صاحب کی باری آئی تو انہوں نے یہ غزل پڑھی:

خاک سے قلزم و گل سنبل و ریحاں نکلے — تم بھی پردے سے نکل آؤ کہ ارماں نکلے
شیخ کے جامے میں آئے کو مسلماں آیا — کافر کے جامے سے نکلے تو مسلماں نکلے
کیا کوئی بزم حسیں ریزہ ریزہ اور بھی ہے — ہوں کیوں چاک جگر چاک گریباں نکلے
بند آنکھیں کیے ہم منتظر جلوہ رہے — جب کھلی آنکھ تو خود جلوہ جاناں نکلے
رنگ و بو قافلہ در قافلہ آئے تھے ذہن — چند مٹتے ہوئے سایے تھے گریزاں نکلے

سب نے ہر شعر کی دل کھول کر داد دی۔ جوش صاحب نے یہ شعر کئی دفعہ پڑھوایا۔

بند آنکھیں کیے ہم منتظر جلوہ رہے — جب کھلی آنکھ تو خود جلوہ جاناں نکلے

اس کے بعد جوش صاحب نے بہت سی رباعیات سنائیں۔ شاعری ختم ہوئی تو سب نے کھانا کھایا اور جمعہ کی نماز سے پہلے یہ نشست برخاست ہو گئی۔

پانچویں مئی کو جناب سید عباس صاحب ایڈوکیٹ کے وہاں دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ بابا صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ جوش صاحب نے اپنا طویل مسدس جس کا عنوان ہے "زندگی اور موت، مجاز اور اہل مجاز کی نظر میں" یہ دو بندوں پر مشتمل طویل مسدس ہے۔ جوش صاحب کے مراثی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعہ کربلا کو حق و باطل کی کشمکش میں ایک ملاقاتی جدوجہد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام کو ایک انقلاب آفریں تعمیری اقدار حیات کی حامل شخصیت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مسدس کا یہ انقلابی پہلو قدیم مرثیہ نگاروں کے برعکس ترقی پسند فکر کا آئینہ دار ہے۔ مسدس یہ تھا۔

زندگی اور موت

محمد اقبال کی نظر میں

ہے یہ وہ دیپ نفس و دارے حیات — شور جس کا گرہن بھی ہے جس کی صبح و رات
جس پہ ہی مدار حفظ حیات و حب ذات — کیا کہوں کیا اس میں جس کے جلوے کائنات

کچھ اسی کے بانکپن سے ہے کلا زندگی
یہ رہی ذات انسان ہے الز زندگی

یہ وہ ہے وہ قدم جو ڈگمگا سکتا نہیں — جس میں استقلال کے پھول کھل آسکتا نہیں
یہ کسی طوفان کو خطرے میں لا سکتا نہیں — یہ چراغ داری ہے جھلا سکتا نہیں

یہ دلوں کی تڑپ یہ دلوں کی جان ہے
رحل نفس آدمی پر یہ اتا قرآن ہے

تول کر دیکھ اپنی ذات پر پھر بھی جبیں — زندگی اور اپنی حیثیت پر لے آستیں
یہ ہو ممکن ہے کہ انسان توڑ دے جبیں متیں — حشر تک لیکن اتا سے ہاتھ اٹھا سکتا نہیں

یہ نا ہی تو محافظ ہے بشر کی جان کا
یہ نہ ہو تو دم نکل جائے غریب انسان کا

عزت حسب و نسب و دودمان و اقربا — جود و نخوت و رحم و عشق و نفرت و بیم و رجا
نعمت و قربانی و اخلاص و ایثار و وفا — حب دنیا حب عقبیٰ حب حق حب خدا

حرز و دیت کے سب ہیں جلوے احساسات کے
کتنے نقش اور رخ ہیں ایک حب ذات کے

نشہ ہر انسان کے دل پر ہے یہ سر خیال — ہیں ہوں صدر ظہور عقل و سلطان جمال
تم ہے صرف میرا فعل میرا انفعال — کچھ سے زیادہ ہے یہ کس ہی تب یہ کس کی مجال

ذات میری افتخار مہر و تخت ہے
کچھ سے برتر ہے کوئی تو کون؟ غیر اللہ ہے

قابل برداشت جب رہتا نہیں دردِ حیات — ڈھونڈھتی ہے تلخیٔ دہر میں راہِ نجات
اس عمل سے عقلِ انسانی میں آتی ہے یہ بات — ارتکابِ خودکشی تک ہے جنونِ جب ثبات

آدمی جیتا ہے سازِ ورگ عشرت کے لیے
اور مرتا بھی ہے تو دلچسپ اذیت کے لیے

شادماں ہوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے — نغمہ جاں کھوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے
کاٹتا بوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے — جاگتا، سوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے

کام رکھتا ہے فقط اپنی ہی مرغوبات سے
کس قدر انسان کو ہے عشق اپنی ذات سے

سوچتا ہے آدمی عرض و سما کچھ بھی نہیں — زیرِ محرابِ فلک میرے سوا کچھ بھی نہیں
مجھ سے کٹ جائیں اگر تو جیا کچھ بھی نہیں — رشتہ مجھ سے توڑ لے تو مدعا کچھ بھی نہیں

جملہ اشیا ہیں محبوبِ لب و گل جہاں میں
سب ہیں اعضا سینۂ فرش و دل کا دل جہاں میں

یہ عجب دھن ہے کہ ہر فردِ بشر کے ورد میں — صرف اپنا مدعا ہے صرف اپنی آرزو
صرف اپنا کروفر ہے صرف اپنی آبرو — صرف اپنا ذکر اپنی فکر اپنی گفتگو

کان دھرتا ہی نہیں کوئی کسی کی بات پر
کس قدر مفتوں ہے انسان اپنی ذات پر

خواہ کتنی برہمی ہو خواہ کتنی بیزری — خواہ کتنا ہی جھنجھوڑیں گردشیں افلاک کی
خواہ کتنی ہی بلاؤں میں گھری ہو زندگی — پھر بھی جینے کی دعائیں مانگتا ہے آدمی

تھرتھراتا تلملاتا بلبلاتا ہے بشر
زندگی کو پھر بھی سینے سے لگاتا ہے بشر

نغمہ بر لب جام بر کف گل بداماں زندگی — توسنِ طرف کہ و محرابِ مستاں زندگی
جلوۂ رنگ و چشمِ آب چراغاں زندگی — موجِ رقص و دجلۂ آہنگ و افشاں زندگی

صبحِ سوزِ دل ہے اس کے شعلۂ آواز میں
صرف کن کے رہ گئی ہے اس کے سازِ ساز میں

زندگی دشمن عناصر کا صدف شاہکار — رہا صبح و شام ضبط رنگ و نکہت و بار
دھوپ آب و آتش امتزاج بود و نابود — خرمن و برق تپاں کا تقاضے بوس و کنار
ایک تکوینی ضمانت اختلاف جنگ کی
ایک تعمیری ہم آہوشی بلعد سنگ کی

زندگی اضداد کا پیمان ملطف و اتفاق — دک ہم آہنگی میان جذبہ وصل و فراق
کی تمل میثاق ماہین جمود و انتشار — خیر و شر کا صلح نامہ شمع و صرصر کا وفاق
شبنم و خورشید کا عہد وفا ہے زندگی
دیکھیے تو بت پرکھیے تو خدا کی زندگی

زندگی فرماں روائے کشور دنیا و دیں — موجد صرف خرد و رحمت الناس
نوع انساں کے لیے ہے مہرباں دوز ہیں — موت سے بڑھ کر کوئی شے قابل نفرت نہیں
زندگی تکریم ہے توقیر ہے تمکین ہے
موت شاہراہ عمل کی سب سے بڑی توہین ہے

موت اندھیاری گھٹا ٹوپ آہوسی تیرہ شام — بے رکوع و بے سجود و بے قعود و بے قیام
شکل من مجذوب یعنی شل افسردہ خام — بے حرارت بے حکایت بے صداقت بے عزام
اس کے پتھریلے کلیجے میں کسک ہوتی نہیں
اس کے دیدوں میں مروت کی چمک ہوتی نہیں

ہوشت موت سے اٹھتا ہے سیوں سے دھواں — فرق ہستی پر کڑک اٹھتی ہے دہشت کی کماں
دل پہ رکھ دیتا ہے خوف مرگ وہ بار گراں — بولے گلشن میں نہیں زندگی کی بلبلیں
کوئی نرم آواز کوئی داستاں بھاتی نہیں
موت یاد آجائے تو راتوں کو نیند آتی نہیں

نیند ان میں دن کو بند دیتی ہے رات — اس کے کہ جھونکے سے بجھ جاتی ہے قندیل حیات
تھاس کا شامیانہ بسسکیاں اس کی قنات — اس کی بارگاہ کاندھوں پر نکلتی ہے برات
مسکرا کر آنسوؤں کے بند پر گاتی ہے موت
ہچکیوں کی گونج میں پیغام بھیجتی ہے موت

کتنی شکلیں میں بھرتی ہے یہ کرب ارتقاش — موت پل رہی ہے یہ کتنے گلشنوں کو خروش
روز تیشے کیا کرتی ہے کتنے پاش پاش — کتنے نوخیز سے جوانوں کی نمو ہے بے ہوش
کیا بتائیں روز کتنے پھول مرجھاتی ہے موت
ہاں سے کتنے جیتے جیتے چھین لے جاتی ہے موت

موت کیڑوں کی خزانے خسرو، قبروں کا مشاد — استخواں سوز و نفس گیر و توانائی شکار
جاں نگار و حلق دردہ روح کوب و جسم خوار — اس کی شاہی نالۂ جانکاہ، سسکی سوگوار
اسکے دام سخت میں آکر اکڑ جاتے ہیں لوگ
دفعتاً جلدی سے ہو جاتے ہیں تو سڑ جاتے ہیں لوگ

لیکن اس کے باوجود اسے محرمان، بین و کاں — سخت حیرت ہوں کہ تھا وہ کون دانائے زماں
موت کو جس نے دیا نام حیات جاوداں — اس قدر پرہول شے کو بنایا گلستاں
رہبر کو کس نے عرف آب حیواں کر دیا
اس پی ظلمت کو کس نے رگ جاں کر دیا

نوح انساں کو دیا کس فلسفی نے یہ پیام — مرد غازی کا کفن ہے ظلمت مرگ مدام
نعش کس نے کر دیے مقتل میں خوابوں کے خیام — جانتے ہو اس دبیر ذہن انسانی کا نام؟
وہ ابو کھی فکر تھا جو اک نیا پیغام تھا
اس حکیم نکتہ پرور کا لحد نام تھا

اے لحد، اے سوز توسن وقت رواں — اے لحد اے طبیب فطرت و سیاح جاں
اے لحد اے تنبیہ نفس و نقاد حیات — موت کو تو نے دیا بخشی آب و تاب جاوداں
روح گاں کے بیماری موت پر مرنے لگے
لوگ پیغام اجل کی تجدد کرنے لگے

حلق کو تو نے تمنائے شہادت بخش دی — اس تمنائے شہادت نے شجاعت بخش دی
پھر شجاعت نے بھیکے کی عزیمت بخش دی — اس عزیمت نے گداؤں کو حکومت بخش دی
اس قدر عجلت سے تو نے رہبری پر چھا گیا
مدعی چکرا گئے جمیع کو خلش ہو گیا

خاک کے ذرات کو تو نے ثریا کر دیا — آگ کو پانی کیا، پانی کو صہبا کر دیا
موت سی کالی بلا کو رشکِ سلمیٰ کر دیا — آخری ہچکی کو گل بانگِ مسیحا کر دیا
سر سے خوفِ نیستی کی بیڑیاں ٹال دیں
آدمی نے موت کی گردن میں باہیں ڈال دیں

یہ تصور موت کا جیسے ہی حسنِ کربلا — وقت دل پر کے تاریکی قلعے سے مٹا
خون میں تیرے گھرانے کے تلاطم آ گیا — لشکرِ صبحِ فروزاں، شام کی جانب چلا
دلستاں قصرِ بقا مسمار ہو کر رہ گیا
رعبِ شاہی نقشِ بر دیوار ہو کر رہ گیا

اے محمدؐ، موت وہ تیرے نواسے کو ملی — آج تک جس سے وہ خنداں ہے ضمیرِ آدمی
ہو اللہ روشنی تیرے چراغِ ذہن کی — کربلا کی دھوپ پر چھتری ہے اب تک چاندنی
یہ نبی پر سر نہیں تیری انا کا تاج ہے
کربلا تیرے مقامِ فکر کی معراج ہے

ہمنوا بحرِ صداقت کا حسین ابنِ علی — مدرسہ درسِ شہادت کا حسین ابنِ علی
مجھ فکری بجابت کا حسین ابنِ علی — حوصلہ تیری ہوت کا حسین ابنِ علی
جس نے بخشے دی نہ طبعِ آدمیت وہ حسین
سانس جس کے دم سے لیتی ہے مشیت وہ حسین

دل دگیر کربلا پر اے شہیدِ محترم — حشر ساماں ہے مگر جذبات کی آنکھیں ہیں نم
چونکہ تیرے جذبۂ نصرت میں ہے آہنگِ غم — اس لیے آنسو چڑھاتے ہیں تری باہیں پہ ہم
دل کا یہ قربان ہے لغزش نہ آئے پاؤں میں
جشنِ فتحِ کربلا ہو آنسوؤں کی چھاؤں میں

لیکن آنسو وہ جو برسائیں شرر رنگی — جس سے لپکے گوہرِ مژگاں دھار رنگی
جس کے تیشے میں ہو تیغِ آب دار زندگی — جن کی رنگیں میں کرشمے لے بہار رنگی
ہو گریں شادابیِ اہلِ جہاں کے واسطے
گلشن ہو بن جائیں طرزِ سروری کے واسطے

ہاں وہ آنسو جن میں تابانی ہو فروغِ خوفِ حق — جن کے گرنے کی صدا میں ہو شہادت کا سبق
جن کے آگے رنگ ہو تاجِ جہاں بانی کا فق — جن کی آب و تاب میں تاریخ کے جھکتے ورق
جن میں جوہر پر نمایاں ہو نمیشہ فرد کے
فرق کر دیں جو سچے اور استبداد کے

سوگواری کا مزا جب ہے رفیقانِ کبار — رخ پہ تابِ حزن ہو آنکھوں میں آبِ ذوالفقار
ہم مثالِ بلبلِ جنگ و نالۂ بے اختیار — دل میں حرماں غزاں ہو سر میں سودائے سوار
بات جب ہے غم اٹھائے جدِ پیکار پر
ایک دل پر ہاتھ ہو ایک ہاتھ ہو تلوار پر

جب حکومت قصرِ ظلم و عدالت ڈھانے لگے — جب طرودِ اقتدار اقدار پر چھانے لگے
خسروی آئین پر جب آگ برسانے لگے — جب حقوقِ نوعِ انساں پہ کڑکا آنے لگے
دل میں درد اٹھے تو شعلۂ خیبر شکن سے کام ہے
ان موقع پر حسینی بانکپن سے کام ہے

کس طرف جاتا ہے تجھ کو سوچ اے مردِ خدا — اک طرف رہبر لٹا ہے اک طرف سر جا
یا حسین سے تاج کردار شہید کربلا — یا محمدیا کشورِ باطل میں جا کر ڈوب جا
یا مسلمان دامنِ عالم جا سب حق موڑ دے
یا حسین ابن علی کا نام لینا چھوڑ دے

سانس لینے کو نہیں کہتے ہیں دنیا زندگی — ہر نفس اک طرح کی ہے تمنا زندگی
ہر قدم تسخیرِ قدرت کا ہے سودا زندگی — نقش میں ہے دوقا کا شور و غوغا زندگی
سرد ہے جس کا لہو وہ آدمی ہے جان ہے
بے دلوں پر زندگی دراصل اک طوفان ہے

اہلِ کوفہ ہیں سوار جاں لیل و نہار — اور تو تنہا ہے جرأت سے مجسم انکسار
تیری آنکھوں میں ہیں قصرِ جلالت کے شرار — سر ہے تیرا اور پلٹے صاحبانِ اقتدار
قوتِ باطل پہ تو انسان چھا سکتا نہیں
حشر میں وہ مصطفیٰ کو منہ دکھا سکتا نہیں

اے حسین اے غیرتِ حق کے امین اے دل و دماغ
اے دیدۂ عزتِ انساں کے داعی شہریار
اے سپہر بے زوال اے بے مثال ذوالفقار
بال پکار اپنے محبوں کو سرِ میدان پکار
نیند کے دامن سے جاگے عظمتِ کردار کو جھنجھوڑ
ہو چکی ہے صبح اپنے سوگواروں کو جھنجھوڑ

دیر کو گھیرے ہوئے ہے شورِ طبل و برق و باد
گھر میں برپا ہے تلاطم در پہ ہے ابنِ زیاد
اور میری سو رہی ہے نورِ سر پر ہے جہاد
کس طرف یا رب نکل جائے یہ عبدِ نامراد
الاماں، حد نظر تک ہے سیاہی کیا کروں
کوئی سنتا ہی نہیں میری الٰہی کیا کروں

ہو رہی ہے پھر برپا میانِ مشرقین
ہر نظر ہے یک ماتم ہر نفس ہے ایک بین
تخت پر سرمایہ داری ہے بصد اجلال و زین
اور نفس سے مس نہیں ہوتے محبانِ حسین
ہے یہی ایمان تو ایمان کو میرا سلام
اک فقط ایمان کیا قرآن کو میرا سلام

کبریا، پروردگارا، کردگارا، داورا
کب سے میری قوم گہری نیند میں ہے مبتلا
کب سے پامال ضمیر خواب ہے میری صدا
نیند آنکھوں کی اڑا دے، موت سینوں کی جگا
یا لگا دے سینۂ مومن میں مارِ زندگی
یا بجھا دے اے خدا میرا چراغِ زندگی

یہ طویل مسدس داد و تحسین کے طور میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ تمام سامعین نے ہر بند بلکہ ہر مصرع پر اس قدر زور شور سے داد دی کہ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ یہ مرثیہ خود امام حسینؑ کے نام سے اظہار عقیدت ہے یا ان نامور کو خراج کے طور پر اشعار کر کے جو انقلاب کا پیغام دیا گیا اس کی حرارت سے خون جوش مار رہا ہے۔ مگر بظاہر تو یہ تعریف کا جوش عقیدت ہی کی کرشمہ سازی معلوم ہو رہا ہے تھا۔ مگر بقول غالب

نہیں گر سرد برگِ ابر اک معنی
تماشائے نیرنگِ صورت ساعت

مرثیے کے موضوع پر گفتگو

بہرحال مسدس ختم ہوا تو میزبانوں نے دسترخوان بچھا دیا۔ ناشتے کے بعد محفل برخاست ہوئی۔ میں اور جوش صاحب اپنے گھر آ گئے۔ سہ پہر میں جب جوش صاحب تمام سے فارغ ہو کر ورانڈے میں آ کر بیٹھ گئے اور ہم لوگ چائے پینے لگے تو جوش صاحب نے کہا "کوئی موضوع چھیڑو"۔ میں نے کہا جوش صاحب! میں خود آپ سے گفتگو کرنا چاہ رہا تھا۔ ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں آپ جیسا اقبالِ ذہن کا مالک اور اس قدر قادر الکلام شاعر موجود ہے مگر لوگ اس کے کلام کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ آپ کے تمام مرثیوں میں انقلاب کا پیغام اس قدر واضح اور ترنگ لہجہ پر نمایاں ہے کہ اسے کوئی شخص نظر انداز کر ہی نہیں سکتا۔ مگر ہمارے عوام کے بلکہ زیادہ تر خواص کے بھی عقائد گزیدہ ذہن جن کو فرقہ وارانہ نفرت کا خون پلا پلا کر پروان چڑھایا گیا ہے اور جو ذکر کرنے اور تو ہاکی کو اہل بیت ہی سے عقیدت کا اظہار سمجھتے ہیں۔ ان کی جہالت کی بھینٹ صرف حضرت زینب کے بے ردا سر اصغر معصوم کے تیر حلق اور امام عالی مقام کے سر بریدہ جسم کی تفصیل سے آگے نہیں جا سکتی اور اس کے بعد ان کا تمام جذبہ یہاں پہ مخالف فرقے کے مسلمانوں کو ابن زیاد، شمر اور یزید کا طرف دار اور جانشین سمجھ کر واجب القتل قرار دینے لگتا ہے۔ حالانکہ اس واقعے کو ہزار سال سے زیادہ ہو گئے ہیں مگر انتقام کی آگ ٹھنڈی ہونے کے بجائے صاحب الذوالفقار اطفال گروہوں کے ہاتھوں ہر وقت بھڑکتی رہی ہے اور اسلام جو دنیا میں امن اور سلامتی کا پیغامبر بن کر انسانیت سے جہالت، تاریکی، فرقہ وارانہ بغض، اطفال اور ہر طرح کی منفی اقدار کو ختم کر کے تمام باطل طاقتوں کے جانے کے بعد کل انسانوں کا متحدہ محاذ بنانے کی خاطر خدا کا آخری پیغام بن کر نازل ہوا تھا اور جس نے چھ زمانے میں دنیا کی عظیم ناحق طاقتوں کے ایوانوں کو منہدم کر دیا تھا اور انسانوں کا خون چوسنے والے جاگیردار، سرمایہ دار اور معاشرے کے جرنیل، باطل بادشاہوں، قبائلی سرداروں، مذہبی پیشواؤں کے چنگل سے انسان کو آزاد کروا کے اسے خلیفۃ اللہ کے منصب جلیلہ پر فائز کر دیا تھا اور جس کو قرآن کے الفاظ میں یہ مژدہ جانفزا سنایا گیا تھا کہ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اور "ولقد کرمنا بنی آدم" کا واجب الاحترام مقام عطا فرما کر

دین اسلام کو ان کی زندگی کا لازمی عمل مقرر فرمایا اور یہ تاکید بھی فرما دی کہ "ولا تکونوا من المشرکین۔ من الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا" دیکھو ان مشرکین میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں اختلاف کیا اور گروہوں میں بٹ گئے لیکن اسلام کے سیاسی دشمنوں نے اس گھر کو اسی کے چراغ سے جلا کر خاک کر دیا اور کیا یہ سر پیٹنے اور ماتم کرنے کی بات نہیں کہ جنگ جمل سے لے کر جنگ کربلا تک مسلمانوں نے ہی مسلمانوں کے خون کے دریا بہائے اور اسلام کی وحدت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور قرآن کی اس واضح تعلیم کو کہ "و کانوا شیعا" نظر انداز کر کے متحارب فرقوں میں بٹ گئے اور ہر فرقہ "کل حزب بما لدیھم فرحون" ہر ایک کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہو گیا۔ آپ اپنے مرثیے میں جس انقلابی پیغام کو مسلمانوں تک پہنچانا چاہتے ہیں اس تک کیسے اس کی رسائی ممکن ہے؟ اور کیا ان کے ذریعہ سے مسلمانوں کو متحد کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے مثلاً۔ حسین اور انقلاب میں یہ بند۔

پھر گرم ہے فساد کا بازار دوستو — سرمایہ پھر ہے برسر آزار دوستو
ناکے پہ خوف اندک و بسیار دوستو — تلوار ہاں اٹھی ہوئی تلوار دوستو
جو تیغ تر ہو خون عدالت کو چاٹ کر
رکھ دے جو بیم و ترس کے پیالوں کو کاٹ کر

یا یہ بند۔

بل کھا رہے ہیں زہر میں پھر سیم و زر کے ناگ — گھیرے ہوئے ہیں گنبد گرداں میں شر کے ناگ
پھر ہیں رخش ہست کی تھامے ہوئے ہے باگ — تا آسماں بلند ہو سے زندگی کی آگ
تنے کو اپنی آنچ کے چولہے میں جھونک دے
ہاں جھونک دے قبائے امارت کو جھونک دے

اور جو مرثیہ آج ہی آپ نے سید عباس صاحب کے گھر میں پڑھا اس کا خاص طور پر یہ بند۔

جب حکومت قصر ہائے عدالت ڈھانے لگے — جب غرور اقتدار اقدار پر چھانے لگے
خسروی آئین پر جب آگ برسانے لگے — جب حقیقی روح انساں پہ کچوکے آنے لگے
رن میں در آ بقدوئے خیبر شکن سے کام لے
ان مواقع پر حسینی بانکپن سے کام لے

تو آپ یہ بتلیے کہ جن عقیدت مندوں کی محفلوں میں یہ انقلابی پیغام سنایا جاتا ہے ان میں سے کتنے لوگ اس پیغام کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کتنے لوگوں کے جذبات سرمایہ دارانہ نظام اور مفرور و جابر دل حکومت کے خلاف مشتعل ہوتے ہیں۔ اول تو خود آپ کے معتقدین کو اس بات پر اعتراض ہے کہ آپ مرثیے کو مسدس کیوں کہتے ہیں۔ دوسرے آپ کے مسدسوں میں جس عصر کا تذکرہ ہے۔ جب آپ کے نئے فاتحوں انقلابی کلام پر یہ ردعمل ہو تو آپ ان لوگوں سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ معاشرے میں کوئی تعمیری انقلاب برپا کریں گے؟

میں اپنی رو میں کہتا چلا گیا اور جوش صاحب نہایت صبر و سکون سے بیٹھے سنتے اور ہاں ہاں کرتے رہے لیکن جب میں خاموش ہوا تو جوش صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "خورشید علی خاں! یہ تو تم نے بالکل درست کہا ہے کہ مرثیوں سے ہمیشہ آہوں اور آنسوؤں کا کام لیا گیا ہے اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسینؑ کے کردار کو پیش کر کے مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ حسینی کردار کے حامل بن کر دنیا کی باطل طاقتوں کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا۔ آزادی کی جنگ میں بدیسی سامراج کے خلاف میں نے اپنی شاعری اور خاص طور پر ان مسدسوں سے بھرپور کام لیا اور لوگوں کے ذہنوں میں جہد و فکر کی شمع روشن کرنے کی کوشش کی مگر انقلابی ذہن سست آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے۔ میرا ایک شعر ہے

ہر گام پہ ہے فکر کو قرنوں کی ضرورت
اور عمر کی تقدیر میں ہے برق خرامی

اور جب تک تمام لوگوں میں تعلیم عام نہ ہو ذہنی انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا جوش صاحب نفسیات کا ایک اصول یہ ہے کہ عمل کی قوت محرکہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ دراصل داخلی تقاضا ہے عمل کا۔ اس طرح جب تک کوئی خیال یا فکر جذبے میں تبدیل نہ ہو وہ عمل کو نتیجت نہیں کر سکتی۔ اور مرثیوں میں جو جذبہ ابھارا جاتا ہے وہ غم اور ماتم کا ہے تو ماتم کا جذبہ جس عمل میں ڈھلے گا وہ صرف غم اور ماتم ہی کا عمل ہو گا اور اس کا دوسرا رد عمل ان اشخاص سے شدید نفرت ہو گی جو اس غم کا باعث بنے۔ اردو مرثیے میں آپ نے پہلی مرتبہ انقلابی فکر داخل کی ہے مگر واقعات کربلا پر ابھی تک جو غم اور بین کے نہایت

گھریلو اور دیہی ماحول چھائے ہوئے ہیں جن کو مرثیہ گو شعرا نے طوفانی تجربوں میں تبدیل کرنے میں اپنا تمام زور فن اس طرح استعمال کیا ہے۔ صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے۔ یہاں تک کہ میر انیس جیسا عظیم قادر الکلام شاعر بھی مرثیے کے متعلق کہتا ہے۔

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی خالی ہووے

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

اور اسی لیے کسی نے مرثیے کو مسدس کا نام نہیں دیا سوائے آپ کے۔ مگر خود آپ کے عقیدت مند حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے مرثیے کو مسدس کہہ کر اس کے مقصد کو فوت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب آپ پر بھی یہ اعتراضات ہوں تو آپ کیسے امید کر سکتے ہیں کہ آپ اس صنف سخن کے ذریعہ سے لوگوں کے جذبات کو سیدھی سے ہٹا کر معاشرتی انقلاب کی طرف منتقل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور مرثیوں سے پیدا شدہ عزت کو ملت بین المسلمین میں تبدیل کر سکیں گے اور تمام مسلمانوں کو لوکیت اور سرمایہ داری کے خلاف متحد کر سکیں گے۔ جوش صاحب نے کہا کہ ہمارا کام کوشش کرنا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے وہی انقلاب تو آہستہ آہستہ ہی آتا ہے اور میں نے مرثیے کو مسدس کہہ کر ہی کوشش کی ہے۔

شبیر بانو صاحبہ کے گھر شبیر حسن خاں کی دعوت:

یہ دلچسپ گفتگو جاری تھی کہ ڈاکٹر عالیہ امام آ گئیں۔ اس شام جوش صاحب کی دعوت ان کی بہن کے گھر تھی۔ چنانچہ ہم لوگ ان کے ساتھ ان کی بہن کے گھر حسین ولا سوا ٹاؤن چلے گئے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کی بہن شبیر بانو، میجر عبداللہ ریڈی کی شریک حیات ہیں۔ ان کے بہن بھائی ان کو بوا کے پیارے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ تعلق ہی کا سا بیت اہل حق رکھتی ہیں اس لیے حضرت جوش کی پرستار اور ادیبوں اور شاعروں کی قدردان ہیں۔ مکان گو بہت بڑا نہیں ہے مگر اس کی زیب و زینت مکین کے اعلیٰ ذوق جمال کی آئینہ دار ہے۔ گیٹ ہی سے رنگ برنگ کے گلاب دامن دل کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو گلدانے رنگ رنگ پائے نگہ میں زنجیر ڈال دیتے ہیں۔ شاید غالب نے ایسے ہی مقام کے لیے کہا تھا۔

گلشن میں بندوبست بہ رنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

مکان کے عقب میں بڑھاپے سے آج شام تمام مہمانوں کی نشست کا انتظام اسی لان پر کیا گیا تھا۔ جب تمام شعرا حضرات جمع ہو گئے تو محفل سخن گرم ہوئی۔ جوش صاحب نے پہلے تو کچھ رباعیات سنائیں پھر سب کی فرمائش پر اپنی نظم "جوانی یاد آتی ہے" سنائی

مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

قریب شام جب دھیمی ہوا نغمے سناتی ہے — سسکتے کنج پر جب سوگواری دوڑ جاتی ہے
شفق جب زندگی پر خون کے آنسو بہاتی ہے — میان گل سماں کام غزالوں کی رتھ جب آتی ہے
اداس کی مدھ میں جب ہر یک پتی کھڑکھڑاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

تھکے سے جھٹپٹے میں ہو نگھے لگتے ہیں جب منظر — فضا کی سوگواری اوڑھ لیتی ہے یہ چادر
طلسمی وادیوں میں اک بلا سا شور ہے ہست کو — کنول کی طرح دل کھلتے ہوئے قمر اک ساحل پر
مرے دل کے سمندر میں ندی جب ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نظر آتا ہے اک پھول کبھی جس وقت دامن میں — سسکتی ہے بدن کی سی چاندنی جب صحن گلشن میں
کوئی آواز مطار شب کو بوں گھلتی ہے جب بن میں — اور اک ویران عشرت گاہ کے خوابیدہ دامن میں
ہوا جس وقت کوئی رات کو سیٹی بجاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

سبک سر تتلیاں جب گونجتی ہیں بزم خوباں میں — کبھی زلفوں کی مہکیں تیرتی پھرتی ہیں ایوان میں
نگاہوں کے سپنے ڈوب جاتے ہیں جب افلاک میں — اور اس موقع پہ مجھ آشفتہ قسمت کی رگ جاں میں
نکیلی راگنی جب ڈوب کر برچھی لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

گھنی کے کنارے جب بیٹھیں جا بہ دوراں
وہ راتیں بولتی ہیں جو کبھی تھیں محرم راز
پرانی داستانیں جب سناتی ہیں مے معمول
اور اس موقع پہ گھبرا کر یہ یاد دلاتا جاناں

نظر جب ایک عاشق کی گھڑی کی سمت جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

افق پر پھوٹتا ہے صبح کا جس وقت غوغا
تھرکتا ہے سنہری وادیوں میں سرمئی دھارا
شعاعِ دھوپ چھاؤں کا پہن لیتا ہے اندھیارا
نظر آتا ہے آدھے چاند کے آغوش میں تارا

نور اپنی سیج کو جب زندگی ویران پاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

فلک کی جگمگاہٹ سے فضا کی مسکراہٹ سے
افق کی تھرتھراہٹ سرد شبنم کی لکھاوٹ سے
نمی کی ہاتھ گل پر درد کی دھیمی کنگناہٹ سے
نسیم صبح کے موجِ بوسوں کی چنچاہٹ سے

کلی میں جب چٹکنے کی تمنا رسماتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

ہوئے سرد چھوتی ہے لیٹیں جب دوشیزہ ترکاں کی
جگر میں پینگ لیتی ہے مہک انفاس خوباں کی
کھلی روشنی سے آنکھ کھل جاتی ہے بستاں کی
اور اس کے ساتھ ہی پہلی کرن صبح سماں کی

جب اس منظر سے ہوتے سینے میں چھو کر ٹوٹ جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کھلی ہے سرد وش ہوا جب شکریں سردی
لرزتے ہیں ستارے دوڑتی ہے چاند پر زردی
دل کو گدگداتی ہے تمنائے جہاں گردی
سسک جاتی ہے جب دھندلی فضا کی لگی سردی

کھلائی میں بولی صبح جب کنگن کھناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

لب کا رنگ لڑ کر جشن کی دھوموں کو مرجھا کر
ریاضوں کو بجا کر رنگ کے شعلوں کو بجھا کر
فضا کو لپکا کر مجھی کھڑوں کو سلوا کر
صبا کی قمچیاں کھا کھا کر آنکھیں کو دھندلا کر

قریب صبح جب شمع شبستاں جھلملاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جھلکتی ہے ستاروں کی ردا جب خوش لباسی پر
برستی ہے نکیلی مے کلاہی دل ربائی پر
اترتی ہے مشامِ آئینہ جب مہ لقاؤں پر
خدا سی دا کی گنگرو بجاتی ہے ہواؤں پر
نشیلی پھیرا ہی کھڑے ہے جب گھونگھٹ اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

گرجتے گونجتے کم بخت ساون کے مہینے میں
لگا دیتی ہے پانی کی جھڑی جب آگ سینے میں
شب غم کے دیکھتے کھولتے ٹھنڈے مہینے میں
بلکتی زندگی جب ڈوب جاتی ہے پسینے میں
مری سوئی ہوئی دم غم کو جب رو کھا جگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

ابھرتا ڈوبتا ہے چاند جب ابر گریزاں میں
کبھی ہلکا کبھی کاجل تحرک اٹھتا ہے میداں میں
ہوائے ساحل پُر غم کھنکتی ہے رگ جاں میں
ستارے غوطہ زن ہوتے ہیں سنگر کے شبستاں میں
تھکی جنا کو جب گنگا کلیجے سے لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

لرزتے ہیں در و دیوار پر یادوں کے جب سائے
نظر آتے ہیں جب گم کردہ مدہوش بال بکھرائے
ملک لگتے ہیں جب چاند کب سے تھے جو گھنائے
ہوا آتی ہے جب بکھرے ہوئے لمحوں کو مہکائے
تھنا جب گھپ اندھیرے میں تنگی راتیں جلاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مرا یہ چہرہ جو گوہر فروش و گل بداماں تھا
متاع گل رخاں تھا دولت محفل نشیناں تھا
کھلیانے نگاہوں کو بت اصنام دوراں تھا
جو کل کی بات ہے جب خانہ قوم حسیناں تھا
اب اس سے جب بہاروں تک مری آنکھیں چراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اٹھتے دوش پر گم کردہ لمحوں کی ردائیں
ہائے دعائیں، شکوے، شکوے، مناجاتیں
ہے چاندی کی تھالی میں دمکتی کندنی باتیں
مری گردن میں باہیں ڈالتی ہیں چاندنی راتیں
اور ان راتوں میں جب اتھل کی بیدی جھلاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

وہاں میری نگاہوں نے کل ہوشیں مچائی تھیں کبھی دانوں کے سینے میں وہاں بندوقیں چلائی تھیں
وہاں شیریں لبوں پر مدتوں مہریں لگائی تھیں جہاں کل رات بھوں سے صبح تک تیغیں چلائی تھیں
مجھے پہچان کر جب وہ گلی آنسو بہاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کبھی بلڑ گلی میں رات کو صدیا جتن کرتی تھکتی ہانپتی تھمتی ٹھہرتی سسکیاں بھرتی
مرتی اٹھتی دمکتی بدکتی بولتی مرتی سنبھلتی کانپتی مرتی جھجکتی جھینپتی ڈرتی
کسی کا در جب کسی انگلی سے آکر کھٹکھٹاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

پیالے کا پیالہ کر تھک کر مجسم شرم ساری سے کلائی میں بیک کنگن گھما کر بے قراری سے
بدن سا لڑکھڑا کر اک ادائے بادہ خواری سے دھنک کی سی لچکتی انگڑائی لے کر طرحداری سے
کسی کو دیکھ کر جب کوئی کم سن مسکراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مجھے کو مرنی صد ساز کر جاتا ہے جب بھنورا پیار عاشق کو بنا کر جاتا ہے جب بھنورا
کوئی کو لطیف تار کر جاتا ہے جب بھنورا کلی کو چوم کر پرواز کر جاتا ہے جب بھنورا
اور اس کے بعد جب تصویر شمعی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نیلے آسمان پر تیرہویں شب کا ماہ کامل نور افشانی کر رہا تھا۔ چاندنی رات، جوش صاحب کا اندازِ بیان اور ہر بند کا محاکاتی تاثر اس غضب کا تھا کہ ہر شخص اپنی اپنی یادوں کے اجڑے ہوئے گم کردہ محلوں کے تصور میں کھویا ہوا تھا اور جتنے چاند ماضی کے دھندلکوں میں گنگنا رہے تھے اس طرح سامنے آ گئے کہ ہر شخص کا دامن چاہِ یوسف کی طرح جھنجھنا بن گیا تھا۔

جوش صاحب نے واہ واہ کے شور میں نظم ختم کی مگر ہر شخص پر ایک عالم بے خودی طاری تھا۔ سب لوگ اس وقت چونکے جب ہوائے وقت کام و دہن کی طرف مدعو کیا۔

کھانے میں اس قدر تکلف کیا گیا تھا کہ بقول میر صاحب

سراپا پہ جس جا نظر کیجیے وہیں عمر ساری بسر کیجیے

غرض یہ پرلطف محفل رات دیر گئے اپنے اختتام کو پہنچی اور میں جوش صاحب کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔

رات دیر سے سوئے تھے مگر صبح سویرے بیدار ہو گئے۔ آج جوش صاحب لاہور روانہ ہونے والے تھے۔ اس لیے ان کے چہرے پر غیر معمولی مسرت کے آثار تھے۔ بات بات پر ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ دس گیارہ بجے تک راجہ صاحب مراد آبادی، فراست رضوی اور سردار اقبال بھی آ گئے۔ ہم لوگ ۲ بجے گھر سے روانہ ہو کر کینٹ اسٹیشن پہنچے تو جوش صاحب تین بج کر پینتالیس منٹ پر تیز گام سے لاہور روانہ ہو گئے۔ اس طرح جوش صاحب کا یہ سفر کراچی اختتام کو پہنچا۔

جوش صاحب کیا گئے کہ گھر کی ساری رونقیں رخصت ہو گئیں۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ "آپ کے جانے کے بعد تمام رونق کھانے کو آ رہا ہے۔ گھر کی رونق ختم ہو گئی۔ شہر ویران ہو گیا۔ دوست احباب کوئی صورت نہیں دکھاتا۔

تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے
شمع گل کھول ہوئی صبح خوش الحاں چپ ہے
افق دل پہ دکھائی نہیں دیتی ہے دھنک
گم ہوا موسم گل بر صد ارماں چپ ہے

نہ ادیب نہ شاعر نہ غم گسار کوئی
تم ہمنشیں تھے تو تھیں ہمنشینیاں کیا کیا

اس کے جواب میں جوش صاحب کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ ایک خط تو بالکل کاروباری نوعیت کا تھا مگر دوسرا ــــ خیر آپ دونوں ہی خط پڑھ لیجیے۔ ایک خط میں لکھا تھا۔ "حضرت خورشید، اس وقت کاروباری موڈ ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھوں گا۔ ہاں "good bye" سبط حسن کے پاس جائیے اور ان کے حساب کو جانچیے اور پک بجھا دیجیے۔

اب ـــــ لکھے گا اس سے زیادہ۔

آپ کا اسیر اخلاص و مودت

جوش

(۲۵۱) ۱۲/۱۰ ایمبیسی روڈ، ساتھویں اسٹریٹ

اسلام آباد ۲۰-۵-۶۲ء

قلم گھس چکا ہے ـــــ یہ خط بنائے دے رہا ہے مجبور کو

میری طرف سے عالم گیر قدر ـــــ سے ملیے اور ثواب کمائیے۔

اسی کے ساتھ دوسرا خط بھی تھا۔ لکھا تھا۔

(۲۵۲) ۱۲/۱۰ ایمبیسی روڈ، ساتھویں اسٹریٹ

اسلام آباد

۲۰-۵-۶۲ء

سیکھ

دل دھڑکے اور پیارے خوشبو۔ آج ہی صبح کو ایک خط لکھ چکا ہوں آپ کو۔ وہ سارا خط "کاروباری" خط تھا۔ ہر چند اس خط میں بھی "کاروبار" ہے۔ لیکن یہ پہلے خط کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوگا۔

پہلے "کاروباری" بات سن لو۔

صبا حسن نے دو ہزار روپیوں کے چیک کے ساتھ حساب بھیجا ہے۔ حساب کا کچھ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ دیکھیں اور سوچیں کہ کیا چال چلی ہے ـــــ صبا حسن نے۔

اس کے دوش بدوش "یادوں کی برات" کے پہلے ایڈیشن کی رقم بھی صبا حسن کے لگے ہی انگلیاں دخل کر گئی ہے۔

اس سلسلے میں آپ کو شفیع الحق سے ملنا ہوگا اور ان سے بار بار ملنا پڑے گا۔ جلیے اور

میری خاطر یاد رہ جائے ورنہ کل رقم ڈوب جائے گی۔

کیا بتاؤں اللہ کا وقت ہے تمام احساب ڈھیلے ہو رہے ہیں بڑی مشکل سے قلم چل رہا ہے۔ آپ کو اپنا مکان دیکھ کر میری یاد آ رہی ہے۔ مجھ سے پوچھیے کہ میرے دل کا کیا عالم ہے۔ شام کو آپ کی ان پر بیٹھ کر بی کس قدر خوش ہوتا تھا یاران خرابات آتے اور چھوڑتے تھے۔ اب وہ ساری خوشی غم میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے کیا ہم چھٹا تک بھر سکتے ہیں صرف اس لیے کہ بعد کو وہ من رو میں۔ لعنت اس کارخانے اور اس کے بنانے والے پر۔

مزے یہ کیا حرامی پن ہے کہ جس بات سے ہم ـــ بگڑتے ہیں ـــ اور اسی بات میں ـــ تمہارا دیتا ہے۔

اب ہم دونوں سارے رو رہے ہیں صرف اس جرم میں کہ ملے کیوں تھے۔ آپ کی ان پر بیٹھ کر ملے کیوں تھے۔

بات کانپ رہا ہے۔ طبیعت بجھی ہوئی ہے۔ زیادہ لکھنا مشکل ہے۔

آپ کا شیدائی

جوش

اس خط کے ملنے کے بعد میں سید حسن صاحب سے ان کے دفتر میں ملا۔ انھوں نے مجھے تفصیل سے تمام حساب سمجھایا۔ "یادوں کی برات" کی طباعت کے اخراجات کا گوشوارہ ان کے پاس ایک رجسٹر میں درج تھا۔ پھر جن جن دوکانداروں کو جتنی جتنی جلدیں فروخت کے لیے دی گئی تھیں اور ان سے جو کمیشن مقرر ہوا تھا اور جیسے جیسے ان سے قیمت وصول ہوتی گئی وہ تمام تفصیل تاریخ وار اس رجسٹر میں درج تھی۔ آمدنی میں سے دو ہزار کا ایک چیک وہ ارسال کر چکے تھے اور دوسرا چیک ارسال کر رہے تھے۔ میں نے جو کچھ سید حسن صاحب کے ریکارڈ میں دیکھا اس سے جوش صاحب کو مطلع کر دیا۔ اس کے بعد میں اپنے کاموں میں کچھ ایسا مصروف ہو گیا کہ ایک مہینے سے زیادہ جوش صاحب کو کوئی خط نہ لکھ سکا۔ اتنی مدت تک خط نہ بھیجنے سے جوش صاحب خفا ہو گئے اور انھوں نے سخت برہمی کا خط لکھا۔

جوش صاحب کا خط۔

میرے آپ بھی منور عباس "یو سو می صدور الناس" کے ماتحت دو لگے جن کو۔ مسٹر آنکھ بیٹ پیاز اوٹ" کہا جاتا ہے۔ میرے کراچی سے آنے کے بعد آپ نے ایک سطر بھی نہیں لکھی مجھ کو۔

مبارک ہو یہ سرد مہری یہ طوطا چشمی یہ ابوسفیانیت۔

جس نے بھی معاویہ کا نمک کھایا، وہ حق پر ظلم ڈھایا ہے۔ اب بھی میں یہ خیال ہے کہ اب کی آیا تو آپ کو خبر بھی نہیں کروں گا اور بے لے واپس آ جاؤں گا۔

ہم خورشید اور دل میں یہ حسرت شدید، اللہ دیا حضرت یزید۔

جوش

بھئی۔ اسے دانے برابر کے یاد رکھ باشد۔

۹۔۱۔۷۔ نصف بجے رات

بابا کیوں لکھوں جواب کی تکلیف نہیں۔ بھاری پتھر تھا۔ لفظ چوم ہی کر چھوڑ دیا۔

اس عتاب نامے کے جواب میں میں نے لکھا کہ "حضور والا اس سے پہلے آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں جس میں "یادوں کی برات" کے تعلق سے جو حساب سبط حسن صاحب سے دیا تھا وہ بھی شامل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو یاد نہیں رہا"

اس کے جواب میں جوش صاحب نے لکھا۔

"میری جان، خط ملا۔ غصہ فرو ہو گیا اور آنے لگا پیار آپ پر۔ آپ کا جلد جلد خط نہ آنے کا خطرہ تھا میں اور اس حیثیت میں آپ پر برس پڑا۔ میں اس مہینے کی سترہویں یا اٹھارہویں کو کراچی آ رہا ہوں۔ جب آؤں گا کلیجہ کر آپ کو کلیجے سے لگاؤں گا۔"

فتح الحق کے نام کا خط منسلک ہے۔ مل لیجیے۔ آپ میرے کام کے واسطے اپنا کام چھوڑ کر بیٹھتے ہیں تم کی احسان دار پر حسد کرتا ہوں تو بڑے رتبے کے ساتھ پیار آنے لگتا ہے آپ پر۔

(۳۰۰ ایف ۲/۱ اسٹریٹ (۲) اسلام آباد

پرسوں لاہور جا رہا ہوں، ایک ہفتے کے لیے۔ دل پھر طواف کوئے ملامت کو جانے ہے۔

جوش صاحب کی کراچی آمد:

اس کے بعد جوش صاحب تیرہویں اگست ۷۲ء کو کراچی تشریف لائے اور ان کے ساتھ ہی کراچی میں پھر سے بہار آگئی۔

محفل عشق میں وہ جوشش دوراں آیا
سے گرا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا
اسے کی تجھ سے کھل بادہ سر جوشش اہل
کہ نگہ تیں و شاہد مستاں آیا
دو اسے دیدا کہ وہ زہد شکن آ پہنچا
رخصت ایماں کہ وہ غارت گر ایماں آیا

اس مرتبہ انھوں نے اپنے ہی مکان میں قیام کیا۔ روز صبح نو بجے میں اور جوشش صاحب گھر سے نکل پڑتے زیادہ تر بابا صاحب کے آستانے پہنچ جاتے۔ پھر وہاں دوپہر تک سایہ دلچسپ باتیں ہوتیں، شاعری ہوتی۔ سہ پہر کو گھر آ جاتے اور شام کو جوشش صاحب کے مکان پر تمام احباب جمع ہو جاتے اور یہ محفل اس وقت برخاست ہوتی جب جوش صاحب لیٹ جاتے۔

فسانہ عزائم صاحب:

ایک دن میں اور جوش صاحب گھر سے دس بجے نکلے تو بابا صاحب کے گھر جانے کے لیے تھے مگر راستے میں راغب صاحب کے دفتر پر رک گئے۔ وہاں فراست رضوی اور ڈاکٹر لیسا احمد صاحب بھی آ گئے۔ ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ کچھ اور لوگ آ گئے

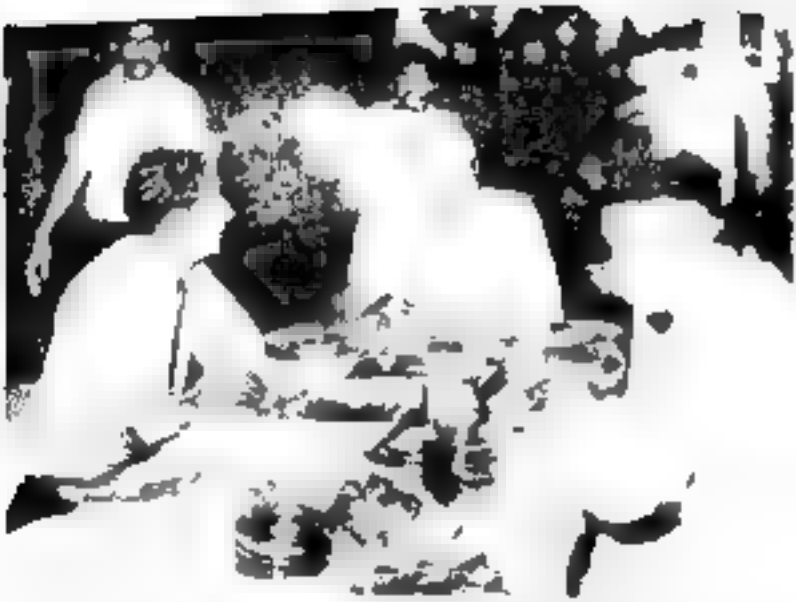

حافظ مراد آبادی، خوش مطبع آبادی، خورشید علی خاں مصور، ماہ نوش

ایک صاحب نے جوش صاحب سے کہا "جوش صاحب! آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

جوش صاحب نے خیریت بتانے کے بجائے فرمایا "جناب مزاج کیفیت مفرد ہے اس لیے ہم کہیں گے "آپ کا مزاج کیسا ہے" نہ کہ "مزاج کیسے ہیں" پھر گفتگو کا رخ زبان کی غلطیوں کی طرف مڑ گیا تو جوش صاحب نے کہنا شروع کیا "مرض کی جمع "امراض" ہے نہ کہ "امراکن" ـــ مگر مرض زمین کے معنوں میں بولا جاتا ہے اس کی جمع "امراض" ہے مگر فرق کے نزدیک مفرد تھی ـــ رکن کی جمع "ارکان" ہے نہ کہ "ارکین" ـــ اگر شرب سے "چھوٹ جانے" تو سے کانا لگتا کہتے ہیں۔ عام طور پر لوگ کہتے ہیں "آج کل بھی چادر اوڑھنی پڑتی ہے" یہ غلط ہے "چادر اوڑھنا پڑتی ہے" درست ہے۔ غرض زبان کی اصلاح میں ایک بج گیا تو جوش صاحب نے بابا صاحب کو ٹیلی فون کر کے کہا۔ "بابا صاحب میں آپ سے ملنا چاہتا تھا مگر وہ اصلاح مرام صاحب پیچھے پڑے ہیں کہ کیا کروں بے در بے سوالات پیش آنے کے میں مجبور ہو گیا ہوں۔ کل اگر زندہ رہا تو ضرور حاضر خدمت ہوں گا"۔

جوش صاحب کی دعوتیں!

غرض دو بجے تک راجب صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر گھر آ گئے۔ دوسرے دن صبح ہی بابا صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ وہاں نہایت پر تکلف ناشتے کا اہتمام تھا۔ خوب سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ پھر دوپہر تک ست پر لطف باتیں ہوتی رہیں۔ شام کو جوش صاحب کی دعوت بیگم اکرمل نذیر کے ہاں تھی۔ ڈاکٹر عالیہ امام، راجب صاحب، بابا صاحب اور بہت سی خواتین مدعو تھیں۔ بیگم صاحب خود بہت اچھا گاتی ہیں اور فن سے واقف ہیں۔ انھوں نے کچھ ٹھمریاں کچھ دادرے سنائے۔ پھر فرمائش پر کچھ غزلیں بھی سنائیں۔ موسیقی کے بعد کھانا شروع ہوا۔ جوش صاحب کے پسندیدہ کباب کئی قسم کے تھے۔ غرض کوئی گیارہ بجے یہ محفل برخاست ہوئی۔

دوسرے دن اٹھارہویں اگست کو بیگم بدر جہاں پرنسپل پبلک ہائی اسکول بدر نے خواتین کے گھر ناشتے کی دعوت تھی۔ اس کے بعد ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ میں اور جوش صاحب صبح آٹھ بجے ان کے گھر پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد اور مہمان بھی آ گئے۔

ہم تو بیٹھے کا تھا مگر عمر نے اور عطائیے سے زیادہ اہتمام کیا گیا تھا، اس کے بعد شاعری شروع ہوئی تو اس بزم میں صرف اس لیے شریک ہو گیا تھا کہ

روشن ہے بزم شعلہ رخاں دیکھتے چلیں اس میں وہ ایک نور جہاں دیکھتے چلیں

وہ بجے یہ محفل برخاست ہوئی اور ہم لوگ اپنے گھر آ گئے۔

ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر دعوت:

جوش صاحب کے کراچی کے قیام کے دوران میں سب سے زیادہ شاندار دعوت ڈاکٹر عالیہ امام صاحبہ کے گھر ہوتی تھی۔ عالیہ کو جوش صاحب سے والہانہ عقیدت اور محبت تھی اور وہ تقریباً روز ہی جوش صاحب سے ملنے ان کے گھر آ جایا کرتی تھیں۔ جوش صاحب کے گھر میں ان کی حیثیت بالکل ایک فرد خاندان کی سی تھی۔ بیگم جوش بھی ان کو اپنی بیٹی کی طرح چاہتی تھیں۔ جوش صاحب کبھی عالیہ کے گھر چلے جاتے اور وہاں تمام دن قیام کرتے تھے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ وہ جادو بیان مقررہ بھی ہیں اور خوش فکر ادیبہ بھی۔ وہ طالب علم بھی ہیں اور معلمہ بھی۔ خلاصہ سیاست کی جادو بیانی بھی ہیں اور محفل دانشوراں کی روح رواں بھی۔ تعلق پسند انقلابی ذہن بھی رکھتی ہیں اور پابند صوم و صلوٰۃ بھی۔ ماتم گسار اہل بیت رسول بھی ہیں اور اصحاب رسول سے عقیدت بھی۔ انھیں غم روزگار بھی ہے اور غم جاناں بھی۔ غزل کی طرف تمنا ہے حسرت کی ضیافت بھی۔ ایک شام جوش صاحب کے گھر تشریف لائیں تو چہرے سے کچھ فکرمند دکھائی دے رہی تھیں۔ جوش صاحب نے فرمایا عالیہ خیریت تو ہے آج تم چہچہاتی دکھائی نہیں دے رہی ہو؟ عالیہ کہنے لگیں کیا بتائیں جوش صاحب ہمارا حال تو بقول غالب یہ ہے کہ

ہزار آفت و یک جان ہے کہاں سے سنبھالے ہوا کے واسطے دے شاخ ہے کہاں فریاد

جوش صاحب نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک نسخہ بتاتا ہوں، وہ لکھ لیجیے اور اس پر عمل کیجیے پھر ایک کاغذ پر یہ اشعار لکھ کر عالیہ کو دیے۔

مشکلیں ہوں گی خود بہ خود آساں صدق دل سے بس ایک کام کریں
ہم مشکل کشا کا ورد مدام ڈاکٹر عالیہ امام کریں

عالیہ نے پرچہ لے کر راحت صاحب کا شکریہ ادا کیا پھر کہا کہ مگر اس وقت میں جس غرض سے یہاں آئی ہوں وہ یہ ہے کہ پرسوں یعنی ۲۲ ویں اگست کو آپ سب حضرات ہم پانچ کے میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ میں نے چند اور احباب کو بھی مدعو کیا ہے وہ سب جوش صاحب کا کلام سننا چاہتے ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا تو پھر اس میں فکر مند ہونے کی کیا بات ہے۔ ہم سب پرسوں وقت مقررہ پر تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔ عالیہ نے جوش صاحب کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گئیں۔

چنانچہ ۲۲ ویں اگست کو میں چار بجے شام جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں راحت صاحب بھی موجود تھے۔ پھر ہم تینوں ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر چلے گئے۔ انہوں نے اپنے وسیع و عریض دالان میں فرشی نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ تمام دالان سفید براق چاندنیوں اور رنگین گاؤ تکیوں سے سجا ہوا کسی مغل بادشاہ کا دربار معلوم ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ گلاب اور بیلے کے گجرے رکھے ہوئے تھے۔ فرش کے ایک سرے پر ایک تخت رکھا گیا تھا جس پر نہایت خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا۔ اس پر دبیز کا گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا اور تخت کے اوپر ایک نہایت خوبصورت مسند بنایا گیا تھا جس پر گلاب اور موتیے کے پھولوں کی لڑیاں پھیلا دی گئی تھیں۔ اس مسند شاہی کو "یادوں کی برات" کے نوشہ سے زینت بخشی گئی۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے مہمان بھی آنے شروع ہو گئے۔ جی الانا صاحب اور ان کے صاحبزادے پیارے علی الانا جو اس وقت سندھ کے وزیر تعلیم تھے تشریف لائے۔ وزیر تعلیم کے ساتھ معتمد تعلیم پناہ علی شاہ صاحب بھی آ گئے۔ جب تمام مہمان جمع ہو گئے تو عالیہ امام کی بھابی عدنان بالوے بادشاہ پر گیت سنایا جس کے بول تھے۔

ارے دیکھو جی موا جیا چرائے لیو جائے

جوش صاحب نے اس ٹکڑے کی دل کھول کر داد دی اور خود بھی کئی دفعہ دہرایا۔ ارے دیکھو جی کا جواب نہیں۔ واہ واہ واہ ارے دیکھو جی موا جیا چرائے لیو جائے۔ جوش صاحب جھوم جھوم کر داد دے رہے تھے۔ جب گیت ختم ہوا تو دوسرا گیت شروع ہوا۔

اندھریا ہے رات نجن رہیو کر جیو؟

جوش صاحب نے اس گیت کی بھی خوب داد دی۔ پھر فرمایا۔ ہندی شاعری میں صورت واقعی

ہوتی ہے مگر عشق میں بے پناہ خواہش سپردگی کے باوجود وہ کبھی بھی عزت نفس کو مجروح نہیں ہونے دیتی۔ میں نے اس کیفیت کو اس طرح ادا کیا ہے کہ

میرے نزدیک بیٹھے ہے وہ نیاز [illegible]

تو عورت کی شدید یہ خواہش ہے کہ اس کا محبوب رات کو اس سے جدا نہ ہو مگر خود اس خواہش کا اظہار نہیں کرتی بلکہ اس کو ڈراتی ہے کہ اندھیرا ہے رات ہے۔ پھر [illegible] کرتی ہے مگر یہ انداز ملتجیانہ کہ رہیو کہ جیو؟ یہ نہیں کہتی کہ رہ جاؤ کسی اور شاعر نے اس کو اس طرح کہا ہے۔

رات آدھی آ گئی کیا جاؤ گے گھر جاؤ گے
صبح کو جانا مرے گھر سے ہوا کھاتے ہوئے

جب گانے کا دور ختم ہوا تو جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش ہوئی۔ جوش صاحب نے پہلے تو دیا ہی سنائی۔

نکلی لب گل سے آہ خوشبو بن کر سر میں آئی رمیدہ آہو بن کر
سر سے گئی دل میں ان کی تصویر لیے تصویر ٹپکے گی آنسو بن کر

اس کے بعد ایک نظم سنائی، جس کا عنوان تھا "سہانی سزائیں"۔

سہانی سزائیں

کیا اک بت کو پھر مہمور لطف بے کراں تو نے
یہ مجھ پر کیا ستم ڈھایا مرے اس دل جاں تو نے
محبت کے شرارے دے کر اک تھکتی جوانی کو
جلا ڈالا مری فرزانگی کا خانماں تو نے
کسی بوغیز کے اڑتے ہوئے آنچل کی برش سے
اڑا دیں مری جیب تمکنت کی دھجیاں تو نے
متاع عقل کو میری نگاہوں میں سبک کر کے
ملا دی خاک میں افکار کی جنس گراں تو نے

اتی دیکھی جو میری مسند آیات و اخلص پر
تو دل کے پار کر دی ایک کھڑے کی سناں تو نے
مرے آگے سیاہ گیسو کی دیواریں کھڑی کر دیں
مرا دھاوا جو دیکھا سوئے قصر لامکاں تو نے
جو شمع ذات کو میں تاب عیں کی رو پہ لے آیا
مسدود کر دیا آنکھوں پہ زلفوں کا دھواں تو نے
سبق لیتے مجھے دیکھا جو خار و خس کے مکتب میں
مجھے الجھا دیا سرو و سمن کے درمیاں تو نے
مجھے گرم عمل جب چلچلاتی دھوپ میں پایا
ہٹا دیں میری جانب گھر گھرتی بدلیاں تو نے
جو کانٹے میری منطق کے چبھے قلب حقائق میں
تو دے دیں پھول سی باتوں کی مجھ کو بدھیاں تو نے
حد پوشی پہ قانع ہو گئی جب پختگی میری
تو میرے دوش کو دے دی قبائے پرنیاں تو نے
مرے سینے کے شعلوں کو جو کجلاتے ہوئے دیکھا
تو اک دھڑکے دل میں بھر دیا سوز سناں تو نے
مرے انفاس سے اٹھتی ہیں اب نکہت گل بھی
کیا ایسا نڈھال اے دشمن جاں و تواں تو نے
مجھے آغوش تنگ و حد بزاں میں بھچوا کر
مری فرزانگی کی توڑ ڈالیں پسلیاں تو نے
جو میں گرجا سرابندیں کے متوالوں کی حلقوں پر
تو مجھ کو بخش دی موسیقی آب رواں تو نے
جب آدھی رات میں لے کر چکا اقلیم حکمت کی
تو پہنا دیں مجھے زلف رسا کی بیڑیاں تو نے

مقتل کر چکا ہیں وہ جب ایمان سداقت کا
تو نازل مجھ پہ کر دی اک ایسی نظم خوش تو نے

مرے بشرنا جب دیکھا لرزاں عرش و کرسی پر
تو دل میں کھول دی میرے نگیں کی دو کلیں تو نے

جو میں نے صلح کر لی کہ وہ قامت دلق پیری سے
تو کڑکا دل مرے سر پر جوانی کی کمال تو نے

مرے طبل بغاوت کی گرج پہنچی جو تا گردوں
تو رشوت میں عطا کر دیں کھنکتی چوڑیاں تو نے

جو آتے آتے ہوئے دیکھی حرم کے آشیانے پر
تو بھر دیں جوش کے دل میں کروڑوں بجلیاں تو نے

جلسوں کی گونج اور واہ واہ کے شور میں جوش صاحب کی نظم ختم ہوئی۔ جوش صاحب کو واقعی بے حد پسند آئی تھی کہ ان کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ اس وقت تمام گلاب کے پھولوں کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا ہے کہ چہرہ جوش کے بجائے وہ مرکز نگاہ بنے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب نے تمام بند اتار کر پہلو میں رکھ لیے۔ اس کے بعد کھانا شروع ہو گیا۔ اس دوران میں بی اے اے صاحب نے مجھے اپنی انگریزی کی چند نظمیں دے کر کہا کہ جوش صاحب سے ان کا منظوم اردو ترجمہ کروا دیں۔ میں نے وہ نظمیں لے کر کہا کہ کوشش کروں گا مگر جوش صاحب کا موڈ ہوا تو وہ ترجمہ کر دیں گے۔ کھانا ختم ہوا تو سب مہمان رخصت ہوئے اور ہم لوگ کوئی ایک بجے اپنے گھر پہنچے۔ دوسرے دن صبح ہی میں جوش صاحب کے گھر گیا اور ان کو اے اے صاحب کی نظمیں دے کر ان سے درخواست کی کہ وہ ان کا منظوم ترجمہ کر دیں۔ جوش صاحب نے کہا پڑھ کر سناؤ۔ میں نے انگریزی میں وہ نظمیں پڑھ کر سنا دیں۔ فرمایا ان میں سے ہر ایک کا مطلب بھی بیان کرو۔ میں نے وہ بھی کر دیا تو انھوں نے وہ کاغذات رکھ لیے۔

کسٹم کلب کا مشاعرہ

اسی دن یعنی چوبیس اگست کو رات میں کسٹم کے پریوشنتی کلب میں مشاعرہ تھا جس کی صدارت مولانا کوثر نیازی فرمانے والے تھے۔ مولانا اس زمانے میں دیر الطلعات و نشریات تھے۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ تمہارے دوستوں میں کوئی ایسا ہے جو کسٹم کلب کے قریب رہتا ہو جہاں ہم دن ہی جا کر قیام کر سکیں اور جو ہمارے کمرے کو دوپہر ہی اتنا تھنڈا کر دے کہ ہم سمجھیں کہ موسم خراب گیا ہے اور ہم تین بجے دن ہی میں ڈرنک وغیرہ سے فارغ ہو کر سو جائیں اور رات بارہ بجے بیدار ہوں تو یہ کہا جائے کہ صبح ہو گئی ہے اور ہم غسل کر کے مشاعرے میں ایک بجے کے قریب پہنچ جائیں۔ میں نے مشاعرے کے منتظم پریوشنتی کلب کے نائب صدر انور احمد صاحب صدیقی کو فون کر کے جوش صاحب کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ انور بھائی نے کہا کہ ان کا مکان کسٹم کلب سے بالکل متصل ہے اگر میں جوش صاحب کو بارہ بجے دن تک وہاں پہنچا دوں تو وہ تمام انتظام کر دیں گے۔ طرحی میں جوش صاحب کو لے کر بارہ بجے کیماڑی انور احمد صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ انور بھائی نے اپنے بیڈروم میں گہرے نیلے رنگ کے پردے ڈلوا دیے تھے۔ برف کا بستر چلا دیا اور سایت آرام دہ بستر پر جوش صاحب کو لٹا دیا۔ گھڑی میں تین بجے کا الارم لگا کر گھڑی ان کے بستر کے قریب اسٹول پر رکھ دی۔ جب جوش صاحب سو گئے تو گھڑی کو تین گھنٹے آگے کر دیا اس طرح کہ جب تین بجے کا وقت ہو تو گھڑی میں چھ بجیں اور جوش صاحب سمجھیں کہ اب موسم خراب ہو چکا ہے تو ان کو ڈرنک اور رات کے کھانے سے فارغ کر کے پھر چھ بجے تک پھر سلا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا گھڑی نے تین بجے چھ بجے کا الارم بجایا۔ جوش صاحب بیدار ہو گئے کمرے میں اتنا اندھیرا تھا کہ شام کا گمان ہوتا تھا۔ ان کا منہ ہاتھ دھلا کر ڈرنک کا سامان رکھ دیا گیا میں ساتھ بیٹھا رہا۔ انور بھائی مشاعرے کے انتظامات میں مشغول تھے مگر بار بار آ کر دریافت کرتے رہتے تھے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ طرحی جوش صاحب پیے اور کھانے سے فارغ ہو گئے تو ان کو پھر سلا دیا گیا۔ اس کے بعد میں بھی انور بھائی کے ساتھ کلب کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ دس بجے کے بعد مہمان آنے شروع ہو گئے۔ مولانا کوثر نیازی تشریف لے آئے تو کلب کے سیکرٹری کالم صاحب نے مشاعرے کا آغاز کیا اور مولانا کا شکریہ ادا کرتے

بولے کہ دیا کہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ مولانا کوثر نیازی وزیر مملکت ۔ حکومت پاکستان نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ہمارے بے وقت نکاح پر اس مجلس شعرا کو اپنی شرکت سے رونق بخشی ۔ سیکرٹری صاحب کا جواب مولانا نے اس طرح دیا کہ ۔ کسٹم والے بے چارے مراعات میں مست سنگدل ہوتے ہیں وہ اپنا محصول وصول کرنے میں کسی سے بھی رعایت نہیں کرتے ۔ اب یہی دیکھیے کہ ایک طرف تو مجھے مہمان خصوصی بنا کر صدر صدارت پر بٹھا دیا مگر اس کے ساتھ ساتھ میرے منصب وزارت سے محصول بھی کاٹ لیا اور مرکزی وزیر کے بجائے مجھے وزیر مملکت بنا دیا" مولانا کے اس دلکش طرز پر محفل تو محظوظ ہو رہی تھی مگر میاں کاظم بارے شرم کے مارے یہ کھلانے کہ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں ۔ شاعر انور بھائی نے ان کی طرف سے مولانا سے معافی مانگی اور مولانا نے بہ کمال شفقت و مہربانی بات کو اس کو ٹال دیا ۔ حالانکہ ۔ گر بگڑ بیٹھتے وہ لائق تعزیر بھی تھا ۔

رجب صاحب مراد آبادی نظامت کے فرائض ادا کر رہے تھے ۔ ہر شاعر کو وہ فی البدیہہ شعر میں دعوت سخن دیتے اور جب تک وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ، بیکرو مائک تک پہنچتے ان کی شان میں ایک رباعی یا ایک قطعہ فی البدیہہ پڑھ دیتے ۔ مشاعرہ شروع ہوا ۔ تمام مہمانان گرامی تشریف لے آئے ۔ شیفتہ صاحب بھی آ گئے ۔ سب کی نگاہیں جوش صاحب کو ڈھونڈ رہی تھیں ۔ مولانا کو انور بھائی نے بتا دیا تھا کہ جوش صاحب ایک بجے تک آ جائیں گے ۔ چنانچہ ہم اور انور بھائی بارہ بجے جوش صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے ۔ ان کی گھڑی تین بجا رہی تھی ۔ جوش صاحب اپنی عید پوری کر چکے تھے ۔ نہا کر غسل کر کے تازہ دم ہو کر ایک بجے ڈائس پر تشریف لے آئے ۔ مولانا نے استقبال کیا اور اپنے پہلو میں بٹھایا ۔ جب تمام شعرا اپنا اپنا کلام سنا چکے تو آخر میں جوش صاحب کی باری آئی ۔ جوش صاحب نے کچھ رباعیات سنائیں اور پھر یہی نظم "عذاب دوراں" سنائی

عذاب دوراں

خداوندا مقدر دشوار رکھا جائے گا کب تک
مرے جلوے کو پامال رکھا جائے گا کب تک

ان اپنائے جاہلت حاکمان دشت فطرت کو
مرا کتا مرا سردار رکھا جائے گا کب تک

اس شعر پر مولانا کوثر نیازی نے فرمایا۔ جوش صاحب! یہ مت بھولیے کہ آپ ہماری وزارت سے اب دوسری وزارت، وزارت تعلیم میں منتقل ہو چکے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ کا اشارہ میری طرف ہے۔ مگر جوش صاحب نے صرف ایک مسکراہٹ سے ان کا جواب دیا اور کلام سناتے رہے۔

مجھے ان جاہلان و موقعان سطلہ پرور میں
خداوند ذلیل و خوار رکھا جائے گا کب تک
مرے قرآن تد الفتال و ادق تاویت کو
بغیر جام و دینار رکھا جائے گا کب تک
ارے ان کتب دکانی کے دیوانوں کے ترنے میں
مجھے سجدے کنار رکھا جائے گا کب تک
اسی انساں کو جو رکھیر دو عالم توڑ بیٹھا ہے
میان جور و زنار رکھا جائے گا کب تک
الٰہی ان سماعت مردہ بادر داد سہروں میں
مجھے شرمندہ گفتار رکھا جائے کب تک

آخر میں مولانا کوثر نیازی نے اپنا کلام سنایا اور سفیدی سحر کی سمود پر یہ مشاعرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

جوش صاحب کی لاہور روانگی

ستائیسویں کو جوش صاحب نیو کام سے لاہور جانے والے تھے میں صبح ہی ان کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب نے مجھے انیس صاحب کی چاروں نظمیں بیع ترجمے کے لوٹا دیں اور فرمایا رات تین بجے ہی سے آنکھ کھل گئی تھی۔ طبیعت موزوں تھی۔ میں نے ان چاروں نظموں کا ترجمہ کر دیا ہے تم دیکھ لو۔ رہنے میں ڈاکٹر عابد امام اور واجب صاحب بھی آ گئے۔ سب نے

ترجمہ سے پسند کیا۔ ترجمہ کا ایک ایک لفظ جوش صاحب کی رجائیت، زندہ دلی اور ان کے نظریہ حیات کی توانائی کا آئینہ دار ہے۔ اصل نظموں سے جب آپ ترجموں کا مقابلہ کریں تو پہلے ہی لفظ سے آپ کو جوش صاحب کا رجائی انداز نمایاں محسوس ہوگا مگر اس کے باوجود پوری نظم مفہوم، سایت، تصویر کشی سے ادا ہو جاتا ہے۔

جوش صاحب کی نظموں کا منظوم ترجمہ

پہلی نظم اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

The light of the inner shrine

Do not like yesterdays cyclone come, its teeth bloody with destruction

Come like the spring,as the harbingerof joy and song

Let laughteraprout from every branch of the tree,

Where the birds may sit, lost in song and ecstasy,

Time will age, but the hills will remain ever young,

Like some trees returning green in every season,

Remove the gloom that dose with in my door ways,

Wipe away the cobwebs of despair that darkens my to-day.

Come tomorrow with laughter,joy and sunshine,

And enable me to behold the light of inner shrine.

نورِ باطن

پہلی آ اسے جان کاتی ہوئی
سمٹی لچکتی لہراتی ہوئی

کل آ کل کا سا طوفان بن کر
تباہی، سیاہی کا عنوان بن کر

برسو اس طرف مسکراتی ہوئی
جوانی کی پھلجھڑی دکھاتی ہوئی

چلی آؤ گھونگھٹ اٹھائے ہوئے — ساحلوں میں خود کو بسائے ہوئے
چھڑ دو مجھے بند غم سے چھڑا دو — مرے آنسوؤں کے دیئے کو بجھا دو
گھٹا سے کھڑا بگڑے نہ دو — سدا سال کی ضرب پڑنے نہ دو
گرجتی ہوئی گھڑگھڑاتی بڑھو — ترنگوں کی مدھ بھاتی بڑھو
کہ دلوں کی چکتی رہے — روانی جو تی سکتی رہے
ترانوں سے دنیا کو مسحور کر دو — مرے کھبہ دل کو پرامید کر دو

نظم نمبر ۲

Your help and guidance

If man feeds innocence with morsels of hate,
Which abounds on the dinner table of life,
Then the bladder of innocence will become diseased with hate,
Learning to paint the nuances of colour from the ravages of war,
Will accustom your brush to dip itself in dark and dismal colours
Shun the path and ways of mutilation and destruction,
Fetch your dreams to the stars of hope and cheer,
And trumpet the music of the song of love
Is this possible for me while thorns and thistles abound
On my life's journey, without your help and guidance?

ترجمہ

مولا مدد سے

نفرت کی غذا نہ دو بشر کو — دستور سے تحریر دلیتو
یہ چیز ابھار دے گی محفل — نفرت کی غذا ہے ہم کا تل
سے خاند روز گھر میں ہاں — چھلکتا شراب حب انساں
اوسے گل کی چلتی پھرت ہو — یادوں کی بو میں سانس مت لو

دیکھ سارے لہو کے دھبے ہیں — رنگ میں بھی قلم ڈبو دو
لوگوں کو دہاڑ نے اجاڑو — کاشتوں کو ہلاؤ پھول پھلو
قلعے جنگ و دمن کے ڈھا دو — لوہا طوفان کا گلا دو
سر پہ آئی بلا کو رد کر — اسے مدح بشر سری مد کر

قلم بھر ہے

The links of common brotherhood

The tide of light had ebbed beyond the horizon
That swallowed the sun like a whale chewing a fish
And my mind wandered across the countless corridors of stars
While the moon looked on with a smile on its face
The exhausted waves of the dying day shed tears
On the aged shores of life's declining years
Inspite of the age of atom and hydrogen bomb
The hand of history was busy at the wheel of human wheels
Trying to forge on earth links of common brotherhood,
Only if it could be alive when history accomplishes this task.

زرو

حب انسانی

گئی تاریک افق دل پہ سمو دھو ہوتی — جتنی دیوار تھی وہ سب معمر کا بجھ ہوئی
دل محبت میں جو حائل تھی وہ دیوار گئی — شکر صد شکر کہ نفرت کی شب تار گئی
ہول جنگ سے الفت کے لیے اجڑے — ابھی ہم کے دھماکوں سے تو اجڑے
بجھا تھا پر اک دور رہ اختلاف دھکا — باقی سرد سے مستقبل انساں دھکا
عقل کی ضرب سے زنجیر جہل ٹوٹ گئی — چرخ پر وحدت انساں کی کرن پھوٹ گئی

رات کی سانس تک ختم ہوئی بے خبری
آئی گاتی ہوئی گلشن میں نسیم سحری

جھلملاں گر گئیں چلتی ہوئی تلواروں پر
پڑ گئی اوس دمکتے ہوئے رخساروں پر

خیمہ امن میں گاتی ہوئی دنیا دیکھوں
کاش! میں زندہ رہوں اور یہ تماشا دیکھوں

نظم نمبر ۲

The ideal one

In the tower of the mind of every poet is the image
Of her whom he, a paragon of beauty dreams,
Majnu called her Laila and Dante called her Beatrice,
Immortalizing in song her beauty and her name,
Setting her up on the pedestal of fancy as an idol of an ideal.
The tales that are told of them in verse and rhyme
Are countless and live through successive centuries,
Oh, you, O Ideal of ideals, have I lavished my love
While you and your beauty abide in eternity
My faulty and clumsy verses cannot
Stand the test of time.

ترجمہ

حسنِ ازل

نصب ہیں جب سے فلک پر ماہ و انجم کے خیام
ہم ہر حسن کے گن گا رہے ہیں صبح شام
دھوم بیداری کی جب سے ہے جہان خواب میں
گونج سازِ حسن کی ہے عشق کی محراب میں

ہاں ازل سے چل رہا ہے عاشقی کا کاروبار
کوئی شیریں پر فدا ہے کوئی لیلیٰ پر شیدا
شمعیں جتنی ہیں قیامت تک جلیں گی سب تابناک
اور اڑ جائے گی وقت صبح پروانوں کی خاک
سب پجاری وقت کے گرداب میں کھو جائیں گے
دیویاں جگتی رہیں گی برہمن سو جائیں گے

ان چاروں نظموں کا ترجمہ کرنے کے بعد جوش صاحب نے حسب ذیل نوٹ بھی لکھ دیا

"الٰہ آباد صاحب دولت مند ہونے کے باوجود ہم نظموں کا شغل فرماتے ہیں۔ ان کی فکر میں گہرائی اور بیان میں کشش ہے۔ یہ میری برادری یعنی جاویدان الٰہ کے خاندان سے ہیں اور میں ان کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اب وہ اس مقام تک آ پہنچے ہیں جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں

تابندہ جاوید الٰہ آبادی — جوش

۲۰ ۔ ۸ ۔ ۴۷"

ابھی ریل کے وقت میں بہت دیر تھی۔ میں نے ہر نظم کی کئی دفعہ پڑھی ہر سطر کا مطلب انگریزی کے متن سے کیا۔ ہر لفظ کی بلاغت پر گفتگو ہوئی۔ ترجمہ کا کمال یہ تھا کہ ہر نظم پر طبزاد ہونے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ غرض ان باتوں میں دو بج گئے۔ ریل کا وقت پونے چار بجے تھا اس لیے سب ملکر کیپٹ اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جوش صاحب کا کمپارٹمنٹ ہی تھا۔ ان کو آرام سے گاڑی میں سوار کرا کر ان کا بستر بیٹ پر بچھا دیا گیا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ میرا ارادہ لندن جانے کا ہو رہا ہے۔ وہاں میری سنا سے ہو جیسے ہاری ہے اگر آپ بھی ساتھ چلیں تو بہت لطف آئے گا۔ جوش صاحب نے کہا جب تم جانے کو تو مجھے بتا دینا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اتنے میں انجن نے رخصت کی سیٹی بجائی اور ہم لوگ جوش صاحب سے گلے مل کر رخصت ہو گئے۔

اسٹیشن سے میں اور ڈاکٹر عالیہ امام سیدھے بی اللہ صاحب کے بنگلے پر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر اپنے آنے کی اطلاع کروائی۔ اللہ صاحب ہم دونوں کو لے کر ڈرائنگ روم میں گئے جہاں پہلے سے شبنم رومانی صاحب اور چند دوسرے اصحاب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں میں نے اللہ صاحب کو ان کی نظمیں جو ترجمے کے دے دیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ترجمہ پڑھ کر بھی سنائیں۔ چنانچہ میں نے چاروں نظمیں کو پڑھ کر سنایا۔ سننے میں پیارے علی اللہ صاحب بھی آ گئے۔ انھوں نے دوبارہ سنانے کی فرمائش کی لہٰذا دوبارہ سنائی گئیں۔ سب نے بے حد تعریف کی۔ دس کے بعد چائے اور اس کے لوازمات سے مدارت کی گئی۔ غرض دو گھنٹے وہاں بیٹھ کر اپنے گھر واپس آ گیا۔

اس کے بعد میں اپنے کاموں میں کچھ ایسا مشغول ہو گیا کہ ایک ہفتہ تک جوش صاحب کو کوئی خط نہ لکھ سکا۔ اس پر جوش صاحب خفا ہو گئے۔ انھوں نے ایک مختصر کو خط لکھا جو نظیر اکبر آبادی کے ہے۔

"آپ نے پھر چپ سادھی۔ موسم گرمی پھر پڑ گیا۔ ہوا پھر بند ہو گئی۔ پھر شدید حبس ہو گیا۔ آخر یہ کجی کس کام کی۔"

پرسوں سلامت علی خاں آئے تھے۔ ایک بچے کو بھی ساتھ لائے تھے۔ ان کو دیکھ کر آپ کی یاد ستانے لگی اور کراچی کی ہوا آنے لگی۔

لیجیے یہ خط ہے اللہ کے نام ان کا پتا اور پورا نام دہلی میں ہیں۔ آپ جائیں اور ان کو یہ خط دے دیں۔ مناسب ہو تو ان کے بیٹے سے بھی بات کر لیں۔ کام اشد ضروری ہے۔ اس لیے جلد اور قوی ترین الفاظ میں ان سے کہیے۔

میں شیری اور تلخی کے ساتھ جی رہا ہوں۔ مسکرا بھی رہا ہوں اور مسہور بھی۔

آپ کا شیدائی

جوش خروشانی

(۲۵) ایف ٹی ایس ٹریٹ (۱۰) اسلام آباد

۹۰۔۹۔۱۹۸۰ ۔ ۹ بجے شب ۵ منٹ

جوش صاحب کا خط لے کر میں دوسرے دن ہی انشا صاحب کے دفتر گیا۔ خط میں جوش صاحب نے پی بھابھی کے صاحبزادے عرفان ہاشمی کے متعلق سفارش کی تھی کہ ان کو محکمہ تعلیمات میں کوئی اچھی سی نوکری دے دی جائے۔ انشا صاحب نے مجھ سے کہا کہ اسی روز ہوٹل کانٹی نینٹل میں شام ہندوستانی جاری ہے جس میں پیارے علی انشا صاحب خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوں گے۔ میں یہ درخواست انھیں دے کر اس پر آرڈر لے لوں اور پھر وہ درخواست ان کو دے دوں تو وہ اس آرڈر پر عمل کروانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ میں پیر کو ہوٹل نٹر کانٹی نینٹل پہنچا۔ وہاں پیارے علی انشا صاحب سے ملاقات کر کے وہ درخواست ان کو دے دی۔ انھوں نے وہ درخواست لے کر رکھ لی اور مجھ سے کہا کہ وہ اس پر عمل کر کے جوش صاحب کو جواب بھیج دیں گے۔ اس شام فارسی کے مشہور شاعر نظامی پر مقالے پڑھے جا رہے تھے۔ مقررین میں نیویارک یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر ہیڈ ٹولسکی بھی تھے جنھوں نے نظامی پر بہت عالمانہ مقالہ پڑھا۔ پیارے علی انشا صاحب نے بھی نظامی پر ایک تعارفی مضمون پڑھا۔ آخر میں اس وقت کے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین خاں نے صدارتی خطبہ تقریر کی اور محفل برخاست ہو گئی۔

دوسرے دن میں نے جوش صاحب کو انشا صاحب سے ملاقات کی تمام تفصیل خط کے ذریعے سے بتا دی۔ اس خط میں میں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میرا ارادہ تیسری کتوبر کو انگلینڈ کے لیے رخصت ہونے کا ہے اگر وہ بھی چلنا چاہیں تو تیار ہو کر کراچی آ جائیں۔ جوش صاحب نے اس خط کا یہ جواب دیا۔

"بڑا غضب کیا خورشید علی خاں آپ نے۔ اچانک اپنی رخصت کی خبر دے کر۔ مرجھا کر رکھ دیا آپ نے پھول سی شگفتہ صبح۔ ابھی چار بجے بیدار ہوا۔ میز پر آپ کا خط رکھا ہوا تھا۔ فوراً چاک کر کے پڑھا۔ دل چاک چاک ہو گیا۔

طے تو یہ ہوا تھا کہ ہم دونوں ساتھ جائیں گے لیکن آپ نے خدا جانے پر کمر باندھ لی۔

سرود سیمیا بصحرا می روی تحفت بے خبری کہ بے ما می روی

آپ کے بچھڑ جانے کا اس قدر دھکا لگا ہے کہ خود کو رہا ہوں اور حروف کی شکلیں مٹتی چلی جا رہی ہیں۔ مرے ایک کی یہ اشتہا کیسا کھڑا ہو گیا کہ آپ اس قدر جلد جا رہے ہیں۔

کچھ روز تو اور توقف کیا ہوتا ممکن ہے ساتھ ہو جاتا۔ مگر آپ اس قدر جلد یورپ پہنچ گئے کہ دیکھیے میری یہ پیش گوئی کہ جب واپس آئیں گے دکان کو سمیٹ پائیں گے۔ اس کی اہمیت سے بہت بچ چکی ہوگی اور کوئی وجہ معاش باقی نہ رہی ہوگی۔

جلیے جلیے میرا دل توڑ کر جلیے۔ آپ جب یورپ سے پلٹ کر آئیں گے۔ مجھے میں پائیں گے۔

یہ میرا آخری خط ہے۔

آپ کی رخصت سے بوکھلایا ہوا

جوش

۔ ا۔ ج۔ ا۔ اسلام آباد۔ صبح ساڑھے چار آغاز سرما

سلام، آخری سلام۔

میری انگلینڈ روانگی:

میں کراچی سے تیسری اکتوبر ۱۹۷۲ء کو انگلینڈ روانہ ہو گیا اور لندن میں ایک دن ٹھہر کر دوسرے دن یارک چلا گیا جہاں میری چھوٹی بیٹی قمر خانم اور ان کے شوہر ڈاکٹر شہریار حسین رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب وہاں فل فورڈ (Halford) ہسپتال میں ملازم تھے۔ ان کا مکان بھی ہسپتال کے حدود میں شہری آبادی سے دور تھا۔ ہسپتال کے اطراف خوبصورت ہرے بھرے میدان سرسبز و شاداب کھیت اور جنگل سا باغات ہیں مگر یہاں سردی شروع ہو چکی تھی جس سے موسم خزاں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جوش صاحب کا خط مجھے یارک میں ملا میں نے اس خط کے جواب میں ان کو لکھا کہ کچھ بے حالات ہوتے چلے گئے کہ مجھے جلدی انگلینڈ آنا پڑا آپ شاید تنی عجلت میں میرے ساتھ نہ آ سکتے مگر یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ یہاں آنے کی زحمت سے بچ گئے۔ کیونکہ آج کل یہاں موسم بہار رخصت ہو چکا ہے اور خزاں کی عملداری ہے۔ جیسے فطرت نے پتا اور زردی جوڑا اتار پھینکا ہے۔ خزاں کے ڈسے ہوئے خشک شجر سرد کھڑے ہوئے سرد ہواؤں کے تھپیڑوں سے سینہ کوبی کر رہے ہیں۔ شہر کے گلی کوچے سنسان اور ویران ہیں۔ اگر کہیں اکا دکا پری زاد نظر بھی آ جاتا ہے تو سر سے پیر تک ڈھکے ہوئے

موسات میں مستقل۔ لے کر لے زیارت مجھے۔ نہ حسن فطرت کی سرنگیری نہ پری زادوں کی جلوہ آرائی لعنت ہے اس شخص پر جو موسم سرما میں دیار مغرب کی سیر کا ارادہ کرے۔

اس خط کے جواب میں جوش صاحب کا ۱۰۔۱۰۔۷۰ کا لکھا ہوا خط مجھے لندن کے پتے پر ملا۔ انہوں نے لکھا۔

آخر چلے گئے حضرت میرا دل توڑ کر اور جلا کر۔ دیکھ لیا نتیجہ اس بے وفائی کا؟ اور جاؤ ..... بھولی اور تھا کو۔

قلم بے حد خراب ہے۔ روشنائی اگل دینے کے بعد بھی خراب رہا ہے جانے سلام بھی اب اس سے کام نہیں لیں گے۔ دوسرا قلم خرید کر آپ کو خط لکھیں گے اپنی صحت سے مطلع کیجیے میرا سارا دل آپ میں لگا ہوا ہے۔

آپ کے فراق کا ڈسا ہوا

جوش

ملائیف ۳/۲ اسٹریٹ ۱۰ ایجنسیز روڈ اسلام آباد

۱۰۔۱۰۔۷۰ رات کے ایک بجے

میرے سنسار جاگے پاک پروردگار

لاہور کی بد حواسیاں:

اس دفعہ میں پہلی مرتبہ انگلینڈ آیا تھا اور یہاں کے طور طریقوں سے ناواقف تھا اس لیے بعض دلچسپ واقعات رونما ہوئے۔ مثلاً جب میں لندن سے یارک آ رہا تھا تو میری بھاوج زاد کزن رضوانہ جام جن کے گھر میں لندن میں ٹھہرا تھا مجھے ریلوے سٹیشن پر پہنچانے کے لیے میرے ساتھ آ گئیں۔ ہم لوگ بانسو وہسٹ سے ٹیوب ٹرین کے ذریعے وکٹوریہ سٹیشن پہنچے وہاں کافی دیر تک گھومے اور پریشان ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں سے کوئی ریل گاڑی یارک نہیں جاتی بلکہ کنگ کراس (King Cross) کے سٹیشن سے جاتی ہے۔ چنانچہ ہانپتے کانپتے پھر ٹیوب اسٹیشن آئے اور وہاں سے کنگ کراس پہنچے۔ وہاں بھی مشکل سے ٹکٹ گھر کا علم ہوا۔ خیر ٹکٹ خرید اور پوچھتے پوچھتے گاڑی تک پہنچے۔ میں گاڑی کے چلنے ہی والے تھا

سوار ہو کر تمام سے ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رضوان مجھے ریل میں بٹھا کر اپنے گھر لوٹ گئے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی روانہ ہوئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹکٹ چیکر آیا اس نے میرا ٹکٹ دیکھ کر نہایت خوش اخلاقی سے کہا آپ کا ٹکٹ دوسرے درجہ کا ہے اور آپ پہلے درجے میں بیٹھ گئے ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسرا درجہ کھانے کے کمپارٹمنٹ کے ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ گاڑی رکے گی تو اتر کر وہاں چلا جاؤں گا۔ چنانچہ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا مگر جب ایک گھنٹے تک گاڑی نہیں رکی اور ٹکٹ چیکر دوبارہ لوٹ کر آیا اور اس نے مجھے دروازے سے لگا کھڑا ہوا دیکھا تو سمجھ گیا کہ میں نووارد ہوں اور وہاں کے رہنے کے نظام سے ناواقف ہوں۔ تب اس نے میری رہنمائی کی اور مجھے مدن ہی اندر سے کھانے کے کمپارٹمنٹ میں سے ہوتا ہوا دوسرے درجے میں پہنچا دیا اور ایک نشست کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ آپ کی سیٹ ہے۔ چنانچہ میں وہاں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں [illegible] کے سٹیشن پر گاڑی رکی وہاں سے ایک خاتون سوار ہوئیں اور میرے پہلو کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ جیسے ہی گاڑی روانہ ہوئی ان صاحبہ نے میرے کاندھے پر سر رکھا اور بے خبر سو گئیں۔ جیسے ہم معمولی بیویوں کے کاندھے پر ہی سر لیتے ہیں کہ انگریزوں کے سروں کا بوجھ برداشت کریں اور میں [illegible] کا بار اس وقت تک بلا حس و حرکت جھیلتا رہا جب تک کہ پارک کے سٹیشن پر گاڑی نہیں رکی۔ اور جب گاڑی رکی تو ان خاتون نے نہایت بے تعلقی سے گردن اٹھا کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ میں اس اسٹیشن پر اترنے والا تو نہیں ہوں؟ اور جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو کہنے لگیں کہ اپنا سر اٹھائیں دوسری طرف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "اچھا، حافظ" اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ انگریز کے سر کے بوجھ سے سبک دوش ہونے میں کتنا سکون ہے۔ نہ معلوم وہ کیسے سر ہوں گے جن کے متعلق غالب نے یہ تمنا کی تھی کہ

میرا اس کی ہے وہ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

کاش مرزا انگلینڈ آ سکتے اور اپنے شاعروں پر حسینانِ افرنگ کی زلفوں کی اندرونی کا تجربہ کر سکتے۔

دوسرا دلچسپ واقعہ پارک میں میری سن قرمام کے گھر کے قیام کے دوران میں پیش

میں کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ قمر کا مکان ہسپتال کے سامنے ہی تھا۔ پارک کا یہ ہسپتال سب سے بڑا شفاخانہ ہے۔ اس میں دوسرے امراض کے ساتھ ساتھ ذہنی مریضوں کے بھی وارڈ ہیں۔ پارک پہنچنے کے دوسرے دن میں اپنی عادت کے مطابق صبح سویرے بیدار ہو گیا۔ گھر سے باہر نکل کر خوب گہرے گہرے سانس لیے طبیعت میں جولانی آ گئی۔ صبح بہت خوشگوار اور روح پرور تھی اور سردی بھی قابل برداشت تھی۔ سوچا سڑک پر کچھ دور دوڑ لگانی چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی سنسان سڑک پر بھاگنا شروع کر دیا۔ ابھی تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ پیچھے سے ایک گاڑی میں تین چار مضبوط گرانڈیل جوان آئے اور مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھا کہ یہ لوگ کچھ دریافت کرنا چاہتے ہوں گے۔ رک کر دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ تو ایک شخص گاڑی سے اتر کر میرے قریب آیا اور پوچھا کہ آپ کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہیں؟ آپ کو میرے دوڑ لگانے پر کوئی اعتراض ہے؟ اس نے پھر پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے کہا کہیں نہیں میں تو صرف صبح کی ورزش کر رہا ہوں۔ اس نے نہایت تعجب سے میری شکل دیکھی اور بڑی زور سے اوہ کہنے لگا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ بات کیا ہے تم مجھے اس قدر حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ اس نے ایک بار پھر مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور پوچھا آپ مریض تو نہیں ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ کیا میں تمہیں مریض دکھائی دے رہا ہوں؟ تب اس نے کہا کہ ہم لوگ ہسپتال کے مرد وارڈ میں ہم نے دیکھا کہ ایک شخص دوڑا جا رہا ہے تو مجھے کہ کوئی ذہنی مریض شفاخانے سے ڈاکٹروں کی آنکھ بچا کر سویرے سویرے بھاگ رہا ہے۔ وہ لوگ تو مجھ سے معافی مانگ کر لوٹ گئے مگر جب میں نے اپنا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ میں شب خوابی کے لباس میں گھر سے باہر آ گیا تھا۔ چنانچہ میں بھی اپنے گھر کی طرف لوٹ گیا لیکن جیسے ہی گھر کے قریب پہنچا وہ جوان اور طاقتور جوان نے آ کر میرے بازو پکڑ لیے اور نہایت حیرت اور شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں کہ آپ کو اس قدر صبح سویرے ابھی سردی میں بھیگ گرم کپڑوں کے اپنے وارڈ سے باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ پھر دریافت کیا کہ آپ کس وارڈ میں ہیں؟ میں نے بادل ناخواستہ ان خواتین کی گرفت سے خود کو چھڑایا اور کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کوئی مریض نہیں ہوں بلکہ ڈاکٹر شہزاد کا مہمان ہوں اور حال ہی

میں پاکستان سے آیا ہوں اور اس وقت صبح کی ورزش کر رہا تھا کہ آپ سب لوگ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے مگر اب میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ غرض کہ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں تازہ وارد ہوں اور انگلستان سے ہوں اور وہاں کے رسوم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے شب خوابی کے لباس میں گھر سے باہر گھوم رہا ہوں تو ان کے منہ سے بھی اسی طرح ہر طویل میں اوہ اوہ نکلا۔ انھوں نے میرے بازو تو چھوڑ دیے مگر وہیں کھڑی ہوئی دیکھتی رہیں کہ میں ڈاکٹر شہریار کے مکان میں جاتا ہوں یا نہیں۔ میں جب گھر پہنچا تو دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا میں نے گھنٹی بجائی۔ سب لوگ چونکہ محو خواب تھے اس لیے ان کو بیدار ہونے میں دیر لگی اتنے میں کچھ اور عورتیں بھی وہاں جمع ہو گئیں اور مجھے اس طرح دیکھنے لگیں جیسے میں کوئی پاگل خانے کا جانور ہوں یا الریٹ کا بن مانس۔ اللہ اللہ کر کے قرنے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی ارے آپ ان ہی کپڑوں میں باہر چلے گئے۔ آپ کو گرم لباس پہن کر باہر نکلنا چاہیے تھا۔ میں نے سمجھا کر کہا صاحب کے واسطے اب زیادہ نصیحت مت فرماؤ اور ان خواتین کو دیکھو جنھوں نے مجھے پاگل خانے سے بھاگا ہوا سمجھ کر میری تفریح خاک میں ملا دی۔ قرنے جب ان عورتوں کو دیکھا تو اس کی سمجھ میں تمام بات آ گئی۔ اس نے ان لڑکیوں کو سمجھا دیا کہ یہ میرے بھائی ہیں اور چونکہ یہاں نووارد ہیں اس لیے ابھی اس بات سے ناواقف ہیں کہ جیسا دیس ویسا بھیس ہونا چاہیے۔ غرض قرنے کی تشریح کے بعد وہ خواتین معافی مانگتی ہوئی رخصت ہو گئیں اور میں ڈاکٹر صاحب کے دوستوں میں کئی دن تک تفریح طبع کا باعث بنا رہا۔

انگریز قوم کا کردار

برصغیر ہند و پاک سے پہلی مرتبہ انگلستان جانے والوں کو ایک بات جو سب سے نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے وہ ہے انگریز قوم میں انسانی ہمدردی اور شرافت کا جذبہ۔ برصغیر کے باشندے جب وہاں میں انگریزوں کے خلاف جو نفرت کے جذبات لے کر انگلستان جاتے ہیں، انگریز قوم ان کو محبت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ قوم ہر ذی حیات سے محبت کرتی ہے۔ انسان تو خیر بڑی ہستی ہے انگریز پودوں اور جانوروں سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی انسانوں سے۔ ان کا ڈسپلن، ان کی رواداری، دوسروں کا احترام، دوسروں کے حقوق کی

پسندیدگی کا احساس اگر کہیں معراج کمال پر دیکھنا ہے تو مگر جنوں کو دیکھ لیجیے اگر آپ پیدل چل رہے ہیں اور سڑک عبور کرنا چاہتے ہیں تو صرف اسی مقام سے عبور کر سکتے ہیں جہاں زیبرا کراسنگ کے نشان ہیں اگر آپ نے ان نشانات پر قدم رکھ دیا تو تمام گاڑیاں فوراً رک جائیں گی اور اس وقت تک رکی رہیں گی جب تک آپ سڑک عبور نہ کر لیں

ٹیلی ویژن کا مشہور بچوں اور خواتین کو اپنی نگرانی میں سڑک عبور کراتی ہیں۔

میں جب پارک میں تھا تو ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو وہاں پارلیمنٹ کے انتخابات ہو رہے تھے شہر میں مختلف مقامات پر پولنگ سٹیشن قائم تھے ڈاکٹر شریف اور قریشی کا پولنگ سٹیشن میں کے بچوں کے سکول میں تھا۔ ہم سب لوگ شام کو ساڑھے سات بجے پولنگ ہوتے گئے میں نے دیکھا کہ ایک ایک آدمی آتا ہے اور نہایت سکون اور اطمینان سے اپنی پسند کے امیدوار کے حق میں اپنا ووٹ ڈال کر چلا جاتا ہے جیسے ہی ہم لوگ سکول کی عمارت میں داخل ہوئے وہاں دو عورتیں اور ایک مرد بیٹھا ہوا تھا انھوں نے قریشی اور ڈاکٹر سے ان کا حق رائے دہی کا سرٹیفکیٹ طلب کیا اور حلقہ نمبر بتلانے پر انھیں اندر جانے کی اجازت دے دی پھر ہم لوگ ایک کلاس روم میں داخل ہوئے جہاں دو خواتین اور ایک پولیس والا بیٹھا ہوا تھا۔ پولیس والا تو کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھا۔ خواتین نے قریشی اور ڈاکٹر کو ووٹ کی دو پرچیاں دیں اور یہ دونوں الگ الگ پارٹیشن میں چلے گئے اور اپنا اپنا ووٹ ڈال کر باہر آ گئے یہ تمام کام کم وقت میں اور سکون و اطمینان کے ساتھ مکمل ہو گیا کہ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ انگلستان کی حکومت کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ ووٹ ڈالنے کا سلسلہ رات دس بجے تک چلتا رہا اس کے بعد ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی اور دوسرے دن دوپہر کو نتیجے کا اعلان کر دیا گیا لیبر پارٹی کو جس کے لیڈر مسٹر ولسن تھے تین دو ووٹوں کی اکثریت حاصل ہو گئی پارلیمنٹ کے کل ممبران کی تعداد ۶۳۰ ہے اس میں سے ۲۹۸ لیبر پارٹی کے ارکین منتخب ہوئے قدامت پسند پارٹی (Conservatives) جس کے لیڈر مسٹر ہیتھ (Heath) تھے ان کے ۲۶۹ ارکان اور لبرل پارٹی جس کے لیڈر مسٹر جیری تھورپ (Jerry Thorpe) تھے ان کے ۱۴ ارکان منتخب ہوئے۔ اس طرح مسٹر ولسن حکومت بنانے کے حقدار ہو گئے۔ حالانکہ ان کو صرف تین ووٹوں کی اکثریت حاصل ہوئی مگر تمام جماعتوں نے انتہائی خوش دلی سے ان کے حکومت بنانے کے حق کو تسلیم

کر لیا حقیقت یہ ہے کہ محبت صرف ایسے ہی ماحول میں قائم ہو سکتی ہے۔

دل کا دورہ

جہاں انگلستان کے معاشرے میں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں یہ معلوم ہونے کی تعجب ہوا کہ کیا حرانی ہے کہ ہم جیسے مشرق کے لوگ وہاں جا کر عام طور پر دل کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں اکیسویں کنٹور کو پارک سے روانہ ہو کر ہیتھرو میں لندن پہنچا۔ بس کے اڈے سے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر ٹیوب کے اسٹیشن جا رہا تھا کہ راستے میں سینے میں درد شروع ہوا اور بڑھتے بڑھتے اس قدر شدید ہو گیا کہ چکر آ گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے وہیں بیٹھ گیا۔ قریب ہی سے ایک ٹیکسی لے کر رضوانہ کے گھر پاسو پہنچا۔ رضوانہ نے جب میری حالت دیکھی تو اپنی ڈاکٹر مس ہی سے فون کیا وہ فوراً ہی آ گئی۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور کہا کہ آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ اس وقت لندن میں ہیں۔ ہم آپ کا مکمل چیک اپ کروانے کے لیے آپ کو ہسپتال بھیج دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ایمبولینس کو فون کیا اور رضوانہ سے کہا کہ ان کو ہارٹ اٹیک ہے مگر گھبرانے کی بات نہیں ہسپتال والے ان کا اچھی طرح علاج کریں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایمبولینس آ گئی اور دو آدمیوں نے مجھے خوب اچھی طرح کمبل میں لپیٹ کر کرسی پر بٹھا دیا اور کرسی اٹھا کر گاڑی میں رکھ دی۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ ویسٹ ملل سکس کے ہسپتال پہنچ گئے اور مجھے ابتدائی معائنے کے بعد انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔

لندن کا ہسپتال

ہسپتال میں پہنچتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ہتھیاری ہاتھوں میں آ گیا ہوں۔ جیسے ہی میں وارڈ میں داخل ہوا ایک نوجوان خوبصورت نرس نے میرا استقبال کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے آنکھ مار کر مجھ سے کہا کہ ارے آپ مسکراتے کیوں نہیں؟ آپ بھلے خاصے صحت مند نوجوان ہیں۔ ایسی مغموم صورت کیوں بنا رکھی ہے۔ جناب زندگی سے بھاگنے کا نام نہیں بلکہ مسکرانے اور خوش رہنے سے عبارت ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے

ایک بستر پر لٹا دیا۔ میرے کپڑے بدلے اور شب خوابی کا لباس پہنا کر میرا بلڈ پریشر لیا۔ پھر کارڈیوگرام لیا۔ اس کے بعد ایک مرد نرس مسٹر سنگھ آئے۔ انھوں نے میری کھال اور سینے پر سے بال صاف کر کے نگارش قلب کے آلات کے تار لگا دیے۔ یہ آلات جو ہر مریض کے سرہانے دیوار پر آویزاں ہوتے ہیں دل کے مریضوں کی حالت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک آلہ فی منٹ دل کی دھڑکنوں کی تعداد بتاتا ہے تو دوسرا کارڈیوگرام کو ظاہر کرتا ہے اور ان آلات کی مدد سے ڈاکٹر پر مریض کے دل کا حال بغیر کچھ کہے ظاہر ہو جاتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں اس شعبے کا بڑا ڈاکٹر جو کنسلٹنٹ کے عہدے پر فائز تھا اور جس کا نام ڈاکٹر کوہلی تھا آیا اور میرا معائنہ کرنے کے بعد کہنے لگا کہ فکر کی کوئی بات نہیں آپ ٹھیک ہو کر اپنے گھر چلے جائیں گے لیکن میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اب آپ کو محتاط زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ اب آپ اپنی عادتوں اور طرز زندگی کا تنقیدی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آپ فطرت کے قوانین کی کہاں کہاں خلاف ورزی کر رہے ہیں کیونکہ فطرت اپنی خلاف ورزی کو معاف نہیں کرتی۔ اگر آپ نیچر کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو آپ آدھ سے عمر طبعی کو پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے بعد سے میں نے سگریٹ اور پان تو بالکل ترک کر دیے اور دیگر معمولات زندگی کو اس طرح ترتیب دینا شروع کر دیا کہ قوانین فطرت کی کم سے کم خلاف ورزی کا امکان رہے۔

اس ہسپتال میں مریض کے تمام معاملے طے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوا اور غذا بھی طے کی جاتی ہیں۔ کھانے کا نظام بہت عمدہ ہے۔ ہر مریض کو اس کی بیماری کی نوعیت کے اعتبار سے غذا کی ایک فہرست دی جاتی ہے جس میں سے وہ اپنی پسند کے کھانوں پر نشان لگا دیتا ہے۔ دوسرے دن وہی غذا اس کو فراہم کر دی جاتی ہے۔ میں صبح میں عام طور پر بکائن کا رس، مچھلی کا قتلہ، ڈبے کے جیم Bonnet مکھن ٹوسٹ اور چائے لیا کرتا تھا۔ دس بجے دن میں بیسن کا کیک کا ٹکڑا اور چائے۔ دوپہر میں سوپ، مرغ، مچھلی یا بکرے کا گوشت، پالک کا ساگ، ڈل روٹی کے سلائس اور میٹھا اور میٹھے میں کبھی پڈنگ اور کبھی آئس کریم۔ رات کو کچھ تھوڑی سے ساتھ۔ اس کے علاوہ صبح چھ بجے اس کے بعد دن میں دس بجے پھر شام چار بجے اور رات دس بجے چائے کافی، دودھ یا بارلکس جو آپ کی پسند ہو لے سکتے ہیں۔

یہاں عام طور پر حکومت ایک مریض پر ۱۰ سے ۱۵ پونڈ تک یومیہ خرچ کرتی ہے۔ کیا وہ میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی خدمات بالکل مفت ہوتی ہیں۔ میں جب ہسپتال میں تھا تو وہاں کی پارلیمنٹ نے ایسا قانون بنایا تھا کہ جس کے ذریعے سے تمام خانگی وارڈس Private Wards ختم کر دیے گئے تھے اور اب کوئی شخص صرف دولت کی بنا پر بیمار لوگوں پر ترجیح نہیں پا سکتا جن کو مرض کی شدت کی بنا پر فوری توجہ کی ضرورت ہو ورنہ تو عام طور پر لوگ پیسے دے کر ہسپتال میں داخل ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کا مرض اتنا شدید نہیں ہوتا تھا کہ شفاخانے میں داخلے کی ضرورت لاحق ہو اور غریب لوگوں کو بھی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر مرض کے لیے اس کے ماہر موجود ہیں اور ان کے الگ الگ ہسپتال ہیں مثلاً کینسر امراض قلب ہڈیوں اور ریڑھ کی ہڈی کے امراض، اعصابی امراض وغیرہ۔ اگر کسی شخص کا مرض اس الجھا ہوا ہو کہ عام ہسپتال میں اس کا علاج ممکن نہ ہو سکے تو اس کو اس مرض کے ماہر ڈاکٹر کے ہسپتال میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ مریضوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے یا ان کے گھر سے لانے لے جانے کے لیے شفاخانے کی گاڑیاں ہوتی ہیں اور ان کے لیے کوئی رقم نہیں لی جاتی اور یہ تمام سہولتیں کسی شخص کو احسان کے طور پر مہیا نہیں کی جاتی ہیں بلکہ یہ اس مملکت میں مقیم ہر انسان کا حق سمجھ کر دی جاتی ہیں۔ میں تو وہاں ایک پردیسی تھا مگر مجھے دو ہفتے ہسپتال میں اس وقت تک رکھا جب تک میں بالکل تندرست نہیں ہو گیا اور رخصت کرتے وقت ایک ماہ کی دوائیں بھی ساتھ کر دی گئیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے میرا پاسپورٹ لے کر ہوم آفس کو یہ لکھ کر بھجوا دیا کہ یہ تین ماہ تک سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں گے اس لیے ان کے ویزا کی مدت اس وقت تک بڑھا دی جائے جب تک ڈاکٹر سفر کی اجازت نہ دیں۔

مارے نرسوں کا کچھ بیان ہو جائے

شفاخانوں کا بیان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہاں مریضوں کی خدمت کرنے والی نرسوں کا بیان نہ ہو جائے۔

ہاں اے دل درد مند و خوش سخن کیں نہ کھولے در خزینہ راز

چاند کا منظر پر عریاں ہوتا — شاخِ گل کا ہے گل افشاں ہوتا
مجھ سے کیا پوچھتے ہو کیا لکھیے — نکتہ ہائے غرد غزا لکھیے
ہائے نرگس کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ گل پر طلب فشاں ہو جائے

یہ ہیں وہ رسیں جو درد کی دوا بھی ہیں اور درد افزا بھی۔ جن کا قسم سارا اندر سارا، جو ہر قدم پہ قشقش پاسے کبھی تر شتی مسکتی، تھرکتی لچکتی ناچتی، اچھلتی، کودتی گاتی مسکراتی ہنستی ہساتی چھیڑ چھاڑ کرتی، کولھے مٹکاتی پنڈلیاں تھرکاتی کمر لچکاتی، لہکتی، مہکتی ہوئی رسیں۔ کوئی شعلہ جوالہ تو کوئی برق طور۔ کوئی سراپا دشمن ایماں تو کوئی جان کافر۔ کوئی پری تو کوئی بنت مریم مگر ہر یک سیمائیں ہیں جن میں انگریز لڑکیاں بھی ہیں آسٹریلوی بھی۔ ہرن بھی ہیں ہندوستانی بھی۔ افریقی بھی ہیں چینی اور جاپانی بھی۔ دن میں گھروں کی ٹھکرائی ہوئی ہیں کالجوں کی مگر ہر رنگ میں حیات کا سامان لیے ہوئے۔ ان میں ایک ترک شیرازی بھی تھی اور نام تھا اس کا شہزاد۔ خدا بیشک شوخ اور چنچل مگر جب وہ جان سارا اندر میں داخل ہوتی تو

رنگ ہو پھول ہو خوشبو ہو صبا ہو جیسے
موسم گل کی طرح کوئی چلا ہو جیسے

یا مثل مخدوم محی الدین:

وہ کیا آئی کہ گویا دور میں جام شراب آئی
وہ کیا آئی رنگیلی راگنی رنگیں رباب آئی
مجھے رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں شباب آئی
لبوں کی مے پلانے جھومتا مست شباب آئی

سے رنگین مچھلیوں کا بہت شوق تھا۔ وارڈ میں ایک میز پر کانچ کا ایک بڑا سا برتن [illegible] کر اس سے رکھ دیا تھا جس میں طرح طرح کی رنگین مچھلیاں تھیں۔ وہ خدا بیشک سے ان کو غذا ڈالتی تھی اور ہر دوسرے تیسرے دن ان کے برتن کی ریت دھو کر [illegible] میں ڈالتی اور پانی بدلتی تھی اور جب وہ مچھلیاں تیزی سے ادھر ادھر تیرتیں تو وہ بھی تالیاں بجا بجا کر رقص کرتی اور خوش ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی ایسی

حرکت کرتی کہ سب مریض ہنسنے لگتے۔

غرض انگلستان کے ہسپتالوں کی فضا اس قدر فرحت بخش اور حیات آفریں ہوتی ہے کہ وہاں انسان اپنی بیماری کا غم بالکل بھول جاتا ہے۔

جب مجھے ہسپتال سے رخصت کیا گیا تو نہ صرف ایک ماہ کی دوائیں بھی ساتھ کی گئیں بلکہ میرے مرض کی تمام رپورٹیں بھی ساتھ کر دی گئیں تاکہ پاکستان کے ڈاکٹروں کو مزید علاج کرنے میں سہولت ہو۔

گھر آنے کے بعد میں نے جوش صاحب کو اپنی بیماری اور علاج کی تفصیل سے مطلع کیا ان کا خط لندن کے پتے پر وصول ہوا جوش صاحب نے لکھا،

لاہور (پھر اس کے بعد)

اسلام آباد

خورشید صبح کو ہسپتال۔ آج کل فردوس لاہور میں شرف قیام حاصل ہے یہی ہر صبح صبح بنارس اور ہر شام، شام اودھ کو شرما رہی ہے۔

ابھی کل "وہاں" سے اپنی سکونت گاہ یعنی سید شوکت حسین صاحب کے مکان پر آیا ہوں آفتاب کے غروب اور میرے طلوع میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ تنہائی کا عالم ہے اور آپ کی یاد ستا رہی ہے۔ کاش اس وقت آپ بھی ہوتے ہاتھ دیتے میں ان کو ڈھونڈ کے لاتا میں کہاں سے ہم۔

آپ میرے دل دکھا کر تنہا لندن چلے گئے میری ہائے آپ پر ایسی پڑی کہ دل کا دورہ پڑ گیا۔ آپ نے "بتریں از گاہ مشکیں" سنا ہو گا اب آنکھوں سے دیکھ لیا۔ آپ لندن کس طرح سے گئے ہیں اور کب تک واپس آئیں گے۔ میں تو ایک ایک پل گن رہا ہوں۔

"یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور"

سردی سخت شدید ہے عید کے دوسرے دن یہاں سے چلا جاؤں گا اور پھر وہی تنہائی ہو گی اور میں۔

میں ہی نہیں اور بھی کوئی آپ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ کس قدر کشش ہے آپ کی ذات میں۔

کراچی میں نئے لی وژن کا مشاعرہ تھا۔ میں نہیں گیا۔ آپ کے بغیر کراچی میں کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اس لیے وہاں جانے سے کتراتا ہوں۔ آپ کو وہاں نہیں پاؤں گا۔ دل تمام کر دیا ہے۔ اب تو آپ اچھے ہو چکے، خوب مزے اڑا رہے ہوں گے۔ وہاں کے جلسے مشاعرے بند کرتے جائیے اور مجھ کو یہاں آکر سنائیے۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ بدوش لندن کی گلیوں میں پھرتا اور حسینوں کے حلقوں میں گھرتا

یہ شام ہو گئی، جو غزل سامنے رکھ دی گئی اور گھسیٹنے لگا کہ بابا ہم کو جلدی سے اٹھاؤ۔ سونے لگا۔

اچھا میرے دور افتادہ حبیب اب تحریر ختم کر رہا ہوں لیکن پتا تو آپ کا ہمراہ نہیں ہے۔ پتا جا کر یہ خط روانہ کروں گا۔

آپ کا شیدائی

کاش پنانی

۲۳۔۱۰۔۷۳

پتا نہیں کیا کر لکھ رہا ہوں۔ آج ۲ جنوری ۷۵ء سے دیر سے بیدار ہوا ہوں۔ چھ بجے میں گھنٹہ مسلسل باقی ہیں۔ جھینپا جھینپا بیٹھا ہوں۔ پھنکار بری رہی ہے مجھ دیر بیدار پر۔

جلدی لکھیے کب آئیے گا۔ گھڑیاں گن رہا ہوں آپ کی واپسی کی۔

لاہور شریف میں کچھ رباعیاں، دو تین نظمیں کہیں ہیں اور ایک مطلع۔ پہلے مطلع سن لیجیے۔

گاہے دل اتنی طاقت میں ڈوبتا ہے مجھے　　چاندنی کا دامن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے

رباعی

لیجے کو جو وہ رہن تمنا کر لے　　خون پہ جنوں و ملک کو شیدا کر لے
ہر دل کے صنم کدے میں اے جوش　　وہ بت ہے خدا کو بھی جو رسوا کر لے

دست فکر کا سبو ٹوٹ گیا　　جب سے ذوق جستجو ٹوٹ گیا
جب عشق کے فرمان سے آنسو ٹپکے　　تو عقل کی آنکھوں کا وضو ٹوٹ گیا

یہ عمر تری اور یہ محبت کا طلب — بھر غم کے ہیں انکھڑیوں میں گرداب
آہوں کے دھوئیں میں گم ہے تیرا مکھڑا — گویا صبح پر ہے گہرے کی طلب

افلاک پہ خندہ زن ہے میری تخیل — مسکود ہے مرا نفس علیل
آتا ہے مری فکر کے در پر ہوش — پرواز کی بھیک مانگنے کو جبریل

انگلینڈ میں جوش صاحب کا یہ آخری خط تھا۔

ستر علاج اور ستریں دیکھ بھال کی وجہ سے میں تیزی سے روبہ صحت ہو رہا تھا مگر چونکہ تین ماہ تک ڈاکٹروں نے ہوا تبدیل کرنے کی صلاح دی تھی اس لیے پاکستان واپس نہ جا سکتا تھا۔ میں وہیں لوسیر کو اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آ گیا لندن میں کچھ دن آرام کر کے واپس یارک قرام کے گھر چلا گیا۔ وہاں ڈاکٹر شہریار کی زیر نگرانی علاج پرہیز اور آرام کیا تو صحت جلد صحت مند ہو گیا۔ اس کے بعد تمام انگلینڈ کی سیر کی۔ ایک دفعہ سٹرکٹ میں ہاتھ ورڈسورتھ کا مکان دیکھا یہ علاقہ ونڈر میر (Wonder Mere) کہلاتا ہے۔ یہ تمام علاقہ بے حد خوبصورت جھیلوں پہاڑوں اور گھنے درختوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد شیکسپیئر کا مکان بھی دیکھا (Stratford upon Avon) میں ہے۔ میں نے ورڈسورتھ اور شیکسپیئر کی کتابیں ان کے گھروں میں واقع کتب خانوں سے خریدیں۔ انگلینڈ کا جغرافیہ بہت خوبصورت ہے اور اس میں رہنے والے لوگ بھی بہت خوبصورت ہیں۔ انگلینڈ میں رہ کر انگریزوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہاں کے قلعوں تفریحی مقامات اور عجائب گھروں کے متعلق اگر لکھا جائے تو ہر موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جا سکتی مگر اس وقت میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کر کے لندن کے سفر کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے مشہور مستشرق پروفیسر رالف رسل سے ملاقات۔

پروفیسر رالف رسل سے ملاقات:

لندن میں ایک روز میں نے سوچا کہ اردو کے پروفیسر رالف رسل سے ملاقات کرنا چاہیے چنانچہ میں نے ان کو اسکول آف اورینٹل سٹڈیز (School of Oriental Studies) لندن میں

نے فون کر کے ان سے بات کی۔ پہلے تو اپنا تعارف کروایا کہ میں کراچی سے آیا ہوں۔ ہوش صاحب کا دوست ہوں اور غالب کا طرفدار بھی اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں کیونکہ آپ بھی غالب کے طرفداروں میں سے ہیں۔ پروفیسر صاحب یہ تعارف سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آپ دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا آپ ۱۰ دسمبر کو گیارہ بجے یہاں کمرہ ۲۰۰ میں تشریف لا سکتے ہیں؟ میں نے وعدہ کر لیا اور تاریخ مقررہ پر گیارہ بجے میں پانچ منٹ کم پر جب میں کمرہ نمبر ۲۰۰ پر پہنچا تو دیکھا کہ اس پر تالا پڑا ہوا ہے اور وہاں کوئی آدمی بھی دکھائی نہیں دیا جس سے کچھ دریافت کر سکتا۔ پہلے تو خیال آیا کہ پروفیسر صاحب بھول گئے ہوں گے کہ میں نے مجھے آج کا وقت دیا تھا۔ پھر خیال آیا کہ شاید میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔ وہاں کوئی آدمی بھی نظر نہیں آیا کہ اس سے کچھ دریافت کر سکتا۔ اسی ادھیڑ بن میں جب ٹھیک گیارہ بجے تو دیکھا کہ سامنے سے پروفیسر صاحب اپنا بریف کیس اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمایا کیا آپ کو آتے بہت دیر ہو گئی؟ میں نے عرض کیا کہ صرف پانچ منٹ ہوئے ہیں۔ فرمایا مگر میں نے تو آپ کو گیارہ بجے کا وقت دیا تھا۔ یہاں آپ کو خواہ مخواہ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ میں نے عرض کیا کہ یہاں میں نووارد ہوں اور راستوں سے ناواقف۔ اس لیے گھر سے جلدی نکل پڑا کہ ڈھونڈنے میں کہیں مجھے دیر نہ ہو جائے مگر آپ نے پتا اس طرح بتایا کہ میں بہت آسانی سے پہنچ گیا۔ دراصل ہوش صاحب کے ساتھ رہ کر پابندیٔ وقت کی اس قدر عادت ہو گئی ہے کہ پانچ منٹ پہلے پہنچنے کو اچھا سمجھتا ہوں بہ نسبت دیر سے پہنچنے کے۔

پروفیسر صاحب نے جب مجھ سے فون پر بات کی تھی تو فرمایا تھا کہ آپ سے ایک گھنٹہ بات ہو جائے گی مگر جب ہم دونوں نے باتیں شروع کیں اور غالب کی فکر پر اس کے اشعار کی روشنی میں، میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا شروع کیا تو تین گھنٹے ہو گئے اور وقت کے گزرنے کا احساس تک نہ ہو سکا۔ جب دو بج گئے تو رسل صاحب نے فرمایا کہ آپ نے جس طرح غالب کے کلام کی تشریح کی ہے اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں چاہتا ہوں کہ غالب پر آپ کا ایک لکچر اپنی کلاس میں بھی کروا دوں۔ اس سلسلے میں وقت اور تاریخ سے آپ کو میں فون کے ذریعے مطلع کروں گا۔

پھر فرمایا کہ کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ جب قوم میں غالب جیسے باغ و بہار شاعر پیدا ہوں وہ قوم انگریزوں کی دو سو برس تک غلام کیوں بنی رہی؟ میں نے کہا کہ چونکہ آپ لوگوں ہی کی حکومت کی ہے اس لیے آپ ہی اس موضوع پر زیادہ بہتر روشنی ڈال سکتا ہیں۔ رسل صاحب نے فرمایا میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی ذہین آدمی پیدا ہوتا ہے تو وہ شعر کہنے لگتا ہے۔ اس کی تمام ذہنی توانائی اس کے باعث گرد کشائی کی تمام صلاحیتیں شاعری کے فن کاری کی نمائش میں صرف ہو جاتی ہیں اور ہمارے ہاں جب کوئی جینیس (Genius) پیدا ہوتا ہے تو وہ ایجادات کرتا ہے اور ہماری قوم ان ایجادات کے ذریعے سے آپ لوگوں کو ہر محاذ پر شکست دے کر اقتدار پر قبضہ کر سکتی ہے اس کے علاوہ ہماری قوم کا ہر فرد اپنے ملک اور قوم کا وفادار ہے۔ اور ہر مقتدر شخص جو کچھ کرتا ہے اپنے ملک کے مفاد کو پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس آپ کے صاحب اقتدار طبقہ کے پیش نظر صرف ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ آپ کے بڑے بڑے جاگیردار نواب اور سربراہ حکومت اپنے مفاد کی خاطر قوم کا سودا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور آپ کے شعرا کی کثیر تعداد ان قوم فروشوں کی تعریف میں لمبے لمبے قصیدے لکھ کر ان کی خوشامد اور اپنی ذہنی خوشحالی میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔ مگر ہمارا کوئی شخص خواہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو سب سے پہلے اپنے ملک اور قوم کے فائدے کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس طرح ایجادات کے ذریعے سے ٹیکنالوجی کی ترقی اور قومی مفادات سے وفاداری یہ دو خصوصیتیں انگریز قوم کی ترقی کا راز ہے۔ اس کے برعکس آپ کے ہاں مشاعروں کے چکر نے آپ کے مفکروں اور عقل مند لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کو شاعری اور واہ واہ کے چکر میں اس طرح گرفتار کر دیا ہے کہ وہاں کوئی موجد پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا اور اس کو ریاستی سرپرستی حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے آپ کے ملک میں ٹیکنالوجی ترقی نہیں کر سکتی اور آج کی دنیا میں ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔

پروفیسر صاحب پی رہے تھے سب کچھ کہہ گئے جو ابھی تک کسی انگریز نے نہیں کہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کتنی سچی باتیں کر رہا ہے۔ گو اس کی فکر جانب کے مشکل اشعار کی معنوی باریکیوں تک رسائی حاصل نہ کر سکی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انسانی ترقی

اور خیال کے باریک دھاگے سے تو وہاں یہ جوڑ آگیا ہے کہ آج بھی دنیا اس کی قوم کی طاقت اور برتری کا لوہا ماننے پر مجبور ہے۔

اور جب میں رائٹ رسل صاحب کے کمرے سے روانہ ہوا تو میری عجیب حالت تھی۔ میں اندیشہ ہائے دور دراز میں ڈوبا ہوا سوچ رہا تھا کہ انگریز قوم کو بچنے کے لیے ہندوستان کا سفر کرنا کس قدر ضروری ہے۔

اس کے بعد میں جس دن لندن سے کراچی رخصت ہو رہا تھا اس سے ایک دن پہلے رسل صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ وہ کل ملنے وہ میرا لیکچر طلبہ پر اپنی کلاس میں رکھنا چاہتے ہیں مگر میں نے عرض کیا کہ میں تو دوسرے دن پاکستان واپس جا رہا ہوں اس لیے معذور ہوں۔ ان کو یہ سن کر افسوس تو ہوا مگر کیا کر سکتے تھے۔ کہنے لگے وہاں ہاؤس صاحب کو میرا سلام کہیے گا۔

۱۹۷۵ء کے واقعات

میری پاکستان واپسی

میں ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو کراچی لوٹ آیا۔ آنے کے بعد جوشش صاحب سے اسلام آباد فون پر بات کی اور اپنے کراچی لوٹ آنے کی اطلاع کے ساتھ ساتھ رائف رسل صاحب سے ملاقات کا ذکر کر کے ان کو رسل صاحب کا سلام بھی پہنچا دیا۔ سن کر بہت خوش ہوئے فرمایا میں آج کل سخت مصروف ہوں تم اسلام آباد آ جاؤ مگر میں خود یہاں اپنے کاموں میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ کہیں آنا جانا میرے لیے ناممکن تھا۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ اپریل کے شروع دنوں میں راجب صاحب مرادآبادی نے مجھے بتایا کہ اس ماہ کے وسط میں سکھر میں کل پاکستان مشاعرہ ہونے والا ہے جس میں جوشش صاحب بھی شرکت کریں گے۔ میں نے ۱۰ اپریل کو جوشش صاحب سے فون پر بات کی وہ لاہور میں ہاشمی صاحب کے گھر مقیم تھے۔ انھوں نے کہا ارے میاں تمھاری صورت دیکھے صدیاں بیت گئی ہیں۔ تم سکھر کے مشاعرے میں جو اس ماہ کی ۱۵ تاریخ کو منعقد ہو رہا ہے، ضرور آ جاؤ اگر نہیں آئے تو مار ڈالوں گا۔ میں نے کہا مشاعرہ سکھر کے ڈپٹی کمشنر یوسف جمال صاحب کروا رہے ہیں اور وہ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ میں بن بلائے اور بغیر تعارف کے کیسے آ جاؤں؟ جوشش صاحب نے کہا میں خود یوسف جمال سے کہہ دوں گا وہ اپنا بچہ ہے۔ تم ضرور آنا۔ تم ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ پندرہویں اپریل بروز ہفتہ ۱۹۷۵ء میں سکھر کے لیے روانہ ہوا تو اسی جہاز سے نبیل صاحب اور غضنفر احسن صاحب (طالب لائبریری والے) بھی سکھر جا رہے تھے

میں جوشؔ کے ہوائی اڈے پر یوسف جمال صاحب نے سب کا استقبال کیا۔ جب میں نے اپنا تعارف کروایا تو خوشی سے گلے لگا لیا۔ مجھے لگے کل جوشؔ صاحب نے ٹی وی پر آپ کا تعارف کروایا اور حکم دیا ہے کہ آپ کے قیام کا انتظام بھی جوشؔ صاحب کے ساتھ کیا جائے اس لیے آپ جوشؔ صاحب کے ساتھ ٹھہریں گے۔ میں سرکٹ ہاؤس پہنچا دیا گیا جہاں لیلیٰ صاحب اور جوشؔ صاحب کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا تھوڑی دیر میں جب تک ہم لوگ چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے جوشؔ صاحب بھی بذریعہ ریل گاڑی لاہور سے سکھر آ گئے۔ جوشؔ صاحب مجھ سے بہت محبت سے ملے اور دیر تک لاہور کے قصے سناتے اور مجھ سے انگلینڈ کے واقعات سنتے رہے۔

سکھر میں کل پاکستان مشاعرہ ۱۲۔۳۔۶۵ء

رات کو مشاعرہ تھا۔ جس کو راغب صاحب مراد آبادی نے کنڈکٹ کیا۔ جس میں پاکستان کے تمام بڑے بڑے شعرا شریک تھے۔ حضرت جوشؔ ملیح آبادی اور جناب لیلیٰ صاحب تو تھے ہی ان کے علاوہ جناب حمد فراز، ہدایت علی شاعر، محسن بھوپالی، سرور بارہ بنکوی، صہبا اختر، سحر انصاری۔ غرض تمام شعرا اور شاعرات نے شرکت کی تھی۔ راغب صاحب ہر ایک کا تعارف بڑی عمدہ اشعار سے کروا رہے تھے چلیے آپ کو بھی مشاعرے میں لیے چلتے ہیں۔

سب سے پہلے جن صاحب کو زحمت کلام دی گئی وہ تھے غلام غوث قاضی صاحب۔ راغب صاحب نے ان کا تعارف اس طرح کروایا

دوست ہے یہ شان اقبالی صاحب — فضل ربی ہے سرفرازی صاحب
ملتا ہوں کہ کہ شاعر خوش فکر بھی ہیں — اللہ ! غلام غوث قاضی صاحب

غلام غوث صاحب اپنا کلام سنا چکے تو راغب صاحب نے فرصت رضوی صاحب کو بلایا۔

کہتے ہیں سب خوب فرصت رضوی — راغب کو ہیں مرغوب فرصت رضوی
اسٹیج پہ آئیں اور سنائیں اشعار — محفل کو ہیں مطلوب فرصت رضوی

فرست رضوی نے اس شعر پر ہی غزل ختم کی۔

کتنے نازک کنائے رکھتی ہیں
ان کی آنکھیں مرے سخن کی طرح

تو راغب صاحب نے زہرہ اشتیاق صاحبہ کو دعوت کلام دی۔

آئیں اب زہرہ اشتیاق آئیں
ان کے اشعار ہیں چمن کی طرح

ان کے بعد جناب جاذب قریشی کو دعوت کلام دی گئی۔

ک صاحب جاہر ہیں جناب جاذب — صد رشک گل تر ہیں جناب جاذب
راغب نہ ہو کیوں جاذب شوق ان کا کلام — خوش فکر سخنور ہیں جناب جاذب

جاذب صاحب کے بعد دلاور فگار صاحب تشریف لائے تو راغب صاحب نے کہا۔

یہ فرض ادا ہو گا نہ مجھ سے رسا — مانا کہ ہے احباب کا پیہم اصر
ان کے اشعار ہیں کہ تیر و نشتر — راغب کہتے تو ہیں دلاور کو

دلاور فگار صاحب کے بعد مظفر ایوبی صاحب کو دعوت دی گئی۔

اشعار میں دل کشی بھی ہے غزل بھی — پڑھتے ہیں یہ یکسر شان محبوب
تائید کریں گے اہل محفل میری — جان محفل ہیں مظفر ایوبی

مظفر بدایونی کے بعد اعجاز انصاری صاحب تشریف لائے

سر تا قدم ہیں معتبر انصاری — میر ادب اگر نہ ہوں انصاری
دنیائے ادب کی تیرگی کے حق میں — خورشید بہ داماں ہیں اعجاز انصاری

اعجاز انصاری صاحب کے بعد راغب صاحب نے اعلان کیا۔

اب بزم میں اک نکتہ داں آتے ہیں
استاد احمد سعید خاں آتے ہیں

ان کے بعد جناب محسن بھوپالی تشریف لائے تو راغب صاحب نے فرمایا

بھوپال کی ہیں شان محسن صاحب — ہیں نازش روزگار محسن صاحب
یہ بھی ہے بھی تعارف ہے جن کا — شاعر ہیں وہ باوقار محسن صاحب

محسن صاحب کے بعد محترمہ رابعہ سماں صاحبہ جلوہ افروز ہوئیں تو راغب صاحب نے استقبال کیا۔

نازاں ہوں کہ یک نکتہ داں آتی ہے — کب شاعرہ فخر بیاں آتی ہیں
بلی سکھر کو ہو مبارک رغب — اس شہر میں رابعہ سماں آتی ہیں

ان کے بعد جناب سرور بارہ بنکوی تشریف لائے۔

لیلائے غزل پہ اب شباب آتا ہے — آنکھوں میں سرور سے تاب آتا ہے
دنیائے ادب میں جسے کہتے ہیں سرور — وہ خالق سنگ آفتاب آتا ہے

سرور تر تو صنائے دور باندھا۔ راغب صاحب نے کہا۔

کیوں ان کی کسی صف سے ہو ناچاقی — ہے ان کی سرشت ہی میں غوش اخلاقی
ہر حرف کو مین ہے ان کا موضوع — صبا افشاں ہیں شاعر آفاقی

صبا اختر کے بعد جناب حمایت علی شاعر کو پیش دعوت سخن دی گئی۔

فطرت نے کیا ہے انتخاب شاعر — ہو گا نہ غروب آفتاب شاعر
حاصل ہے حمایت علی بھی ان کو — خوش بخت سخن ور ہیں جناب شاعر

جناب حمایت علی شاعر عام طور پر ترنم سے پڑھتے ہیں۔ آواز میں لگ کا رچاؤ کلام کا لطف دوبالا کر دیتا ہے مگر اس دفعہ جب انھوں نے اپنا کلام تحت اللفظ سنانا شروع کیا تو سامعین نے شور مچا دیا کہ ترنم سے سنائیے۔ حمایت علی صاحب نے کہا کہ وہ ترنم سے پڑھنا چاہتے تھے مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی ہے تو راغب صاحب نے فوراً کہا۔

ہے شوق ترنم سے سنانے کا مجھے
آواز مگر ساتھ نہیں دیتی ہے

حمایت علی شاعر کے بعد جناب احمد فراز تشریف لائے تو راغب صاحب نے کہا۔

سنائے غزل کا راز آیا لب پہ — باصد عجز و نیاز آیا لب پہ
ملے ہے اعجاز تغزل راغب — نام احمد فراز آیا لب پہ

احمد فراز کی غزل کا مقطع تھا

فیض احمد فیض

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا مہمل ہے فراز
وہ تو قاتل کو بھی الزام مسیحائی دے

سامعین نے دل کھول کر داد دی اور مزید غزل سنانے کی فرمائش کی تو فراز صاحب نے ایک غزل اور سنائی جس کا آخری مصرع تھا۔

روشنی کیسی کہ یادیں بھی مٹا دی جائیں گی

اس کے بعد راغب صاحب نے عباسی صاحب کو دعوت کلام دی۔

رونق محفل ہیں عباسی بھی پی بزم میں
اب مزاح و طنز کی شمعیں جلا دی جائیں گی

عباسی صاحب مزاح کی شمعیں جلا چکے تو خود راغب صاحب کی باری آئی راغب صاحب نے ارشاد فرمایا کہ حضرات اب میری باری ہے مگر میں آپ کی اس قدر صبح خراشی کر چکا ہوں کہ شاید اب آپ مجھے مزید برداشت کرنا پسند نہ فرمائیں مگر لوگوں نے شور مچا دیا اور راغب صاحب کو اپنا کلام سنانا پڑا۔

راغب صاحب کے بعد جب جناب فیض احمد فیض کو دعوت کلام دی گئی تو لوگوں نے اس قدر زور شور سے ان کا استقبال کیا کہ راغب صاحب کی آواز سنسن شور میں دب کر رہ گئی اور میں ان کے استقبالی اشعار نہ سن سکا۔ فیض صاحب اس وقت اردو ادب کے سب سے بلند مقام اور عوام کے محبوب ترین شاعر ہیں۔ یہ ترقی پسند فکر کی آواز، محبت اور انسانیت کا پیکر، ستم دیدہ کے مظلوم انسان ان کے خاندان کے افراد ہیں اور ظلم، بے انصافی خواہ کسی جانب سے ہو فیض صاحب چیخ بلکہ دہاڑ جاتے ہیں۔

فیض میں میر کی زباں اور غالب کی فکر یک جا جمع ہو گئی ہے۔ آج فیض صاحب نے کئی تازہ نظمیں سنائیں۔ آپ بھی سنیے۔

فیض صاحب نے کہا۔ پہلے دو شعر سن لیجیے۔

ہزار درد شب آرزو کی راہ میں ہیں — کوئی ٹھکانا بتاؤ کہ قافلہ اترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوق دید مٹے — شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ ترے

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جس میں مطلع سمجھا ہے۔ فیض صاحب کے پڑھنے

کا ایک خاص انداز ہے آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ کو ہلکے سے جھٹکے سے ادا کرتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ انداز زیادہ مناسب نہیں کرتا مگر جب سنتے سنتے کان عادی ہو جائیں اور اس پیارے لہجے میں فیض صاحب کی شخصیت کی حلاوت گھلنے لگے تو پھر فیض صاحب کے اسلوب کا جو پوری طرح سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ فیض صاحب نے اپنے خاص انداز میں غزل شروع کی۔

نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غمگسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا

جو تھے ہم تو بسر تھیں قربتیں کتنی
کم ہوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کیا کیا

تیرے کے دہ پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے
اگرچہ رہ میں ہوئیں جگ ہنسائیاں کیا کیا

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں بھلائیاں کیا کیا

ستم پہ خوش، کبھی لطف و کرم سے دھیان
سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا

فیض صاحب غزل سنا رہے تھے اور سامعین نے داد کے شور سے تمام پنڈال سر پر اٹھا رکھا تھا۔ غزل ختم کر کے جب وہ رخصت ہونے لگے تو لوگوں نے اور کلام سنانے کی فرمائش کی تو راجب صاحب نے ان کی تائید میں فرمایا۔

غزل ایک اور سنا دیں جو تم نے نہ سنائی
یہ سامعین ہیں دیں گے دہائیاں کیا کیا

فیض صاحب نے لوگوں کی فرمائش پر بنگلہ دیش کی علیحدگی پر کہی ہوئی غزل سنائی جس کا عنوان ہے۔

"ڈھاکے سے واپسی پر"

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر ہمیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے ختم درد عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

اس کے بعد سامعین کے اصرار پر راقم صاحب نے ایک اور غزل سنانے کی فرمائش کی۔

اک غزل ہم اور سن لیں گے جناب فیضؔ سے
آرزو ہو جائے گی پوری مناجاتوں کے بعد

فیضؔ صاحب نے یک نظم شروع کی۔

"ہم تو مجبور تھے اس دل سے"

ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس میں ہر دم — گردشِ خوں سے وہ کہرام بپا رہتا ہے
جس طرح وقت بلاوش جو ل بیٹھیں ہم[1] — میکدے میں سفرِ جام بپا رہتا ہے
جو ناظر کو ملا جب بھی سماں کوئی — داغِ حرماں کوئی صدمہ تمنا کوئی
غم یاس سے بوجھل جو شفا ہونے لگا — زخمِ امید کوئی پھر سے ہرا ہونے لگا
ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس کی ضد پر — ہم نے اس رات کے ماتھے پہ سحر کی تحریر
جس کے دامن میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ہم نے اس دشت کو ٹھہرایا فردوسِ نظیر[2]
جس میں جز صحرائے جاں سرد ہوا کچھ بھی نہ تھا

دل کو تسخیر کوئی اور گوارا ہی نہ تھی — کلفتِ زیست تو منظور تھی ہر طور مگر
راحتِ مرگ کسی طور گوارا ہی نہ تھی

اس نظم کے بعد جب فیضؔ صاحب رخصت ہونے لگے تو لوگوں نے ایک اور "ایک اور" کا شور مچا دیا تو فیضؔ صاحب کو مجبوراً ایک اور غزل سنانا پڑی۔ اس کا عنوان ہے۔

[1] مطلب ہے جلاوش پہ مصرع اس طرح ہے۔ "جیسے رندانِ بلاوش جو ل بیٹھیں ہم"
[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضؔ صاحب پاکستان کے مستقبل کے متعلق بدظنی کر رہے ہیں

"غبار خاطر محفل ٹھہر جائے"

کہیں تو کاروان درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آ لگے عمر رواں یا دل ٹھہر جائے
اماں کیسی کہ موج خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے[1]
کوئی دم بادبان کشتی صہبا کو تہہ رکھو
ذرا ٹھہرو غبار خاطر محفل ٹھہر جائے[2]
فرو ساقی ہی جز زہر ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس کرام کے قابل ٹھہر جائے
ہماری عاشقی اس دل سے اب تک ایک وتد ہے
یہ وہ طوفاں ہے جو پل بھر لب ساحل ٹھہر جائے[3]
نگہ منتظر کب تک کرے گل آمد بہاری
کہیں تو دشت غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے

سامعین کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا مگر رات بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ آخر فیض صاحب نے یہ کہہ کر کہ اب ہم جوشش صاحب کو سنیں گے۔ سامعین سے اجازت لی اور اپنی نشست پر تشریف لے آئے اور رجب صاحب نے حضرت جوشش ملیح آبادی کا استقبال ان الفاظ سے کیا

انسان کائنات کہتے ہیں جوشش — انسان کے دل کی بات کہتے ہیں جوشش
فطرت ہر بن گوشش نظر آتی ہے — جس وقت ریاضیات کہتے ہیں جوشش

1. یہ ظلم تھا کہ ہمارے کاشش ہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے (غالب)
2. ذرا ٹھہرو لے چلو کاروان کیف و مستی کو
کہ سطح دامن عالم شکست رنگ ہے ساقی (جوشش)
3. کتاب میں یہ مصرع اس طرح ہے۔ "یہ طوفاں ہے جو پل بھر لب ساحل ٹھہر جائے"

جوش صاحب جب مائیک پر تشریف لائے تو بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ آواز میں جوش و جوانی کی گھن گرج نعرہ مستانہ لگا رہی تھی کہ "جو ہمہ و سال کی ایسی تھی"۔

آتے ہی فرمایا۔ جناب ایک فارسی شعر یاد آ رہا ہے۔

یک نعرۂ مستانہ ۔ چاہئے ۔ شنیدم

ویراں شود آں شہر کہ سے خانہ ۔ وجود

پھر فرمایا کہیں سے یک نعرۂ مستانہ سنائی آ رہا ہے سامعین میں سے ۔ وہ شہر ویران ہو جائے گا جہاں سے خانہ نہیں ہے۔

ویراں شود آں شہر کہ سے خانہ ۔ دارد

لوگوں نے شور سے پنڈال سر پہ اٹھا لیا۔ اسی شور میں جوش صاحب کی آواز پھر ابھری۔

سے دق نگاہیست ۔ ہنگامہ عشقے

اے دوست ۔ شہرے کہ دراں عشق گرے نیست

اس پر سرور بادہ بنکوی بولے۔ جوش صاحب اب فارسی ہی سنائیے حضور۔

جب سامعین کا شور کچھ کم ہوا تو جوش صاحب نے رباعیات سنانا شروع کیں۔

اس وقت سبک بات نہیں ہو سکتی — توہین عزائم نہیں ہو سکتی
مجرے کے لیے آئے ہیں جبریل امیں — کہ وہ کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

اب بزم نگاراں ہے مجھے دار جحیم — لے کے آئی یہاں تک اسے عزم عظیم
یہ بھی کہنا پڑا کہ جیئے خوش باش — یہ بھی سننا پڑا کہ ہاں تسلیم

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھا جانا یارب — سو بار جہنم میں جلانا یارب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ — ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

ہم دوستوں میں قہقہہ دیوانے سے — مطلب ہے فقیروں کے سمل جانے سے
ہر شام و سحر کرتے ہیں عیاشی ہم — تو لطف وضو سے اور مے پینے سے

حضرت جوتشی میع نادی کلام سنا رہے ہیں

لوگوں نے اس قدر دور شور سے داد دی کہ پنڈال سر پر اٹھا لیا۔ جوشی صاحب نے فرمایا۔

جس پر بھی حسینوں کا کرم تھا اک دور — اس قوم میں اپنا بھی بھرم تھا اک دور
جو اہل نگاہوں کی گزرگاہ ہے اب — یہ چہرہ جو آنکھوں کا حرم تھا اک دور

دنیا کا عجب طور نظر آتا ہے — بدلا ہوا ہر دور نظر آتا ہے
حیرت ہے کہ جب آئینہ میں دیکھتا ہوں — بوڑھا سا کوئی اور نظر آتا ہے

پیری سے ہمیشہ کی نرالی ہم نے — ہر آن جوانی ہی منالی ہم نے
ہر سال کوئی درد مہ و سال سہیں — گو اپنی ہمیشہ کم بتالی ہم نے

ہے دوست دل میں گر کدورت نہ چاہیے — اچھے تو کیا برے سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رحمت نہ چاہیے — کانٹوں سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پلا ہوا ہے وہ بھی نسیم سحر کا

اف غرق شراب ناب رتیں نہ کرو — جو پٹ سہیں پڑتی ہیں وہ گھاتیں نہ کرو
یہ سانس کی خوشبو ہے کہ رچی کی لالی — اف اتنے قریب آ کے باتیں نہ کرو

اس کے بعد جوشی صاحب کہہ رہے تھے کہ اب رات ست ہو چکی ہے مگر سامعین میں سے کسی نے کہا وہ رباعی سنائیے۔ کل رات گئے عین طرب کے ہنگام۔ جوشی صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا سہیں صاحب اب تو

ہر ہاست کی ہے یہ ہاست آؤ سو جائیں — ہر ہست ہے خود حیات آؤ سو جائیں
شبنم سے ہے چاندنی کا دامن نمناک — اب بھیگ چکی ہے رات آؤ سو جائیں

مگر لوگوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ نظم سنائیے تو جوشش صاحب نے مجبور ہو کر سنانا شروع کیا۔ ایک مطلع سن لیجیے۔

کچھ دل اتنی لطافت میں ڈوبتا ہے مجھے
چاندنی کا وزن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے

مگر اصلاحی صاحب نے کہا۔ "محسوس ہوا نظام شمسی کا دباؤ"۔ جوشش صاحب نے تائید کی۔ جی ہاں جی ہاں یہی بات ہے۔

لوگوں نے شور مچایا گل بدلی سنائیے۔ راجب صاحب نے مجھ سے کہا۔ "خورشید صاحب بیاض میں سے گل بدلی نکال کر دیجیے"۔

سرور صاحب نے کہا۔ "کیا گل بدلی ہے؟ اگر وہ ہے تو سبحان اللہ واللہ مزا آجائے گا"۔

جوشش صاحب اس بات پر مصر تھے کہ "سب بھیگ چکی ہے رات تو سو جائیے"۔ مگر لوگوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر جوشش صاحب کو مجبوراً ایک نظم سنانا پڑی۔

"یادش بخیر ہم بھی کبھی روز مہ چکاں تھے"

یادش بخیر ہم بھی کبھی روز مہ چکاں تھے — نوخیز و نو ادا تھے تو تیر و تو کماں تھے
آنکھیں فسانہ گو تھیں انداز طرز خواں تھے — کشمیر کی کہانی کشمیر کی داستاں تھے
گہرے تھے گل حسن تھے گل مدعا تھے گل فشاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

آنگن میں ناچتے تھے برسات کے مہینے — آغوش میں صنم تھے ترشے ہوئے نگینے
پہلو میں تھے دھڑکتے زیر و زبر تھے سینے — تن ڈھانپتے تھے جیسے گرداب میں سفینے
وہ بھی رواں دواں تھے ہم بھی رواں دواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

ہر سانس تھی ہماری اک کشتی دخانی دکی ہوئی ترنگیں بکی ہوئی روانی
کھلا ہوا شگوفہ کھلتی ہوئی کلی بڑھتی ہوئی حکایت بڑھتی ہوئی کہانی
بھڑکی ہوئی دھنک تھے کڑکی ہوئی کماں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

تھے گل رخاں میں بھرتے تھے روپ کیا کیا پاپا کا دل لبھاتے جاتے تھے دیر گرجا
پنڈت کو رام کرتے پھرتے تھے شب کو ہم مسلم کی کنج میں پڑھتے تھے لو ہا
مومن کے دائرے میں پکے حدیث خواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

کھلیں میں کودتے تھے راتوں کو جب یکایک ہوتی تھی شہ سے بھاتی شہ دوبلوں کی دھک دھک
گھڑیوں کی لو جگاتیں جھٹ سے بجا کے دیپک ہم صبح کو یہ باتیں کرتے رہتے تھے دیر تک
اس درجہ پاسباں ناموس گل رخاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

کرتا تھا حقہ ثابت جس وقت کوئی کھوٹ ہم اس کی دوستی کا پیتے تھے جام فٹ فٹ
ہوتا تھا جب حسد سے دو دوستوں کا جھگڑا راہ مصالحت پر ہم دوڑتے تھے جھٹ پٹ
اپنے پہ بھی کرم تھا اس پر بھی مہرباں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

اک دور آ گیا تھا ایسا بھی زندگی میں رہنا پڑا تھا ہم کو ملاں کی گلی میں
گھڑیوں کی ٹھنکیاں تھیں گھڑیوں کی چاندنی میں سہمے ہوئے تھے سرگم لکنت تھی گنگری میں
کاشی میں آشیاں تھا بھاؤں کے درمیاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

ٹلتی تھیں جب نگاہیں ترکان شعلہ تن سے ٹھنتی تھیں دلوں کی آہیں اس بے بدن سے
لو کم سنوں کی پایل جب بولتی تھی چھن سے محراب زندگی میں چلتی تھی توپ دن سے
وہ دولت قمر تھے ہم دامن کتاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

گردن میں ڈالتے تھے بانہیں جو ہار بنکر — سینوں میں گو بجتی تھی مستی کی آگ جھر جھر
اور رات بھیگتے ہی جب نشے میں وہ دل بر — تکیوں پہ اینٹھتے تھے بکھرے گرا گرا کر
ہم بھی وہیں وہیں تھے وہ بھی وہاں وہاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

ایوان تھا اور متوالیوں سے جھل جھل — اڑتا کسی کا مجرہ تڑپی کسی کی بیکل
انگڑائیوں کا میلہ گدراہٹوں کا دنگل — آنکھیں بیابیوں کی رقصاں نشوں کی بھل بھل
پٹڑے کنواریوں کے دوشیزہ کھلکھلاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

لفظوں میں ہم پہ یارو ہر شوخ ناز میں تھی — کندن کے خال و خد تھے یاقوت کی جبیں تھی
آنکھوں میں ست کدے تھے لہجے میں بھیرویں تھی — ہم میں وہ کون ایسی الہٹ سے جو نہیں تھی
تتلی تھے پنکھڑی تھے موہن تھے ارمواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

بیدی صبیح ابن کامل گھل اٹھاں — سدا ستارہ چکا صمدی اگر چراغاں
چھاگل پیالہ چھم چھم رم جھم رباب رسماں — شب بانے بادہ باراں لب بانے بوسہ خواہاں
یہ طرفہ کارواں تھا ہم میر کارواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

راتیں گزارتے تھے ہم جوش گھر سے باہر — رہتے تھے مہ وشوں کے اخلاص سے مسلسل
اور گھر میں جب پہنچتے سہمے ہوئے سراسر — تو پوچھتی تھیں بیگم یہ صبح کو بگڑ کر
کیوں جی قسم تو کھاؤ کل رات کو کہاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

اور اس طرح جب جوش صاحب تمام رات بزم گل رخاں میں گزارنے کے بعد صبح کو بیگم کے احتساب سے سہم کر ہر شریف آدمی کی طرح جھوٹی قسمیں کھا رہے تھے تو مقام مرے کے پنڈال کے قریب کی مسجد سے موذن کی فجر کی اذان گونج رہی تھی۔ "الصلوٰۃ خیر من النوم" تو

جوش صاحب نے بے ساختہ کہا۔

موذن مرحبا بروقت بولا۔ تری آواز مکے اور مدینے۔

یوسف جمال صاحب نے تمام شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح یہ محفل شعر و سخن اپنے اختتام کو پہنچی۔

دوسرے دن سہ ماہی شعرا کا مشاعرہ ہوا جس کی پیر حسام الدین صاحب راشدی نے صدارت کی۔ شیخ ایاز اور دوسرے شعرا نے شرکت کی۔ میں اور جوشش صاحب شریک ہوئے۔

چودھویں اپریل کو یوسف جمال صاحب نے اپنی قیام گاہ پر سہ ماہی شعرا کو ناشتے پر مدعو کیا تھا۔ میں اور جوشش صاحب بھی گئے مگر جیسے ہی مکان کے صدر دروازے پر یہ تحریر دیکھی "رہائش گاہ ڈپٹی کمشنر سکھر" تو جوش صاحب نے کہا کہ جو شخص اس قدر غلط مکان میں رہتا ہے میں اس کی کسی دعوت میں شریک نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہاں سے بھاگ چلو۔ میں نے عرض کیا کہ جوش صاحب اس طرح پسپائی آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ ضرور اس پارٹی میں شرکت فرمایئے اور یوسف جمال صاحب کی توجہ اس اصطلاح کی غلطی کی طرف مبذول کر دیجیے تاکہ غلطی کی اصلاح ہو۔ اس طرح تو یہ غلطی جوں کی توں برقرار رہے گی تو جوش صاحب شرکت پر راضی ہو گئے اور یوسف جمال صاحب سے مل کر پہلی بات ہی کی کہ "جناب آپ کے مکان پر "رہائش گاہ" جیسی غلط اصطلاح لکھی ہوئی ہے اور آپ ابھی تک اس غلطی کو برداشت کیے ہوئے ہیں؟" یوسف جمال صاحب نے نہایت محبت اور انکسار سے جوشش صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اولین فرصت میں اس غلطی کی اصلاح کریں گے۔ اس کے بعد جوش صاحب کو ناشتے کی میز پر لے جایا گیا جہاں تلی ہوئی مچھلی، پوریاں، دہی، آلو کا بھرتا اور پھلوں سے مہمانوں کی خاطر کی گئی تھی۔

ناشتہ ختم ہوا تو مہمان رخصت ہونے لگے۔ شیخ ایاز پیر حسام الدین صاحب سے مل کر رخصت ہو گئے۔ انھوں نے جوش صاحب سے تعارف حاصل کیا۔ انھیں خدا حافظ کہا اور چلے گئے۔ سب نے یہ بات محسوس کی کہ "اس قدر دشمن اور باب وفا ہو جاتا"۔ جب سب لوگ چلے گئے تو میں، جوشش صاحب، سرور بارہ بنکوی، راغب صاحب اور چند احباب

یوسف جمال صاحب کے گھر ٹھہرے گئے اور ان کی مہمانیت دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جناب یوسف جمال فیض صاحب کے انداز میں ان کا کلام اس طرح سناتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے خود فیض صاحب اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ ابھی یہ دلچسپ محفل جاری تھی کہ یوسف جمال صاحب کے فی سے آ کر بتایا کہ کچھ حضرات کی سیٹیں دو بجے کی فلائٹ سے کراچی کے لیے مختص ہو چکی ہیں جس میں میرا اور جوش صاحب کے علاوہ پیر حسام الدین صاحب کا بھی نام تھا چنانچہ ہم لوگ بادل ناخواستہ وہاں سے رخصت ہو کر گیسٹ ہاؤس گئے اور اپنا سامان لے کر ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔

کراچی واپسی:

یوسف جمال صاحب نے ہم لوگوں کو ہوائی جہاز پر سوار کروایا اور اس طرح ۱۳ اپریل ۷۵ء کو ہم لوگ کراچی واپس آ گئے۔ کراچی میں ایئرپورٹ پر میرا بیٹا گاڑی لے کر آ گیا تھا ہم لوگوں نے پہلے جوش صاحب کو ان کے گھر پہنچایا اور پھر میں اپنے گھر آ گیا۔

دوسرے دن شام کو جوش صاحب کے گھر تمام دوست جمع ہوئے۔ ڈاکٹر جلیل عالی، سلامت علی خان اور رغب صاحب بھی تھے جوش صاحب نے کچھ رباعیات سنائیں جو لاہور کے قیام کے دوران میں ہوئی تھیں۔

اے شام فراق اے بلائے خوں خوار — شاہد رہنا کہ میں ہوں یوں زار و نزار
اس وقت ہے چاندنی بھی اتنی بھاری — گویا لادے ہوئے ہوں ارباب کہسار

آغوش میں دور شکست سمن ہے اے جوش — اور ہونک رہا ہے در پہ دستک کا فروش
ذکر کہ وہ بگڑا رہی ہے خود کو مجھ سے — یہ ساعت جنت ہے جہنم بردوش

اک بوند ہوں دریا سے بچھڑ جاتا ہوں — بیمار ہوں جینے سے بگڑ جاتا ہوں
اے تلخی طبع ترا خانہ خراب — اس جان تمنا سے بگڑ جاتا ہوں

ہی ہار ہے پر کی صدا آتی ہے — اک دشمن اطہر کی صدا آتی ہے
رہ جاتی ہے جب اجل تو میرے دل سے — پرپشم قلندر کی صدا آتی ہے

بجلت یہ دنداں سے مری عمر دراز — انجام کے چہرے پہ ہے رنگ آغاز
بگ بگ میں گرجتا ہے جوانی کا غرور مشش — دم بم دم بم کی آتی ہے آواز

جب یہ محفل ختم ہوئی تو جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ کل صبح نو بجے تک آ جائیے، بابا صاحب کے گھر چلیں گے۔ ڈاکٹر عابد امام نے بھی کہا کہ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔

بابا صاحب کی باتیں۔ لا الٰہ الا اللہ:

دوسرے دن سولہویں اپریل ۱۹۷۸ء بروز بدھ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب بیٹھک کر چکے تھے۔ میرے جانے کے بعد شیروانی پہنی، ڈبیہ بٹوا لیا کہ راستے میں عابد امام بھی آ گئیں اور ہم تینوں بابا صاحب کے مکان واقع بنارس کالونی تیسری روڈ پہنچے۔ بابا صاحب نے نہایت محبت اور مسرت سے ہمارا استقبال کیا۔ جوش صاحب کو اپنے قریب صوفے پر بٹھایا۔ پہلے مٹھائی پیش کی گئی۔ پھر پھلوں کی باری آئی۔ اس کے بعد چائے نوش کی گئی۔ آج ہم لوگ تمام دن بابا صاحب کی لیاقت اور نہایت دلچسپ عالمانہ گفتگو سے مستفید ہوتے رہے۔ جب ہم چائے پی رہے تھے تو بابا صاحب نے فرمایا: یہ تمام کائنات حادث ہے اور قوانین الٰہی کے تابع۔ اس کا ایک ذرہ بھی احکام الٰہی کے خلاف حرکت نہیں کر سکتا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلافت الٰہی کے منصب پر فائز فرما کر یہ تمام کائنات اس کے سپرد کر دی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دے دیا کہ دیکھو اللہ کے علاوہ کسی اور کے حکم کے آگے مت جھکنا۔ "لا الٰہ الا اللہ" اللہ کے علاوہ کسی کو اپنا معبود مت تسلیم کرنا۔ اس لیے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم اس منصب جلیلہ سے گر جاؤ گے جس پر تمہیں اللہ تعالیٰ نے فائز فرمایا ہے۔ اس لیے اب تم اس کائنات کے خزانوں سے استفادہ کرتے رہو اور یہ تم صرف ان قوانین کی دریافت اور ان پر عمل کر کے ہی کر سکتے ہو جن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس

کائنات کو تخلیق کیا ہے۔

جوش صاحب نے کہا۔ بابا صاحب آج تو آپ میری فکر کی نمایندگی فرما رہے ہیں۔ میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ انسان کی فلاح صرف اس میں ہے کہ وہ قوانین دین دیانت کو اپنا لے اور ان ہی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔

بابا صاحب نے کہا۔ جی ہاں یہی ہے تو آپ ہم کو محبوب ہیں اور اب یہ حکم ہے کہ آپ کو قیامت کے دن کوئی ہاتھ نہ لگائے نہ اللہ نہ پیغمبر نہ کوئی فرشتہ۔ آپ اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ محبوب ہیں۔

میں نے کہا جوش صاحب مبارک ہو اب تک تو آپ صرف دانیال آدمی تھے اب سے محبوب دانیال بھی ہو گئے۔

اس فرمان پر محفل جو گمبھیر ہوتی جا رہی تھی کچھ ہلکی پھلکی گفتگو کی طرف مڑی۔

جوش صاحب نے کہا ان ہی باتوں سے تو میں بابا صاحب کا عاشق ہوں۔

اب گفتگو کا رخ جو بھی سمت کی طرف مڑا تو جوش صاحب نے لطیفے سنانے شروع کیے ایک دن وہ بیٹھے ایک دوست کے گھر گئے جن کو وہ نواب صاحب کہا کرتے تھے ان کے والد ایک عبادت گزار بزرگ تھے۔ جس کمرے میں جوش صاحب کو بٹھایا گیا تھا اس کے ساتھ والے کمرے سے کچھ غٹر غوں غٹر غوں کی سی آوازیں آ رہی تھیں جوش صاحب نے یہ دوست سے پوچھا نواب صاحب کیا آپ نے ساتھ والے کمرے میں کبوتر پال رکھے ہیں۔

نواب صاحب نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا ہمیں والد صاحب وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔

جوش صاحب نے اس لطیفے کو ایک رباعی میں بھی بیان کر دیا۔

حضرت یہ گھٹن ہے کیوں طاقت مسلسل
وقفہ تسلیم کیوں ہے اتنی بوجھل
پیہم یہ غٹر غوں کی ہے کیسی آواز ؟
اور ہو بھی ہیں والد ماجد مشغول

بابا صاحب نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ گفتگو کے دوران کہنے لگے کہ بابا صاحب میرے پاس دو سو سال پرانا اچار ہے۔ میں نے تعجب سے کہا اتنا پرانا

بد دست حالت میں کیسے رہ سکتا ہے؟ ذرا امام کو بھی چکھا دیکھیں تو کہ اس کا مزہ کیسا ہے؟
صاحب فرمانے لگے کہ بابا صاحب اگر اسی طرح میرے بزرگ چکھاتے رہتے تو اب تک وہ بد حالی کیسے رہ سکتا تھا۔

بابا تاج الدین ناگپور والے:

بابا صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ ناگپور کے بابا تاج الدین صاحب کا سنایا کہ ایک مرد ان کے پاس اپنے بیٹے کو لے کر آیا اور عرض کی کہ حضور اس لڑکے نے کچھ پڑھ لکھ لیا ہے۔ آپ بابا صاحب سے سفارش فرما کر اس کو کوئی اچھی سی ملازمت دلوا دیجیے۔ بابا صاحب نے اس لڑکے کو مخاطب کر کے فرمایا۔ تم لکھے پڑھے ہو؟

لڑکا۔ جی ہاں

بابا صاحب۔ کہاں تک؟

لڑکا۔ بی اے کر چکا ہوں۔

بابا صاحب۔ اچھا تو یہ بتلاؤ اپنی پیشانی کی تحریر پڑھ سکتے ہو؟ اگر تم بوشتہ تحریر پڑھ سکتے ہو تو میں کہوں گا کہ پڑھنا جانتے ہو مگر یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں لیکن اگر تم وہاں خود کچھ لکھ سکو تو میں کہوں گا کہ لکھنا بھی جانتے ہو۔ اور یہی انسان کا کمال ہے۔ غرض اس طرح دلچسپ گفتگو جاری رہی کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔

جوش صاحب دوپہر میں کھانا نہیں کھاتے۔ اس لیے وہ ایک کمرے میں جا کر سو گئے میں نے اور حلیمہ امام نے بابا صاحب کے ساتھ نہایت لذیذ کباب، بریانی، پراٹھے، قورمہ اور کئی قسم کے سالن، اچار چٹنی وغیرہ کے بعد میٹھا کھایا۔ اور اس کے بعد بابا صاحب کی دلچسپ باتیں سنتے رہے۔ جوش صاحب تین بجے بیدار ہوئے۔ غسل ثانی فرمایا اور حلیمہ کی فرمائش پر بابا صاحب نے قوال کو حکم دیا کہ وہ بابا صاحب کا کلام سنائیں۔

قمقمے کی غلطی:

اب محفل موسیقی سجائی گئی۔ سہ پہر کو دوست احباب اور بابا صاحب کے

سامعین بھی تشریف لے آئے۔ قوال نے ہارمونیم اور طبلہ ذکر رکھا۔ ہارمونیم خود سنبھالا اور ایک نوجوان طبلچی کو آواز دے کر بلا لیا۔ پہلے چند غزلیں سنائیں پھر ایک منقبت شروع کی۔ قوال کی آواز سماعت دلکش تھی۔ منقبت کے الفاظ بھی بے حد متاثر کرنے والے تھے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش تھا اور بعض لوگ عالم وجد میں محو ہو رہے تھے۔ جوش صاحب بھی دلچسپی سے سن رہے تھے کہ دفعتاً قوال نے ٹیپ کا بند سنایا

دربان کے ساتھ دل ہوا علی ہوا علی ہوا

یک دم جوش صاحب یہ چونکے جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو اور زور زور سے کہنا شروع کر دیا "بابا صاحب۔ ہوا" کا قافیہ "ہوا" نہیں ہوتا"۔ جیسے ہی جوش صاحب کی آواز گونجی ہر شخص استغراق کے عالم سے چونکا۔ جوشش صاحب کہہ رہے تھے "کلام اچھا ہے مگر قافیہ غلط ہے"۔ یہ سن کر بابا صاحب کچھ متاثر ہوئے۔ مگر فوراً ہی فرمایا۔ جی ہاں اس میں قوال کا ذہن خیال نہیں رکھا گیا۔ یہ عالم جذب میں کہی گئی ہے۔ مگر اس مداخلت کے بعد محفل کا وہ رنگ دوبارہ نہ جم سکا اور ہم لوگ اس محفل سے رخصت ہو کر اپنے گھر آ گئے۔

بہ خانۂ سلامت

ایک شام جوشش صاحب کے مکان پر سب احباب جمع تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور جوشش صاحب طلوع ہو چکے تھے کہ اتنے میں سلامت علی خاں صاحب اپنی موٹر میں وہاں آ پہنچے اور جوشش صاحب سے درخواست کی کہ باقی شغل سے فارغ ہو کر ان کے مکان پر مکمل کریں۔ سلامت علی خاں صاحب کی بیگم سلیمہ صاحبہ سادی کباب بہت عمدہ بناتی ہیں۔ جوشش صاحب ان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کباب بہت پسند کرتے تھے۔ جوش صاحب نے دریافت کیا کہ کیا سادی کباب کھلائیں گے؟ تو خاں صاحب نے کہا جی ہاں اسی لیے تو حاضر ہوا ہوں۔ یہ سنتے ہی جوش صاحب فوراً پیمانہ بہ کف خاں صاحب کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ خاں صاحب نے مجھے، راغب صاحب اور حافظ امام کو بھی بہ اصرار ساتھ لے لیا۔ راستے میں راغب صاحب نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی۔

از راہ محبت و شرافت آئے
حیرت ہے کہ ہنگام عیادت آئے
بیساد بکف کار میں جوشش اے راحت
اک پل میں کفاف سلامت آئے

سلیم بھائی اور سلامت علی خاں کے تمام بچے جوش صاحب کے بے حد گرویدہ تھے۔ ان کا بڑا لڑکا ٹیپو تو بچپن سے جوش صاحب کا چہیتا تھا۔ جب یہ خاندان ڈھاکے میں رہتا تھا اور سلامت علی خاں جوٹ کا کاروبار کرتے تھے تو جوش صاحب ان کے گھر ہفتوں قیام کیا کرتے تھے۔ ٹیپو میاں جب چھوٹے سے تھے تو جوش صاحب کے کمرے کی کنجی لیے لیے پھرتے تھے اور جوش صاحب جب باہر سے گھر آتے تو ٹیپو میاں کو آواز دیتے۔ اے میاں کنجی والے ہمارے کمرے کی کنجی تو دیجیے گا۔ اور ٹیپو میاں فوراً ہی جیب سے کنجی نکال کر جوش صاحب کے حوالے کر دیتے۔ اس وقت جب جوش صاحب سلامت علی خاں کے گھر بیٹھے ہوئے تھے تو سلیم بھائی نے جوش صاحب کو ایک تصویر دکھائی جس میں ننھے ٹیپو میاں جوش صاحب کی گود میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب نے تصویر دیکھ کر بے ساختہ کہا "اسے یہ کنجی والا ہماری گود میں بیٹھا ہوا ہے"۔ راحت صاحب نے فوراً یہ رباعی کہی۔

یہ حضرت جوشش کا ہے اک متوالا
بیٹھا ہے بآغوش جو ہوا بالا
کہتے تھے جناب جوشش اسی کو راحت
ڈھاکے میں بڑے پیار سے کنجی والا

جوش صاحب نے چوتھا پیگ ختم کیا تو سلیم بھائی نے کھانا چن دیا۔ جوش صاحب نے کھانے کی تعریف کی اور سب نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو احباب نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب نے کہا "ابھی تک وہ موڈ نہیں آیا ہے جو کلام سناتا ہے"۔ پھر عالیہ امام سے فرمائش کی کہ وہ کوئی اچھی سی غزل گا کر سنائیں۔ سلامت علی خاں نے ہارمونیم ٹھیک کر رکھ دیا۔ عالیہ نے جوش صاحب ہی کی غزل سنانا شروع کی۔

آنکھیں ہتھیلیوں سے مل نیند ہے چشم تر میں
بھر دے حنا کا رنگ بھی رگِ نیم تر میں
چھیڑوں کبھی جو رات کو تاروں سے نغمہ ٹپک پڑے
درد بھرا ہوا ہے وہ دل کے شکستہ ساز میں
میرے گدازِ عشق کا تم پہ اثر ہوا ضرور
بن کا رنگ آ چلا میرے دل نیند میں
دیکھ لو لے پہ ہے جوش کا دل بھی عنقریب
ذکر تھا کل یہ حسن کے خلوتیاں راز میں

حلیہ کی دل کش آواز اور فن موسیقی سے ان کی مہارت اور غزل کے ہر شعر نے ہر شخص کو بے خود کر دیا تھا۔ جب غزل ختم ہوئی تو رغب صاحب نے یوں داد دی۔

محفل جوشش میں کھلا ہم پر — ہائے کیا چیز ہے پریت کی ریت
نقش ہیں پردہ سماعت پر — ڈاکٹر حالیہ نام کے گیت

یہ محفل دس بجے تک چلتی رہی اس کے بعد سب احباب اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ میں نے جوش صاحب کو ان کے گھر پہنچایا۔ راستے میں جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ بائیسویں تاریخ کو ڈیرہ غازی خاں میں مشاعرہ ہے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ اس وقت تو میں نے کہہ دیا کہ میں سوچ کر جواب دوں گا اور انہیں گھر پہنچا کر اپنے گھر آ گیا۔ دوسرے دن میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا تو میری بیوی نے کہا کہ وہ بھی ساتھ چلیں گی۔ ان دنوں ملتان میں میرے چچا زاد بھائی حمایت علی خاں حبیب بنک کے ایریا منیجر تھے۔ ان کے بیوی بچے سب دنوں سے ہم میاں بیوی کو ملتان بلا رہے تھے مگر کسی طرح جانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اب یہ موقع فراہم ہوا تو میری بیوی نے کہا کہ وہ ملتان اتر جائیں گی اور ہم لوگ مشاعرے سے فارغ ہو کر واپس ملتان آ جائیں۔

ڈیرہ غازی خاں کا مشاعرہ

ہم تینوں بائیسویں اپریل کو کراچی سے ملتان روانہ ہو گئے۔ ایرپورٹ پر حمایت علی خاں

اور ان کی بیگم موجود تھیں۔ میری بیوی ان کے ساتھ چلی گئیں۔ میں اور جوشش صاحب پیدل ہی وہاں روانہ ہو گئے۔ وہاں کے نوجوان خوبصورت ADM مسٹر ریڈی نے ہمارا استقبال کیا اور ہم لوگوں کو اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ ریڈی صاحب مرحوم سطنے ریڈی کے چچا زاد بھائی اور مشاق قمر حلاوی کے نواسے ہیں۔ نہایت گورے چٹے، بھورے گھونگریالے بال وجیہہ نوجوان ہیں۔ جوش صاحب کے حد درجہ معتقد۔

وہاں پہنچ کر جوشش صاحب نے غسل کیا لباس تبدیل کر کے فروب آفتاب پر دیا شکل کیا اور کھانا کھا کر سو گئے۔ مشاعرے میں اور ست سے شعراء مدعو تھے۔ عنایت علی شاعر، رجب مراد آبادی، سمیر نیازی، محسن بھوپالی، سرور بارہ بنکوی، عبدالحمید عدم، احمد فراز۔ یہ سب حضرات بھی ریڈی صاحب کے مکان میں جمع تھے۔ سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر دو بجے کے قریب مشاعرہ گاہ میں پہنچ گئے اور مشاعرہ شروع ہو گیا۔ بارہ بجے ریڈی صاحب جوشش صاحب کے کمرے میں گئے اور ان کے پیر دبانے لگے اس سے جوشش صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ جوشش صاحب کو بیدار کرنے کا جو طریقہ ریڈی صاحب نے اختیار کیا میں اس نوجوان کی حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کی عظمت کا بھی قائل ہو گیا۔ اتنا بڑا افسر اور بزرگوں کے سامنے یہ انکسار۔ اس مشاعرے کے بعد میری ملاقات ریڈی صاحب سے کبھی نہیں ہوئی مگر ان کے کردار کی خوبصورتی اور دلکشی کا نقش میرے ذہن پر ہمیشہ کی طرح آج بھی تر و تازہ ہے۔ آج وہ یقیناً بہت بڑے افسر بن گئے ہوں گے۔ میں نے بعد میں جوشش صاحب سے ریڈی صاحب کی سعادت مندی کی تعریف کی اور کہا کہ ایسے ہی نوجوان ہماری تہذیب کی عظمت کے امین ہیں۔ مشاعرے کے دوران اور اس کے بعد جس طرح ریڈی صاحب نے تمام شعرا کی ضرورتوں کی جزئیات کا خیال رکھا وہ ان کے کردار کی خوبی کا آئینہ دار تھی۔

جوشش صاحب نصف شب کے بعد بیدار ہوئے تھے۔ سادھو کر مشاعرہ گاہ میں پہنچ گئے۔ اس وقت تک تمام شعرا اپنا اپنا کلام سنا چکے تھے۔ جوشش صاحب نے کچھ رباعیات اور چند نظمیں سنائیں اور مشاعرے کے اختتام کے بعد اپنی قیام گاہ پر آ کر دوبارہ سو گئے۔ صبح اٹھ کر ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد روانگی کی تیاری شروع ہو گئی۔ میں بلاش

صاحب اور میر نیازی صاحب ایک موٹر میں ملتان روانہ ہو گئے۔ راستے میں میر نیازی صاحب سے دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا کہ ان کی شاعری میں شعر خود انسانی سماج اور انسانی حیات کی بوقلمونی کا استعارہ ہے۔ ملتان پہنچ کر جوش صاحب ہوائی جہاز سے لاہور روانہ ہو گئے اور میر نیازی صاحب کو میں نے ریلوے سٹیشن پہنچایا جہاں وہ ایک بجے کی گاڑی سے لاہور روانہ ہو گئے۔ ان دونوں حضرات کو روانہ کر کے میں اپنے بھائی عنایت علی خاں کے گھر آ گیا جہاں میری بیوی مقیم تھیں۔

لاہور کا سفر:

ملتان میں تین چار دن قیام کر کے میں اپنی بیوی کے ساتھ لاہور روانہ ہو گیا اور وہاں اپنے ایک اور چچا زاد بھائی فخر علی خاں کے گھر سمن آباد میں قیام کیا۔ جوش صاحب قریب ہی ہاشمی صاحب کے گھر میں مقیم تھے۔ میں دوسرے دن صبح سویرے ان سے ملنے چلا گیا۔ مل کر بہت خوش ہوئے۔ دس بجے تک کچھ اور احباب بھی آ گئے۔ بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ دوپہر میں جب جوش صاحب آرام کی غرض سے لیٹ گئے تو میں گھر آ گیا۔ شام کو جب میں جوش صاحب سے ملنے گیا تو وہاں فلمی دنیا کی مشہور شخصیت جناب سید شوکت حسین رضوی بھی موجود تھے۔ وہ جوش صاحب کو اپنے گھر لے جا رہے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو مجھے بھی اصرار کر کے ساتھ لے لیا۔ ان کا گھر اور اسٹوڈیو ایک ہی عمارت میں واقع ہیں۔ وہاں ان کی حالیہ بیگم یاسمین صاحبہ نے ہمارا استقبال کیا۔ شوکت صاحب جوش صاحب کے عاشقوں میں سے ہیں۔ جوش صاحب کی بے حد خاطر تواضع کی گئی۔ یاسمین صاحبہ کی فرمائش پر جوش صاحب نے اپنا کلام بھی سنایا۔ شوکت صاحب شعر فہمی کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اور جو شعر اچھا ہوتا ہے اس کی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر کوئی دس بجے کے قریب شوکت صاحب نے ہمیں اپنے اپنے گھر پہنچایا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات:

دوسرے دن جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ چلو آج مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے

لے چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مولانا کے مکان پر پہنچے۔ ان دنوں مولانا کی طبیعت کچھ ناساز رہتی تھی۔ اس لیے زیادہ تر آرام فرماتے رہتے تھے مگر جیسے ہی ان کو جوشی صاحب کی آمد کی اطلاع ملی باہر تشریف لے آئے اور ہم لوگوں کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست فرمایا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر گفتگو کا رخ مسئلہ جبر و قدر کی طرف مڑ گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ ہم انسان کو نہ تو بالکل مجبور مان سکتے ہیں اور نہ بالکل آزاد۔ انسان کی آزادی اور مجبوری دونوں ہی کی حدود متعین ہیں اسی لیے ہر انسان اپنی آزادی کی حد تک اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اسی پر اس کی جزا و سزا کا انحصار ہے مگر جوشی صاحب نے فرمایا کہ ہم سوفی صدی مقہور ہیں اور ایک فی صد بھی اپنے اعمال پر قادر نہیں۔ بے شک ہم جو بھی چاہیے کر سکتے ہیں مگر جو بھی چاہنا ہی سرے سے ہمارے بس میں نہیں۔ ہمارے تمام اعمال داخلی اور خارجی جبر کے تحت سرزد ہوتے ہیں۔ ہمارا ہر عمل دراصل کسی خارجی یا داخلی محرک کا ردعمل ہوتا ہے۔ اب ایک اسی بات کو دیکھیے کہ آپ اس وقت آرام فرما رہے تھے۔ اس لیے کہ داخلی طور پر آپ کا مزاج ناساز ہے مگر جیسے ہی آپ کو میرے آنے کی اطلاع ملی میرے اور آپ کے برسوں کے تعلقات اور دوستی کے جذبات نے آپ کو آرام ترک کرنے اور مجھ سے ملنے کے لیے یہاں آنے پر مجبور کیا۔ اس طرح آپ کا آرام اور یہاں آنا دونوں داخلی اور خارجی محرکات کے ردعمل کے طور پر عمل پذیر ہوئے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں کام یعنی آپ کا آرام اور مجھ سے ملنے کے لیے آرام ترک کرنا، آپ نے اپنی آزاد مرضی سے انجام دیے مگر جس کو آپ اپنی آزاد مرضی سمجھ رہے ہیں وہ دراصل ردعمل ہے ان محرکات کا جو میں نے ابھی بیان کیے ہیں۔

مودودی صاحب نے فرمایا۔ جوشی صاحب آپ کی بات حد تک درست ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس قسم کا عقیدہ جس میں انسان کو اس قدر مجبور سمجھ لیا جائے کہ اس کو اپنے اعمال کی ذمہ داری سے بری کر دیا جائے ہمارے "ایمان" کے خلاف ہے۔ جوشی صاحب نے کچھ اس انداز سے جس میں کچھ الجھاؤ کچھ طنز اور کچھ تمسخر کے جذبات ملے ہوئے تھے فرمایا۔ "مودودی صاحب ایمان کی خاطر بے ایمانی نہ کرو"

مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ آپ سے بحث کرنا بے سود ہے۔ پھر انھوں نے جوشی صاحب

کو جبر و قدر کے مسئلے پر اپنی ایک کتاب دے کر کہا کہ پہلے آپ اس کتاب کا خود سے مطالعہ فرمائیں اور پھر دل کھول کر اس پر تنقید کریں اور جب آپ اگلی مرتبہ تشریف لائیں تو اس موضوع پر گفتگو ہوگی۔

اس کے بعد ہم دونوں وہاں سے رخصت ہو کر مولانا کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی صاحب کے گھر گئے جو جوش صاحب کے سب سے بے تکلف دوستوں میں سے تھے مگر وہاں معلوم ہوا کہ وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

وہاں سے رخصت ہو کر ہم گھر آ گئے۔ جوش صاحب نے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب مجھے دے کر فرمایا کہ میں سے خود سے پڑھ کر جو اعتراضات میرے ذہن میں آئیں وہ لکھ لوں تاکہ مولانا سے ان پر گفتگو کی جا سکے مگر اس کے بعد مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی۔

لاہور میں جوش صاحب عام طور سے مست خوش رہتے تھے۔ وہاں ان کے قریبی دوستوں میں ایک تو ڈاکٹر حسین رضوی صاحب تھے دوسرے ظفر خان صاحب جو اردو فارسی شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے مگر ان تمام دوستوں کے علاوہ جوش صاحب کے لیے سب سے زیادہ محبوب اور پرکشش شخصیت وہ تھی جس کو وہ ہمیشہ آخر الزماں کے لقب سے یاد کرتے تھے اور جو اپنی سہیلیوں سے ملنے کے علاوہ ہر وقت جوش صاحب کے قریب رہنے کے سارے ڈھونڈھتی تھی اور پھر ہاشمی صاحب جو پیچھے ماہوں سسر یعنی جوش صاحب کی خاطر تواضع میں لگے رہتے تھے۔ وہ ساری کباب اور بالائی کی مٹھائی بنانے میں مہارت رکھتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں غذا میں جوش صاحب کی کمزوری تھیں۔ ان کے علاوہ ہاشمی صاحب کے پاس پان کے لیے چونا اور کتھا بنانے کا بھی ایک خاص نسخہ تھا جسے کو اس طرح دودھ میں پکاتے اور اس میں کچھ ایسی چیزیں ملاتے کہ روکھا کھانے سے بھی منہ نہ کٹتا۔ ہاشمی صاحب خود اپنے ہاتھوں سے پان بنا کر جوش صاحب کے لیے ان کے پاندان کی ڈبیا بھر دیتے تھے جو تمام دن کے لیے ان کو کافی ہوتی اور پھر وہ وہاں لاہور اور شام کو کہیں نہ کہیں ایک شعری نشست کا اہتمام کرتے جس میں جوش صاحب کی شرکت ضروری ہوتی۔ غرض جب تک جوش صاحب لاہور میں رہتے ہر روز روز عید اور شب شب برات کا سماں رہتا ہے۔ جوش صاحب جیسا شاعر اور موضوع شعر سامنے ہو تو پھر انداز

کی ظفرانی گفتگو کا مل دیا ہوتا ہے جنوں ان کے،

تا شاعری کی مانگ کو حسن سے بھر سکیں

باد دگر جوش بنایا گیا ہیں ہیں

ایک دن باشی صاحب کے مکان میں ظفرانی صاحب شوکت صاحب ان کی بیگم یاسمین صاحبہ اور جوشش صاحب کی محبوبہ لتہ آخر الزماں میں اور میرے بھائی فخر علی خاں سب جمع تھے جوشش صاحب نے فرمایا۔ صاحبو میں آج آپ سب حضرات کو اپنی ایک جدید ترین نظم سناؤں گا مگر شرط یہ ہے کہ اگر کوئی شعر پسند آئے تو کھڑے ہو کر داد دیجیے گا اس کے بعد جوش صاحب نے اپنی تین دن پہلے کہی ہوئی نظم سنائی جس کا عنوان ہے۔

فردوس دوزخ نصیب

یہ کہ ہے کیا وہ گلشن جبیں — وہ خلوت گر نظم دنیا و دیں

یہ گلنار طوطی یہ وحشت غزال — یہ نخلیہ قوس و یہ ابرو ہلال

تجلی یہ سیماب و ظلمت یہ دوش — غستاں خریدار و مستی فروش

سیکتے شگوفے میں گرداب ناز — دہکتے کا قاتل شب و راز

ابھرتی جواں ہمکتی پھبن — دھواں در جاں گلشن گلشن

شب قدر کاکل کی رو پر نگار — سرشہ سے غلاف حرم تار تار

پس جلد رخسارہ بے عدیل — رواں دجلہ بادہ و سلسبیل

تکلم کی رو میں یہ موج حیا — سبو کے دہکنے کی مدھم صدا

نگاہوں کی گردش میں صد دور جام — نشے کے تلے جوبنوں کے خیام

نکیلی ترنگوں کی رو پر جھمن — کھنکتے نفس سے جھنکتا بدن

جبیں پر دھندلکے کی نذریں شفق — ہوا میں یہ موتے کا جیسا ورق

صباحت کی موجوں کا چہرے پہ نور — چراغوں کے جلتے ہیں جیسے بلور

سیہ بدلیوں میں غزالوں کے خوں — دھلی میں بجلی لہو پیتے میں جھوں

جھمکتی جھلکتی ہوئی انگڑائیاں — محل جواہر کی جیسے دوکاں
نظر ٹوٹتی اور جڑتی ہوئی — ندی بن کے جس طرح مڑتی ہوئی
نگاہوں میں کمسن باہوں میں بن — تبسم میں برکھا کی آتی کرن
وہ بڑھ کر سجے کریں شہریار — ترش جائے ہیرو وہ کھڑے کی دھار
دمکتے ہوئے یوں سرخیوں کی شلنگ — شعاعوں میں جس طرح عطر کا رنگ
بدن دوست وادی کاشمیر — بدن نازشِ پریاں و حریر
سرود شبستاں بہ صبح سحر — دو صد یوسفستاں بہ چاہ ذقن
عروس گل و بنت صرو رواں — نگار سر و دختر گلستاں
سخ ناز و تموّج افسوں بدوش — بناتِ الوہیت چشم و گوش
رگ و پے گزرگاہ سیلاب مل — سیہ دھنسے بالیدہ بوئے گل
دہن بستہ بے چناں و چنیں — نمو بخش و نوکار و نیم آستیں
صبیح بہاراں و ماہ تمام — دُعا اندام، قوسِ چشم، انگور نام
سراپا شبستاں نسیم سحر — حنا دود باد و حنا آبشار
لب لعل پروردہ انگبیں — سبک چہرہ افشردہ یاسمیں
ترنم خمیر و تبسم نہاد — غزل آل، غم زاد، مینا مزاج
بہ جلوت شمیم و بہ خلوت زجاج — گجن خو، گہر دیدہ، مینا مزاج
سمن دو صبا سل سنبل وطن — گلی انفاس سے لبریز شبنم بدن
شکر حرف سے طبع کوثر خرام — گلابی سرشت و صراحی قوام

■

مگر اس کے باوصف وہ تنہا سال — محبت کے تیوار سے ہے نڈھال

جوش صاحب کی شاعری کا مقابلہ ان کی محبوبہ سے:

یہاں سے نظم کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو جوش صاحب نے وہ حصہ نہیں سنایا

یہ کہہ کر جاں گئے کہ لی الوقت یہ طبع متعلق ہے مگر جتنا حصہ جوش صاحب نے سنایا اس کے متعلق وہاں حاضرین کا یہ عالم تھا کہ مسلسل کھڑے رہے اور جوش صاحب کے حکم کے مطابق کھڑے ہو کر ہر شعر کی داد دیتے رہے۔ میں اس تمام نظم خوانی کے دوران میں کلام کی مخاطب ہستی کو غور سے دیکھتا رہا اور باوجود انتہائی غور کے مجھے اس کے سراپا میں ایک مصرع کی بھی رجائی نظر نہیں آئی۔ جب سب لوگ رخصت ہو گئے تو جوش صاحب نے مجھ سے کہا۔ ڈاکٹر صاحب میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ تم نے میری اس نظم کی اس طرح داد نہیں دی جیسی میں تم سے توقع کر رہا تھا۔ میں نے کہا جوش صاحب اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں۔ فرمایا کہو ارے میاں اب تم بھی بات کرتے ہوئے شرمانے لگے۔ میں نے کہا کہ جب میں آپ کے کلام کا مقابلہ مشاعرہ میں کر رہا تھا تو حضرت مرزا محمد رفیع سودا چپکے چپکے میرے کان میں کہہ رہے تھے۔

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

جوش صاحب برا مان گئے کہنے لگے میاں پہلے حسن کو پرکھنے والی آنکھ پیدا کرو۔ میں نے کہا حضور یہ آنکھ آپ کو مبارک ہو۔ ہم کو تو آپ کا کلام کافی ہے۔ اس نظم کا ہر شعر ہر مصرع بلکہ ہر لفظ آپ کے عظیم شاعر ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ اس پوری نظم میں آپ نے جس حسن کا سراپا بیان فرمایا ہے وہ خود اپنا موضوع آپ ہے مگر میں حمایت ادب سے یہ عرض کرنے کی گستاخی کروں گا کہ آپ کی حقیقی محبوبہ میں اس حسن کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی ہے۔ اب اس مصرع کو لے لیجیے۔ وہاں وہاں جو بن گھنن گھن گھنن۔ اس سے میرا ذہن اجنتا کے غاروں میں بنائے ہوئے دیویوں کے ان مجسموں کی طرف منتقل ہو گیا جنہیں سنگ تراشوں نے سنگ خارا کی چٹانوں کو کاٹ کر ایسے ایسے سوانی پیکر تراشے اور ان کے جسمانی خوش ابھاروں میں کہ انہیں دیکھ کر بے ساختہ ایمان پکار اٹھتا ہے کہ واقعی جوبن پھٹا اسی کو کہتے ہیں۔ اس نظم میں آپ نے جتنی مثالیں دی ہیں وہ صرف آپ کے تخلیقی شاداب ذہن کی آئینہ دار تو ہو سکتی ہیں مگر حقیقت سے ان کا کوئی تعلق کم از کم مجھے کہیں نہیں دیتا۔ نہ تو ان کے نظم میں وہ نزاکت ہے کہ اس کو سیو کے ورکے سے تشبیہ

دی جا سکے۔ ان کی تھوڑی میں چاہِ ذقن ہے جہاں آپ نے دو صد یوسفستان آباد کر دیے ہیں اور نہ قد سرو رواں ہے۔ چہرے اور آواز کو افسوں بدوش کہہ کر بنائے الوہیت چشم و گوش قرار دینا یہ بالکل آپ کی داخلی حسیت کی مبالغہ آمیزی ہی ہو سکتی ہے جس سے دوسروں کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کے بعد جتنی علامتیں اور استعارے آپ نے حسن کے متعلق استعمال فرمائے ہیں گلابی سرشت و صریحی قوام تک یہ سب آپ کی قوت متخیلہ کی جادوگری ہے۔ یہ اردو ادب میں نہایت دلکش اضافہ ہے اور اس سے اردو کا دامن جواہر نایاب سے مالا مال ہو گیا ہے مگر آپ کی موصوفہ میں اس کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ اس سے مجھے فردوسی کا وہ شعر یاد آ رہا ہے جہاں اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

منم کردہ ام رستم پہلواں

دگر دیلے بودہ در سیستاں

آپ جیسا قادر الکلام شاعر ذرہ کو آفتاب اور ایک گیہ ہے دیہ کو گلستان بہار بنا سکتا ہے۔ آپ کی یہ نظم اردو ادب کا شہ پارہ ہے یہ اپنی ذات میں ادب عالیہ ہے مگر اس میں آپ کا محبوب کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ اس ادب پارے کو آپ جس سے چاہیں منسوب فرما دیں۔ کیونکہ آپ،

ہر خس کو گلزار بنا دیتے ہیں — ہر خس کو چمن زار بنا دیتے ہیں

ہر ذرۂ جادہ کو یہ لیتی رفتار — ہم مصر کا بازار بنا دیتے ہیں

اور آپ میں یہ قدرت بھی ہے کہ،

تلوار کو چھوئیں تو مرہم ٹپکے — مرمر کو فشار دوں تو زمزم ٹپکے

بخشا ہے تخیل نے وہ اعجاز مجھے — شعلے کو پکڑ دوں تو شبنم ٹپکے

اور آپ فکر و فن کی اس بلندی پر بھی فائز ہیں جہاں سے آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ

ناموس خیالات کے دعوے ہم ہیں

گردون محاکات کے تمغے ہم ہیں

دیکھے جو ہمیں عرش تو گھبرائے کہ

ایوان سخن کے وہ منارے ہم ہیں

جوش صاحب سب خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے پھر فرمایا جناب آپ میرے ہی
الفاظ سے مجھ پر حملہ فرما رہے ہیں مگر اتنی بات آپ کچھ نہیں پائے کہ شاعر کا کلام اس کی
صلاحیتوں کا آئینہ دار تو بے شک ہوتا ہے مگر اس کی شاعری کے محرک کو آپ کیسے نظر انداز کر
سکتے ہیں۔ یہ محرک شاعری کا عکس آپ کو شاعر کے جذبات کے اظہار ہی میں دکھائی دے سکتا
ہے اور شعر کی تخلیق میں صرف بصارت ہی ایک حال نہیں ہوتی بصیرت بھی اہم ہوتی ہے۔
اصل چیز شاعر کے وہ جذبات ہیں جو کسی خارجی شے سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ اس کو تخلیقی
عمل پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ایک عام آدمی کے احساسات میں اور شاعر کے احساسات میں تو فرق
ہوتا ہے ہی اور ہر شاعر کو اپنے جذبات کے اظہار پر ایک سی قدرت بھی حاصل نہیں ہوتی اور پھر
ہر شاعر کے جذبات میں وہ طوفان بھی برپا نہیں کر سکتا جو اس کے شعر کی تخلیق کا باعث بنے
رہے ہیں تو بلا کسی قسم کے انکسار کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس حسن کی کیفیت کو پوری طرح ادا
ہی نہیں کر سکا۔ میں باوجود اتنی جگر سوزی اور محنت آپ کے اتنی قادر الکلامی کے اپنے کلام
سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کا صرف تیس فی صد کہہ
سکا ہوں۔ الفاظ جذبات کا بہت کمزور اظہار ہیں۔ وہ صرف علامات یا اشارے ہو سکتے ہیں جن سے
آپ شاعر کے احساسات کا کچھ تھوڑا سا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ کلی حقیقت نہیں بن سکتے۔

کون سمجھے یہ شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

اسی لیے میں کہتا ہوں۔

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو — قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پر نہیں لڑتے معنی — الفاظ کے سینے میں اتر کر دیکھو

میں نے کہا جوش صاحب آپ برا نہ مانیے۔ میں آپ کو چھیڑ چھیڑ کر جو اتنی باتیں کرتا
ہوں اور آپ کی بے تکلفی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں تو اس سے میرا مقصد
دراصل یہ ہوتا ہے کہ

میں نے اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
کہ ترا حسن ترے حسن بیاں تک دیکھوں

وہ آپ مجھ سے یہ بھی فرما سکتے ہیں اور بجا طور پر فرما سکتے ہیں کہ:

ثابت نہ کر سپنے کو کیے اور جہاں بیتے کو بغل میں داب پوتھی کو سنبھال
کھا نہ مجھے شعر و ادب کے لکھتے نافہم ہیں نمک سمندر میں نہ ڈال

جوش صاحب نے ذرا انکسار فرمایا۔ ارے آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ آپ کی شرافت ہے مگر آپ سے میری محبوبہ کا میرے کلام سے مقابلہ کرنے نہ بیٹھ جائیے گا۔

ہم لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ وہ سن بیٹھے تشریف لے آئیں اور جوش صاحب کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ میں جوش صاحب کی غیر مطبوعہ بیاض۔ عرائس و مضراب۔ کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اتنے میں میری نظر ایک غزل پر پڑی جو مجھے ان کی محبوبہ کا ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ معلوم ہوئی۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اس بیاض سے ایک ست رنگ حقیقت پسندانہ غزل سنا دوں۔ پہلے اس کے کہ جوش صاحب کچھ فرماتے سن لو انہوں نے فرمایا۔ ضرور ضرور سنائیے۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔

تجھے ناداں ہوں آنکھیں لڑانا بھی نہیں آتا
نظر باتیں کرے یوں مسکرانا بھی نہیں آتا
تیری بچپن کی صورت ہے ابھی الھڑ جوانی کو
کھنچی انگڑائیوں میں جھنجھلانا بھی نہیں آتا
ہوائیں جب اڑاتی ہیں ترے سینے کے بادل کو
تو اس بادل کو چنگی میں دبانا بھی نہیں آتا
اچانک میرے آ جانے سے وقت رخصت گھبرا کر
چھپا کر چہرہ گھٹنے سے بیٹھ جانا بھی نہیں آتا
تیرے مکھڑے پہ ہے کرب تمنائے ہم آغوشی
ابھی دل کے تقاضوں کا چھپانا بھی نہیں آتا
تجھے اب تک شبیلی ٹکڑیوں کی سوچ رنگیں میں
نگاہ کے مشعلوں کا ترنا بھی نہیں آتا

فرد حسن سے غافل ہے اتنی کم سی تیری
کہ میری چھیڑ پہ تیوری چڑھانا بھی نہیں آتا
پپوٹوں کے کناروں پر سیاہی کے گھروندے ہیں
ٹھکانے سے تجھے کاجل لگانا بھی نہیں آتا
مرے حرف تمنا و طلب کاری سے شرما کر
کلائی میں تجھے کنگن گھمانا بھی نہیں آتا
جو سوتی ہے تو ساری رات کروٹ پہ ہوتی ہے
ابھی تکیے گر کر رسمسانا بھی نہیں آتا
کمر کے لوچ سے پلکوں کی طوفاں خیز لرزش سے
نگاہ جوشش کو بھولا جھلانا بھی نہیں آتا

میں نے غزل ختم کر کے سمن سے پوچھا۔ کہیں جناب خاتون موصوفہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

سمن بلا جھجک کہنے لگیں کہ موصوفہ ماہر نفسیات معلوم ہوتی ہیں جس کی سادگی میں پرکاری ہے اور بے خودی میں ہشیاری اور جس کا حسن تغافل میں عرمت آزما ہے۔

جوشش صاحب نے سمن کے اظہار خیال کی خوب داد دی اور فرمایا۔ دیکھا جناب حسن تعلی اس کو کہتے ہیں۔ میں نے کہا جوشش صاحب یہ تشریح صرف سمن ہی کر سکتی تھیں۔ ہم لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ ہاشمی صاحب بھی آ گئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ جوشش صاحب کل صبح پنی گاڑی میں اسلام آباد روانہ ہونے والے ہیں آپ کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے جوشش صاحب سے کہا کہ میرا ارادہ بھی اسلام آباد جانے کا ہے اگر آپ کی گاڑی میں اور کوئی نہ ہو تو میں اور میری بیوی بھی آپ ہی کے ساتھ چلیں۔ جوش صاحب نے کہا اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کل صبح نو بجے تیار رہیے گا میں آپ کو اختر میاں کے گھر سے لے لوں گا۔ اس کے بعد میں جوش صاحب سے رخصت ہو کر گھر آ گیا۔

جوش صاحب کے ساتھ اسلام آباد کا سفر:

دوسرے دن پانچویں مئی ۱۹۸۰ء میں اور میری بیوی صبح ساڑھے آٹھ بجے باشمی صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ جوش صاحب سامان گاڑی میں رکھ چکے تھے۔ کہنے لگے میرے بھائی آپ نے کیوں تکلیف کی میں خود آپ کو لینے آ رہا تھا۔ میں نے کہا چلیے اس بہانے باشمی صاحب کو بھی خدا حافظ کہہ لیں گے۔ فرض نو بجے ہم لوگ لاہور سے روانہ ہوئے۔ رستے میں گوجرانوالے میں چائے پی۔ جہلم میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ جوش صاحب نے اصرار کر کے بل خود دا کیا۔ شام پانچ بجے ہم لوگ اسلام آباد پہنچے۔ میں اور میری بیوی میری سن اقبال عالم کے گھر اتر گئے اور جوش صاحب اپنے گھر تشریف لے گئے۔ اس سال میں میری سن کا گھر ۱۰ اسٹریٹ پر تھا جہاں سے جوش صاحب کا مکان قریب ہی واقع تھا۔ میں نے سادھو کے کپڑے بدلے اور بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ جوش صاحب نے گاڑی بھیج دی اور میں ان کے گھر چلا گیا۔ رات کا کھانا جوش صاحب ہی کے ساتھ کھایا اور رات کو گھر آ کر سو گیا۔

دوسرے دن صبح دس بجے پھر جوش صاحب کی گاڑی آ گئی اور میں ان کے گھر چلا گیا۔ جوش صاحب کی میز پر دو ضخیم رجسٹر رکھے ہوئے تھے۔ یہ دراصل ان کی ڈائریاں تھیں، جن میں وہ روزمرہ کے واقعات لکھتے رہتے تھے۔ بہت سے واقعات اور شخصیات پر اپنی رائے تحریر کرتے رہتے اور اگر کوئی انوکھا واقعہ دیکھتے تو وہ بھی اس میں لکھ دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف کے بھی کچھ باتیں بھی لکھ دیتے تھے۔ اس روز میں نے اتفاقاً جو ایک ڈائری کھولی تو اس پر یہ جملہ لکھا ہوا تھا۔

"جب عقل چکراتی ہے تو وہ بت خانہ تہمت کا طواف کرنے لگتی ہے"۔ دن میں عام طور پر جوش صاحب لوگوں سے ملنے کے لیے ان کے گھر یا دفتر چلے جاتے تھے۔ البتہ ان کے

اور دن کو وہ سرگشتہ سرا و معانی کوئے سر و شہر ادباں میں لے گا

یہ ملاقاتیں دس بجے سے لے کر ایک دو بجے دن تک چلتی تھیں۔ پھر گھر آ کر آرام کرتے تھے۔ اس روز ہم لوگ سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے دفتر گئے۔ وہاں جوش صاحب سیکرٹری فنانس ارتضیٰ زیدی سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کے دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کسی میٹنگ میں

مصروف ہیں۔ جوش صاحب لطائف سیماب صفت انسان ہیں وہ کسی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ فوراً واپس چلے گئے۔ البتہ شام کو ریدی صاحب خود دفتر سے سیدھے جوش صاحب کے گھر آئے اور دفتر میں نہ مل سکنے کی معذرت چاہی۔ باتوں باتوں میں ریدی صاحب نے پوچھا "جوش صاحب مودود میں Over Writing کے لیے کیا کہیں گے؟" جوش صاحب نے کہا میں تو اسے "بالا نویسی" کہوں گا۔ پھر ریدی صاحب نے دریافت کیا اور Writing Pad کا کیا ترجمہ ہوگا۔ جوش صاحب نے کہا "بیاض مرسلت"۔ ریدی صاحب نے کہا واقعی یہ اصطلاحات اچھی ہیں۔ انھیں سرکاری دفاتر میں استعمال کرنا چاہیے۔

اسلام آباد میں جوش صاحب کے احباب:

اسلام آباد میں بھی جوش صاحب کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان میں حسن ابدال سے اختر اور مسعود تو تقریباً روز ہی شام کی محفل میں شریک رہتے تھے۔ وہ کیپٹن سے کرنل رمضان اور اظہار حیدر ریدی بھی کھڑے آجایا کرتے تھے۔ اس شام بھی اختر صاحب آئے اور مجھے اور جوش صاحب کو اگلے روز کی شام ان کے گھر حسن ابدال آنے کی دعوت دے گئے۔

چنانچہ حسب وعدہ میں اور جوش صاحب چودھویں مئی کو اختر علی خاں صاحب کے گھر حسن ابدال پہنچے۔ انھوں نے ہمارے لیے بہت پرتکلف ناشتے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ کیپٹن سے کرنل رمضان اور اظہار حیدر ریدی بھی مدعو تھے۔

کرنل صاحب نہایت مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ ان کو اس قدر لطیفے یاد ہیں کہ وہ گھنٹوں سامعین کو دلچسپ لطیفے سناتے اور سب کو ہنساتے رہتے ہیں۔ اس دن بھی محفل نے بہت سے لطیفے سنائے۔ جوش صاحب بھی بہت اچھے موڈ میں تھے۔ رات گیارہ بجے کے بعد تک کلام سناتے رہے۔ جب رات زیادہ ہو گئی تو جوش صاحب نے کہا۔

سو باتوں کی ہے یہ بات۔ آؤ سو جائیں
اب بجھ چکی ہے رات۔ آؤ سو جائیں

چنانچہ یہ دلچسپ محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

دوسرے دن صبح کو ناشتے سے فارغ ہو کر میں، جوش صاحب اور اختر صاحب بازار گئے اور سستے سے ٹکٹ خرید لائے۔ حسن ابدال کے اطراف ٹکٹ کے سستے بڑے بڑے بازار ہیں۔ یہاں سستے اچھے ٹکٹ دو روپے میں ایک سیر ملتے ہیں۔ جوش صاحب ٹکٹ کو لک وٹ کہا کرتے تھے۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ ٹکٹ کو کسی دفعہ دیکھو تو ہر کا پہلو ملتا ہے دیسے وہ سستے خوق سے یہ پھل کھاتے ہیں۔ خرید و فروخت سے فارغ ہو کر ہم لوگ اپنے میزبانوں سے رخصت ہو کر واہ کینٹ پہنچے۔ وہاں اعلیٰ حیدر زیدی نے جوش صاحب اور مجھے روک لیا۔ گرمی زیادہ تھی۔ ان کے گھر میں ایک تہہ خانہ ہے جو گرمیوں میں سخت ٹھنڈا رہتا ہے۔ انھوں نے دوپہر میں جوش صاحب کے لیے آرام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ زیدی صاحب کی واہ کینٹ کے بازار میں کپڑے کی بہت بڑی دوکان ہے۔ ہم لوگوں نے بھی ان کی دوکان سے کچھ قمیصیں اور کرتوں کا کپڑا خریدا۔ پھر دوپہر میں گھر آ کر کھانا کھانے کے بعد جوش صاحب تو سو گئے مگر میں اور زیدی صاحب بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ ان سے اسلام، خدا اور عام انسانی قدروں پر گفتگو ہوتی رہی۔

کیا جوش صاحب خدا کے قائل نہیں ہیں؟

زیدی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا جوش صاحب کے عقائد کے بارے میں کیا خیال ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ جوش صاحب خدا کے قائل نہیں ہیں۔ آپ تو جوش صاحب کے سب سے قریب ہیں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

میں نے کہا کہ میں نے آج تک جوش صاحب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے متعلق حقیقت پسندانہ نظر رکھنے والا مفکر نہیں دیکھا۔ فرمایا۔ کیا آپ اپنے اس خیال کی وضاحت فرمائیں گے؟ میں نے کہا۔ آپ کو یہ بات تو معلوم ہے کہ اللہ اسم ذات ہے اور یہ مرکب ہے ال اور الٰہ کا۔ عربی میں الٰہ کے معنی تحیر و شیدائی کے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے کہ جس ذات کے تعلق سے ہم الٰہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس کا ادراک انسان کے لیے محال ہے اور انسانی عقل اس کے متعلق جس قدر غور و فکر کرے گی اس کو سوائے تحیر و شیدائی کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔ عرفان ذات الٰہی کا منتہیٰ یہ ہے کہ انسان کو

بی بدسالی کا شکار ہو جاتے۔ بقول حضرت جوش،

جب علم کے سب کھنگال ڈالے طلسم — تب دولت عرفان جہالت پائی

بات یہ ہے کہ انسانی فہم کی ساخت ہی کچھ اس طرح کی ہوئی ہے کہ وہ صرف مثالوں کے تناظر سے ہی کسی شے کا ادراک کر سکتی ہے۔ اس لیے علمائے سائنس کا یہ مقولہ ہے کہ "علم کا سفر معلوم سے نامعلوم کی طرف ہوتا ہے" اور اللہ تعالیٰ تو وحدہ لاشریک ہے جب اس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے تو یہ بات انسانی عقل کے لیے ناممکن ہے کہ "ذات" کا ادراک کر سکے اور جب ہم ذات کا ادراک کر ہی نہیں سکتے تو اس کے متعلق جو تصور بھی قائم ہوگا وہ انسانی ذہن کا آفریدہ ہوگا جس کے متعلق جوش صاحب کہتے ہیں کہ

صاحبو ایسا خدا خالق نہیں مخلوق ہے

یہ خدا تو آدمی کے ذہن کی ایجاد ہے

دراصل بات یہ ہے کہ انسان نے جب شعور کی آنکھ سے اس خارجی کائنات کو دیکھا تو اس نے اس میں جگہ جگہ توانائی کے ایسے مظاہر محسوس کیے جن کے آگے خود کو بے بس پایا۔ زلزلے، طوفان، بیماریاں، موت۔ انسان ان طاقتوں کو راضی کرنے کے لیے قربانیاں دینے لگا اور رفتہ رفتہ یہ مظاہر پرستی اصنام پرستی میں تبدیل ہو گئی۔ اسی دوران مفاد یافتہ طبقات کے کچھ عقلمند لوگ ان دیوتاؤں کے ترجمان بن گئے اور مادی مفادات کے ساتھ ساتھ عام انسانوں کے ذہن پر بھی نفسیاتی تسلط قائم کر لیا اور اس طرح اللہ کا تصور انسانی ذات سے وابستہ ہو کر ایک مطلق العنان شہنشاہ کا روپ اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ جب اللہ کا تصور خارجی بتوں کے تصور سے الگ بھی ہو گیا تو بھی اس میں شخص کا عنصر شامل رہا اور انسان نے ایک مطلق العنان شہنشاہ کی ذات میں جو خصوصیات ہوتی ہیں جیسے کہ وہ ہر قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ جو شاہ سے خوش ہو جاتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے نواز دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے برباد کر دیتا ہے تو یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب کر کے اللہ کو بھی ایک مطلق العنان شہنشاہ کا شخص دے دیا تو جوش صاحب کہتے ہیں،

خدا بصورت سلطان نشستہ بر سر عرش

میں جو بت شکنی ہے تو آخری کیا ہے؟

اور علامہ اقبال نے کہا کہ:

تراشیدم صنم بر صورت خویش — بہ شکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود دلی رنگین کمال است — ہمی رنگے کہ ہستم خود پرستم

اس لیے جوش صاحب خدا کے تعلق سے ہر قسم کے تشخص کے خلاف ہیں مگر وہ اس کائنات میں ایک توانائی مطلق کو محسوس کرتے ہیں اور یہ توانائی ہے، مستقل ناقابل قوانین کے ذریعہ سے اس کائنات کے ذرے ذرے کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور صرف یہی وہ ادراک حقیقت ہے جس میں کوئی تحول یا منطقی نقص نہیں ہے۔ جوش صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ہم خدا کی ذات کا ادراک نہیں کر سکتے مگر خدا کے قوانین اور اس کے احکامات کا علم حاصل کر سکتے ہیں اور یہ حیثیت عبد یہی ہماری ذمہ داری بھی ہے اور ضرورت بھی۔ وہ تمام قومیں جو ذات کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ تاریکی کی وادیوں میں بھٹک رہی ہیں۔ اسی لیے نامراد و خستہ حال ہیں مگر وہ تمام قومیں جو قوانین الٰہی کی دریافت میں لگی ہوئی ہیں بقدر علم کامیاب و کامران ہیں اور بیحد خوش حال ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی چاہیے کہ تلاش ذات کے صنم خانۂ ظلمت و جہل سے نکل آئیں اور قوانین فطرت کی دریافت کا سائنٹفک فکر پیدا کریں۔ جوش صاحب کی دہائی ہے۔

ظلمت کا نہ مطلوب و لقا کا منکر — جاننا نہ خبر نہ جدا کا منکر
یاراں سے تشخص کا تراشا ہے جو بت — الحاد ہے صرف وسوسہ خدا کا منکر

جوش صاحب کا ذہنی سفر تلاش حقیقت کا سفر ہے وہ روایات کے انکار سے حقیقت کے اثبات کی طرف جا رہے ہیں یعنی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف۔

وہ اک نگاہ تجسس ہے سوئے ذات و صفات
کچھ سمجھ میں نہیں جسے مفتیان دین الحاد

ایک جگہ کہتے ہیں۔

آیات صفات کی تلاوت نہ کرو — جویندگی ذات میں غفلت نہ کرو
لفظ اللہ پردہ ہے جلوہ نہیں — اس حرف خفائی پہ قناعت نہ کرو

یہاں صفات سے مراد وہی انسانی صفات ہیں جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اور جویندگی ذات

ے مرد توانا مطلق تک رسائی ہے جس کی کوشش میں ماہرین طبیعیات لگے ہوئے ہیں
یہ توانائی جب صفاتی پیکر اختیار کرتی ہے تو ریاضیاتی قوانین میں ظاہر ہوتی ہے اور جو قومیں
ن قوانین سے واقف ہوتی ہیں وہ اپنے مقاصد میں کبھی ناکام نہیں ہوتیں۔

ربیلی صاحب جو مست مومو سے میری باتیں سن رہے تھے کہنے لگے کہ آج آپ نے
بڑی فکر کے بے حد اہم مومو فراہم فرمایا ہے۔ میں آپ کی باتوں پر ضرور غور کروں گا۔
ہماری باتوں میں پانچ بج گئے۔ جوش صاحب بھی بیدار ہو چکے تھے چنانچہ جب وہ غسل سے
فارغ ہو کر آئے تو ہم لوگوں نے چائے پی اور وہ کیبنٹ سے رخصت ہو کر اسلام آباد آ گئے۔
میں اپنے گھر چلا گیا اور جوش صاحب اپنے گھر

دیکھو تو کوئی جوش پہ کیا بانکپن ہے آج!

دوسرے دن جب میں گیارہ بجے کے قریب جوش صاحب کے گھر گیا تو جوش صاحب
بہت خوش تھے۔ ان کے گھر لاہور سے ہاشمی صاحب ان کی بیگم اور بیٹیوں کے ساتھ ان کی
سالی بنت آفرا اور ان کی بھی آئی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ایسے موقع پر مجھے یہ گھر واپس چلے
جانا چاہیے مگر جیسے ہی میں نے اجازت چاہی تو جوش صاحب نے کہا کہ اگر میں آپ کو اجازت
دے دوں تو آپ ضرور چلے جائیے۔ جب میں نے ان سے اجازت چاہی تو وہ کہنے لگیں کہ
آپ فرزانہ اور رخسانہ سے پوچھ لیں اگر وہ ہاں کہہ دیں تو ضرور چلے جائیے۔ رخسانہ جو وہیں بیٹھی
ہوئی تھیں کہنے لگیں ارے دیکھیے نا خورشید صاحب موسم کس قدر خوبصورت ہو رہا ہے۔ کیسی
گھٹائیں چھا رہی ہیں اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ ہمارا ارادہ شکر پڑیاں اور راول ڈیم دیکھنے کا
ہے کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے؟ اجی حضرت کیا آپ معتقد میر نہیں ہیں جو کہتے
ہیں کہ

میر اسب بہار کا اس صحرا میں چل جس کر
نادان فصل گل میں کوئی بھی گھر رہے ہے

تو اسے کہا جناب میں تو معتقد جوش ہوں جن کا حکم ہے کہ

آ دیکھ تو سامان کے بدلتے ہوئے حالات ہو جائے گا کل خاک یہ مجموعۂ ذات
کرتا ہے کیوں عشق و جوانی کی مدارات اس رت میں عبادت ہے حسینوں کی ملاقات
برسات ہے برسات ہے اے دوست غرابت

تو خواتین و حضرات فوراً اٹھ جائیے اور گاڑی میں بیٹھ جائیے اور اعلان ہو جائے کہ

آ مست گھٹاؤں کی طرح دشت میں گھومیں
چھلکائیں سے ہوش ربا جام کو چھیں
کیا دہر ہو عالم کو کریں غرق سبو میں
ہستی سے گزر جائیں مچلتے ہوئے دھومیں

جوش صاحب نے کہا کہ چلو آج ہم سب کھانا بھی باہر کسی اچھے سے ہوٹل میں کھائیں گے چنانچہ ہم سب جوش صاحب کی گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ گاڑی تم چلاؤ پہلے ہم لوگ شکر پڑھیں گے۔ اسلام آباد ویسے ہی مست خوبصورت شہر ہے اگر اس کو مردوں کا بلد کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا اور پھر جب بادل چھائے ہوئے ہوں، ہر طرف سبزہ ہو، چنبیلی اور گلاب کے پھول ہر سو حسن اور خوشبو ارزاں کیے ہوئے ہوں تو ہر انسان ہوا میں پرواز ہوتا ہے۔ میں نے جوش سے کہا۔ ذرا دیکھیے۔

سبزے کا فرش ابر کا خیمہ، گلوں کا خلد گلشن میں اہتمام ہے کیا کیا ترے لیے

جوش صاحب کہنے لگے ارے یہ اتنا پرانا مال تم کہاں سے لے آئے۔ میں نے کہا جوش صاحب یہ شعلہ و شبنم کی غزل کا شعر ہے مگر دیکھیے شاعری کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے یہ شعر بھی اسی موقع کے لیے کہا ہے اور یہ اشعار بھی تو آپ نے اسی موقع کے لیے کہے تھے۔

لرزاں تھی جس کے دبدبۂ فرد سے زندگی
پہلو میں پھر وہ شاہد پیماں شکن ہے آج

اس لیے میری دعا ہے کہ

رخ نگاہ بدلے بچائے رب خدا دیکھو تو کوئی جوش پہ کیا بانکپن ہے آج

سب کہنے لگیں سچ کہتے جوش صاحب یہ اشعار آپ نے اس موقع کے لیے کہے تھے اگر اس موقع

کہے تھے تو خورشید صاحب کو کیسے یاد ہو گئے؟

جوش صاحب نے انتہائی معصوم صورت بنا کر کہا کہ تعجب ہے خورشید علی خاں نے یہ کہاں سے سن لیا۔

سر خدا کہ عارف و دانا بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروشش از کجا شنید

رخصت کیے لگیں خورشید صاحب اگر آپ کو جوش صاحب کی نظم برسات سے برسات ہے اے رند خرابات مکمل یاد ہو تو سنائیے۔ میں نے جوش صاحب سے دریافت کیا کہ اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔ جوش صاحب نے کہا ضرور ضرور۔ میں نے وہ نظم سنائی۔

برسات ہے برسات

آ کے تو سلوں کے برستے ہوئے لمحات — ہو جائے گا کل خاک پہ مجموعۂ ذرات
کر جائیں کہیں عشق و جوانی کی ملاقات — اس رت میں عبادت ہے حسینوں کی ملاقات

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات
برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

ساحل پہ نہ جا آج سے ہر بادہ کشا کی — ہر گام پہ کھلتی ہے گرہ زلف رسا کی
لو دی کرامت اثر لغزشِ پا کی — رہ رہ کے چمکتی ہے کمر ارض و سما کی

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات
برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

کیا سب میں بادل کے ہے خورشید کا بیڑا — کیا ہوا پھرتا ہے تھیلے پہ تھیلا
کس طمطراق سے تھیلے کا جو ہے گنج تھیلا — تو خیمہ دھنگیں ہیں کہ پانی کا ہے ریلا

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات
برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

ہر خدا ناچیز ہے اس وقت شرابی — ہر رند خوش اوقات کا چہرہ ہے شرابی
لہجہ شریعت کو مبارک ہو خرابی — پیمانہ چھلکتا ہے دمکتی ہے گلابی

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

میدان میں دھمال ہے برستا ہوا پانی بادل کی طبیعت میں ہے دریا کی روانی
پھیلے ہے کوئی سرخ لباس اور کوئی دھانی ہر چہرہ رنگیں سے ملتی ہے جوانی

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

گلزار میں کوئل کی صدا گونج رہی ہے کہسار میں ڈھولک ہوا گونج رہی ہے
قلقل سے جنوں خیز فضا گونج رہی ہے میدان میں گھنگھرو گھٹا گونج رہی ہے

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

کافر ہوں اگر ہاتھ سے تقوے پہ تباہی بوتل کی یہ سرخی یہ گھٹاؤں کی سیاہی
اور سینے پہ کسی شوخ کی دزدیدہ نگاہی بھر جام کے آتی ہے جبابی یہ جبابی

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

انبوہ حسینوں کا ہے دریا کے کنارے طوفاں ہے تلاطم ہے ترانے ہیں ترانے
پھرتے ہیں نظر باز بھی سینوں کو ابھارے جھولے ہیں جھما جھم ہے گھٹا جھم ہیں شانے

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

آمست گھٹاؤں کی طرح دشت میں جھومیں چھلکائیں مے ہوش ربا جام کو چومیں
کیا دیر، دو عالم کو کریں غرق سبو میں ہستی سے گزر جائیں مچاتے ہوئے دھومیں

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

رنگین فضاؤں میں گھٹا جھوم رہی ہے دریا میں تلاطم ہے ہوا جھوم رہی ہے
لہروں پہ ملاحوں کی صدا جھوم رہی ہے ساغر میں مے ہوش ربا جھوم رہی ہے

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

سلگا ہی ہے موسم کے فلک راگ شرابی ہاں چھڑ سے ساغر دل یاگ شرابی
پیالے سے پیالی میں لگا آگ شرابی ہاں کاگ اڑ کاگ اڑا کاگ شرابی

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

سب نے بے ساختہ کہا واہ واہ جناب آپ کا حافظہ تو کمال کا ہے۔ میں نے کہا اس میں حافظے کا کمال نہیں اس وقت کے ماحول کا کمال ہے۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ:

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ صہبا مرے آگے

غرض یہ کہ شعر و شاعری اور دلچسپ گفتگو کے دوران میں جب ہم لوگ شکر پڑیاں کی سیر سے فارغ ہوئے تو دو بج چکے تھے۔ جوش صاحب نے کہا کہ پہلے چل کر کسی چائنیز ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔ پھر واپس ڈیم چلیں گے۔ چنانچہ ہم لوگ آب پارہ کے ایک چائنیز ہوٹل میں گئے وہاں کھانا کھایا اور پھر واپس ڈیم گئے۔ تمام راستے ویسی ہی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ غرض اب گھوم گھام کر شام کو پانچ بجے گھر پہنچے۔ میں نے جوش صاحب سے اجازت لی اور اپنے گھر آ گیا۔

نیم در چشم زدن صحبت یار آخر شد:

دوسرے دن شام کو جب میں جوش صاحب کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ سخت اداس اور افسردہ کیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے سلام کیا تو میری طرف اس طرح آنکھیں اٹھا کر دیکھا کہ جیسے کوئی سایت تاریک غار سے جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں خود ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبانے لگا۔ میں نے پوچھا حضور والا مزاج و شریف ناساز تو نہیں ہے؟ یہ آپ اس وقت تنہا کیوں ہیں؟ اور آپ کے مصاحب کہاں ہیں؟

ہوئے ہیں خشک اور آنکھیں نم خیریت تو ہے قبلہ عالم؟

جوش صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی جیسے کہہ رہے ہوں۔

کیوں کر تمہیں بتائیں ہم اے غمگساں غم
کیا کرب جاں گداز ہے عشرت گزیدگی

جب میں نے سب مجبور کیا تو کہنے لگے کہ کل جب تم گھر چلے گئے تو "اس" کے والد بھی لاہور سے آ گئے۔ اس کی والدہ نے "اس" سے کہا کہ میں نے تو تم کو اپنی خالہ کے گھر رہنے کے لیے کہا تھا تم یہاں کیوں چلی آئیں؟ پھر وہ "اس" کو اپنے ساتھ لے گئے۔ حالانکہ رخسانہ اور فرزانہ نے ان کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ کچھ دنوں کے لیے اس کو ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دیں مگر وہ ظالم عورت اس کو اپنی چوکھٹ میں دبا کر لے گئی۔ آج صبح سے بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوں مگر نہ وہ آئی اور نہ اس کا ٹیلی فون ہی آیا۔ انتظار کے اس کرب میں کچھ اشعار ہو گئے ہیں تم بھی سن لو۔

کچھ تک آنے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
منہ دکھانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
اے مری بلبل شیریں سخن و خوش آواز
چہچہانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
بہتر خواب پر اے ناز بھری گل بدنی
مسکرانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
اے مرے باغ تمنا کی نسیم سحری
لہلہانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
سونے آنگن میں مرے پاؤں کی آہٹ سن کر
آنکھ اٹھانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
اے دہن بستہ گل جان سمن بست صبا
مسکرانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے

اپنے شدت سے دھڑکتے ہوئے دل کی روداد
لب پہ آنے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
بے تکلف مرے پہلو میں ابھی بیٹھی
بیٹھ جانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے

میں نے کہا جوش صاحب میں آپ کو صبر کی تلقین کرنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا مگر مجھے ڈر ہے کہ اس غریب لڑکی کا خیال آ رہا ہے۔ نہ معلوم وہ کن حالات میں ہوگی اور اس کے ماں باپ کا اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ جوش صاحب نے کہا۔ ارے خورشید علی خاں کی بیٹی کس قدر پر مسرت تھا اور آج دیکھو کہ صبح قیامت ہے۔

کہیں سے کھائی ہیں کانٹوں کی ٹھوکریں میں نے
وہ دو سانسیں جو تھیں بوئے گل کے درمیاں میں نے

میں نے دوستوں اور عزیزوں کو آواز دے کر بلایا اور جب وہ آ گئیں تو میں نے ان سے کہا کہ جوش صاحب کے پاس بیٹھی رہیں اور ان سے علمی اور ادبی گفتگو کریں تاکہ ان کا دل بہلا رہے۔ تھوڑی دیر میں ہاشمی صاحب بھی آ گئے۔ اور مجھ سے کہنے لگے کہ خورشید صاحب ہم لوگ کل مری جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ بابا جوش صاحب بھی جائیں گے۔ آپ بھی چلیے۔ میں نے کہا مجھے ضروری کام سے کراچی پہنچنا ہے اس لیے مجبور ہوں ورنہ میں بھی ضرور چلتا۔

جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر چل سکو تو ضرور چلو مگر میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا مگر میں نے معافی مانگ لی۔

دوسرے دن جوش صاحب اور ہاشمی صاحب اور ان کے بیوی بچے سب صبح ہی صبح مری روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور میری بیوی ریل گاڑی سے لاہور آ گئے۔ لاہور آنے کے تیسرے دن سن کانٹے لی فون آیا کہ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ جوش صاحب بھی لاہور کیسے ہوئے ہیں اور فیضان صاحب کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں" میں نے کہا مجھے نہیں معلوم مگر میں معلوم کر کے بتاؤں گا۔

اس کے بعد میں نے فیضان صاحب کے گھر ٹی فون کیا تو کسی نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کانٹے لی فون نمبر بدل گیا ہے۔ اور جب بدلے ہوئے نمبر پر

کُل پاکستان مشاعرہ ٹنڈو محمد خان ۱۹۶۵ء

(فرش پر بیٹھے ہوئے) فرید جاوید، مجید جعفری اور دوسرے (ڈیسک پر بیٹھے ہوئے) دائیں سے
الیاس عشقی، راغب مراد آبادی، حوش ملیح آبادی، اختر ادریس، فیض احمد فیض، یوسف جمال
(احمد فراز (کھڑے ہوئے) وسط میں اقبال صفی پوری، سراج الدین ظفر، آفاق صدیقی، حسن عابدی
محسن بھوپالی اور دوسرے

نئے ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نمبر غراب ہے۔ ایک دن اختر میاں نے بتایا کہ ذیشان صاحب ان کو کہیں بازار میں ملے تھے اور ان سے پوچھ رہے تھے کہ جوش صاحب کیا ان کے گھر میں ہیں؟ اختر علی خاں نے کہا کہ وہ تو شاید آپ کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں؟ تو ذیشان صاحب نے کہا کہ وہ آئے تو ان کے گھر ضرور تھے مگر یہ کہہ کر کہ وہ جوشیہ علی خاں سے ملنے اختر علی خاں کے گھر جا رہے ہیں چلے گئے اور اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ میں نے اختر میاں سے کہا کہ کسی طرح جوش صاحب کا پتا چلاؤ کہ وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں مگر ان کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

دوسرے دن شام کے وقت سمن کا دوبارہ ٹیلی فون آیا۔ وہ رو رہی تھی مجھ سے کہنے لگی جوشیہ صاحب میرے والدین کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے کہ میں جوش صاحب سے محبت کرتی ہوں۔ انھوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ کل جوش صاحب ہمارے گھر آئے تھے میرے ابی امی نے ان سے ملنے اور مجھے ملنے دیا۔ ملازم سے کہلوا دیا کہ وہ یہاں نہ آیا کریں مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اب کے وہ ہاشمی صاحب کے گھر بھی نہیں ہیں۔ اس وقت امی ابا باہر گئے ہوئے ہیں میں بڑی مشکل سے آپ کو ٹیلی فون کر رہی ہوں۔ جوشیہ صاحب میں سخت پریشان ہوں۔ خدارا بتائیے کہ میں کیا کروں۔ میں نے کہا کہ آپ تو سخت بہادر خاتون ہیں اور باہر نفسیات بھی۔ اگر آپ نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار کیا تو پابندی اور سختی ہو جائے گی۔ آپ اپنی روزمرہ کی زندگی کے معمولات اسی طرح جاری رکھیے جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔ ابھی آپ کے والدین کو صرف شبہ ہے اس شبہ کو یقین میں تبدیل ہوتے دیکھیے۔ چند دنوں میں جب والدین مطمئن ہو جائیں گے تو یہ پابندیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ میں جوش صاحب کو تلاش کر رہا ہوں مگر مجھے ان کا پتا نہیں چل رہا ہے۔ اگر میری ملاقات ہو گئی تو میں انھیں سمجھا کر اسلام آباد واپس نہ کروں گا۔ اگر آپ کو موقع ملے تو آپ کچھ دنوں کے لیے اپنے مرحوم کے گھر کراچی آ جائیے گا۔ اس کا جواب دوسری طرف سے کچھ نہیں آیا اور ٹیلی فون رکھ دیا گیا۔ دوسرے دن اتفاق سے میری ملاقات ذیشان صاحب سے ہو گئی تو معلوم ہوا کہ جوش صاحب واپس اسلام آباد چلے گئے۔ میں اور میری بیوی لاہور سے ملتان چلے گئے جہاں میرے بھائی حمایت علی خاں رہتے تھے اور وہاں چند دن قیام کر کے دوسری جان کو ہم دونوں کراچی آ گئے۔ کراچی آنے کے بعد میں

اپنے کاموں میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ جوش صاحب کو کوئی خط بھی نہ لکھ سکا البتہ کبھی کبھی ٹیلی فون پر آپس کی خیریت کا تبادلہ ضرور ہو جاتا تھا۔

سمن اور جوش صاحب کی کراچی آمد:

اس واقعہ کے کوئی سوا مہینے کے بعد ساتویں جولائی ۱۹۷۰ء کو سمن کا ٹیلی فون لاہور سے آیا کہ وہ دوسرے دن تیز گام سے کراچی آ رہی ہیں۔ میں انھیں کینٹ اسٹیشن پر ملوں چنانچہ آٹھویں جولائی کو میں کینٹ اسٹیشن پہنچ گیا۔ جب گاڑی آئی تو میں ٹکٹ چیکر کے قریب گیٹ پر کھڑا ہوا تھا۔ گاڑی رکنے کے تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک خاتون سیاہ برقعے میں ملبوس میرے قریب آئیں اور میرے سامنے آ کر اپنا نقاب الٹ کر کہا "آداب" میں نے دیکھا کہ سمن ہیں۔ ہم دونوں اسٹیشن سے باہر آئے اور وہ میری گاڑی میں بیٹھ کر کہنے لگیں "رشید صاحب آپ کو میں نے سخت زحمت دی ہے جس کی میں بے حد معافی چاہتی ہوں مگر مجھے آپ کے علاوہ یہاں کراچی میں اور کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جس کو میں بے تکلفی سے اتنی زحمت دیتی۔" میں نے کہا "اے آپ یہ کیا فرما رہی ہیں یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔" پھر میں نے دریافت کیا کہ اب والدین کا کیا حال ہے تو کہنے لگیں کہ ہاشمی صاحب کی بچیوں نے بڑی حد تک میرے والدین کے شک کو دور کر دیا ہے۔ میرے ساتھ رضیہ اور فرزانہ بھی آنے والی تھیں مگر شاید وہ دو چار دن کے بعد کراچی آ جائیں البتہ جوش صاحب کل بھی دوپہر کو اسی تیز گام سے کراچی پہنچ رہے ہیں اور اس مرتبہ وہ آپ کے مکان پر قیام کریں گے۔ آپ ان کی مہمان نوازی کے لیے تیار ہو جائیے۔ ان کی ہی سمجھیے بلکہ ہم دونوں کی۔ میں نے کہا اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو گی۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

میں نے پوچھا تو اب آپ میرے ساتھ میرے قریب خانے پر چلیں گی؟ تو انھوں نے کہا "نہیں یہاں میرے چچا رہتے ہیں۔ میں ان کے گھر قیام کروں گی البتہ آپ میرے چچا کا گھر دیکھ لیجیے تاکہ جب جوش صاحب آپ کے گھر آ جائیں تو آپ آ کر مجھے لے جائیں۔" میں نے کہا "اب آپ بالکل فکر نہ کریں اور اپنے کراچی کے قیام کو زیادہ سے زیادہ پر مسرت بنائیں۔ چلیے

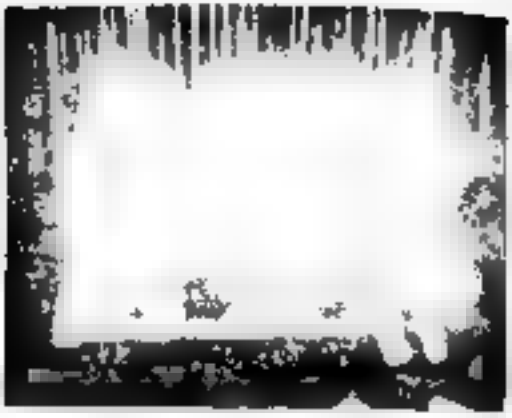

عورشید علی خان آتش صاحب، سلامت علی خاں
بی - ۱۵ ، بلاک "ایں" والے مکان میں

(کھڑے کی میز پر) محمد رشید علی خاں، حضرت جوشؔ، سلامت علی خاں بی۔ اے، بلاک بی ۳ والے مکان میں

محمد رشید علی خاں اور حضرت جوشؔ، بی۔ اے بلاک "این" والے مکان میں

پیر جوش صاحب کی ایک سلت پر عمل کرتے ہوئے آپ کو برنس روڈ کی دسندلسی پلازہ میں پھر
آپ کو آپ کے چچا صاحب کے گھر پہنچا دیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں برنس روڈ آئے وہاں سے
سی پی ایم پھر میٹرو پولیٹن ایریا میں سمن کو ان کے چچا کے گھر پہنچا کر میں اپنے گھر آ گیا۔

گھر آنے کے بعد میں نے راجب صاحب کو فون کیا کہ کیا ان کو معلوم ہے کہ
جوش صاحب کل یعنی جولائی کو تیز گام سے کراچی پہنچ رہے ہیں؟ راجب صاحب نے کہا
کہ جی ہاں۔ جوش صاحب نے فون پر ان کو بتایا تھا کہ وہ بدھ کے دن کراچی آ رہے ہیں
اور یہ بھی کہا تھا کہ آپ کو اطلاع کر دوں کہ اس دفعہ وہ آپ ہی کے ساتھ قیام کریں گے۔
انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ راستے کو مجھے مطلع کرنے والے تھے۔ خیر دوسرے دن میں،
سلامت علی خاں، راجب صاحب کینٹ اسٹیشن پہنچ گئے۔ جوش صاحب کو لے کر جب ہم
لوگ اسٹیشن سے روانہ ہوئے تو سلامت علی خاں نے کہا کہ جوش صاحب آج آپ میرے گھر
تناول فرمائیں۔ شام کو میں نے چند دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر
آپ چاہیں تو اپنے گھر چلے جائیے۔ میں نے کہا اس دفعہ جوش صاحب غریب خانے کو رونق بخشنے
والے ہیں۔ جوش صاحب نے کہا ارے تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہو گئی۔ میں نے کہا کہ آپ کے
چاہنے والے کیا آپ کے چہرے سے اتنی بات بھی نہیں جان سکتے کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟

جوش صاحب کہنے لگے۔ اب باتیں نہ بناؤ سچ سچ بتاؤ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ میں نے کہا
مجھے راجب صاحب نے بتایا ہے مگر ان کے علاوہ بھی مجھے کشف کے ذریعے سے آپ کا ارادہ
معلوم ہو گیا تھا۔ مگر اب اس بات کو میں رہنے دیجیے تفصیل بعد کو معلوم کر لیجیے گا۔ جوش
صاحب کہنے لگے کہ کیا بغیر سی پلازہ ہی گھر پہنچا دیں گے؟ میں نے کہا حضور بھلا ایسا بھی ہو
سکتا ہے؟ یہ تو آپ کی سنت ہے اور میں تو لاہور سے آنے والے مہمانوں کو بھی یہاں سے
سی پلازہ بغیر ان کے گھر نہیں پہنچاتا۔ جوش صاحب میرے اشارہ سمجھ گئے۔ فرمایا کیا واقعی؟ میں
نے کہا جی ہاں واقعی۔ راجب صاحب اور سلامت علی خاں پیچھے کی نشست پر بیٹھے باتوں میں
مشغول تھے اور جوش صاحب اگلی سیٹ پر میرے ساتھ تھے۔ ہم لوگ برنس روڈ پہنچے اور جب
دسندلسی کی دکان کے سامنے میں نے گاڑی کھڑی کی تو سی والے نے چار گلاس لا کر ہمیں
گاڑی میں دیے اور مجھ سے کہنے لگا۔ کل آپ کے ساتھ آپ کی صاحبزادی تھیں؟ میں نے کہا

بی نہیں وہ میری سن تھیں۔ خیر لسی پی وام دیے اور سلامت علی خاں کے گھر آ گئے۔ اس دن جوش صاحب ان ہی کے گھر ٹھہرے۔ شام کو اور احباب بھی آ گئے۔ ہمارے کسٹم کے دوست سلطان خاں صاحب، صرور بارہ بنکوی اور رجب صاحب اور میں۔ ہم نے رات کا کھانا بھی سلامت علی خاں ہی کے گھر کھایا پھر میں جوش صاحب کو اپنے گھر لے آیا۔ گھر آ کر میں نے جوش صاحب کو سمن کے متعلق سب باتیں بتائیں اور یہ بھی بتا دیا کہ ان کے چچا کا گھر بھی دیکھ آیا ہوں۔ دوسرے دن صبح نو بجے سمن کا ٹیلی فون آیا کہ میں آ کر ان کو اپنے گھر لے جاؤں۔ چنانچہ جب میں جانے لگا تو جوش صاحب نے کہا کہ وہ بھی ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر سمن کے چچا نے دیکھ لیا تو اس کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ تو جوش صاحب ہاں کر کے اور میں جا کر سمن کو اپنے گھر لے آیا۔ دس بجے سلامت علی خاں بھی آ گئے۔ جوش صاحب یہ نہیں چاہتے تھے کہ سلامت علی خاں کو سمن کے متعلق کچھ معلوم ہو اس لیے میں ان کو لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ خاں صاحب نے پوچھا جوش صاحب کہاں ہیں۔ میں نے کہا ان کی طبیعت کچھ خراب ہے اس لیے سو رہے ہیں۔ دروازہ بند ہے اس لیے میں نے ان کو آواز نہیں دی۔ سلامت علی خاں یہ کہہ کر کہ وہ شام کو آئیں گے، چلے گئے۔ تقریباً ایک بجے سمن بھی اپنے گھر چلی گئیں۔

سہ پہر کو جوش صاحب اور میں سجاد صاحب کے گھر گئے۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور بیمار تھے۔ جوش صاحب نے انھیں کچھ رقم دی اور ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر عبدالخالق صاحب سگریٹ والے کی دوکان واقع بولٹن مارکیٹ گئے۔ وہاں کچھ دیر بیٹھ کر شام کے قریب گھر آ گئے۔ یہاں تمام احباب جمع تھے۔ سورج غروب ہوا تو جوش صاحب پھر بیک طلوع ہوئے۔ تھوڑی دیر میں شعر و شاعری شروع ہو گئی۔ جوش صاحب نے کچھ نئی رباعیات سنائیں۔ اس کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔

عبدالخالق صاحب کے گھر دعوت اور تخلیق کائنات پر گفتگو:

چودھویں مئی بروز پیر ۱۹۷۵ء جوش صاحب کی دعوت جناب عبدالخالق صاحب سگریٹ والے کے گھر تھی۔ جوش صاحب کے ساتھ راجب صاحب مراد آبادی، سلامت علی خاں صاحب

دعوت دی۔ عبدالخالق صاحب نے رئیس صاحب امروہوی اور ان کے بھائی سید محمد تقی صاحب کو بھی مدعو کیا تھا۔ ان کے علاوہ کئی شعرا اور دانشور بھی محفل میں شریک تھے۔ ہم لوگ شام سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں رئیس صاحب اور تقی صاحب بھی آ گئے۔ سورج کے غروب ہوتے ہی دعوت شروع ہو گئی۔ عبدالخالق صاحب نے گفتگو کا آغاز ایک سوال سے کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ یہ کائنات ایک سربستہ راز ہے۔ ہم کو نہ اس کی ابتدا کی خبر ہے اور نہ انتہا کی۔ یہ سب کیا ہے، کہاں سے آیا ہے، اس کا انجام کیا ہو گا؟ ہماری کچھ میں کچھ نہیں آتا۔

جوش صاحب نے کہا۔ جی ہاں ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

میں نے عرض کیا کہ جوش صاحب کا تو تمام کلام اور ان کی ساری فکر ہی انہی سوالات اور ان کے جوابات پر مبنی ہے لیکن اگر اجازت ہو تو میں مختصر کچھ عرض کروں۔

سب نے کہا ہاں ہاں آپ فرمائیں۔

میں نے کہا۔ یہ تمام سوالات اس وقت سے انسانی فکر کا مرکز رہے ہیں جس وقت سے اس نے شعور کی آنکھ سے خارجی دنیا کو دیکھنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ حواس کے تجربات، توہمات اور فکری صلاحیتوں کے مطابق اس نے ان سوالات کے جوابات دیے۔ اس میں صاحبانِ اقتدار کی اپنی مصلحتیں بھی شامل رہیں۔ آہستہ آہستہ انسانی شعور نے اس کائنات میں سب سے زیادہ طاقتور قوتوں کو محسوس کرنا شروع کیا۔ پھر جب فلسفے نے جنم لیا تو اس نے بھی ان سوالات کے جوابات اپنے اپنے تجربوں کے مطابق دینے شروع کر دیے مگر فلسفہ عام طور پر محض سائنٹیفک تجربات پر مبنی نہیں ہوتا ہے اس لیے اس کی جو بھی رائے کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی گئیں۔ چینی، کلدانی، ہندی، سومیری، مصری مفکروں نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے مگر یونانی فلاسفہ حقیقت کی تلاش میں حقیقتوں سے زیادہ قریب رہے اور اسی فکر نے مشرق وسطیٰ کے مذاہب کی فکر کو بھی متاثر کیا جس نے یورپی فکر میں انقلاب پیدا کیا مگر یونانی فلسفہ بھی کسی حقیقت تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ مذاہب نے اس مسئلہ کا حل یہ پیش کیا کہ اس

کائنات میں ایک حالت کو مشخص کر کے اس کا ایک نام رکھ دیا اور پھر یہ کہہ دیا کہ یہ سب کائنات اسی خالق کے حکم کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے اور اس وقت تک باقی رہے گی جب تک خالق اس کو باقی رکھنا چاہے گا۔ اس سے عام ذہن تو مطمئن ہو گیا مگر دورِ حاضر کا سائنٹفک ذہن مذہب کی تعلیمات سے مطمئن نہیں ہے وہ اس کائنات کی ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے چنانچہ سائنسی تحقیقات کے ذریعے سے انسان اس تجسس میں لگا ہوا ہے کہ ٹھوس حقائق معلوم کیے جائیں اور اب آہستہ آہستہ حقائق پر سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے اب سائنس نے کائنات میں ایک توانائی مطلق کے ناقابلِ تردید وجود کے یقین تک تو پہنچ گئی ہے اور یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ یہ تمام کائنات اسی توانائی مطلق کی صفاتی جلوہ گری ہے لیکن ابھی تک انسانی ذہن کی رسائی اس توانائی مطلق کے جس ابتدائی صفاتی یا مادی وجود تک ہو سکی ہے وہ جوہر، ایٹم اور اس کے اجزائے ترکیبی یعنی Particles ہیں مگر سائنس ابھی تک یہ نہیں معلوم کر سکی کہ توانائی جوہر میں کیسے تبدیل ہو جاتی ہے چنانچہ وہ جوہر کو انتہائی ابتدائی وجود ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کیونکہ جوہر میں توانائی کی وحدت اپنے چار مظاہر میں ظاہر ہوتی ہے اور سائنس کی منزل وحدت کی تلاش ہے۔ اس لیے جوہر توانائی کا اولین مظہر نہیں ہو سکتا۔ بہرحال سائنس کی تحقیق کا طریقہ کار تو یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تردید شہادتوں کے ذریعے سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے اور جو علم توانائی اور جوہر کی تحقیق میں لگا ہوا ہے وہ ہے طبیعیات Physics جس علم نے اب تک جتنی معلومات حاصل کی ہیں اس سے اس کائنات کی ماہیت کا سراغ مل جاتا ہے۔ طبیعیات کے بعد جو علم ہماری رہبری کرتا ہے وہ ہے کیمیا Chemistry۔ جب ایک سے زیادہ جوہر ملتے ہیں تو وہ مالیکیول بناتے ہیں اور یہیں سے علم کیمیا کی ابتدا ہوتی ہے اور یہی مالیکیول سے یہ تمام کائنات عالمِ وجود میں آتی ہے۔

یہ کائنات انتہائی منظم قوانین کے تحت مختلف ارتقائی منازل سے گزرتی رہتی ہے اس کی محبوب صفت تغیر ہے یعنی توانائی مطلق ہر لمحہ نئی شان میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے مگر یہ سب تغیر صرف صفاتی پیکر میں واقع ہوتا رہتا ہے۔ توانائی میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی ممکن نہیں۔ بہرحال مالیکیولر سطح پر جو تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں ان کے متعلق قوانین علم کیمیا اور اس کی ہر دو شاخیں دریافت کر رہی ہیں اور یہی مالیکیول جب ایک خلیہ Cell بناتے ہیں جس کو

DNA کہا جاتا ہے وہاں سے BioChemistry شروع ہو جاتی ہے یہ خود کار حیاتیاتی اکائی ہے جہاں سے حیات کا آغاز ہوتا ہے اور یہی خلیے مل کر جسم بناتے ہیں جہاں سے حیاتیات Biology کا علم شروع ہوتا ہے جو آگے چل کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حیوانیات Zoology دوسرا نباتیات Botany پھر حیوانیات کی ارتقائی شکل انسان ہے اور اس کے رویوں کا علم نفسیات کہلاتا ہے اور پھر انسان کے انفرادی اور اجتماعی اعمال سے تمام عمرانی علوم پیدا ہوتے ہیں۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ زمین چاند سورج ستاروں اور کہکشاؤں کی تحقیق ہو رہی ہے اور ان کی ماہیت دریافت کی جا رہی ہے اور یہ علوم اس قدر ذیلی شاخوں میں تقسیم ہو گئے ہیں کہ ان کا شمار کرنا بھی نہایت مشکل کام ہے کیونکہ جوش صاحب کے بقول

گرہیں کھل رہی ہیں ہر نفس دقیق نظارہ کی
کہ اک اور ہی سے اب یک عالم ہوتی جاتی ہے

ہر

ہر قدم تحقیق کے نئے موڑ ہیں گنیے جستجو تو ڈوب جائیں اعداد

اگر آج تحقیق اور جستجو کا یہ عالم ہو تو ہم آج سے ہزاروں سال قبل کے فلسفہ کے ذریعہ اس کائنات کی پیچیدگیوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ آج ہم کو جملے بیشتر سوالات کے جوابات صرف سائنس ہی کے ذریعے سے ملنے ممکن ہیں اور جیسے جیسے سائنسی علوم ترقی کر رہے ہیں ہماری معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے ہم کو چاہیے کہ اپنا ذہن کھلا رکھیں اور نئے علوم کی روشنی میں اپنے خیالات کو مستحکم کرتے رہیں۔ اگر ہم اپنے دماغ کے دروازے بند کر کے قدیم خیالات ہی میں الجھے رہے تو اس پیچیدہ کائنات کے اسرار تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

جوش صاحب کے اشعار ملاحظہ ہو

متاع کفر ملے یا سعادت ایماں
جلا مشعل تحقیق ہر چہ بادا باد

طرح ہے علم سے اے جوش بہت ملنے کو
اٹھا پردہ اسرار ہر چہ بادا باد

علامہ اقبال کہتے ہیں۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

اس سے ضروری ہے کہ ذہن کو عقائد کے طلسم کدے سے نکال کر سائنسی تحقیق و تجربات کی روشنی میں لایا جائے پھر کائنات کے تمام سربستہ راز آہستہ آہستہ ہم پر منکشف ہوتے جائیں گے۔

عبدالخالق صاحب نے دریافت کیا تو کیا ہم اس توانائی مطلق کو سمجھ سکتے ہیں؟

میں نے کہا۔ ابھی یہ بات کہنا مشکل ہے کیونکہ ابھی ہم کو یہ نہیں معلوم کہ توانائی مطلق میں تبدیلی کیسے پیدا ہوتی ہے یعنی توانائی کس طاقت کے زیر اثر جوہر میں تبدیل ہوتی ہے۔ کیا وہ کوئی خارجی طاقت ہے جو توانائی کو جوہر میں تبدیل کرتی ہے یا وہ داخلی طاقت کے ذریعے سے خود بخود تبدیل ہو جاتی ہے۔ آئن سٹائن اس عمل کو ایک واقعہ (Event) کہتا ہے مگر اس کے متعلق خاموش ہے کہ یہ واقعہ کیسے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ کوئی دوسری طاقت ہے جس نے اس کائناتی طاقت کو ذرات میں تبدیل کر دیا۔ اب دیکھیے غالب کیا کہتا ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اسی قصہ کو بیدل نے ایک سوال کے انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

کے کشیدہ اس فلاخت کہ بہ قید ما و من آمدی؟
تو سمار عالم دیگری ز کجا بہ این چمن آمدی؟

لیکن سائنس، ابھی اس مسئلہ پر یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ممکن ہے مستقبل میں سائنس ہی راز پر سے پردہ اٹھانے کے قابل ہو جائے یا شاید یہ راز راز ہی رہے لیکن جہاں تک حسی موجودہ کائنات کا تعلق ہے ہم کو یہ معلوم ہے کہ یہ کائنات منظم اور ناقابل تغیر قوانین میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہاں ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم کو اپنی مرضی کے مطابق نتائج حاصل کرنا ہیں تو ہم کو وہ قوانین معلوم کرنا پڑیں گے جن سے ہمارے مطلوبہ نتائج حاصل ہو

سکیں اور یہ قوانین معلوم کرنا ہمارے لیے ممکن ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے تمام مختلف سائنسی علوم ہر شعبہ حیات میں علت اور معلول کے ان قوانین کی دریافت میں لگے ہوئے ہیں جن سے انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر پرمسرت زندگی بسر کر سکے گا۔ جوش صاحب ہی کا ایک شعر ہے۔

مبارک باد ہاں اے ذوق تحقیق کہ ہر معلول ہے علت بداماں

عبدالخالق صاحب نے فرمایا اب ایک سوال اور ہے یہ بتائیے کہ کیا یہ قوانائی مطلق قوت شاعرہ ہے میرا مطلب ہے کیا اس میں شعور بھی ہے؟

میں نے عرض کیا۔ شعور کی پہچان کیا ہے؟ یہ خیال منظم کارخانہ حیات و کائنات جس کا ہر ذرہ بالکل تغیر قوانین میں جکڑا ہوا ہے جن قوانین کی دریافت میں انسانی ترقی یافتہ دماغ شعور سرگرداں ہے تو شعور کی اس سے بڑی شہادت اور کیا ہوگی۔ یہ کائنات کی تشکیل و تغیر و ارتقا میں انسانی عظیم الشان ذہن کا کارنامہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان پی سترین ذہنی صلاحیتیں کو استعمال کر کے اس عظیم ذہن کی کارفرمائی کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے لیکن پھر بھی سائنس کی عمر ہی کتنی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ جب انسانی ذہن اس عظیم ذہن کو پوری طرح سمجھ لے گا اس کی کوشش حد بھی آ جائے گا۔ پھر حد اعتقاد کا مسئلہ نہیں رہے گا بلکہ یہی یقین ہو جائے گا۔ اس وقت جب انسان اللہ اکبر کہے گا تو اس کو اللہ اکبر کے معنی کی بے نہایت وسعت کا شعور ہوگا۔ اور اس وقت جب وہ لا الٰہ الا اللہ کہے گا تو اس کلمے کی حکمت اور حقیقت اس کے ذہن پر پوری طرح منکشف ہوگی۔ وہ لا الٰہ الا اللہ کے علاوہ کسی خداوند کو تسلیم نہیں کرے گا۔ انسان پھر کسی طاقت کے آگے سر نہ جھکائے گا وہ اللہ کے بالکل تغیر قوانین کو تسلیم کرے گا وہ مقام ہوگا جب انسان عبدیت کے حقیقی مفہوم کو سمجھ لے گا اور اسی وقت وہ خلافت الٰہی کے منصب پر فائز ہوگا۔ یہ تمام کائنات اس کے لیے مسخر ہوگی اور وہ جس سے جتنا چاہے گا استفادہ کر سکے گا اور یہی جنت کی زندگی ہوگی۔

مجھے یقین ہے وہ وقت ضرور آئے گا۔ اب آپ جوش صاحب کی ایک رباعی سنیے۔

جس وقت یہ فیضان فکر و عمل جولاں انسان بنے گا تاجدار داماں
مجھ کو نہ ملا تو نے فلک آفاق بچ کر مری اولاد سے جائے گا کہاں؟

عبدالخالق صاحب بہت غور سے میری باتیں سن رہے تھے۔ آخر میں کہنے لگے، خورشید صاحب! آج آپ نے میرے ذہن کے بہت سے جالے صاف کر دیے۔ سید محمد تقی صاحب نے فرمایا۔ خورشید صاحب آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ ملتے رہا کیجیے۔ اتنے میں کسی نے آ کر کھانا میز پر چن دیا گیا ہے۔ عبدالخالق صاحب نے جوش صاحب کو ان کی نشست ہی پر کھانا کھلا دیا۔ اس کے بعد شاعری کا دور شروع ہوا۔ جوش صاحب نے جتنی رباعیات سنائیں وہ انسانی عظمت، علم اور شعور کی برتری سے متعلق تھیں۔ تقریباً رات گیارہ بجے یہ محفل برخاست ہوئی اور ہم لوگ اپنے اپنے گھر لوٹے۔

دوسرے دن جوش صاحب کی دعوت ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ جوش صاحب کی دعوت کا بہت خاص اہتمام کرتی ہیں۔ کراچی کے شعرا اعلیٰ حکام اور موسیقی سے وابستگی رکھنے والے حضرات و خواتین اس دعوت میں مدعو ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی میرے اور راجب صاحب کے علاوہ پناہ علی شاہ سیکرٹری تعلیمات حکومت سندھ جناب جعفری صاحب (CS) کمال اظفر صاحب کے سسر جناب مشتاق احمد صاحب یوسفی پریسیڈنٹ یونائیٹڈ بنک، نواب چھتاری آفتاب صاحب، سیکرٹری سہروردی صاحب، جناب محسن بھوپالی، سرور بارہ بنکوی، عزیز انصاری اور دیگر شعرا شریک محفل تھے۔ یہ محفل بھی نہایت دلچسپ رہی۔ شعرا نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ پھر جوش صاحب کو زحمت کلام دی گئی اور تقریباً دو بجے محفل برخاست ہوئی۔

مشتاق احمد صاحب یوسفی کے گھر دعوت:

دوسرے دن جوش صاحب کی دعوت مشتاق احمد صاحب یوسفی کے مکان پر تھی۔ یوسفی صاحب جوش صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مجھے اکثر جوش صاحب کے ساتھ یوسفی صاحب کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت بھی جب وہ یونائیٹڈ بنک کے پریسیڈنٹ تھے اور اس وقت بھی جب وہ بینکنگ کونسل کے صدر تھے جب بھی جوش صاحب ان کے دفتر جاتے۔ یوسفی صاحب اپنے تمام کام ملتوی کر کے جوش صاحب کی خاطر تواضع میں لگ جاتے۔

جس دن یوسفی صاحب نے جوش صاحب کو اپنے گھر مدعو کیا تھا اس دن چند دوسرے

شعرا، ادبا اور اہل دانش خواتین و حضرات کو بھی دعوت دی تھی۔ ان کو جوش صاحب کی یہ عادت بھی معلوم تھی کہ جوش صاحب غروب آفتاب کے ساتھ طلوع ہو جاتے ہیں اور غالباً اس بات کا اہتمام وہ اپنے مکان پر نہ کر سکتے ہوں گے اس لیے شام چار بجے اپنے ایک آدمی کے ہاتھ ایک بوتل بھجوا دی۔ وہ صاحب یہ تحفہ لے کر میرے گھر تشریف لائے اور مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں وہ تحفہ جوش صاحب تک پہنچا دوں۔ میں نے وہ بوتل جوش صاحب کو دے کر ان حضرت کا پیغام بھی پہنچا دیا۔ جوش صاحب برا بن گئے اور بوتل لوٹا دی۔ جب شام ہوئی تو جوش صاحب مجھ سے کہنے لگے آج یوسفی کی دعوت چل جاؤ۔ تم ان کو فون کر کے کہہ دو کہ جوش صاحب کی طبیعت خراب ہے وہ آج ان کے گھر نہ آ سکیں گے۔ چنانچہ میں نے فون کر کے یوسفی صاحب کو جوش صاحب کا پیغام پہنچا دیا مگر ابھی بدلی صاحب کا فون آیا اور انھوں نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کسی طرح جوش صاحب کو لے کر کم از کم آدھے گھنٹے کے لیے یوسفی صاحب کے مکان پر آ جاؤں۔ بدلی صاحب نے فرمایا کہ یوسفی صاحب نے جوش صاحب کی دعوت کا بہت پرتکلف اہتمام کر رکھا ہے اور بہت سے مہمانوں کو مدعو کر لیا ہے اب اگر جوش صاحب نہ آئے تو بہت برا ہوگا۔ بدلی صاحب نے کچھ اس طرح مجھ سے خواہش کی کہ میں نے اور سلامت علی خاں نے جوش صاحب کو مجبور کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے سہی یوسفی صاحب کی محفل میں شریک ہو جائیں۔ بڑی مشکل سے جوش صاحب تیار ہوئے اور ہم تینوں بغیر لباس تبدیل کیے جیسے بیٹھے تھے اسی حالت میں یوسفی صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں یوسفی صاحب نے واقعی بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ باہر لان پر بہت سے مہمان جمع تھے اور سب جوش صاحب کے منتظر تھے۔ یوسفی صاحب نے بہت محبت اور اخلاق سے ہم لوگوں کا استقبال کیا اور جوش صاحب کے بیٹھنے کے لیے جو خاص صوفہ متعین کیا گیا تھا وہاں ہم تینوں کو اٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر میں جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش ہونے لگی۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا خورشید علی خاں کوئی موقع نکالو۔ میں جوش صاحب کی بیاض کے صفحے الٹنے لگا۔ ایک دم میری نظر ایک صفحہ پر پڑی۔ لکھا تھا۔ ہاتم حقل۔ جوش صاحب پوچھنے لگے ارے میاں کچھ ملا۔ میں نے کہا جوش صاحب یہ نظم لکھی ہے۔ ہاتم حقل۔ جوش صاحب نے مسکرا کر کہا واہ کیا خوب موقع

راغب مراد آبادی اور جوش ملیح آبادی

کے مطابق نظم سنائی ہے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے وہ نظم سنائی۔ مگر پڑھنے کا انداز کہہ رہا تھا کہ بے کیف ہو رہے ہیں چنانچہ نظم ختم کر کے مجھ سے کہنے لگے۔ بھاگ چلو۔ اور باوجود اس کے کہ لوگ کچھ اور کچھ اور کی فرمائش کرتے رہے جوشی صاحب کھڑے ہو گئے اور ہم لوگ وہاں سے رخصت ہو کر لیاقت آباد آ گئے۔ وہاں کی چورنگی سے کباب اور روٹی لی اور اپنے گھر آ گئے۔ وہاں جوش صاحب نے اپنے چار پیگ مکمل کیے۔ کباب اور روٹی کھائی اور سو گئے۔

جوش صاحب جب تک کراچی میں رہے روز کسی نہ کسی کے گھر دعوت رہتی تھی۔ ایک دن سرور اقبال کے گھر ناشتے کی دعوت تھی۔ دوسرے دن یونین انڈسٹری (بنکٹ اینڈ پینس) کے مالک حبیب صاحب کے گھر دعوت تھی ایک دن اقبال جعفری صاحب کے گھر جو کہ کلفٹن میں تھا اور جو بلدیہ عظمیٰ میں آخر تعلقات عامہ تھے، دعوت تھی۔ ہر جگہ مابعد پر تکلف کھانے پینے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

نجی کی رفاقت:

یہ دعوتیں تو شام کو ہوتی تھیں مگر دن میں جوش صاحب گھر پر ہی رہتے کیونکہ لوگ بھی ان سے ملنے آ جایا کرتے تھے۔ ایک روز سب نے فرمائش کی کہ ہاشمی صاحب کی بچیاں بھی کراچی آئی ہوئی ہیں اور وہ سب مل کر کلفٹن جانا چاہتی ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ جوش صاحب بھی ان کے ہمراہ ہوں۔ جوش صاحب نے کہا اگر خورشید علی خاں آپ لوگوں کو لے جائیں تو میں بھی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ دوسرے دن صبح سویرے ہم سب مل کر کلفٹن روانہ ہو گئے۔ وہاں تمام دن کلفٹن کی سیر کرتے رہے اور جب واپس لوٹے تو شام ہو چکی تھی۔ ادھر میرے مکان میں عصر کے وقت ہی سے احباب جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ واجب صاحب، سرور بارہ بنکوی، سلامت علی خاں اور فراست رضوی سخت حیرت زدہ تھے کہ نہ جوش صاحب کہاں چلے گئے۔ ہم نے بچیوں کو ان کے گھر پہنچایا اور مغرب کے بعد گھر پہنچے۔ جوش صاحب نے منہ ہاتھ دھویا اور احباب میں آ کر بیٹھ گئے۔ سب لوگ تجسس بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ آخر واجب صاحب نے پوچھ ہی لیا کہ ہم لوگ کہاں گئے تھے۔ جوش صاحب تو خاموش رہے مگر میں نے بات ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ میرے ایک

دوست کے گھر چلے گئے تھے وہاں ایسا موضوع گفتگو چھڑ گیا کہ دیر ہو گئی۔ راغب صاحب
عکیمی کے سے انداز سے جوش صاحب کی نبض دیکھنا شروع کر دی اور فوراً یہ شعر پڑھا۔

یہ راز کھلا نبض کی رفتار سے سرکار گویا ابھی پہلو سے سخن رخصت ہوئے ہیں

میں نے کہا راغب صاحب اس وقت تو آپ کو مناظرہ ہوا ہے مگر یہ شعر آپ میری ڈائری
لکھ دیجیے۔ راغب صاحب نے لکھا "الہامی شعر"۔ پھر شعر لکھ کر اس کے نیچے اپنا نام اور تاریخ
۲۹۔۱۰۔۶۵ء لکھ کر یہ الفاظ بھی لکھ دیے "حضرت جوش کی نبض دیکھنے کے بعد ٹھیک
شام کے وقت"۔ جوش صاحب شعر سن کر مسکرانے لگے مگر میں نے کہا راغب صاحب
اس وقت آپ پر خاص الہام ہوا ہے ہم لوگ واقعی ایک دوست کے گھر بیٹھے تھے
راغب صاحب نے فی البدیہہ ایک اور رباعی فرما دی۔

افشا ہو جائے رمز امکان نہیں جو محرم راز ہے وہ نادان نہیں
ہر شخص کے مداح ہیں حضرت جوش ہر شخص تو خورشید علی خان نہیں

اسی وقت جوش صاحب نے بات ٹالتے ہوئے اپنا گلاس بھرا اور بیاد فلاں بنت فلاں
کر شغل مے گل فام میں مشغول ہو گئے اور فرمایا۔

اس وقت سبک بات نہیں ہو سکتی توہین خرابات نہیں ہو سکتی

اور اس طرح موضوع بدل دیا۔

بابا صاحب اور تصور خدا:

دوسرے دن جوش صاحب نے کہا چلو آج وہاں شاہ صاحب کے گھر چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم
لوگ کوئی دس بجے بابا صاحب کے مکان واقع بنارس کالونی پہنچ گئے۔ بابا صاحب چند
معتقدین کے ساتھ تشریف فرما تھے ہم کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے بہت محبت اور احترام سے
جوش صاحب کو اپنے قریب تخت پر بٹھایا۔ میں بھی قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

بابا صاحب نے جوش صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ دونوں بہت اچھے موقع سے
تشریف لائے۔ میں ان لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ خدا کا تصور ہر شخص کے علم، تجربے ذہنی اور
فکری صلاحیت کے مطابق جدا جدا ہوتا ہے۔ خدا کوئی چیز محسوس تو ہے نہیں کہ آنکھوں سے

دکھائی دے سکے اور تصور کی صلاحیت ہر شخص کی الگ الگ ہوتی ہے اس لیے ہر انسان خدا کا اپنا الگ تصور رکھتا ہے۔ اسی خیال کو میں نے ایک رباعی میں یوں بیان کیا ہے۔

باقی ہے ہے اک ربط یہاں فانی کا
ہے دارومدار اسی پہ حق دانی کا
جیسا بندہ خدا بھی اس کا ویسا
جو رنگ ہے شیشے کا وہی پانی کا

جوش صاحب نے فرمایا ہی ہاں۔ حافظ نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی ہے۔

در رہ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرم راز ہر کسے بر حسب فہم گمانے دارد

میں نے عرض کیا بابا صاحب کیا خدا کا حقیقی اور معروضی تصور انسان کے لیے ناممکن ہے؟ بابا صاحب نے فرمایا جی ہاں۔ اس لیے کہ انسانی حواس محدود ہیں اور خدا لامحدود۔ اور کوئی محدود لامحدود کا تصور نہیں کر سکتا۔ وہ جب بھی اس کا تصور کرے گا لامحدود کو محدود کر دے گا اور خدا محدود نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن نے خدا کی "ذات" کا کوئی تصور نہیں دیا بلکہ دور جاہلیت میں ذات کے تعلق سے جتنے تصورات تھے ان کی نفی کی ہے۔ مثلاً زمانہ جاہلیت میں انسان ایک سے زیادہ طاقتوں کو کائنات میں کارفرما سمجھتا تھا اور ہر طاقت کا ایک بت تراش کر اس کی پرستش کرتا تھا۔ قرآن نے فرمایا کہو اللہ ایک ہے۔ اس طرح وحدانیت کے تصور سے تمام معبودان باطل کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس تمام کائنات کا خالق پروردگار اور رب صرف ایک اللہ ہے۔ نہ اس کا کوئی ثانی ہے اور نہ کوئی اس کی طرح مافوق۔ اس لیے وہ "الصمد" ہے یعنی وہ اعلیٰ ترین قوت ہے جس سے ہر حاجت مند رجوع کرے اور اس سے بڑی کوئی طاقت تصور میں نہ آسکتی ہو۔ اس طرح قرآن نے انسانی ذہن کو انسانوں کے بنائے ہوئے بتوں کے چنگل سے نکال کر قادر مطلق کی طرف رجوع کیا۔ پھر اس سلسلے میں ایک یہ تصور بھی تھا کہ بتوں کی بیویاں اور اولادیں بھی ہوتی ہیں۔ قرآن نے اللہ کے تصور کو اس باطل تصور سے بھی پاک کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ دنیا میں کوئی اس کا ہمسر۔ اس طرح اللہ کی "ذات" کو تمام شخصی تصورات سے جدا کر کے اس کی صفات کے متعلق بھی جتنے باطل

تصورات تھے ان کی نفی کی۔ اس طرح ایک قادر مطلق وحدہ لاشریک لہ کا تصور پیش کیا مگر
محدود کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا ایسا ہی تصور انسانیت کامل کی نشوونما میں مدد و معاون ہو سکتا ہے
کہ یہ احکامات اور قوانین کے ذریعے سے اس کائنات کا خالق بھی ہے اور قادر مطلق بھی۔

ایک صاحب نے دریافت فرمایا۔ بابا صاحب وہ کس طرح؟

بابا صاحب نے فرمایا۔ وہ اس طرح کہ جب انسان کے ذہن میں ایک قادر مطلق کا تصور
استوار ہو جائے گا تو وہ کسی دوسری طاقت کے سامنے نہیں جھکے گا۔ بقول اقبال

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور جب انسان خداوندان باطل کے ظلم سے آزاد ہو جائے گا تو اس کا ایمان اللہ تعالیٰ پر مستحکم
ہو جائے گا اور ہر معاملے میں کسی دوسرے کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے
احکام معلوم کرنے کی کوشش کرے گا اور چونکہ اللہ کا قانون کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیتا اس
لیے قوانین الٰہی پر عمل کرنے سے اسے جو بھی مقصد میں کامیابی حاصل ہوگی اس سے انسان
میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور اس طرح اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان
کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا ہے اور یہ کائنات اس کے لیے مسخر فرما دی ہے اور یہ ہدایت بھی فرما
دی کہ دیکھو اللہ کے علاوہ کسی اور کو اپنا الٰہ مت قرار دینا۔ اس مقصد کے لیے اس کو کلمہ
لا الٰہ الا اللہ کا سبق بھی سکھا دیا مگر انسان قوانین الٰہی معلوم کر کے ان پر عمل کرنے کے بجائے
معبودان باطل کے سامنے جھکنے لگا اس طرح اس بلند مقام سے گر گیا جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے
بحیثیت خلیفہ فائز فرمایا تھا۔ تمام پیغمبر اور اولیاء انسان کو اس کا بھولا ہوا مقام دلوانے کے
لیے بھیجے گئے اور آج بھی اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے انسان کو سیدھا راستہ دکھانے اور اللہ
تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں مشغول ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ بابا صاحب یہاں میں ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ
پیری مریدی کے ادارے کام ہیں جن میں پیر صاحب انسانوں سے خود کو سجدے تک کرواتے
ہیں ان اداروں کے ذریعے سے کون سی خدمت انسانی کی تبلیغ ہوتی ہے؟

بابا صاحب نے فرمایا یہ لوگوں کی جہالت ہے۔ دراصل بھی عام آدمی کا ذہن بھٹکے

محسوس کا سہارا ڈھونڈتا ہے جو ان کو پیرنی کی شکل میں مل جاتا ہے۔ اس زمانے میں بھی بہت سے جاہل اور دھوکے باز لوگ پیری اور روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر داخل ہو گئے ہیں جو لوگوں کو طرح طرح سے فریب دے کر ان کا استحصال کرتے ہیں مگر جو سچے اللہ والے ہیں وہ کبھی کسی انسان کو انسان کے سامنے جھکنے کی ترغیب نہیں دیتے۔ وہ تو ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام ہی سمجھاتے رہتے ہیں اور جس حد تک ان سے ممکن ہے لوگوں کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔

غرض ان باتوں میں بارہ بج گئے۔ بابا صاحب نے دسترخوان بچھوا دیا مگر جوش صاحب نے معذرت کر لی اور فرمایا کہ کچھ لوگ ان سے ملنے کے لیے گھر پر آنے والے ہیں اس لیے وہاں سے اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ جب ہم گھر پہنچے تو سمن اور ہاشمی صاحب کی صاحبزادیاں وہاں بیٹھی ہوئی جوش صاحب کا انتظار کر رہی تھیں۔ جوش صاحب نے دریافت کیا کہ تم کب سے بیٹھی ہوئی ہو؟ تو سب نے کہا کہ بس یہی کوئی دس پندرہ منٹ سے۔ جوش صاحب نے کہا چلو پہلے چل کر کسی چائنیز ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ صدر میں ABC چائنیز ہوٹل آئے وہاں کھانا کھانے کے بعد جوش صاحب نے کہا کہ اب چلو ملیر کے ہوٹل چلتے ہیں۔ پھر ہم لوگ گریٹ ہوٹل ملیر چلے گئے۔ وہاں شام تک بیٹھے باتیں کرتے رہے مگر ابھی دھوپ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچ گئے اور شام کو حسب معمول تمام احباب جمع ہو گئے۔ آج جوش صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا اور گو دن میں آرام نہیں کیا تھا مگر دور دور تک کسی قسم کی تھکن کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

مجرے کا تقویٰ:

جوش صاحب کے ایک دور کے عزیز ہیں حمدی خاں صاحب۔ کراچی میں ملیر پارک پر ان کا "بلڈنگ ریسٹورنٹ" ہے۔ وہ اکثر جوش صاحب کی دعوت اپنے ہوٹل میں کرتے رہتے تھے۔ دوسرے دن صبح کوئی دس بجے حمدی خاں صاحب دو خواتین کے ساتھ جوش صاحب سے ملنے کے لیے ہمارے گھر تشریف لائے۔ میں نے انہیں دیوان خانے میں بٹھا کر جوش صاحب کو ان کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اس وقت کسی "اور" کی آمد کے منتظر تھے مگر جیسے ہی میں نے کہا حمدی خاں صاحب کے ہمراہ دو خوبصورت خواتین بھی ہیں تو جوش صاحب نے فوراً معنی

خیر مسکراہٹ کے ساتھ یہ رباعی پڑھی

قدموں پہ مرے عرش معلیٰ بھی سہی — خورشید کی آنکھوں میں ضیا بھی سہی
حوریں حاضر ہوئی ہیں مجرے کے لیے؟ — اچھا حاضر کرو یہ تقویٰ بھی سہی

یہ کہتے ہوئے جوش صاحب اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ سلام دعا کے بعد حمدی خاں صاحب نے ان خواتین کا تعارف کرایا۔ جوش صاحب یہ دونوں سنیں آپ کی فین ہیں۔ یہ بڑی ہیں ان کا نام رخسانہ ہے ان کے شوہر بیوی میں لفٹننٹ کمانڈر تھے مگر ان کا انتقال ہو چکا ہے اور یہ چھوٹی سنیں ہیں ان کا نام رخسانہ ہے انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (صحافت) میں امتحان کیا ہے۔ یہ دونوں شعر و ادب کی دلدادہ ہیں۔ سخن فہم بھی ہیں اور آپ کی طرفدار بھی۔ میں جب یہ معلوم ہوا کہ آج کل آپ کراچی میں ہیں تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ جوش صاحب سے ملنا ہے۔ اس لیے آج میں انھیں لے آیا۔ جوش صاحب نے کہا یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا لیکن اگر پہلے سے فون کر دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ ہم کوئی ایسا وقت مقرر کرتے جس میں زیادہ دیر بیٹھ کر گفتگو کر سکتے۔ اس وقت تو چند ایسے لوگ آنے والے ہیں جن کو پہلے سے وقت دے رکھا ہے۔ رخسانہ نے کہا جوش صاحب ہم بلا اطلاع حاضر ہونے کی معافی چاہتے ہیں مگر میں اس وقت صرف آپ کو اپنے گھر دعوت کرنے کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔ اگر ایک شام ہمارے نام بھی ہو جائے تو ذرہ نوازی ہوگی۔ جوش صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا کل شام کوئی خاص پروگرام نہیں ہے اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو کل کا وقت ان لوگوں کو دے دیں۔ جوش صاحب نے اجازت دے دی۔ حمدی خاں صاحب نے جوش صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ راغب صاحب کو بھی ضرور ساتھ لائیے گا اور وہ کل شام پانچ بجے ہم لوگوں کو لینے کے لیے ہمارے گھر آ جائیں گے۔ غرض یہ پروگرام طے کر کے وہ لوگ رخصت ہوئے اور تھوڑی ہی دیر میں جوش صاحب کے مصاحبین خاص تشریف لے آئے۔ اس دن مجھے کچھ ضروری کام تھا اس لیے میں نے جوش صاحب سے اجازت لی اور چلا گیا مگر ملازم کو یہ تاکید کر دی کہ مہمانوں کا ہر طرح خیال رکھے۔

اس شام جوش صاحب کی دعوت راغب صاحب کے ایک دوست چودھری رحمت علی صاحب کے گھر تھی۔ چنانچہ غروب سے پہلے جوش صاحب، راغب صاحب، سلامت علی خاں

بعد میں چودھری صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ دیکھا تو چودھری صاحب کچھ افسردہ سے دکھائی دیے۔ ان کی باتوں سے اضطراب نمایاں تھا۔ غالباً کسی ٹھیکے میں، انھیں شدید نقصان ہوا تھا۔ راغب صاحب نے ان کی حالت دیکھ کر اسی وقت یہ رباعی کہی۔

لو شمع سحر کی تھرتھرانے جیسے
برق در میں چمکے و تاب کھانے جیسے
میں شدت غم سے جاں بہ لب ہوں اس طرح
طوفان میں ناؤ ڈگمگانے جیسے

پھر جوش صاحب نے اپنا کلام سنایا اور جیسے ہی آفتاب غروب ہوا میخانہ سجا دیا گیا۔ جوش صاحب نے جام لے کر کہا۔ "بنام فلاں بنت فلاں" اور محفل کا موڈ بدل گیا۔ جوش صاحب نے یہ رباعی سنائی۔

سینے میں جوانی ہو تو پیری کیسی — ہر رات ہے لیلیٰ تو ہر دن عیدی
پانی کی جھنک ہو اور سہ رسے گا — ہو سو سال کی ایسی تیسی

اس کے بعد ایک اور رباعی سنائی۔

کہ مار ہے پر کی صدا آتی ہے — اک دشمن اختر کی صدا آتی ہے
دھمکاتی ہے جب اجل تو میرے دل سے — بر پشم قلندر کی صدا آتی ہے

غرض جب محفل برخاست ہوئی تو چودھری صاحب کا غم مسکراہٹوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

دوسرے دن حسب وعدہ حمدی صاحب خاں صاحب عصر کے بعد تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر میں راغب صاحب بھی آ گئے، اور ہم سب رخسانہ صاحبہ کے گھر غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے پہنچ گئے۔ وہاں دونوں بہنیں رخسانہ اور رکسانہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ جوڑے میں گلاب ہاتھوں میں چنبیلی کی کلیوں کی پہنچیاں، خوشبو سے تمام خانۂ چمن معطر۔ استقبال کے لیے ہیرون در منتظر کھڑی تھیں۔ جیسے ہی ہم لوگ پہنچے رکسانہ نے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور جوش صاحب کو سلام دے کر اندر اور ہم لوگ ان کے خوابصورت ڈرائنگ روم میں بٹھا دیے گئے۔ رکسانہ نے جوش صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ "ادھر طرف جوش صاحب یہ ہم نے جلدی میں آپ کے لیے دعوت شیراز کا اہتمام کیا ہے امید ہے آپ

کچھ خیال نہ فرمائیں گے۔ راغب صاحب نے لوا اٹھا۔

جناب جوش ہی کے دل کا یہ الہام کہتی ہیں
مکالمہ ہر طرف مکس ناز سے رسکانہ کہتی ہیں

اتنے میں جوش صاحب کی نظر رسکانہ کی تصویر پر پڑی۔ نکھرا ہوا شباب اور جھنجھلائے ہوئے گلاب کا پھول۔ جوش صاحب نے تصویر ہاتھوں میں لے کر یک شعر پڑھا۔

یہ کم سنی کا ناز یہ عالم شباب کا
پھولوں میں تم ہو پھول لیے ہو گلاب کا

راغب صاحب نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی،

آغوش میں کشمیر لیے بیٹھے ہیں
یا خلد کی جاگیر لیے بیٹھے ہیں
اس وقت جناب جوش تو اے راغب
رسکانہ کی تصویر لیے بیٹھے ہیں

رسکانہ نے بی شرمانے لگیں تو راغب صاحب نے ایک اور رباعی فی البدیہہ سنا دی۔

راغب دیکھے کوئی بچشم بیدار
رسکانہ ہے یا ساز طرب کی جھنکار
لہجے میں ہے ساغر کی کھنک یا رب
چہرے پہ کھلے ہوئے پھولوں کی بہار

رسکانہ نے ستار اٹھایا اور جوش صاحب کی یک طرحی غزل شروع کی۔ واقعی لہجے میں ساغر کی کھنک تھی۔ جوش صاحب نے اپنا شعر پڑھا۔

بہلا تھا پہ گویا کنول کھلتے ہوئے
کھڑی ہوئی ہے جوانی شباب اٹھاتے ہوئے

طرحی حسن اور شاعر جہاں جمع ہو جائیں وہاں صرف یک بات کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ عمدی خاں صاحب نے پوری کر دی۔ انھوں نے بلیک لیبل کی بوتل نکالی اور میخانہ سجا دیا۔ میں نے کہا واہ خاں صاحب بس یہاں یہی ایک کمی تھی جس کو آپ نے پورا کر دیا۔

جوش اٹھتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

اس تمام مدت میں رخسانہ دور بیٹھی ہوئی تھیں۔ راغب صاحب نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا۔

کیا ہو مشتاق دل جلانے میں
اس قدر بھی پاس آنے میں

جب جوش صاحب کے چار پیگ ختم ہو گئے تو کھانا چن دیا گیا۔ ہر چیز صاحب قدیم تھی۔ مرغن یہ محفل حسن و نشاط تقریباً نصف شب پر ختم ہوئی۔ اور جب ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو راحب صاحب نے فرمایا۔

بنتے ہیں تمام گھر بگڑنے کے لیے — بنتے ہیں تمام شہر اجڑنے کے لیے
کیا جبر مشیت ہے کہ راحب ہم بھی — احباب سے ملتے ہیں بچھڑنے کے لیے

جوش صاحب نے فرمایا۔

انسان سے کیا ربط بڑھاتے انسان — ہر گلن ہوا ہے اک راہ طوفان
سرمدی دانش و حب و عشق و سودا — پھر فصل و فراق موت غفلت نسیان

ماحول بوجھل ہونے لگا تو میں نے جلدی جلدی جوش صاحب اور راحب صاحب کو گاڑی میں بٹھایا اور گھر روانہ ہو گیا۔ گو رات دیر سے پہنچے مگر یہ محفل اس قدر دلچسپ تھی کہ بقول دفتر حسن:

کچھ اتنی دلنواز تھی کل اس کی بزم ناز
ہر شخص رات دیر گئے اپنے گھر گیا

جوش صاحب کی کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی:

جوش صاحب کو کراچی کلکٹر آف کسٹم کی طرف سے ۲۸ ستمبر ۱۹۶۰ء کو کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ کا اجازت نامہ دیا گیا تھا۔ (Clearing and Forwarding Licence) اور جوش صاحب نے ان کے دور کے ایک مرید محمد عابد صاحب کی شرکت میں۔ جوش کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی کے نام سے ایک فرم قائم کر رکھی تھی اس کے دفتر کا پتا ۱۰۔ شیخ چیمبرز۔ ام اے جناح روڈ۔ کراچی پاکستان۔ ٹیلی فون نمبر 23850 اور ٹیلی گرام کا پتا DANYEXPO تھا اور لائسنس نمبر ۲۲۱ تھا۔

جوش صاحب اس میں خود تو کیا کام کرتے۔ اس کمپنی کا تمام کاروبار عابد صاحب ہی سنبھالتے تھے۔ البتہ جوش صاحب اپنے تعلقات کی بنا پر بڑے بڑے جہازوں اور کمپنیوں کا درآمدی اور برآمدی کام اس کمپنی کو دلواتے رہتے تھے۔ اب جب سے وہ اسلام آباد منتقل ہو

گئے تو ان کو اس قرم سے کوئی آمدنی نہیں ہو رہی تھی اور عابد صاحب جوش صاحب کے حصے کی رقم بھی ادا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ کراچی کے اس قیام کے دوران میں جوش صاحب نے تین ہزار پانچ سو روپے کے عوض یہ تمام کاروبار مستقل طور پر عابد صاحب کے حوالے کر دیا۔ ۲۵ جولائی ۱۹۷۵ء کو عابد صاحب حسب معاہدہ رقم لے کر آ گئے اور اس سلسلے میں لکھا پڑھی ہو گئی۔ جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ تین دستاویزات انگریزی میں تیار کروں۔ ایک گفٹ ڈیڈ کے نام کہ آئندہ سے "جوش کلیرنگ ایجنٹ اینڈ کارڈ رائٹنگ ایجنسی" کا کاروبار ان کے بجائے ان کے شریک کار محمد عابد صاحب انجام دیں گے۔ دوسرا عابد صاحب کے ساتھ معاہدے سے متعلق کہ اگر وہ ساڑھے تین ہزار روپے ادا کر دیں تو ان کی حیثیت ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء کے معاہدے کی رو سے شریک کار کی تھی اب وہ معاہدہ ختم ہو جائے گا اور عابد صاحب اس کمپنی کے تمام کاروبار کے بلاشرکت غیرے مالک ہو جائیں گے اور تیسری دستاویز کے ذریعہ تین ہزار پانچ سو روپے کی رسید لکھ دی گئی۔ یہ تمام معاہدہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۵ء کو انجام پائے اور جوش صاحب نے ان تینوں دستاویزات پر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد عابد صاحب نے دوسری اگست کو جوش صاحب اور ہم سب احباب کی بہ گھر ناشتے کی دعوت کی اور نہایت ذوق سے ساری پائے نان اور سوئیاں کھائیں۔

اسی قیام کے دوران میں جوش صاحب نے ایک نظم بھی کہی جس کا عنوان ہے "ترانۂ عیادت" جس دن یہ نظم مکمل ہوئی اسی دن مجھے سنائی اور میں نے نقل کر لی۔

ترانۂ عیادت

اے شیخ کہاں تک یہ تشنیع و دل آزاری
میری تو عبادت ہے اب نوشی و مے خواری
لیجان مشیت سے حاصل ہے مجھے اب تک
بانہوں کی گہر ریزی بوسوں کی شکر باری
اقلیم نگاراں میں ہاں آج بھی قائم ہے
بیداری قسمت سے بندے کی عمل داری

گل ریز سادوں میں رم جھم کے ملاووں میں
ہے یاد بھاروں میں سرمستی و سرشاری
بکھری ہوئی زلفوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں
سبزے پہ ہم آغوشی ساحل پہ گہر باری
کھڑوں کی صباحت سے زلفوں کی سیاہی سے
صبحوں کی بھی ملتانی شاموں کی بھی سرداری
اسرار انا الحق تک پہنچی ہے نظر اب تو
ہر وقت پہلو کی اللہ دی دل داری
وہ وصل میسر ہے جو فصل سے ماں ہے
معراج ہے اور کرب تو میں نہیں طاری
اللہ کی رحمت نے بخشی ہے مجھے جوش
راتوں کے اندھیروں میں توفیق سحر کاری
وہ بخت سمن میرے پہلو میں نہ آ سکتی
خورشید علی جاں کی ہوتی جو نہ غم خواری

• نوٹ۔ میرے محبوب و مفکر دوست جو نادر تو نا ظم آباد کراچی میں رہتے ہیں اور جن کو حضرت آغا زاہد نے دلبر جانی کا خطاب عطا فرمایا ہے!

دوسری اگست کو سمن اور ہاشمی صاحب کی بچیاں جوشش صاحب سے ملنے آئیں اور سمن نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو یوسفی صاحب سے کہہ کر بینک کی ملازمت دلوا دی جائے۔ جوشش صاحب نے وعدہ کر لیا اور فرمایا کہ وہ ایک درخواست لکھ کر یوسفی صاحب کے پتے پر روانہ کر دیں اور جب درخواست ان کے پاس پہنچ جائے گی تو جوش صاحب یوسفی صاحب سے سفارش کر دیں گے۔ ہاشمی صاحب کی بچیاں عابد صاحب کے گھر مقیم تھیں اور سمن لہجہ کے گھر۔

جوش صاحب کی سلام آباد روانگی

جوش صاحب کو سلام آباد کچھ اہم کام تھا اس لیے وہ تیسری اگست [illegible] کو بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد پرواز کر گئے مگر مجھ سے فرما گئے کہ اگر ان بچیوں کو لاہور کی ضرورت پڑے تو میں ان کا خیال رکھوں۔

اسلام آباد پہنچنے کے دوسرے دن جوش صاحب نے مجھ سے ٹیلی فون پر بات کی پہلے تو بے متعلق باتیں کیں پھر کہا کہ ان کا کراچی سے اسلام آباد کا سفر دیسے تو خوش گوار گزرا مگر چونکہ ان کا دل کراچی ہی میں رہ گیا ہے اس لیے سست بے چین ہیں۔ پھر فرمایا کہ میں عابد صاحب کو ٹیلی فون کر کے ہاشمی صاحب کی بچیوں سے یہ معلوم کرواؤں کہ ان لاہور کب پہنچ رہی ہیں۔ چنانچہ میں نے اسی وقت ٹیلی فون کیا تو عابد صاحب تو باہر گئے ہوئے تھے مگر رخسانہ سے بات ہو گئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ لوگ آٹھویں اگست بروز جمعہ لاہور روانہ ہوں گے اور ان کی بھی ان کے ساتھ ہوں گی۔ میں نے اسی وقت جوش صاحب کا خبر بتایا مگر اسلام آباد کی لائن میں ملی۔ اس کے بعد میں اپنے کاموں میں ایسا مصروف ہو گیا کہ جوش صاحب کو مطلع کرنا بھول گیا۔

گیارہویں اگست کو جوش صاحب کا چھٹی اگست کا لکھا ہوا خط وصول ہوا لکھا تھا

"اے بس اس لیے بڑی لجاجت سے فون کیا کہ عابد سے یہ دریافت کر کے مجھے فون کر دیجیے کہ میری بیٹی آخر الزماں کس تاریخ کو روانہ ہو رہی ہے لیکن آپ اس خیال سے ٹال گئے کہ آپ کے فون کا بل بڑھ جائے گا۔ اسی کا نام ہے دوستی؟ دس بارہ روپے بچانے اور میرا دل توڑ دیا۔

جی چاہتا ہے آپ کی اس بخل آلودہ بے مہری پر اس قدر لکھوں کہ آپ کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں مگر پھر یہ سوچتا ہوں کہ آپ کہیں گے یہ جوش کس قدر احسان فراموش ہے۔ گر میں نہ ہوتا تو یہ ناشکرا دن پکڑے پکڑے پھرتا۔ اس کو تخلیہ میسر نہ آتا اور اس کے لب و آغوش اس ہلکر ناز کے مل نگاریں اور اس کے نرم جسم سے لطف اندوز نہ ہو سکتے۔

احسان فراموشی سب سے زیادہ ذلیل عیب ہے۔ اس لیے آپ کی شکایت کے تمام

مجھ سے زیادہ اعتماد کیا ہے اور میں نے شرافت اسی میں دیکھی کہ آپ پر فون دشمن نہ کروں۔
جا چھوڑ دیا حافظ قرآن کو کر

آپ کا شکر گزار

احسان مند

جوش

مجھے دیتی نہیں کچھ مہلت تیری
صبح پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری
اسے ہے حسن سے یہ گفتگو تو برتو سے جوش کی ہیں تو

خط ملتے ہی میں نے جوش صاحب کو ٹیلی فون کیا ہے حد عاجزی سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی فروگزاشت نہیں ہوگی اور اس مضمون کا خط بھی لکھ دیا۔ جوش صاحب اس قدر معصوم آدمی تھے کہ فوراً خوش ہو گئے اور خود مجھ سے بے حد معافی مانگنے لگے۔ پھر خود مجھے بتایا کہ سمن کا ٹیلی فون لاہور سے آ چکا ہے۔ غرض اس طرح جوش صاحب کی خفگی ختم ہوئی۔

اس کے بعد جوش صاحب کا اکیسویں اگست کا لکھا ہوا خط مجھے تیسویں کو ملا۔ لکھا تھا:

"بھئیے صاحب، سرکار الوہیت اقتدار نے فون پر ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی درخواست کر چکی جا چکی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے کہ میں سفارش کے واسطے کراچی چلا جاؤں۔ میں نے یوسفی صاحب کو خط لکھا ہے ان کا جواب آ جائے تو کراچی روانہ ہو جاؤں۔ کیا رہنے ہے آپ کی اس باب میں؟ اور اگر جواب دیجیے یا فون پر بات کر لیجیے

میں تو بڑے لطفے میں پڑا ہوا ہوں خورشید صاحب۔ خوب جانتا ہوں یہ موسم ان تعلیمات کا نہیں ہے لیکن کیا کروں میری عقل گدھوں کی کمائی ہوئی تھوڑی گھاس چر رہی ہے اور میرے سینے کا لونڈا عقل کو ٹھینگا دکھا دکھا کر سیٹیاں بجا اور "ہپ ہپ ہرا" کر رہا ہے۔

تھوک میری اوقات پر لعنت میری ذات پر

"بڑا مفکر بنا پھرتا ہے سالا اور اندر اتنا گوبر تھا۔"

اگر غیرت ہوتی تو ڈوب مرتا چلو بھر پانی میں لیکن میں تو منہ پر بھیری لوئی تو کیا کرے گا
کوئی کی حد تک بے حیا ہو چکا ہوں۔

قائل صد ہزار نفریں
جوش ناعاقبت میں

اسلام آباد ۲۱۔۸۔۱۹۸۵ء

اس خط کے جواب میں، میں نے جوش صاحب کو لکھا کہ ابھی ابھی آپ کا کیسوی گست کا لکھا ہوا خط ملا۔ اس خط کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ تو جوش صاحب کی تحریر ہے مگر درمیان میں ایک لکیر کے بعد جو دوسرا حصہ ہے وہ شبیر حسن خاں صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ارے یہ بزرگ آپ پر کس طرح قابض ہو گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے ہاتھ لگاتے ہی ایسا دھوبی پاٹ مارا کہ آپ چاروں شانے چت ہو گئے۔ یہ بتائیے وہ بزرگ کب تک آپ پر مسلط رہے اور کب آپ کی جان چھوڑی؟ اور اب آپ کا کیا حال ہے۔ جوش صاحب آج کل آپ پر دو جنوں کا قبضہ ہے۔ اللہ رحم فرمائے آپ کی حالت پر

جہاں تک آپ کے خط کے پہلے حصے کا تعلق ہے تو آپ نے یوسفی صاحب کو خط تو لکھ ہی دیا ہے اب یہ تو ان کے جواب کا انتظار فرمیے یا ٹیلی فون پر ان سے بات کر لیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ گرسن ہیک کی ملازمت کے معیار پر پوری اتریں تو یوسفی صاحب آپ کو نامزد ضرور کریں گے۔ ویسے اگر آپ کراچی آنا چاہیں تو ہمارے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد معلوم ہوا کہ سمن کو بینک کی ملازمت مل گئی اور ان کی پوسٹنگ بھی ہو گئی۔ مگر ان سے وہ ملازمت زیادہ دن نہ چل سکی اور شاعرانہ مزاج کی خاتون حساب کتاب کے پرخار صحرا سے بہت جلد پناہ مانگ کر نکل آئیں۔

اس کے بعد تقریباً دو مہینے تک جوش صاحب سے کوئی خط و کتابت نہ ہو سکی تو میں نے بالآخر پانچویں اکتوبر کو انہیں خط لکھ کر ان کی خیریت دریافت کی اور میں نے لکھا کہ میرا ارادہ ہندوستان جانے کا ہو رہا ہے اگر وہ بھی ساتھ چل سکیں تو بہت لطف آئے گا۔ اس کے جواب میں بارہویں اکتوبر کا لکھا ہوا خط مجھے چودھویں اکتوبر کو ملا۔ انہوں نے لکھا تھا

بار بار جی چاہا کہ آپ کو خط لکھوں لیکن جب یہ سوچا کہ آپ بریلی نے نکل جب مجھے کبھی فون ہی نہیں کرتے تو پھر میں خط کیوں لکھوں۔

کل دوپہر کو آپ کا خط آیا۔ اس لیے مجبوراً خط لکھ رہا ہوں۔ جی ہاں مجبوراً۔ دل اس وقت بھی یہی کہہ رہا ہے کہ جواب ٹال جاؤ۔ بخیلی سے کیسی رسوائی

بخیل از بودن بد بخود بد بہشتی نہ باشد بحکم خبر

اس وقت جیسی سنسان میں دو بجے ہیں۔ رات اندھیری ہے۔ محلے کے کسی مکان سے ابھی ہنسی کی آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ اب سناٹا طاری ہے۔ سامنے کی کھڑکی سے کوئی مجھے گولی مار دے گا۔ بار بار یہ خیال آ رہا ہے۔ اچھا ہے کوئی اللہ کا بندہ گولی مار دے اور اس بے چین دھڑکنے والے دل کو سکون بخش دے۔ جی ہاں دہشت ہی چاہ رہا ہے ہندوستان جانے کا آپ کا سا بخیل ساتھ ہو گا تو کروٹ کروٹ حوریں ہوں گی۔ لیجیے پھر آ گیا پیار آپ پر۔ ہوش ہی نہیں۔ ہوش سے تھوڑا دست بخیل ضرور ہوں گا ——

پھر مکمل خاموشی ہے۔ پیام ہے۔ سلام۔ دل کم بخت زندہ گھٹا جا رہا ہے۔ سانس اٹک اٹک کر آ رہی ہے۔ یہ خاموشی جان لے کر چھوڑے گی۔ دونوں پاؤں پر ورم آ گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں علاج کیجیے یہ بڑی خطرناک علامت ہے۔ میں کہتا ہوں جوتی کی نوک سے کل آنے والی موت آج ہی آ جائے۔ کون سے قدر بٹ رہے ہیں اس حرام زادی زندگی میں؟ اللہ بلاتا تو درکنار یہاں تو بچے لگے رہتے ہیں دن رات کچا کچا۔

کاش میں سنگ دل خورشید علی خاں ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ ایک چھری لے کر کھا جاتا ہوں۔ بانسے شقی ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ اے اللہ مجھ پر کرم فرما اور میرے سینے میں شمر کا دل عطا فرما دے۔

ہوا میں خنکی تیر رہی ہے اور میرے دل میں آگ جل رہا ہے۔ سناٹا فضا کا اور میرے سینے میں قیامت کا شور برپا ہے اور اس قدر کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ کروڑوں ایٹم بم پھٹ رہے ہیں اور تمام گلی میں کتے بھونک رہے ہیں مجھ پر۔ میں حسین ہوں اور تمام کربلا ارض کربلا ہے۔

پھر بھی داد دیجیے میری ہمت جانی یا سادگی کی کہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر قہقہے لگاتا

ہوں۔ نفس اور آفاق کے اسرار پر غور کرتا ہوں اور قدرت کے دقیقے بھی سنتا ہوں۔
ہر چند زندگی تین حد موذی سمجھوں یہی مسائل، معاشقے اور معاش میں گھری ہوئی ہے۔ پھر بھی
خوش دلی سے باز نہیں آتا اور بہ پابوش قلندر کے نعرے لگاتا رہتا ہوں

خورشید سے "اکمل الناس" کا چاہے والا
جوشش جس کا دین دنیا دونوں میں کالا

۱۲۔۱۰۔۷۵۔ چوتھے تین بجے
از کمرستان اسلام آباد

اب رباعیات لکھنے کے بعد چار بج گئے

نیند کا پیمانہ پیا ہے تو نے — جھپکی سے پلکوں کو سیا ہے تو نے
دل ہی کے انگلیوں سے پیہم آنکھیں — آنچل نظروں کا بچھا دیا ہے تو نے

اللہ اللہ یہ کرشمے تیری — ہر آن یہ سسکیاں یہ آہیں تیری
اے رشک سمن کہیں نہ کٹ کر رہ جائیں — پلکوں کے جھپکے سے نگاہیں تیری

کھڑا ہے دھواں دھواں نظر خرقی گداز — اللہ اللہ یہ میری فکر ناز
میرے دل پر چلا رہی ہے بجلیاں — تیری یہ پلکوں سے کٹتی آواز

نیندیں کیا کیا دھواں بنائی ہم نے — آنکھوں کے الاؤ میں جلائی ہم نے
جھیلیں ہیں جوانی میں جوانیاں بھی کہ جب — آنچیں اوڑھیں نویں بچھائیں ہم نے

اللہ اللہ یہ آنچلوں کا غرور — رنگ رنگ ہے شرارہ حرمین و طور
اللہ اللہ ہے آگ ہے کہ میرے نزدیک — دفتر آتا ہے تلپٹ کو اسے جوش

جھکی جو ہوا باگ اٹھے ہنکارے — بجنے لگات نے کچھ نغمے
پھیلی گئی رنگینی سرہم طرب — بھیجے گئے پنکھیوں کے دعوت نامے

خود حسن جب آشفتہ نوا ہوتا ہے — آفاق میں اک حشر بپا ہوتا ہے
کانٹوں سے جو رخ میں وہ کیا جائیں — ڈس لیتا ہے جب پھول تو کیا ہوتا ہے

اس خط کے لفافے پر یہ پتہ تحریر ہے

خورشید علی خاں، اجمل الخیری
ط۔ بی۔ این۔ نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

اس خط کے جواب میں میں نے صرف اس لکھ کر خط بھیج دیا کہ

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یہ فرمایئے آپ کراچی کب تشریف لا رہے ہیں؟
باقی وقت ملاقات

آپ کا "اجمل الخیری"
خورشید کا مشیاناس
جمعرات ۲۲۔۱۰۔۶۵ء

جوش صاحب کی کراچی آمد

چھبیس کو جوش صاحب نے مجھے ٹیلی فون کیا "دبئی میں چھبیس کو ہوائی جہاز سے کراچی پہنچ رہا ہوں تم مجھے ایرپورٹ پر لینے آ جانا۔ اس دفعہ میں آپ ہی کے گھر پر قیام کروں گا"۔
چنانچہ میں اور سلامت علی خاں چھبیس کو ایرپورٹ سے جوش صاحب کو لے آئے اور ان کے گھر پہنچا دیا۔ اس دفعہ جوش صاحب کا کراچی میں قیام بہت کم مدت کے لیے

تھا۔ ان کے ملنے والوں میں ایک صاحب رطے میں ملازم تھے جوش صاحب نے، بھی رقم دے کر فرمایا کہ اسلام آباد کے لیے کوپے کی ایک سیٹ ان کے لیے ریزرو کروا دیں اور اگر یہ ریزرویشن ایک ہفتہ کے اندر ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ دوسرے دن سے جوش صاحب کی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تیسرے یا چوتھے دن جوش صاحب کی دعوت اقبال حمید زیدی صاحب کے گھر تھی۔ اقبال میاں خوبصورت اور بہت سیرت نوجوان ہیں کیمیڈا میں رہتے اور کاروبار کرتے ہیں۔ خود بھی شعر کہتے ہیں اور جوش صاحب کے پرستاروں میں سے ہیں۔ ان کے والد صاحب بھی شاعر ہیں اور پیشہ وکالت سے وابستہ ہیں۔ ان کا مکان جوش صاحب کے مکان کے قریب ہی لینڈس ڈاؤن میں ہے۔ جوش صاحب جب بھی کراچی آتے ہیں، اقبال میاں ان کی ضیافت پر تکلف دعوت ضرور کرتے ہیں۔ اقبال صاحب کے مکان پر محفل شعر و سخن جاری تھی میں، راغب صاحب اور سلامت علی خاں بھی موجود تھے۔ اتنے میں رطے والے صاحب آئے اور جوش صاحب کو ریل کا ٹکٹ دے کر کہا "جوش صاحب آپ کے لیے اگلے پیر کو کوپے ریزرو ہو گیا ہے"۔ جوش صاحب نے تو ان کا شکریہ ادا کر کے ٹکٹ رکھ دیا لیکن راغب صاحب نے فرمایا

راغب صاحب کی پیشین گوئی:

لحات پر اتوار چلے جائیں گے ؟ اوقات گھر بار چلے جائیں گے
رہ جائیں گے ہم لوگ یوں ہی معلوم کیا پیر کو سرکار چلے جائیں گے

اس وقت تو سب نے اس فی البدیہہ رباعی کی خوب داد دی مگر یہ بھی عجیب و غریب اتفاق ہے کہ اس واقعے کے تقریباً سولہ سال بعد جب جوش صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ بھی پیر کا دن تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راغب صاحب نے یہ رباعی اسی دن کے لیے کہی تھی۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس محفل میں انسانی فطرت کی پیچیدگیوں پر گفتگو چھڑ گئی سب نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا۔ آخر میں میں نے اپنے خیالات بیان کر دیے۔ جوش صاحب میرے خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا۔ خورشید علی خاں! خیالات کے اعتبار سے

ہیں گئے اور کسوارے حیات رکھتے ہیں"۔

راقم صاحب نے فوراً ایک رباعی کہہ دی۔

باقی نہیں آگ اور ہیں شرارے اب تک
آنکھوں کے کسی کی ہیں یہ تارے اب تک
اللہ رے جوش کی نظر میں راقم
خورشید علی خاں ہیں کسوارے اب تک

اس محفل میں جوش صاحب نے رباعیات سنائیں۔

جو دل کی ہے وہ بات کہیں ہوتی ہے
جو دن ہے وہ رات کہیں ہوتی ہے
ہستی ہے وہ طوفاں کہ اکثر اے جوش
اپنے سے ملاقات نہیں ہوتی ہے

اے سر اٹھا سر دخشاں ہو جا
اے مور ہمک اور سلیماں ہو جا
اس تنگ نا کے خوں سے اے حیواں
خود کو باہر نکال انساں ہو جا

فرصت پہ ہے لعل و گہر کا دھوکا
ہر جلوہ ہے اک رقص شرر کا دھوکا
جب سطح مشاہدے کی جل تو کھلا
آفاق تمام ہے نظر کا دھوکا

چلتا نہیں کچھ زور توانائی کا
حافظ ہے بس اللہ ہی بینائی کا
ہر برف کی سل میں برق ہے پرافشاں
ہر مادہ مرکب ہے توانائی کا

اے تن کی گلستاں دیکھے تو کوئی
ہر پل اک جلوہ آن دیکھے تو کوئی
سینے پہ شکم، دل دل کی حاملہ
چھوٹے چھوٹے بچان دیکھے تو کوئی

رات تقریباً دس گیارہ بجے یہ محفل برخاست ہوئی۔

دوسرے دن جوش صاحب کی ناشتے کی دعوت ان کے سمت مرحوم دوست سید عباس

صاحب یزدکیٹ کے گھر تھی۔ وہاں اور دوسرے شعرا کے علاوہ راجب صاحب، حکیم رشید ترابی اور حضرت بابا ذہین شاہ صاحب تاجی مدظلہ بھی مدعو تھے۔ بابا صاحب نے جوش صاحب کے متعلق فرمایا کہ ہم تو جوش صاحب کو اپنا پیر مانتے ہیں کیونکہ ان میں تمام صفات درکار ہیں۔ یہ بہت عظیم انسان ہیں۔ یہ کسی بادشاہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے مگر جستجوئے حق میں شک سے آگاہی سے دعوٰی کرتے ہیں۔ میں ان کے مقام بلند کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر یہ میری سمجھ سے بہت اونچے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ راجب صاحب نے کہا، بابا صاحب یہ فرما رہے ہیں کہ جوش صاحب۔

بے گلہ دستور شہنشاہی ہیں　　منزل پہ نظر جس کی ہو وہ راہی ہیں
کیوں حضرت جوش کو نہ ہم پیر کہیں　　اوصاف تو آپ میں بھی درکار ہیں

بابا صاحب نے فرمایا۔ راجب صاحب تو سوچتے بھی شعر ہی میں ہیں۔ اس محفل میں بابا صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا۔ ایک شعر یہ تھا۔

دورِ محبت کہ اہل سے ہے بے رنگ　　وہ مرکب یک لمحہ عمر گزراں تھا

اس کے بعد چوتھی دسمبر کو جوش صاحب اسلام آباد تشریف لے گئے۔

انسانی "ذات" اور "شخصیت"

اس کے بعد جوش صاحب دسمبر کے وسط میں کراچی تشریف لائے اور اپنے مکان پر قیام کیا اور کراچی کی رونقیں دوبارہ لوٹ آئیں اور پھر وہی شام کی دعوتیں۔ کبھی کہیں کبھی کہیں۔ شام کو احباب جوش صاحب کے مکان پر جمع ہو جاتے اور غروب تک علمی و ادبی گفتگو ہوتی اور غروب آفتاب کے بعد محفل رندانہ کا رنگ اور ہو جاتا۔

ایک دن میں اور راجب صاحب شام سے قبل جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ جوش صاحب بھی غسل ہمالی کے بعد تخت پر جلوہ افروز ہو چکے تھے۔ گفتگو کا رخ خود انسان "ذات" کی طرف مڑ گیا۔ راجب صاحب نے سوال کیا کہ انسانی "ذات" کی حقیقت کیا ہے؟ جوش صاحب نے فرمایا کہ ذات کے بجائے اگر آپ شخصیت کہیں تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ہر شے جس میں خود انسان بھی شامل ہے اس کائنات کے مختلف اجزا کے ایک خاص

مذہب میں ترغیب پانے کے نتیجے میں عالم وجود میں آتی ہے اور چونکہ یہ پوری کائنات تغیر پذیر ہے اس لیے انسانی وجود بھی ہر لمحہ تغیر کی زد میں ہے ہم جو کچھ ہیں وہ ہمارے اطراف کے عناصر، ہمارے جغرافیائی، معاشرتی تانے بانے اور ہماری میراث کے اثرات کا نتیجہ ہیں اور اسی جبر کے تابع ہماری شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ میں نے کہا، جوش صاحب آپ کی ایک رباعی کا بھی غالباً یہی مفہوم ہے

کہنے کو تو یک بات کہتا ہوں میں
پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زبان سے "میں" نکلتا ہے ندیم
اس پردے میں "کائنات" کہتا ہوں میں

راجب صاحب نے کہا کہ یہ ساری باتیں میری شخصیت کے تعلق سے تو درست ہو سکتی ہیں مگر خود میری ذات کا ادراک پھر بھی محال ہے اور اس کے بعد ایک رباعی کہہ دی

"میں" کون ہوں میں کیا ہوں کہاں جان سکا
اور "ظہیر" بھی اپنے کو نہ گردان سکا
چہرے پہ ہے اس قدر رد و سال کی گرد
ہے بھی خدوخال نہ پہچان سکا

۱۹۔۱۲۔۱۵

جوش صاحب نے کہا ہی ہاں انسان اتنا حیرت ناک اور پیچیدہ حیوان ہے کہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی طباع و ذہین کیوں نہ ہو ثبات عقل و فکر کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے کہ اسے اپنی ذات کی معرفت تام حاصل ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنی ذات سے چونکہ اتصالی قرب حاصل ہوتا ہے اس لیے یہ اتصالی قرب ہمارے واسطے اس بات کو بے حد دشوار بنا دیتے ہیں کہ ہم خود کو کچھ کی طرح سمجھ سکیں۔

ہے سب سے بڑا فاصلہ قرب کامل اپنی ظلمت سر میں جاناں کیونکر

لیکن یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک ہے ہماری "ذات" دوسری ہماری "شخصیت"۔ جہاں تک ذات کا تعلق ہے اس کا ادراک مشکل ہے لیکن جہاں تک شخصیت کا تعلق ہے

اس کا معروضی تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کام ہر باشعور انسان کو کرنا چاہیے۔ ہم کو چاہیے کہ اس بنیادی امر کے متعلق اپنے عادات، ماحول، مزاج اور جذبات سے تھوڑی دیر کے واسطے دست بردار ہو کر اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ہماری یہ تمام شخصیت اور ہماری شخصیت کے تمام مسلمات کی یہ سرجنک عمارت جس کی چھت کے نیچے ہم آج بھی فراغت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جسے اس کرۂ ارض کی تمام عمارتوں کے مقابلے میں ہم سب سے زیادہ پائیدار اور سب سے زیادہ خوبصورت سمجھ رہے ہیں دراصل مکمل ہے کہ موروثی ہے یا اس عمارت کو ہماری فکر نے تعمیر کیا ہے یا پھر یہ کسی حادثہ کی بنا پر ہمیں ترکہ میں ہی بنا بنائی مل گئی ہے اور اگر غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ شخصیت موروثی ترکہ ہے تو پھر ہمیں اپنی شخصیت کے خواص کو معلوم کر کے ان کو دور کرنے اور ان کی جگہ ستر کردار کو پانے کی قدرت بھی ہونا چاہیے۔ اسی کو ہم شعور کی پختگی کہتے ہیں اور یہیں سے کردار کی تخلیق اور تہذیب کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ دلچسپ گفتگو جاری تھی کہ قریب کی مسجد سے موذن نے صبح کے مرتب ہونے کا مژدہ جانفزا سنایا اور جوش صاحب نے جلدی جلدی گلاس بھرا اور "بیاد فلاں بنت فلاں" کے الفاظ کو جام میں انڈیل دیا۔ تھوڑی دیر میں دوسرے احباب بھی آ گئے اور محفل کا رنگ بدل گیا۔

عقیدہ پرستی:

اس کے بعد ۲۰ دسمبر کو میں صبح دس بجے جوش صاحب کے گھر گیا۔ وہ بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ آؤ آؤ۔ ابھی ابھی ایک رباعی ہوئی ہے تم کو سب سے پہلے سنا رہا ہوں۔ میں نے کہا ارشاد فرمائیے۔

اب تک گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ ہیں نادان — سن سن سن سن ہیں اب بھی اقوال کے بان
تک تک تک تک ہے مرشدوں کی تال — تھر تھر تھر تھر تھرک رہا ہے انسان

میں نے عرض کیا۔ سبحان اللہ۔ جوش صاحب اس وقت اردو ادب میں آپ سے بڑا قادر الکلام شاعر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس رباعی کے الفاظ کا صوتی تاثر ہی ان خیالات اور جذبات کا سچا آئینہ دار ہے جو آپ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی خوبی یہ ہے کہ حال لفظ

اپنی عقل و دانش کا اعلان کر دیتی ہے وہاں آپ اللہ کے صوتی اثر سے خیالات کے ابلاغ کا کام نہایت کامیابی سے انجام دینے پر قادر ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا بعض دفعہ صوتی اثرات فوراً اللہ سے زیادہ اثر آفرینی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جوش صاحب نے کہا چلو ذرا روش علی بھیم جی سے مل کر آتے ہیں چنانچہ ہم وہاں بھیم جی صاحب کے گھر چلے گئے۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر واپسی میں راجب صاحب کے دفتر میں ان سے ملنے چلے گئے۔ وہاں کچھ اور احباب بھی موجود تھے۔ ایک صاحب نے جوش صاحب سے سوال کیا کہ ہم بہ حیثیت قوم علم کے اعتبار سے مغربی ممالک کے مقابلے میں اس قدر پیچھے کیوں ہیں۔

جوش صاحب نے فرمایا کہ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری عقائد پرستی ہے۔ ہم ابھی تک حقائق حیات کو معروضی انداز میں دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک سازش کے تحت ہمارے عوام کو جدید تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے تاکہ مراعات یافتہ طبقات کے مفادات کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ میں نے کہا جوش صاحب آج سے چند یوم پیشتر میں نے عقائد کے متعلق چند نکات نوٹ کیے ہیں۔ اب کے آئیں گا تو آپ کو ضرور سنائوں گا۔ جوش صاحب نے فرمایا ضرور سنائیے گا۔ چنانچہ دوسرے دن جب میں جوش صاحب کے گھر گیا تو اپنی وہ تحریر بھی ساتھ لیتا گیا۔ آپ بھی سن لیجیے

ہر عقیدہ ایک ایسی بھول بھلیاں ہے جو مسافر راہ حقیقت کو بے دام فریب میں مبتلا کر کے ہمیشہ کے لیے گم کردہ راہ کر دیتی ہے۔ اس کی نظر میں حقائق مسخ ہو جاتے ہیں۔ تلبیس کا پردہ سمی بدل دیتی ہے۔

۲۔ معتقد کی آنکھوں پر ایسی عینک چڑھ جاتی ہے جس سے حقائق کبھی اپنا اصلی رنگ نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے ہمیشہ دہرہ رہ حقیقت کو چاہیے کہ وہ تمام عقائد کے بندھنوں سے آزاد رہے۔ جو جس قدر زیادہ کھلا ذہن رکھے گا وہ اسی قدر آسانی اور سرعت کے ساتھ علم کی دشوار گزار گھاٹیوں پر صحیح سمت میں گامزن ہو سکے گا۔ مشرق کا المیہ یہ ہے کہ یہاں بڑے بڑے دیو بھی عقائد کی مادر عقائد میں اپنا دامن الجھائے بغیر نہ گزر سکے۔ جوش صاحب نے یہ سن کر کہا "ہائے ہائے مدتوں سے اس بدبختی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے"۔

۳۔ عقیدہ دوسروں کے ذہن کی امانت ہے۔

۲۔ عقیدہ ذہنی افلاس ہے۔ عقیدہ اضمحلال شوق ہے۔ سفر عشق میں ذوق راحت طلبی ہے۔

۵۔ عقیدہ کاسہ دریوزہ گری ہے۔

۶۔ عقیدہ توہین عزم و ہمت ہے۔ فکر کا جمود ہے۔ ارتقا اور تغیر کا دشمن ہے۔

۷۔ عقیدہ ایسی شراب ہے جو فکر کے تمام اعصاب کو مخمور کر دیتی ہے۔

۸۔ عقیدہ عقل کے شہ پر نوچ لیتا ہے۔

۹۔ عقیدہ دوسروں کی بغل پر رقص کرنے کا نام ہے۔

۱۰۔ عقیدہ تحقیق کے ہاتھوں کی ہتھکڑی ہے۔

۱۱۔ عقیدہ وہ زہر ہے جو پیدائش کے بعد سے ماں باپ اور ماحول پھر اولاد کے خون میں گھولتے رہتے ہیں۔

۱۲۔ عقیدہ نوع انسانی کو مختلف متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

۱۳۔ عقیدہ شہادتوں کو جھٹلانے کا نام ہے۔

۱۴۔ عقیدہ آزادی ذہن کے پیر کی بیڑی ہے۔

جوش صاحب نے سست صورت سے سنا اور پھر فرمایا۔ بالکل سچ کہتے ہو۔

مرے نزدیک تو عقل و عقائد کی ہم آغوشی
نکاح بے قبول و عقد بے اسباب ہے ساقی

اتنے میں سلامت علی صاحب آ گئے۔ انھوں نے کہا جوش صاحب پہلی جنوری ۷۰ء کو میرے گھر پر آپ کے ناشتے کی دعوت ہے۔ آپ سب احباب ضرور تشریف لائیں۔ تھوڑی دیر میں حالیہ امام بھی آ گئیں۔ انھوں نے یکم جنوری کی شام کی دعوت کا اعلان کر دیا۔ جوش صاحب کسی کو مایوس نہ کر سکے۔

۲۰ دسمبر کو جوش صاحب حبیب پبلک اسکول میں ایک تقریب میں مہمان خصوصی تھے میں ان کو لے کر ساڑھے تین بجے وہاں پہنچ گیا۔ وہاں جوش صاحب نے بچوں سے خطاب کیا اور علم کی اہمیت اور وقت کی قدر پر تقریر کی۔ شام کو گھر آ گئے۔

دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ عباس مرزا صاحب کے گھر جو کے ڈی اے میں آفیسر تھے جانا چاہتے ہیں چنانچہ ہم دونوں دس بجے صبح ان کے گھر ناظم آباد

پہنچے۔ وہاں ڈاکٹر حسن قادری جو کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے مل گئے۔ جوش صاحب نے ڈاکٹر صاحب کا مجھ سے تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ یہ اپنے نام کے ساتھ قادری لگاتے ہیں مگر ہیں شیعہ۔ پھر جوش صاحب نے ڈاکٹر صاحب ہی سے دریافت کیا کہ آپ اپنے نام کے ساتھ قادری کیوں لگاتے ہو؟ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مخصوص شیعوں کا محلہ تھا جس میں تمام کے تمام قادری رہتے تھے مگر وہ شیعہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے شیعہ ہونے کے باوجود قادری کا لاحقہ ترک نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت عالم اور اچھے مفکر تھے۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

۱۹۷۶ء کے واقعات

سلیم سلامت:

یکم جنوری ۱۹۷۶ء کو میں اور راغب صاحب صبح آٹھ بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ اور ان کو لے کر سلامت علی خاں کے مکان گئے۔ وہاں خاں صاحب اور ان کی بیگم نے چند احباب کو بھی مدعو کر رکھا تھا اور ناشتے کا بہت پرتکلف اہتمام کیا تھا۔

تقریباً ساڑھے دس بجے ناشتہ ہوا۔ اس میں کھیریں بھی ہوئی۔ کباب، پراٹھے، حلوہ، پوریاں، کلیجی گردے تلے ہوئے سب نے خوب سیر ہو کر ناشتہ کیا مگر راغب صاحب نے دعا کے واسطے تاخیر سے طعام ملنے پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کر دیا۔

یہ تو بچا ہے بدیر کھانے ہم نے — یا یہ ہو کے سیر کھانے ہم نے
اللہ سلامت کو سلامت رکھے — حلوہ پوری بنیر کھانے ہم نے

جوش صاحب نے میرے مصرع میں ترمیم کی "اللہ سلیم کو سلامت رکھے"۔ سب نے اس ترمیم کی داد دی۔ سلامت علی خاں نے اپنی بیگم کے متعلق فرمایا کہ یہ شعر بھی کہتی ہیں۔ جوش صاحب نے سنانے کی فرمائش کی۔ سلیم بھائی نے شرماتے ہوئے کہا شروع شروع میں شعر کہنے کی کوشش کی تھی مگر اب تو بری ہو گئے۔ طبیعت موزوں نہیں ہوتی ہے۔ سب نے اصرار کیا کہ ابتدائی دنوں کا ہی کلام سنائیں۔

بھائی نے کہا ایک غزل شادی کے فوراً بعد کہی تھی اس کے دو شعر یاد ہیں۔

مبارک مبارک یا دور ہستی نظارا آفریں ہو شیخ ہمارا
شباب آگیا ہے رباب آگیا ہے ہو مدہوش ساقی ہے یہ بھی گوارا

چنانچہ کردہ شعر کہے گئیں ان کے آگے یاد نہیں ہے۔

راغب صاحب نے کہا۔

سلیر تو کہتی رہیں شعر راغب سماعت علی خاں نے کیا تیر ہارا

جوش صاحب نے ارشاد فرمایا۔

بڑی خاکساری سے بیٹھا ہوا ہے سلیر کے آگے سماعت بچارا

اس کے بعد جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش ہوئی۔ جوش صاحب نے چند اشعار اور چند رباعیات سنائیں۔

یارب ادھر وہ نازش دوراں کب آئے گا
رحل نگاہ شوق پہ قرآں کب آئے گا

رنگین تمناؤں کی جھلک دیکھی طاعت کی سسکتی ہوئی چھلک دیکھی
کھولا جو در ضمیر عاصیان خدا چھم چھم کرتی جنت کی نہر دیکھی

اور ان گفتگو شراب کے متعلق جوش صاحب نے کہا

"یہ تو ہمارے مقام آسمانی کے خلاف ایک دعا ایجاد کی ہے"۔

غرض ان باتوں اور شاعری میں ایک بج گیا اور محفل برخاست ہو گئی۔

اسی دن شام کو ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر جوش صاحب اور ہم سب احباب کی دعوت تھی۔ عالیہ ہمیشہ جوش صاحب کی دعوت کا سمت حاصل اہتمام کرتی ہیں۔ ان کو عام طور پر علم دوست علم سے تو لگاؤ ہے ہی مگر جوش صاحب سے ان کے بزرگوں سے بہت قریبی تعلقات چلے آرہے ہیں۔ ان کے والد سید محمد عسکری صاحب جو بھوپال میں ایک کامیاب ایڈوکیٹ تھے۔ جوش صاحب کے جوانی کے دوستوں میں سے تھے۔ عالیہ کے بڑے بھائی سید محمد مہدی ترقی پسند مصنفین کے قافلہ سالاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بچپن میں جوش صاحب کے حلقۂ ارادت کے سربرآوردہ نوجوانوں میں تھے اور کراچی میں ڈاکٹر عالیہ امام اس خاندانی

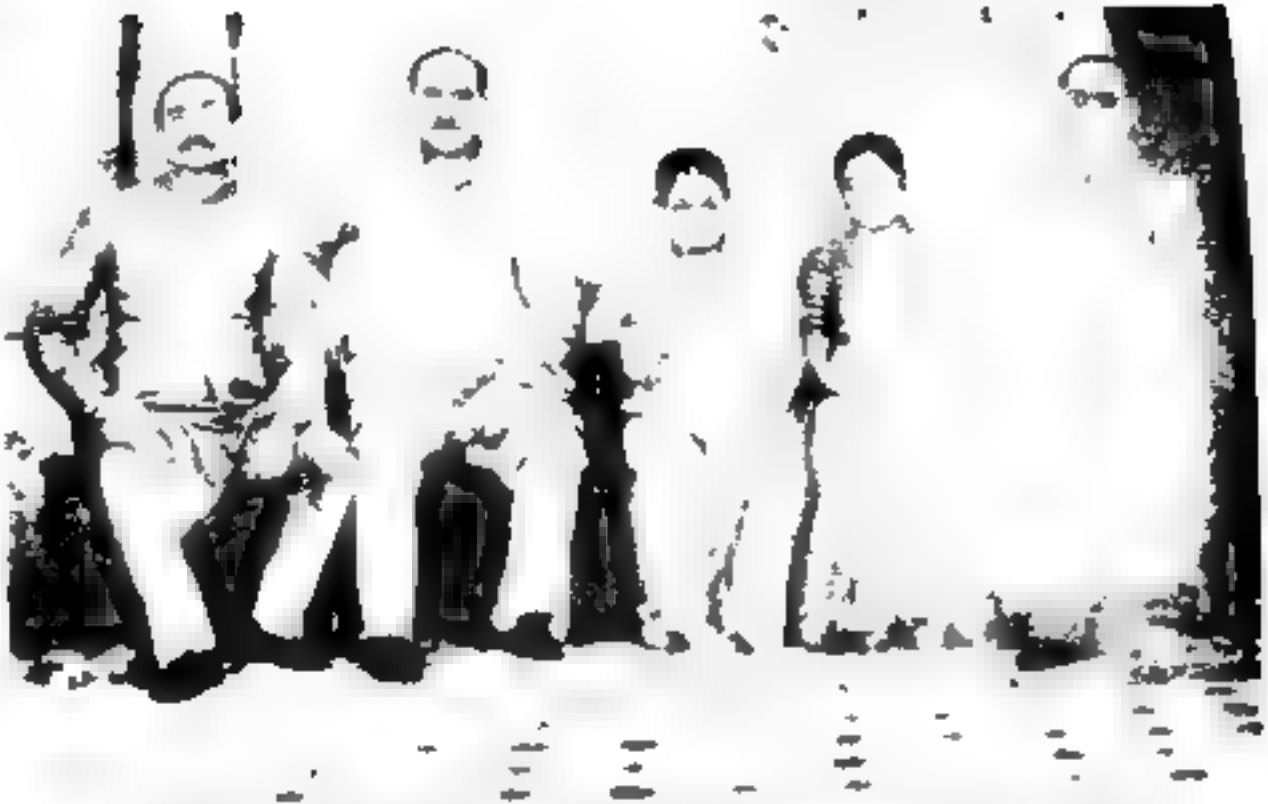

آغا ساحل (مزاح باش)، بیگم بیلی (قزلباش)، شہزادہ جہاں بیگم خوش، خوش ملیح آبادی، رئیس احمد خاں (برادر خوش)

رعایت کی حمایت و رواداری بشرط استطاعت کے ساتھ ادا ہیں۔

چنانچہ اس دفعہ انھوں نے پر تکلف دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اوت کام و دہن کے ساتھ روحانی گوش کا بھی بندوبست تھا۔ خود حالیہ بہت اچھا گاتی ہیں اور ان کی بڑی بہن کی بیٹی نہایت ہی اچھا گاتی ہیں۔ جوش صاحب اس محفل میں بہت خوش رہتے ہیں۔ لطیفے بھی خوب سناتے ہیں اور کلام بھی۔ یہ انجمن صبح دو بجے نصف شب کو پہنچ کر اختتام پذیر ہوئی۔

بیگم جوش کا انتقال:

دوسری جنوری ۱۹۸۰ء کو جوشش صاحب تیز گام سے اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ ان کی روانگی کے ایک ہی ہفتہ کے اندر جمعہ کے دن ۹ جنوری ۱۹۸۰ء کو ایک انتہائی خوفناک المیہ پیش ہو گیا۔ رات تقریباً ساڑھے آٹھ بجے جوشش صاحب کے گھر اسلام آباد سے میرے پاس ٹیلی فون آیا اس کی پوتی بول رہی تھیں۔ جوش صاحب کی بیگم شرف جہاں آگ سے جل کر نکل کر گئیں۔ بچی نے بتایا کہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد نانی، بچے اپنی دادی کو نانی کے تھے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں اور کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ چونکہ سردی زیادہ تھی انہوں نے ہیٹر جلا کر پردوں کے قریب رکھ لیا اور لحاف اوڑھ کر سو گئیں۔ نیند کی حالت میں لحاف کا ہیٹر پر گر گیا اور آگ پکڑ لی۔ وہ بیچاری بدقسمتی پان تو پہلے ہی سے تھیں۔ دھوئیں کے اثر سے بے ہوش ہو گئیں اور لحاف کے شعلوں میں جل کر راکھ ہو گئیں۔ جب پوتا پوتی نے ان کے کمرے سے دھواں نکلتے دیکھا تو دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ چونکہ اندر سے بند تھا اس لیے انھوں نے فوراً فائر بریگیڈ کو ٹیلی فون کیا مگر اس کے آنے تک سب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ جوشش صاحب کا صدمہ سے برا حال تھا۔ میں نے ٹیلی فون پر ان سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ میں ان کی رندھی ہوئی آواز کے علاوہ اور کچھ نہ سن سکا۔

بیگم جوش۔ تمام عمر جوش صاحب کے معاشقوں کے سبب رقابت کی آگ میں جلتی رہیں اور آخر اس زندگی سے نجات بھی پائی تو آگ ہی کے توسط سے۔ اپنے افسوس کے لیے جوش صاحب کو پڑھنے کا خط لکھا۔ پہلے کسی خط لکھ کر چاک کیے۔ اظہار جذبات کے

لیے مناسب الفاظ دیے تھے۔ اتنی ہمت تھی کہ ان کو صبر کی تلقین کر سکوں۔ صرف اتنا لکھ سکا کہ۔ جوش صاحب اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر غم اعزازی ہوتا ہے مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ کاش آپ یہاں ہوتے تو ہم سب آپ کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض غم ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کے ساتھ رہتے ہیں اور صرف وقت ہی ان کی دھار کو کند کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اکثر ٹیلی فون پر جوش صاحب سے بات ہوتی رہتی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ چند ہفتوں ہی میں انھوں نے بڑی حد تک اس غم پر قابو پا لیا پھر تیسری مارچ کو جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ وہ پاکپتن کو کراچی پکار رہے ہیں اور میں ان کو لینے کے لیے ایئرپورٹ ضرور آؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا

پاکپتن مارچ ۱۹۷۱ء بروز جمعہ حسب وعدہ جوش صاحب اسلام آباد سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی تشریف لائے۔ میں ان کو لینے کے لیے ایئرپورٹ گیا تھا۔ وہاں مرزا عالمگیر قدر اور ان کے ساتھ ایک صاحب محمود نامی بھی جوشی صاحب کے استقبال کے لیے موجود تھے واپسی میں وہ بھی جوش صاحب کے ساتھ میری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راستے میں جوشی صاحب نے دریافت کیا کہ نامی تو ہندو نام معلوم ہوتا ہے تو مرزا صاحب نے فرمایا کہ ان کے آباؤ اجداد ہندو ہی تھے مگر جب یہ مسلمان ہو گئے تب بھی اپنی قومی شناخت کو باقی رکھنے کے لیے اپنے مسلمان ناموں کے ساتھ نامی کا لاحقہ قائم رکھا۔ گھر پہنچنے کے بعد مرزا صاحب نے کہا نامی ایک مجلس مرثیہ منعقد کرنا چاہتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ جوشی صاحب اس مجلس میں کوئی مرثیہ پڑھیں۔ جوشی صاحب نے فرمایا مرزا تم کہتے ہو تو میں شریک ہو جاؤں گا اور جو مرثیہ تم کہو گے وہ پڑھ بھی دوں گا مگر تم خوب جانتے ہو کہ میں نے یہ مرثیے اس لیے نہیں کہے ہیں کہ لوگ صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے انھیں مجلس مرثیہ میں پڑھوائیں۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ قبلہ جوش صاحب آپ اس بات پر بھی تو غور فرمائیے کہ آخر میں کیوں آپ سے ان محفلوں میں مرثیے سنانے کی فرمائش کرتا ہوں۔ ارے میاں یہی تو وہ مقامات ہیں جہاں تمھارے انقلابی پیغام کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ان مجالس میں

تھی، یہ عقیدت مند سامعین مل جاتے ہیں جو کم از کم ثواب کما کر ہی تمہاری بات غور سے سنتے تو ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا پیغام ضرور ایک دن اپنا اثر دکھائے گا اور یہاں سے ذہنوں پر جمی ہوئی برف آج نہیں تو کل ضرور پگھلے گی اور جتنی تمہارے پیچھے تو وہ پاک ہیں جو تم جیسے بلند گروں کی کارگاہیں ہونا چاہیں

جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا مرزا تم سے بحث میں کون جیت سکتا ہے۔ بہرحال جس دن تم چاہو مجھے آ کر لے جاؤ میں چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے فرمایا اچھا اب مجھے اجازت دو۔ یہ کہہ کر وہ اور تاجیانی صاحب رخصت ہو گئے اور میں بھی تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھر آ گیا۔

اس کے تیسرے دن جوش صاحب صبح ۹ بجے اپنے ایک عزیز فاروق احمد خان صاحب کے ساتھ میرے گھر تشریف لائے اور فرمایا آؤ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ راستے میں فاروق احمد خان صاحب نے اپنا تعارف کرانا شروع کیا۔ میں جوش صاحب کا حنفی المذہب عزیز ہوں۔

میں نے کہا وہ تو آپ کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ مذہب کی تشریح میرے خیال میں ضروری نہیں تھی۔ خان صاحب نے فرمایا ارے صاحب آپ کو شاید نہیں معلوم جوش صاحب بھی پی دو حیال کی طرف سے کٹر سنی ہیں۔ میں نے کہا یہاں بھی آپ نے کٹر کی صفت زائد استعمال فرمائی ہے۔ جوش صاحب جو کچھ ہیں وہ میں بھی جانتا ہوں۔ اس وقت تو آپ صرف اپنے کاروبار کے تعلق سے فرمائیے کہ آپ کا کیا شغل ہے۔

فرمایا میری موٹر کے پرزوں کی ایک دوکان پلازہ سینما کے قریب بندر روڈ پر واقع ہے جوش صاحب نے فرمایا ان کی کچھ رشتے اور بالغات بھی ہیں سندھ میں جہاں سے ان کے گھر صابن عمدہ آم آتے ہیں اور یہ گنے کی رس کی کھیر بھی بہت لذیذ کھلاتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا فاروق صاحب دلچسپ آدمی ہیں۔ ہم لوگ پہلے عبدالخالق صاحب مکھنے والے کی دوکان واقع بولٹن مارکیٹ گئے وہاں کچھ دیر بیٹھ کر پھر ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر پہنچے جو کینٹ اسٹیشن کے عقب میں واقع تھا۔ وہاں ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا بعد جوش صاحب نے وہیں آرام کیا۔ عالیہ کے گھر سے ہم لوگ شام پانچ بجے لوٹے۔ جوش صاحب

کو ان کے گھر اور مجھے میرے گھر پہنچا کر فاروق جان صاحب اپنے گھر چلے گئے۔ چلتے وقت جوش صاحب نے فرمایا کہ کل بابا ذہین شاہ صاحب کے گھر جانا ہے، صبح نو بجے تک آجائیے چنانچہ میں دوسرے دن صبح نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر میں فاروق جان صاحب بھی آگئے اور ہم لوگ بابا صاحب کے گھر چلے گئے۔ بابا صاحب بہت خوش ہوئے اور بہت محبت سے جوش صاحب کو بے تریب صوفے پر بٹھایا۔ بیگم جوش کے انتقال کے بعد یہ بابا صاحب کی جوش صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ اس لیے پہلے تو انھوں نے افسوس کا اظہار کیا پھر فرمایا کہ ایک دور میں بیٹھا ہوا اس معاملے کے متعلق افسوس کر رہا تھا تو دفعتاً ایک خیال ذہن میں آیا جو میں عرض کیا تو وہ بلیغ شکل گئی۔

رفع عین عذاب کردہ بگفت وقنا ربنا عذاب النار

جوش صاحب واپس ہوئے تو بابا صاحب نے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔ پہلے تو انھوں نے چند اشعار سنائے۔ پھر ادھر ادھر کی گفتگو ہوتے رہی۔ دوران گفتگو کسی صاحب نے فاروق صاحب سے دریافت کر لیا کہ سندھ میں ان کے کتنے باغات ہیں۔ انھوں نے فرمایا صرف ایک آم کا باغ ہے۔

میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ کیا باغ کی جمع باغات درست ہے۔ جوش صاحب نے فرمایا باغات اور مکانات غلط العام ہیں جو جائز ہے۔ زبان میں دو قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایک کو ہم غلط العوام کہتے ہیں یعنی وہ غلطیاں جو غیر تعلیم یافتہ اور جاہل طبقے سے سرزد ہوتی ہیں ان کو ہم جائز نہیں سمجھتے۔ اس کے برعکس اگر ہر شخص جس میں تعلیم یافتہ طبقہ بھی شریک ہے کوئی غلطی کرے تو وہ غلط العام کہلائے گی جو جائز ہے۔ باغات اور مکانات بھی غلط العام ہیں جو جائز ہیں۔

احدیت۔ واحدیت اور محمدؐ

بابا صاحب نے فرمایا کہ عوام اپنی کم علمی کی وجہ سے لغت کو محدود کر دیتے ہیں۔ مثلاً آل محمدؐ کے معنی صرف محمد صلعم کی اولاد کے لیے جاتے ہیں حالانکہ آل کے معنی میں رفقاء بھی بعد میں آنے والے سب ہیں۔ اس اعتبار سے تمام مسلمان آل محمدؐ ہیں۔ اس کے علاوہ ایک

اور دلچسپ بات آپ کو بتلاؤں کہ یہ تمام کائنات بھی چونکہ تخلیق کے اعتبار سے قابل تعریف ہے اس لیے محمد ہے اس اجمال کی شرح یہ ہے۔ کائنات جمع ہے کائنہ کی اور کائنہ کے معنی ہیں چیز کا وجود میں آنا ہے جس کا پہلے سے کوئی نمونہ موجود نہ ہو۔ یہ خالق کے ارادے کے مطابق تخلیق پاتی اور ہر لمحہ نئے سے نئے پیکر میں ڈھلتی رہتی ہے۔ دراصل یہ تمام کائنات ذات مطلق کی صفاتی جلوہ گری ہے۔ مقام "احدیت" میں ذات مطلق بلا صفات ہوتی ہے یعنی ہر قسم کی صفت سے مبرا۔ احد کے معنی ہی ذات بلا صفات کے ہیں۔ انسان کے لیے اس خود ذات بلا صفات کا ادراک محال ہے۔ لیکن جب ذات احدیت مادی صفات سے متصف ہو جاتی ہے تو وہ "واحدیت" میں تبدیل ہو جاتی ہے یعنی ذات اور صفات واحد ہو جاتے ہیں اس مقام پر وہ قابل ادراک ہو جاتی ہے اور تمام عالم بن جاتی ہے اور چونکہ یہ کل عالم مظہر ذات احدیت ہے اس لیے قابل تعریف ہے یعنی محمد ہے۔ میں نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا جیسے غالب کہتا ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینے باد صبا کی

باباصاحب نے فرمایا۔ جی ہاں اور یہی چمن قابل تعریف بھی ہے یعنی محمد ہے اور مسلمانوں کے عقائد کی رو سے تمام عالم کی صفات سمٹ کر جس ایک انسانی ذات کے پیکر میں جمع ہو گئی ہیں وہ حضرت محمد صلعم کی ذات اقدس و اعلیٰ ہے۔ اس طرح ذات محمدی جامع صفات عالم ہے۔ ایسی جامع صفات شخصیت ہمیں اور کوئی دوسری دکھائی نہیں دیتی۔ جیسے ایک آم کی گٹھلی میں تمام درخت اور آموں کی صفات پوشیدہ ہوتی ہیں اسی طرح اگر تمام قابل تعریف صفات کسی ایک انسانی ذات میں جمع ہو سکتی ہیں تو وہ حضرت محمد صلعم کی ذات مبارک ہوگی۔

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مقام احدیت میں ذات مطلق ناقابل ادراک ہے لیکن جب احدیت صفات سے متصف ہو جائے تو وہ واحد بن جاتی ہے اور یہیں سے قابل ادراک بھی ہو جاتی ہے اور قابل تعریف بھی یعنی محمد بھی اور چونکہ تمام مسلمانوں کو اپنے کردار اور اعمال کی رو سے قابل تعریف شخصیت یعنی محمدؐ کی پیروی کر کے خود کو بھی قابل تعریف شخصیت کا

حال بنا، چاہیے اس لیے تمام مسلمان آل محمدؐ ہیں۔

غرض سب دیر تک بابا صاحب کی یہ حکایت دلچسپ گفتگو ہوتی رہی اور جب یک بج گیا تو بابا صاحب نے ہم لوگوں کو کھانے کے لیے مجبور کرنا شروع کر دیا مگر دوران گفتگو بے کل مٹھائیاں اور چائے پی چکے تھے کہ اب کوئی گنجائش مزید کھانے کی نہیں رہی تھی اس لیے ہم سب نے معذرت کر لی اور گھر آ گئے

شام کو تمام احباب جوش صاحب کے مکان پر جمع ہو گئے۔ راجب صاحب بھی اپنے ساتھ ایک سوالنامہ لے آئے۔

راجب صاحب کا ایک سوال یہ تھا کہ "گزشتہ دو ماہ کی مدت میں آپ ذہنی طور پر بے حد پریشان رہے کیا اس پریشانی میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔ جوش صاحب نے جواب دیا کہ اب کچھ کمی کی بند ہوئی ہے۔

راجب صاحب نے سوال کیا کہ "آپ کثرت کہا کرتے ہیں کہ میں غم کو زیادہ دیر تک دل میں قیام کی اجازت نہیں دیتا لیکن رفیقۂ حیات کی رحلت کا غم کئی ماہ گزر جانے کے بعد بھی تازہ ہے۔ جوش صاحب نے فرمایا "میں نے سپر ڈال دی ہے جب بھی ذرا تنہا ہوتا ہوں یہ غم تازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد راجب صاحب نے تھوڑا ایک ادبی سوال کر دیا اور موضوع بدل گیا تھوڑی دیر میں آفتاب غروب اور سے حاضر طلوع ہو گیا اور شاعری و ادب نے ماحول کا رنگ بدل دیا۔ چار بجے کے بعد جب جوشؔ صاحب کھانے سے فارغ ہو گئے تو دریافت کیا کہ کیا وقت ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا "آٹھ بجے ہیں باقی ہیں"۔ جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "پھر بھی تھے جیسے باقی ہیں"؟ اس کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔

دوسرے دن تقریباً دس بجے صبح جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا انھوں نے فرمایا کہ "راجب صاحب کے دفتر میں ہیں میں وہیں پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں راجب صاحب کے علاوہ فراست رضوی فاروق جاں اور نسیم صاحب ان محکمے کے ڈپٹی ڈائریکٹر بھی موجود تھے۔ نسیم صاحب ترقی پسند فکر رکھتے ہیں سخن فہم بھی ہیں اور شعر بھی اچھا کہتے ہیں۔ جوشؔ صاحب کے مداح ہیں۔ میں جب پہنچا تو زبان پر گفتگو ہو رہی تھی

جوشش صاحب فرماتے تھے "یہاں کے بعد وہ پر" میں گئے گا۔ یہاں پر یا وہاں پر کہنا غلط ہے۔ زیادتی کی دال نہیں بھول جائے گی ریاتی کہیں گے۔ Little bits کا ترجمہ چھوٹے کریں گے Dead slow کے لیے سر تھنگی چال بولیں گے۔ غرض ادھر ادھر کی باتوں میں ایک گھنٹہ گزر گیا تو جوش صاحب نے کہا چلو بل پارک چلتے ہیں۔ چنانچہ میں فاروق خاں صاحب اور جوش صاحب حمدی صاحب کے ہوٹل بلوسمن جو بل پارک پر ہے پہنچے۔ وہاں خاں صاحب نے ایک کمرے میں ہم لوگوں کے بیٹھنے کا سب اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تو چکن تکہ، نان، سلاد اور رہی پیش کی گئی۔ اس کے بعد کافی پلائی گئی۔ جوشش صاحب دوپہر میں وہاں سو گئے۔ تین بجے بیدار ہو کر ہمارے گھر آ گئے۔ وہاں جوش صاحب نے غسل ثانی فرمایا پھر چائے پینے کے بعد ہم لوگ سلامت علی خاں صاحب کے گھر گئے اور ان کو ساتھ لے کر غروب سے کچھ دیر پہلے جوش صاحب کے مکان پر پہنچے۔ وہاں سے ہی تقریباً سات بجے شام گھر لوٹا۔

منور عباس صاحب کے گھر دعوت:

دوسرے دن جوشش صاحب کی دعوت ان کے دوست منور عباس صاحب کے گھر تھی۔ میں صبح ساڑھے نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں سلامت علی خاں بھی آ گئے۔ جوشش صاحب نے فرمایا کہ ابھی منور عباس کے گھر کوئی نہیں آیا ہوگا اس لیے ساڑھے دس بجے تک چلیں گے۔ چنانچہ ہم لوگ ساڑھے دس بجے ان کے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو راغب صاحب اور بابا ذہین شاہ صاحب تاباں پہلے سے موجود تھے۔ ان کے علاوہ اور سب سے احباب موجود تھے۔ جوش صاحب کے پہنچنے کے بعد شعر و شاعری شروع ہو گئی۔ جناب راغب صاحب نے اسد شاہ جہاں پوری مرحوم کی غزل سنائی۔ ایک شعر یہ تھا:

ترک دنیا کی کئی بار قسم کھائی ہے — پھر یہ سوچا کہ تری انجمن آرائی ہے

کسی صاحب کی غزل کا ایک شعر یہ بھی تھا:

خیال ترک محبت تو کیا ہے بارہا آیا — مجال ترک محبت نہ ایک بار ہوئی

شاہد نقوی صاحب نے رباعی سنائی:

عالم کے لیے مد شریعت کیا ہے
عاقل ہے تو قانون کی حاجت کیا ہے
ناداں ہے تو مذہب کا اسے ہوش ہی کیا
دانا ہے تو مذہب کی ضرورت کیا ہے

راجب صاحب اور بابا صاحب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ آخر میں جوش صاحب نے رباعیات سنائیں۔

ہم آگ میں کھیلے ہیں خیالات کی تلاؤ — بلبلوں کی تہہ سے کھینچتے ہیں سجاؤ
ہم سرخ برق میں اگاتے ہیں چمن — ہم قطرۂ شبنم کو بناتے ہیں الاؤ

بڑھتے ہوئے تو حملے سے ڈرتا ہوں میں — بے وقت تو دو لے سے ڈرتا ہوں میں
پیدا ہوتے ہی خود گلے سے خنجر — خنجر سے نہیں گلے سے ڈرتا ہوں میں

رباعیات کے بعد جوش صاحب نے مسدس "عظمت انسانی" سنایا۔ اس کے آخری بند پر پہنچے کے تھے چنانچہ تھوڑی دیر میں یہ نشست کمیٹی محفل بزم ماتم بن گئی تو میں اور سلامت علی خاں اپنے گھر چلے آئے۔ جوش صاحب کو بعد میں کسی نے گھر پہنچایا۔ شام کو جب میں اور سلامت علی خاں جوش صاحب کے گھر گئے تو انھوں نے کہا۔ ارے تم دونوں مردود کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں نے کہا جوشش صاحب ہم تو خوشی کے ساتھی ہیں۔ غم سے دور رہتے ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں، جی ہاں سچا ہے جس نے معاویہ کا نمک کھایا اس نے دوستوں پر ظلم ڈھایا۔

حق و باطل کے استعارے کربلا اور قرآن کی روشنی میں:

میں نے کہا حضور والا آپ جیسا عظیم مفکر اور انسانی عظمت کا علمبردار جب یک بیک سانس میں دو متضاد جذبات کا اظہار کرے اور عقیدت مندوں کی محفل میں اجتماع ضدین پر داد و تحسین کے ڈونگرے سمیٹ کر دامن میں کوئی خلش محسوس نہ کرے تو ہم جیسے آپ کی

حقیقت نگر کے شیدائی آپ کے حقیقت کی اس کرشمہ سازی پر اپنا گریبان چاک کر کے گھر نہ جاتے تو وہاں آپ کے حقیقت مندوں کی نفرت انگیز نگاہوں کا نشانہ بنے بیٹھے رہتے؟ ایک طرف تو آپ فرماتے ہیں۔

روح دہر میں گلزار جناں ہے انساں — خلد و لف و لم آب رواں ہے انساں
جنبش نبض مکاں روح رواں ہے انساں — خاک ہے تاج محل شاہ جہاں ہے انساں

حاکم کون و مکاں عالم دوراں انساں
عالم اک رحل مبک سیر ہے قرآں انساں

اور اس کے ساتھ ساتھ جب انسانیت کی یہ لافانی تلقین بھی فرماتے ہیں:

بات تو جب ہے کسی فرد سے وحشت نہ رہے — دوست تو دوست ہے دشمن سے بھی نفرت نہ رہے
دل میں یوں صاف کہ امکان کدورت نہ رہے — عقل کی ہے یہ لیاقت کہ عداوت نہ رہے

شہر وحدت میں ہیرو حرم و دیر نہیں
صحبت نگر اگر ہے تو کوئی غیر نہیں

اور جب انسانی کے جذبات عروج پا کر یہاں تک پہنچ جاتے ہیں کہ:

کفر بھی راہ محبت میں ہے عین اسلام — عنصر بغض ہو دل میں تو عبادت بھی حرام
جو کسی قلب پہ جڑتا ہے نگین اکرم — کندہ ہوتا ہے وہ عرش پہ اس شخص کا نام

جب کوئی غیر کو پیغام اماں دیتا ہے
انتہ کے ہر ذرہ آفاق اذاں دیتا ہے

انسان کو یہ حیثیت انسان اس مقام الوہیت پر فائز فرمانے کے بعد جب آپ معرکہ حق و باطل کی مثال بیان فرماتے ہیں تو آپ کے ذہن میں نہ ہلاکو اور چنگیز کی بربریت آتی ہے جنہوں نے انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کروا دیے تھے اور نہ نیرو کی سفاکی جس نے ایک ہنستے کھیلتے شہر کو آگ کے شعلوں کے حوالے کر کے بانسری سے موسیقی کی دھنیں تخلیق کیں اور نہ ہٹلر و مسولینی کی جیوٹیت جس نے تمام دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک کر کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا بلکہ آپ حق و باطل کی علامتوں کے طور پر تاریخ اسلام کے ایک انتہائی بدنما طرح سیکے کو پیش فرماتے ہیں جس نے اسلام کو وہ ایسے منکر گروہوں

میں تقسیم کر دیا کہ قیامت تک اب وہ متحد ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور جب آپ اسی اختلافی مسئلہ کی طرف اشارہ فرما کر ایک فرقے کو تلوار اٹھانے کی تلقین فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

کربلا آج بھی ہے ایک لکارتا پکار ہے کوئی یزدی ابن علی پر طیار
عصر حاضر میں یزیدوں کا نہیں کوئی شمار تم حسینوں پہ ہو راضی ہو مسلح اشرار
ہو ہاتھ میں کہیں تیغ کی جھنکار نہیں
لب پہ نالے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار نہیں

تو وہاں مجلس میں کچھ جیالے ہماری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے یزیدوں میں ہمارا بھی شمار ہو۔ جوشیلے صاحب میں یہ مانتا ہوں کہ آپ کربلا کو ایک انقلاب کی علامت کے طور پر استعمال فرماتے ہیں مگر ہم آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ کسی اختلافی واقعہ کو اس طرح پیش نہ فرمائیں جس سے آپ کی فکر جانبدار معلوم ہو اس سے صلح تو کیا ہوگی البتہ فرقہ وارانہ جذبات ضرور مشتعل ہو سکتے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے آپ کے مسدس وہ نتائج پیدا نہیں کر سکے جو آپ ان کے ذریعے سے پیدا کرنا چاہتے تھے۔ المیہ یہ ہے کہ جہاں ایک فرقہ آپ کے مسدس میں کربلا کے عنصر کا فقدان محسوس کر کے ان سے جذباتی وابستگی محسوس نہیں کر سکا تو دوسرے فرقے نے آپ کو فرقہ وارانہ خیالات کا حامی سمجھ لیا اور جب کسی فکر کی طرف سے نفسیاتی کراہت پیدا ہو جائے تو ذہن اس خیال کو جذب کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس اختلافی نقطہ کو ان مرعات یافتہ طبقات نے جن کے مفادات پر آپ کے خیالات سے ضرب پڑ رہی تھی آپ کے خلاف استعمال کیا اور کہیں نے کہیں تو ریاستی طاقت کے ذریعے سے اور اکثر پروپیگنڈے کے ذریعے سے آپ کے خلاف ایسا محاذ تعمیر کر دیا جس سے آپ کی فکر کو جو پذیرائی ملنا چاہیے تھی وہ نہ مل سکی۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلامی تاریخ میں حق و باطل کے ٹکراؤ کی مثالیں کم ہیں کہ آپ اختلافی واقعہ کو اس مقصد کے لیے استعمال فرمائیں۔ قرآن نے ابلیس اور آدم کو حق و باطل کی طاقتوں کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے تین علامتیں اور بھی اس مقصد کے اظہار کے لیے استعمال کی ہیں۔

فرعون، قارون اور شداد

ایک فرعون۔ جو سیاسی طاقت کے انتہائی تباہ کن ادارے کی علامت ہے جس نے تمام انسانوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور جو مطلق العنان شہنشاہوں اور جابر آمروں کی شکل میں آج بھی انسانیت کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کیے ہوئے ہے۔

دوسرا قارون۔ جو معاشی استحصال کی علامت ہے جس نے تمام معاشی منافعات اپنی ذات کے لیے وقف کر رکھے تھے اور تمام انسانیت کو ان سے محروم کر رکھا تھا اور جو آج بھی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے روپ میں انسانیت کا خون چوس رہے ہیں۔

تیسرا شداد۔ جو مذہبی پیشوائیت کی تحریص قدروں کا حامل ادارہ ہے جس نے دنیا میں اپنے لیے تو جنت تعمیر کر لی مگر تمام انسانیت کو دوزخ میں جھونک دیا اور جن کا شیوہ ہر دور میں پہلے دو طبقوں کی روحانی تائید رہا ہے۔ بقول نبیل احمد نبیل

یہ جادو ستم حکمت عیاراں رہی ہے ۔۔۔ تائید ستم مصلحت مفتی دیں ہے

قرآن نے ان سیاسی طاقتوں کے مقابلے میں پیغمبروں کو تعمیری انقلاب کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے جنھوں نے انسانیت کو اپنے اپنے زمانوں میں ظلم و ستم کی طاقتوں سے نجات دلوائی۔ علامہ اقبال نے اسی تصور کو یوں پیش کیا ہے کہ

شعلہ بھی ہے اسی سے نمرود ۔۔۔ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

غرض یہ کہ گر حق و باطل کی کشمکش کے اثمار کے لیے جو تاریخی اشارے اور مثالیں حاصل کرتا ہیں تو تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو عین جاری ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت موثر ذریعہ بلاغ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی رہی ہے کہ ہادی برحق رحمت اللعالمین جنھوں نے دنیائے انسانیت کو سلامتی اور امن کا درس دیا جب آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا تو خلافت کے سوال پر خود امت مسلمہ میں ایسے اختلافات پیدا کر دیے گئے جو بالآخر واقعہ کربلا کا سبب بنے اور اس کے بعد جو مسلمانوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم و بربریت کا سلوک روا رکھا اس کے تصور ہی سے شرافت انسانیت کی پیشانی پر پسینہ آ جاتا ہے اور جس کی وجہ سے اسلامی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ مگر آج ہم اسی اختلافی واقعات کو ایک مرتبے کے نقطۂ نظر سے انقلاب کی علامت

کے طور پر پیش کر کے یہ سمجھیں کہ ہم کوئی تعمیری کام کر رہے ہیں تو اس کو فرقہ وار ۔ خوش فہمی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور یہ فکر کبھی وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی جو آپ چاہتے ہیں کیونکہ اس کی تعمیر میں ایک صورت خرابی کی مضمر ہے ۔ اس کی زمین ہی میں فساد ہے اس میں بدعنوانی آ ہی نہیں سکتی۔

غرض میں جوش میں کہتا چلا گیا اور جوش صاحب جو ابتدا میں سنجیدہ موڈ میں نہیں تھے رفتہ رفتہ نہایت سنجیدہ ہو گئے اور بہت محبت سے میری باتیں برداشت کرتے رہے اور جب میں خاموش ہو گیا تو انھوں نے اتنا فرمایا کہ یہ تم سچ کہہ رہے ہو اب مجھے اپنی کوششیں بے کار اور ہوتی دکھائی نہیں دیتیں

اسے میں سورج غروب ہو گیا اور تمام سنجیدگی غرق مے ناب ہو گئی ۔ دوسرے دن شام کو جوش صاحب سلامت علی خاں کے ہمراہ میرے گھر تشریف لے آئے ۔ خاں صاحب اپنے ساتھ ایک وہسکی کی بوتل بھی لے آئے تھے ۔ چنانچہ شام کی ڈرنک جوش صاحب اور سلامت علی خاں صاحب نے میرے ہی گھر پر کی ۔ میں نے جوش صاحب کو اس بات پر بھی راضی کر لیا کہ وہ ہمارے ہی گھر کھانا کھائیں ۔ جب وہ مان گئے تو جلدی سے جا کر ان کی پسند کے کباب بھی لے آیا ۔ کھانا کھانے کے بعد دیر تک ہم باتیں کرتے رہے اور جب رات زیادہ ہو گئی تو میں نے جوش صاحب کے لیے اپنے گھر میں سونے کا بندوبست بھی کر دیا ۔ سلامت علی خاں تو اپنے مکان چلے گئے مگر جوش صاحب یہیں سو گئے ۔

فقیر خانقاہ سے ملاقات:

صبح سویرے ہم دونوں بیدار ہو کر چہل قدمی کے لیے نکل گئے راستے میں جوش صاحب کی ملاقات ایک ایسے صاحب سے ہو گئی جو ان کے بہت قدیم چاہنے والوں میں سے تھے جوش صاحب ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے اور ان سے ان کے مکان کا پتا دریافت کیا ۔ انھوں نے کہا میرا مکان یہاں سے بہت قریب ہے اگر زحمت نہ ہو تو گھر چلیے میری بیگم آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی ۔ جوش صاحب فوراً راضی ہو گئے اور ان کے ساتھ ان کے گھر روانہ ہو گئے ۔ ان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا ۔ انھوں نے ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا

دور پی بیگم کو مطلع کرنے کے لیے اندر چلے گئے تھوڑی ہی دیر میں ایک نہایت صحت مند سفید
خوبصورت خاتون بڑی بڑی غزالی آنکھیں گول چہرہ بھرا بھرا بدن عمر تقریباً ساٹھ، پینسٹھ سال باہر
تشریف لائیں اور نہایت بے تکلفی سے جوش صاحب کے قریب بیٹھ گئیں۔ جوش صاحب
نہایت حیرت آمیز مسرت سے ان کی خیریت دریافت کرتے رہے اور یہی حال ان خاتون کا
بھی تھا۔ دونوں نے ہندوستان سے ہجرت کے واقعات اور اس کے بعد کراچی میں قیام کے
حالات مختصر طور پر ایک دوسرے کو سنائے۔ جوش صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے
فرمایا کہ وہ آج کل میرے مکان ہی میں مقیم ہیں جو ان کے مکان سے قریب ہے۔ ان خاتون
نے جوش صاحب کو دوسرے دن ناشتے پر مدعو کر لیا اور مجھ سے بھی حاضری کا وعدہ لے لیا۔
ان کے شوہر نے جوش صاحب کی ایک بہت پرانی نظم سنائی جس کے متعلق جوش صاحب
نے فرمایا کہ وہ بیس سے قبل کی تحریک علالت کے زمانے کی ہے۔ میں نے وہ نظم لکھ لی جو
حسب ذیل ہے۔

ابر کرم سے خطاب

کس مقدس میکدے سے جھوم کر نکلا ہے تو
کون سی گنگا کی چوکھٹ چوم کر نکلا ہے تو
آ رہا ہے کس ادا سے کیف برساتا ہوا
ایک پرچم کی طرح بے جیب لہراتا ہوا
اھونڈ کوئی پاک دیپ پی الفت کے لیے
مقتب کر دے رہیں بدلان رحمت کے لیے
جس جگہ بھٹکی ہوئی انسانیت آباد ہو
جس جگہ انسان کا ٹوٹا ہوا دل شاد ہو
یہ جسم زار اس الطاف کے قابل نہیں
رحمتوں کی جس پہ بارش ہو یہ وہ محفل نہیں
جس جگہ سرمایہ داری کا لقب تہذیب ہے
جس جگہ کتوں کی صف صف خطبہ تلذیب ہے
سہ کھا دیو باطل ہے حاکم خنجر بدست
جس جگہ تعزیر کے قابل ہے مرد حق پرست
رات بے تابی سے کٹتی ہے حال انسان کی
گل رہی ہیں ہڈیاں انصاف کی ایمان کی
اس زمیں پر ساتھ اور شور برسنا چاہیے
برق گرنی چاہیے پتھر برسنا چاہیے

اس کے بعد انھوں نے جوش صاحب کی ایک رباعی بھی سنائی،

پہلو میں میرے دیدۂ پرنم ہے کہ دل سجدہ یہ مقیاس جب قلم ہے کہ دل
ہو ذرہ بھی کج تو بال پڑ جاتا ہے یہ شیشۂ ناموس دو عالم ہے کہ دل

اس کے بعد بیگم صاحب نے بھاگل بسکٹ اور چائے سے ہم لوگوں کی تواضع فرمائی اور دوسرے دن ناشتے پر آنے کا وعدہ لے کر رخصت کیا

جب ہم گھر واپس آ رہے تھے تو جوش صاحب بہت خوش تھے میں نے دریافت کیا کہ یہ خاتون کون ہیں؟ تو جوش صاحب نے فرمایا یہ فتنہ عالم ہیں میں نے کہا آج بھی یہ اس قدر حسین ہیں تو جوانی میں وہ جس قدر خوبصورت ہوں گی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جوش صاحب نے ان کے تعلق سے بہت کچھ تفصیل بتائی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ اس دن جوش صاحب بہت خوش رہے اور بے چینی سے دوسرے دن کا انتظار کرتے رہے۔ شام کو میں نے جوش صاحب سے دریافت کیا کہ کیا انھوں نے ان کا ذکر یادوں کی برات میں کیا ہے؟ جوش صاحب نے فرمایا ارے خورشید علی خاں ان رخسار کو ہزار کوشش کر کے کس آفت رسا کے دیدار ہوگے۔ اس پری جمال کے حسن بے مثال کے آگے میرے طرز شباب کی پتلیاں کانپ جاتی تھیں۔ یہی ایک چہرہ تھا جو آج تک ذہن کے افق سے غروب نہیں ہوا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ یہ خاندان ہندوستان سے کراچی آ چکا ہے مگر مجھے ان کا پتا معلوم نہ تھا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ راجب صاحب اور سلامت علی خاں بھی آ گئے اور گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ دوسرے دن میں اور جوش صاحب آٹھ بجے فتنہ عالم کے گھر پہنچ گئے۔ دونوں میاں بیوی ڈرائنگ روم میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کو تو خاص طور پر آراستہ کیا ہی گیا تھا مگر خود بیگم صاحب رشک صد گلستاں ہی ہوئی تھیں اللہ اللہ اس عمر میں بھی چہرہ پر کیا سماں تھا۔ مجھ میں تو ان کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں تھی اور دل ہی دل میں جوش صاحب کی خوش قسمتی پر رشک کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں میز پر کھانا چن دیا گیا۔ ظہیر صاحب نے فرمایا جوش صاحب انھوں نے آدھی رات تک جاگ کر یہ سب اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔ میں تو ناشتے کا اہتمام دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کئی قسم کے تو کباب ہی تھے۔ سیخ کباب، سیاری کباب، شامی کباب، پھر کلیجی گردے بھنے ہوئے مرغ کا تھا بھنا قورمہ سالن، بریانی پراٹھے، انڈوں کا سالن۔ ایک پلیٹ میں نہایت عمدہ بالائی اور

طرح بیٹھے ہیں شاہی ٹکڑے۔ غیر قانونی۔ انڈوں کا حلوہ۔ اس قسم کے کھانے اور کھانے والے صرف ہم دو آدمی اور پھر ان دونوں میاں بیوی کی مہمان نوازی۔ اصرار کر کے جوش صاحب کو ہر چیز چکھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو چائے کا دور چلا۔ نہایت لذیذ کشمیری چائے پیش کی گئی۔ اس کے بعد گفتگو کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے پی ہجرت کی تفصیل اور کراچی میں قیام کے متعلق بتایا۔ تھوڑی دیر میں شوہر صاحب کسی کام سے اٹھ کر باہر چلے گئے اور بیگم صاحبہ جوش صاحب کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ باتوں باتوں میں جوش صاحب کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو میں نے کہا جوش صاحب مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے اگر اجازت ہو تو میں چلا جاؤں؟ جوش صاحب نے کہا نہیں میں بھی ساتھ ہی چلوں گا چنانچہ ہم لوگ تقریباً بارہ بجے کے قریب وہاں سے رخصت ہو کر گھر آ گئے۔ بیگم صاحبہ نے بہت اصرار دوبارہ آنے کا وعدہ لیا اور جوش صاحب نے حسب عادت فرمایا ضرور ضرور حاضر ہوں گا مگر کسی شام کو۔ پھر گھر منتقل ہو گئے اور پھر فالتو میری موجودگی میں دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔ بس اب تو وہ ہیں نہ حضرت جوش۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

کیسویں مارچ ۱۹۷۶ء کو بابا ذہین شاہ صاحب تاجی کے مکان پر مشاعرہ تھا جس کا اعلان بابا صاحب نے اخبارات میں بھی کر دیا تھا۔ بابا صاحب نے صبح آٹھ بجے مجھے فون کیا کہ میں جوش صاحب کو لے کر ان کے گھر دس بجے تک پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں اور جوش صاحب کے گھر گیا اور ان کو بابا صاحب کا پیغام پہنچا دیا۔ اس وقت وہاں سالک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جن کے گھر میں بھی ایک شعری نشست کا اہتمام تھا۔ سالک صاحب اس بات پر تیار نہ تھے کہ جوش صاحب ان کے گھر کے علاوہ کہیں اور جائیں۔ بہت چاہا جوش صاحب مروت کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ میں نے کہا تھوڑی تھوڑی دیر دونوں جگہ چلے چلیے۔ جوش صاحب تیار ہو گئے تو سالک صاحب نے کہا پہلے میرے گھر چلیے۔ چنانچہ ہم لوگ سالک صاحب کے گھر چلے گئے مگر وہاں اس وقت تک اور کوئی نہیں آیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر منظور حسین شور ملیک تشریف لے آئے۔ ان کے بعد کمال رضا صاحب اور تقریباً ساڑھے دس بجے تک شاہد نقوی صاحب، سید عباس صاحب اور بہت سے شعرا صاحبان تشریف لے آئے اور مقررہ مشاعرہ ہو گیا۔ پھر وہاں اتنی دیر ہو گئی کہ ہم لوگ بابا صاحب کے

مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے۔ گھر آ کر جوش صاحب نے نئے لی فون پر بابا صاحب سے ان کے مشاعرے میں شریک نہ ہو سکنے کی معافی مانگ لی اور دوسرے دن حاضر ہونے کا وعدہ کر لیا۔ دوسرے دن صبح ہم لوگ بابا صاحب کے آستانے پر پہنچے۔ بابا صاحب نے اسی محبت اور گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور صرف اتنا فرمایا کہ جوش صاحب کل ہم لوگ آپ کے کلام سے محروم رہے۔ جوش صاحب نے اپنی مجبوری بیان کی اور بات ختم ہو گئی۔

بل پارک کی ایک شام:

اسی شام کو جوش صاحب کی دعوت حمدی خاں صاحب کے ہوٹل میں تھی۔ میں اور راغب صاحب بھی مدعو تھے۔ چنانچہ ہم نہایت وقت مقررہ پر بل پارک میں واقع بلوسین ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ حمدی خاں صاحب نے ہوٹل کی چھت پر ہمارے بیٹھنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہم لوگ وہاں بیٹھے اطراف کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز اور غروب آفتاب کا نظارہ کر رہے تھے کہ ہوٹل کے قریب ایک بڑے گول دائرے میں گھومنے والا جھولا چلنے لگا۔ لوگ جوق جوق اس کی طرف جا رہے تھے اور جھولے میں بیٹھ کر اس کی گردش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جوش صاحب نے فرمایا چلو ہم بھی جھولے میں بیٹھ کر گردش روزگار کا لطف اٹھاتے ہیں مگر راغب صاحب اس وقت کسی اور جگہ جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ فرمانے لگے کہ ابھی سورج غروب ہوا چاہتا ہے لیکن آپ کہاں جائیں گے اور پھر فرمایا۔

انسان غلط و بھولا نکلا — جو پینگ نہ دے سکے وہ جھولا نکلا

باوصف مساعی مشیت راغب — حیرت ہے خلیفہ بے اصولا نکلا

اتنے میں سورج غروب ہو گیا مگر کہیں سے مغرب کی اذان کی آواز نہیں آئی۔ جوش صاحب نے حیرت سے دریافت کیا بھئی کیا یہاں کوئی مسجد نہیں ہے؟ راغب صاحب نے فرمایا:

آیا نہیں انساں کو خدا یاد اب تک — فریاد ہے اس پر دل ناشاد اب تک

بل پارک پہ ہے خانہ بے موجود مگر — مسجد کی پڑی نہیں ہے بنیاد اب تک

جوش صاحب نے مجھے حکم دیا کہ ان کے لیے پیگ بنائیں۔ میں نے ایک جام بنا کر

جوش صاحب کے سامنے رکھ دیا اور انھوں نے بیاد فلاں بنت فلاں کہہ کر ایک گھونٹ پیا اور گلاس میز پر رکھ دیا۔

راغب صاحب نے فرمایا۔

مل پارک کی یہ صحبت ہے اور یہ شام
فردوس نظر آتش سیال یہ جام
خورشید علی خان ہیں ساقی راغب
اور حضرت جوش ہیں خواروں کے امام

اس دور معلوم ہوتا ہے کہ حمدی خاں صاحب اپنے گاہکوں میں اتنے مشغول ہو گئے کہ ہم لوگوں کی طرف توجہ نہ کر سکے اور ہماری سیرابی کے لیے انھوں نے جس بیرے کو متعین فرمایا تھا وہ شاید اس وجہ سے کہ ہم سے اس کو ٹپ ملنے کی امید نہ تھی، اس نے بھی کچھ لاپروائی برتی۔ کباب کچے تھے اور مرغ کے تکوں پر گوشت کم تھا۔ جوش صاحب بے کیف ہو کر اٹھ گئے اور گھر آ کر باقی پیگ مکمل کر کے کھانا کھایا۔

راغب صاحب نے اس دعوت کے متعلق فرمایا۔

سو سالہ جشن جناب حمدی مسعود — ہم لوگ ہیں طالب فلاح و مسعود
حمدی کا یہ اعجاز نہ بھولے گا کبھی — بوتل شراب ہے اور تکے موعود

علامہ رضی جے پوری:

چوبیس مارچ بدھ کے دن صبح نو بجے میں جوش صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں راغب صاحب مرادآبادی، میاں فراست رضوی بھی موجود تھے۔ جوش صاحب نے کہا۔ واہ واہ خوب وقت پہ آئے چلو بابا صاحب کے گھر چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم تینوں بابا صاحب کے آستانے پر پہنچے وہاں ایک صاحب بابا صاحب کے مہمان تھے اور حیدرآباد سے تشریف لائے تھے۔ یہ صاحب جوش صاحب کے بھی دوستوں میں سے نکلے۔ گھنے چہرے، لانبا، دبلے پتلے ناک ستواں اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ حیدرآباد کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اب وظیفہ پر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا یہ رضی جے پوری

ہیں نہ صرف یہ کہ قابل آدمی ہیں بلکہ کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ پھر مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا کہ ان کو مستقل علیحدگی پسند ہے۔ یہ سنتے ہی رضی صاحب کا رنگ اور موڈ ایک دم بدل گیا۔ فرمایا جوش یہ کیا حرکت کی۔ اب تم بھی جہیز طلب کرنے لگے۔ اتنے میں ایک نیا نیا شادی شدہ جوڑا بابا صاحب کی دعا میں لینے کے لیے کمرے میں داخل ہوا اور بابا صاحب کے قریب بیٹھ گیا۔ بابا صاحب نے محبت اور شفقت سے دونوں کو دعائیں دیں۔ مٹھائی کھائی اور جب وہ دونوں رخصت ہو گئے تو رضی صاحب نے پھر نے فرمایا:

جب بھی سنتا ہوں کہ ہوتی ہے کسی کی شادی
حسرت آتی ہے کہ وہ شخص ہمیں کیوں نہ ہوئے

جوش صاحب نے فرمایا میاں مستقل چلے جاؤ یہ حسرت بھی نکل جائے گی۔ بابا صاحب نے فرمایا بھائی جو کراچی آ کر کچھ نہ کر سکے وہ مستقل جا کر کیا کرے گا۔ جوش صاحب نے فرمایا کہا کم علیحدہ تو کما سکے گا۔

نظریہ اضافت:

رضی صاحب جب زیادہ برہم ہونے لگے تو جوش صاحب نے فرمایا چلو اب گھر چلتے ہیں رضی کو ہماری صحبت ناگوار گزر رہی ہے مگر بابا صاحب نے مجبوراً بٹھا لیا اور موضوع بدل دیا۔ کسی بات پر رضی صاحب فرمانے لگے کوئی چیز اضافی نہیں ہوتی بلکہ خود اپنی قدر آپ رکھتی ہے۔ جوش صاحب دیر تک مسکرانے لگے تو رضی صاحب نے فرمایا معلوم ہوتا ہے آپ مجھ سے متفق نہیں ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا ارے رضی اتنی واضح بات پر تم اس قدر مجھ سے مستقل دعویٰ پیش کر رہے ہو تو سوائے ہنسنے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ رضی صاحب نے کہا: آپ اپنی مستقل بات کی توضیح فرمائیے۔ تو جوش صاحب کہنے لگے ارے بھائی دنیا کی کوئی قدر لے لیجیے اس کو ناپنے کا کوئی نہ کوئی پیمانہ تو مقرر کرنا ہی پڑے گا اور وہ پیمانہ ظاہر ہے دوسری قدر کی نسبت سے اضافی ہو گا۔ مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں کہ چوری خود اپنے اندر ایک بری قدر ہے اور یہ کسی قدر سے اضافی نہیں مگر خود کیجیے کہ چوری کے معنی کیا ہیں؟ کسی شخص کو اس کی مرضی اور علم کے بغیر اس کی ملکیت سے محروم کر دینا۔ اس میں بنیادی بات ملکیت کا تصور ہے

اور یہ ملکیت کے حقوق کسی قانون کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شے کسی کی ملکیت نہ ہو تو ہر شخص اس سے مستفید ہو سکتا ہے اور اس صورت میں چوری کا تصور بھی نہیں ہو گا۔ مثلاً آپ دریا کے کنارے سے جتنا چاہیں پانی حاصل کر سکتے ہیں لیکن جب وہ پانی کسی کی ملکیت میں چلا جائے تو پھر آپ مالک کی مرضی کے خلاف اس کو حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ قانون نے اس کو ملکیت کا حق عطا کر دیا ہے۔ لہٰذا چوری کی برائی ایک تو حق ملکیت سے اضافی ہے دوسرے اس قانون سے جو اس کو جرم قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ہر قدر کسی دوسری قدر کی نسبت سے اضافی ہے۔ یہ صرف حقوق کی بات نہیں بلکہ دنیا کی ہر شے کی قدر کسی دوسری شے کی نسبت سے اضافی ہوگی۔ مگر بظاہر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ رضی صاحب اس استدلال سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اس پر میں نے کہا دیکھیے غالب نے کتنے دل نشین انداز میں نظریہ اضافیت کو ایک شعر میں بیان کر دیا۔ سب لوگ میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے غالب کا شعر پڑھا۔

جز سے سپہ یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نہیں خس سے نشیمن شعلے سوزاں کا

غالب نے نظریہ اضافیت کی دو مثالیں اس شعر میں دی ہیں۔ محبوب کی فطرت کی کج خلقی ہماری فطرت کے تکدر کی نسبت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور شعلہ کی تیزی گھاس کی خشکی کی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔ پھر غالب نے ایک شعر میں اسی نظریہ کو بیان کیا ہے۔

یہ کنارہ چھپا کہ ناؤ چلی کچھ کیا بات دھیان میں آئی

ہر حرکت اس کے ماحول کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔ غالب نے بھی حرکت کی اضافیت کو بیان کیا ہے۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اس پر رضی صاحب نے فرمایا یہ ٹھیک ہے بعض باتیں اضافی ہیں اور آپ نے سچے استدلال کی تائید میں شعر بھی سنا دیئے پیش کیے مگر ان سب کے باوجود میری رائے یہ ہے کہ ہر شے اضافی نہیں ہو سکتی بعض اقدار اپنی قدر آپ ہیں مگر اس مرتبہ رضی صاحب نے کوئی

مثال نہیں دی۔ غرض اس دلچسپ گفتگو کے بعد ہم لوگ وہاں سے رخصت ہو کر گھر آ گئے۔ میں نے رستے میں جوش صاحب سے عرض کیا کہ حضور آپ کس بنا پر یہ فرما رہے تھے کہ رضی صاحب بہت کھلے ذہن کے آدمی ہیں؟ جوش صاحب مسکرا کر کہنے لگے کہ میں نے ان کے ذہن کا اس گہرائی سے مشاہدہ نہیں کیا تھا۔

شام کو جب سب احباب جوشی صاحب کے مکان پر جمع ہوئے تو راضب صاحب بھی تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں رضی صاحب سے پوری کا ذکر آ گیا تو میں نے کہا کہ وہ نہ معلوم مستقل حلوے سے اس قدر کیوں چڑتے ہیں۔ راضب صاحب نے فوراً یہ رباعی کہہ دی۔

حلوے سے دیدنی جمال مستقل	فردوس شاہد ہے خیال مستقل
حلوے کا اگر ذکر کسی نے چھیڑا	یہ کہتے رضی اہل کمال مستقل

میں نے کہا اب کے جب بابا صاحب کے گھر جائیں اور وہاں رضی صاحب سے ملاقات ہو تو ان کو یہ رباعی ضرور سنا دیجیے۔ چنانچہ جب ہم لوگ دو تین دن کے بعد بابا صاحب کے مکان گئے تو وہاں فضل احمد کریم فضلی صاحب، راضب صاحب، جوش صاحب اور فراست رضوی سب ہی شعرا موجود تھے اور رضی صاحب بھی تھے۔ تھوڑی دیر میں شعر و شاعری شروع ہو گئی تو راضب صاحب نے وہی رباعی سنا دی۔ رضی صاحب ریاضہ برہم ہونے لگے تو راضب صاحب نے ایک اور رباعی سنا دی۔

ہر وقت زباں پر ہے دعا مستقل	جنت بھی نہ میں لوں گا بجائے مستقل
بابا صاحب، رضی دعا فرمائیں	جبریل کہے، رضی بھی جائے مستقل

رضی صاحب اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ہم لوگوں نے ان کو منانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ اس سے محفل بے کیف ہو گئی تو سب لوگ رخصت ہو گئے۔

اسی شام کو ڈاکٹر علیم امام بڑے خوبصورت کپڑے زیب تن کیے، بالوں میں بالوں کا گجرا لگا کر اور عطر کی خوشبو میں رچی بسی جوشی صاحب کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ یکشنبہ کی شام جوشی صاحب اور ہم سب احباب کی دعوت ان کی سن کے گھر حسین آباد میں ہے۔ راضب صاحب نے فوراً ایک رباعی انھیں سنا دی:

بن کے خوشبو سے راحت شام آتی ہیں
اور لے کے مسرت کا پیام آتی ہیں
ملے کو جناب جوشش سے اسے راحت
کس ناز سے ماہیہ ام آتی ہیں

ماہیہ جوش صاحب سے گفتگو میں مشغول ہو گئیں اور راحت صاحب کی طرف ان کی پشت ہو گئی تھوڑی دیر تک تو حضرت صاحب چپ رہے مگر پھر یہ رباعی سنا دی

یہ حسن یہ دل کشی یہ جوڑ دھالی — ہائے ہمسر مرد بیخد یہ سانی
کیجے کی طرف پشت میاں باخدا — اک صاحب دل سے اور رد گردانی

ماہیہ نے جب یہ دیکھا کہ راحت صاحب زیادہ رو دھالی ہو رہے ہیں تو جوش صاحب سے بدو کے دن دعوت میں شرکت کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئیں۔

انتیسویں مارچ ۱۹۷۶ء۔ آج کل جوش صاحب اپنی نواسی مہوش عالم عرف بوبی کے گھر مقیم ہیں ان کے شوہر حسن ناصر صاحب اچھے شاعر ہیں جوشش صاحب ان دونوں میاں بیوی سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کا مکان شمالی ناظم آباد بلاک "بی" میں عمران شادی ہال کے عقب میں واقع ہے۔ یہ جگہ میرے مکان واقع بلاک این سے بہت قریب ہے۔

اسرار "خودی" یا "میں" کا تصور:

میں صبح تفریح کے لیے بتردن کے غیر آباد میدان میں جاتا ہوں جہاں ابھی تک کسی دیہات کے میدان کا سماں باقی ہے۔ جب برسات ہو جاتی ہے تو سانپ چھوٹے چھوٹے تالابوں میں مرغابیاں بھی آ جاتی ہیں اور میدان میں بھٹ تیتروں کے جھنڈ بھی کثرت دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے کبھی کبھی کوئی قاتل کسی انسان کو قتل کر کے اس ویرانے میں نعش بھی پھینک جاتے ہیں۔ اس دن مجھے بہت پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔ تفریح چھوڑ کر پولیس سٹیشن جانا اور پولیس کو ساتھ لا کر نعش کی جگہ دکھانا پڑتی ہے۔ ایسا دو بار ہو چکا ہے مگر اب پولیس نے اس علاقے میں پٹرولنگ شروع کروا دی ہے۔ خیر یہ تو بیچ میں ایک بات نکل آئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ۲۹ ویں مارچ کو پیر کے دن صبح ہی صبح جب میں گھر سے نکل کر میدان میں آیا تو موسم بہت

ہی خوشگوار تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ میری فکر کا رخ خود اپنی ہی ذات کی جانب مڑ گیا اور میں سوچنے لگا کہ "میں" کیا ہوں؟ ہم بار بار "میں" کہتے ہیں معلوم ہے کیا شے کیا یہ میرا گوشت پوست کا جسم "میں" ہے یا یہ جسم سے الگ کوئی شے ہے۔ اگر بقول علامہ اقبال "میں" احساس خودی ہے جس سے ہم میں احساس نفس یا تعین ذات پیدا ہوتا ہے تو خودی میری ایک صفت ہوئی مگر میں خود کیا ہوں؟ ایک خیال یہ آیا کہ یہ احساس "میں" ہمارے اعصابی نظام کا مقام فکر ہے مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ احساس "میں" ہمارے اعصابی نظام کی مقام فکر کی علت ہے یا معلول یعنی میرا تصور "میں" کیا موجود بالذات کوئی شے ہے یا یہ فکری نظام کی ساخت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا احساس ہے۔ ان ہی فکروں میں غلطاں میں نے جوش صاحب کی قیام گاہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ جوش صاحب گھر کے سامنے ہی ٹہل رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر خوشی سے فرمایا ارے یہ صبح صبح کہاں سے چلے آ رہے ہو؟ میں نے کہا صبح سیر کے لیے نکلا تھا راستے میں بیٹھے خیالات نے ہجوم کیا کہ تم خود بہ خود آپ کی طرف اٹھ گئے۔ بقول آپ کے:

جب بھی کانٹوں نے پاؤں برسائے　　تیری نگری کے پھول یاد آئے

جوش صاحب نے فرمایا۔ بھئی موضوع فکر کیا تھا؟ میں نے کہا آج میں خود ہی موضوع فکر بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا میں اپنے اعصابی نظام کا مقام فکر ہوں جس کا مرکز دماغ ہے؟ جوش صاحب نے فرمایا کہ مقام فکر کے بجائے "مقام شعور" کہہ سکتے ہیں۔ فکر دراصل "شعور" کا نتیجہ ہے۔ میں نے کہا مگر یہ شعور یا احساس ذات کوئی مادی شے ہے یا غیر مادی؟ جوش صاحب نے فرمایا ہم تو توانائی مطلق کو مادی پیکر کے توسط ہی سے محسوس کر سکتے ہیں کیونکہ بقول غالب "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" توانائی مطلق ہے انسان کے لیے انفرادی وجود ترشی ہے مگر دراصل وہ ایک بحر بے کنار ہے۔ ہر انسان میں اسی توانائی کی جلوہ گری ہے مگر ہر شخص کا انفرادی وجود یا احساس ذات اس کو دوسروں سے الگ ایک شخص عطا کرتا ہے اور اس کو ہر شخص "میں" کہتا ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب کیا غالب نے اس شعر میں اسی تصور کو پیش کیا ہے:

ہمارے گرہ خیچہ شعر جوش ہے　　طلسم بال و پر رنگ کا معلوم

جوش صاحب نے فرمایا جی ہاں بہت اچھا شعر آپ کے ذہن میں آیا ہے۔ ہم لوگ دیر تک اس دلچسپ موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ جب دو بج گئے تو جوش صاحب نے فرمایا کہ ان کا ارادہ بابا صاحب کے وہاں جانے کا ہے اس لیے گر میں بھی جانا چاہوں تو جلدی تیار ہو کر آ جاؤں چنانچہ میں گھر گیا اور تیار ہو کر واپس جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا اور ان کو لے کر بابا صاحب کے گھر چلا گیا۔ جوش صاحب نے بابا صاحب سے فرمایا کہ آج خورشید علی خاں پر معرفت ذات کی کیفیت طاری ہے۔ بابا صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ پھر یہ ہماری جماعت میں شریک ہو جائیں تاکہ معرفت الٰہی کی منزلیں بھی آسانی سے طے کر سکیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضور والا مجھے تو ابھی معرفت ذات بھی حاصل نہیں ہو سکی، معرفت الٰہی تو بہت دور کی بات ہے۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ جب کسی سالک میں اپنی ذات کو پہچاننے کا احساس بیدار ہو جائے تو سمجھ لو کہ وہ معرفت الٰہی کی تلاش میں چل پڑا ہے۔ اس کے بعد شعر و شاعری شروع ہو گئی۔ بابا صاحب نے ایک غزل سنائی جو ہمارے آج کے موضوع سے بہت قریب تھی۔ چند اشعار یہ ہیں۔

میں ہی میں جلوہ گر تھا میں تھا جلوہ نما
حق کو انجمن بزم میں نمایاں دیکھا
اپنی منزل سے جو باہر کہیں آیا نہ گیا
میری منزل کی طرف اس کو خراماں دیکھا
قابل دید ہے دنیائے محبت کہ جہاں
کوئی کافر نظر آیا نہ مسلماں دیکھا

اس کے بعد بابا صاحب نے ایک اور غزل سنائی۔ اس کے بھی چند اشعار حسب ذیل ہیں:

کثرت حسن میں بھی عالم یکتائی ہے
بزم کی بزم ہے حسنائی کی حسنائی ہے
بے خودی میں دوسرے سانس کی خوشبو تھی جسے
میں یہ سمجھا ترے دامن کی ہوا آئی ہے

کفر کامل ہے تو ایمان بھی کامل ہے ذہین
حق شناسوں کی نظر سے یہی شناسائی ہے

یہ دلچسپ شاعری تقریباً ایک بجے ختم ہوئی اور ہم لوگ گھر لوٹ آئے۔ گھر آ کر میں نے سوچا کہ علامہ اقبال کے خیالات خودی کے متعلق معلوم کرنا چاہیے تو میں نے اقبال کے مقدمہ اسرار خودی کا مطالعہ کیا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں "خودی وحدت وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس میں تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستحیر ہوتے ہیں۔ یہ پر اسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے یہ عمل کی راہ سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔ وہ تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر اس کی ماہیت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی۔" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "خودی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے گوناگوں تجربوں سے اپنے آپ کو مستحکم کرے۔ وہ تخلیق و تکمیل کے پیہم سفر کو کبھی کسی منزل پر ختم نہیں کرتی۔" وہ لکھتے ہیں

خودی کیا ہے؟ راز درون حیات — خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات
خودی جلوہ مست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

چراغے درمیان سینہ تست — چہ بود ہست ہیں کہ در آئینہ تست

علامہ اقبال بھی اسے "پر اسرار شے" لکھتے ہیں جو مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی اور اس کو "راز درون حیات" سمجھتے ہیں مگر کوئی صاحب فکر اپنے وجود کی ماہیت کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ غالب البتہ توانائی مطلق کو سمندر سے اور انفرادی انا کو قطرے سے تشبیہ دے کر اس مضمون کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

ہے مضمحل وجود صور پر نمود بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

مگر اس طرح وہ انفرادی انا کی مکمل نفی کر دیتا ہے۔ یہ مثال قطرہ و موج و حباب کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر انسانی انا کا مسئلہ جس میں شعور ذات ہے پھر پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم خود توانائی مطلق کا حصہ ہیں جو شعور مطلق بھی ہے تو خود آگاہ کیوں نہیں ہیں؟ ہمارا شعور ذات حواس کی بنا پر ہی میں کیوں قید ہے۔ اس تصور سے کس قدر گھٹن ہوتی ہے کہ ہم خود سے تمام سے

ناواقف ہیں۔ ہم جو کچھ جان سکتے ہیں صرف اپنے حواس کے ذریعے ہی سے جان سکتے ہیں ہماری ذات اور ہمارے شعور کے درمیان ہمارے حواس کا پردہ حائل ہے اور ذات میں داخلی طور پر علم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ہم جو کچھ جان سکتے ہیں وہ شعور کے توسط سے جان سکتے ہیں اور شعور حواس کے توسط سے علم حاصل کر سکتا ہے مگر حواس کی معلومات فراہم کرنے کی صلاحیت اس قدر محدود اور اتنی شرائط کے تابع ہے کہ کسی علمی دریافت کے متعلق یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ اس میں ہمارے عقاید اور پہلے سے قائم شدہ قدریں جو ہمارے فکری سانچوں کی تشکیل کرتی ہیں۔ حقیقت تک رسائی میں سخت بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہیں۔ کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا علم کس قدر حقیقت آشنا ہے۔

یہ کس قدر بڑا المیہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ سے ناواقف ہیں اور وہ حقیقت جو ہم میں جلوہ گر ہے وہ خود اپنا تعارف ہم سے نہیں کرواتی۔ بیدل کہتا ہے

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و ز رفتن خود خبر نہ شد
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما[1]

اقبال بھی اس گھٹن کو محسوس کرتا ہے اور گلہ کرتا ہے کہ

تیری دانائی سے ہے میرے جہاں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو

غالب اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کرتا ہے کہ

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

مگر علامہ اقبال نے اس عالم جبر میں بھی ایک تعمیری اور مثبت پہلو اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ گو ہم اپنی ذات کی ماہیت کو نہیں سمجھ سکتے لیکن اپنی صلاحیتیں کا ادراک ضرور کر سکتے ہیں۔ اقبال کا تصور خودی در عمل انسانی ذات کی صلاحیتیں کی آگہی ہے انسان اگر اپنی صلاحیتیں سے آگاہ ہو جائے تو وہ صرف اس کرۂ ارض ہی کو نہیں بلکہ اس کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔

---

[1] تمام عمر میں تیرے ساتھ ہم پیالہ رہا اور میری شکل کبھی کم نہ ہوئی۔ کیا قیامت ہے کہ (ابھی بھی) تو (میرے وجود کے) کنارے سے میرے (ادراک کے) کنارے تک نہ پہنچا

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے

اس آب جو سے کیے بحر بے کراں پیدا

غرض تمام دن ان ہی خیالات میں گزرا اور شام کو جب جوش صاحب کے سے خانہ طلبہ آگہی پر حاضر ہوا تو جوش صاحب نے دریافت فرمایا کہ آج تمام دن کیا مشغولیت رہی تو میں نے عرض کیا کہ آج تمام دن میں خود کو تلاش کرتا رہا۔ جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ پھر کس نتیجے پر پہنچے؟ تو میں نے عرض کیا کہ اس تلاش کے دوران میں نے بدنصیبی سے بچنے کے لیے خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں وہ میں خود ہی تو ہوں۔ میں نے سوچا کہ بقول غالب

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

میں اپنا غیر تو ہوں نہیں جو میں تلاش کروں کیونکہ تلاش ذات میں نکلنے والے بڑے بڑے فلسفی اور صوفیا تو انانی مطلق کو اپنا غیر سمجھ کر اس کی تلاش میں نکلتے ہیں اور ان میں کثرت تلاش میں خود اپنے ہی کو کھو دیتے ہیں بقول غالب

ہاں اہل طلب کون سے فرزانہ تھے لیکن

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

تو میں نے سوچا کہ خود کو کھو دینے کے بجائے کیوں نہ اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لوں۔ تب میں نے محسوس کیا کہ یہ ساری کائنات میری بیدار کی منتظر ہے پھر مجھے کائنات کے ہر ذرے کی آوازیں آنے لگیں:

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی؟

پھر میں نے دیکھا کہ

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے

کس کا دل ہوں کہ وہ عالم سے لگایا ہے مجھے

رموزِ بے خودی

یوگی صاحب نے فرمایا اب آپ فکر کے جادۂ مستقیم پر گامزن ہو چکے ہیں مگر اتنی بات نہ بھولیے کہ جب آپ اس کائنات کے حوالے سے "میں" کا لفظ استعمال کریں تو اس میں انانیتِ جزوی کے بجائے تمام نوعِ انسانی کی انانیت کی کوشش کیجیے کیونکہ جب کسی انسان کی انا خود اس کی اپنی ذات کی حد تک محدود ہو کر رہ جائے تو وہ دوسروں کے دکھ درد کا احساس کھو دیتا ہے۔ اس لیے "انا" کا اپنے خول میں بند ہو جانا تمام برائیوں کی جڑ ہے اور انا کا پھیلاؤ ہر نیکی کی بنیاد ہے انانیتِ جزوی اپنی ذات کے خول سے کبھی نہیں نکلتی اور انانیتِ کلی اس کردار کی نفی ہی کا نہیں تمام انفس و آفاق کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس مقام پر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اسماء اجسام اور اشکال ایک اضافی چیز ہیں اور ایک ایسا عالمِ عینیت ہمارا منتظر رہتا ہے جہاں غیریت کا تصور محال ہے اور یہ ہو کہ انسان ذات ہوں کہ نجوم نور ہو کہ نار جمادات ہوں کہ نباتات۔ جان لو ہوں کہ انسان یہ سب کے سب ایک ہی جوہر سے معرضِ وجود میں آئے ہیں اور سب کے سب ایک ہی خاندان کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔

کہتا ہوں پھر کہ دل میں کدورت نہ چاہیے
وحدت کے سر پہ ضربتِ کثرت نہ چاہیے
مطلق اکائی میں دوئیت نہ چاہیے
غیریت و شر و عصبیت نہ چاہیے

آفاق ایک جسم ہے اور ایک ذات ہے
اے دوست دوئیت غیر جہالت کی بات ہے

اس حلقۂ عینیت میں داخل ہو کر یہ بات قطعی طور پر ناممکن ہو جاتی ہے کہ آدمی اس عالمِ کون و فساد میں کسی ایک آدمی سے بھی نفرت کر سکے بلکہ اس کے برعکس اس کے واسطے یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے کہ وہ تمام موجودات عالم سے بالعموم اور تمام نوعِ انسانی سے بالخصوص محبت اور خود اپنی ذات کی طرح محبت کرے۔ میں نے کہا غالب اس بات کو اس طرح کہتا ہے۔

اتنا ہی مجھ کو پی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں بیخبر جب میں

جوش صاحب۔ جی ہاں اور جب تک انسان کے کردار کی تربیت اس طرح نہیں ہوتی کہ وہ جزو میں کل اور قطرہ میں دجلہ نہ دیکھ سکے یہ سائنسی ترقی کی بے پناہ طاقت ہر لمحہ خطرات بڑھاتی رہے گی۔

رنگ و مزاج و سیرت و ملک و زبان و دیں
ان سب سے اصل نوع بشر کو غرض نہیں
ہاں محو کر دہن سے یہ نکتے نہیں
یہ "میں" کا لفظ ہے جو ترے لب پہ ہم نشیں

تیرا نہیں ہے صرف یہ دم غم لیے ہوئے
یہ "میں" تو دوش پر ہے دو عالم لیے ہوئے

اور گہری نظر سے غور فرمائیں تو کہنا پڑے گا کہ:

تیرا وجود فخر نظام حیات ہے تو محض ایک ذات نہیں کائنات ہے

غرض یہ اضافی دلچسپ گفتگو جب یہاں تک پہنچی تو قریب کی مسجد سے موذن نے سورج کے غروب ہونے کا مژدہ سنایا اور جوش صاحب نے ساغر معرفت میں پی ناکوتا کر دیا۔

ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر دعوت:

اس کے بعد ۲۱ ویں مارچ کو شام ڈاکٹر عالیہ امام کی دعوت میں شرکت کے لیے میں شام چار بجے صاف ستھرے کپڑے پہن کر جوش صاحب کے گھر گیا وہاں راجب صاحب پہلے سے ایک سوانحنامے کے ساتھ موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر جوش صاحب نے فرمایا کہ "آج تو آپ بڑے بن ٹھن کر آئے ہیں"۔ راجب صاحب نے فوراً کہا۔

محفل جوش میں بن ٹھن کے سر شام آئے
چشم بددور کہ شہزادہ گلفام آئے

اسی شام رخب صاحب نے کسی اور سوالات کے ساتھ ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ جوش صاحب آپ اگلے دن یعنی یکم اپریل ۱۹۶۹ء کو اسلام آباد روانہ ہونے والے ہیں۔ کیا وہاں بھی آپ کو کراچی کے احباب یاد آئیں گے"۔ جوش صاحب نے انتہائی شاعرانہ انداز میں ارشاد فرمایا "ایک بالکل دل سے جدا نہ ہوگا اور وہ میرے وجود کا احاطہ کرے گا اور اس خدا سے کراچی کے ادیب و احباب کے چہرے دیکھیں گے اور میرے دل پر رقصیاں چلائیں گے"۔ میں نے اپنے دل میں کہا، جوش صاحب واقعی اپنے احباب کا دل رکھنا خوب جانتے ہیں۔ غرض سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہوا تو ہم لوگ حسین ڈی سلوا جالان روانہ ہوئے اور عالیہ کی سن صاحب کے گھر پہنچے۔ وہاں عالیہ نام ان کی سن اور بھابھیوں کے علاوہ اور بہت سے احباب جمع تھے۔ اس روز میری ملاقات مشفق خواجہ صاحب سے ہوئی۔ میں ان کی ادبی حیثیت سے تو واقف تھا مگر ان کو دیکھنے کا اتفاق پہلی دفعہ ہوا تھا۔ خواجہ صاحب ان اہل علم دانشوروں میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کا ہر لمحہ تحقیق اور مطالعہ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ وہ بہت کم آمیز ہیں مگر اردو ادب کا شاید ہی کوئی میدان ہو جہاں خواجہ صاحب کے نقوش قدم منزل کی رہنمائی کے لیے موجود نہ ہوں۔ جوش صاحب بھی خواجہ صاحب کے علمی تبحر کے قائل تھے۔ اس روز ان کا کلام بھی سنا اور بہت لطف آیا۔ میں اور راحب صاحب جوش صاحب کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ اتنے میں مجھے یاد آیا کہ میں اپنی ڈائری گاڑی ہی میں بھول آیا ہوں تو ڈائری لینے کے لیے گاڑی تک گیا۔ جوش صاحب مجھے کہ میں گھر جا رہا ہوں تو انھوں نے کہا "ارے خورشید علی خاں کہاں غائب ہو گئے"۔ رخب صاحب نے فرمایا

اس دشمن ایماں کو بلا یاد ہے — اس نغمہ دل و جاں کو بلا یاد ہے
پہلوئے جناب جوش کب سے خالی — خورشید علی خاں کو بلا یاد ہے

جوش صاحب نے فرمایا

جس کے پہلو سے یاد اٹھتا ہے — درد بے اختیار اٹھتا ہے

میر تقی میر

خیر میں فوراً آ گیا اور پھر شاعری شروع ہو گئی اور دیر تک جاری رہی۔ راحب صاحب نے بھی رباعیات سنائیں۔ ایک رباعی یاد رہ گئی،

ہنستی ہے کبھی ذہن کو حیرانی بھی تھکتی ہے کبھی انجمن حیرانی بھی
کس درجہ تضادات ہیں میرے اندر میں خود ہی تماشا ہوں تماشائی بھی

کھانے کے بعد موسیقی کی محفل منعقد ہوئی۔ جوش صاحب بہت خوش ہوئے اور چلتے ہوئے فرمایا۔ "علیہ کج بحثی بمبئی والوں کے بڑی بجا آئی"۔ وہاں سے ہم لوگ کوئی گیارہ بجے اپنے گھر لوٹے۔

جوش صاحب کی اسلام آباد روانگی

دوسرے دن یکم اپریل کو جوش صاحب صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد روانہ ہونے والے تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ صبح ساڑھے چھ بجے تک میں ان کے گھر پہنچ جاؤں مگر جب دوسرے دن صبح میں ان کے گھر پہنچا تو وہ اقبال حیدر زیدی صاحب کے ساتھ مجھ سے پہلے ہی ایئرپورٹ روانہ ہو چکے تھے۔

جوش صاحب کی کراچی واپسی

اس کے بعد جوش صاحب مئی کی تیسویں تاریخ بروز جمعہ کراچی تشریف لائے۔ اس مرتبہ کراچی میں ان کا قیام تقریباً ڈیڑھ ماہ سے زیادہ رہا۔ اس دوران جوش صاحب کا روزمرہ کا پروگرام معمول کے مطابق رہا۔ دن میں کبھی بابا صاحب کے گھر کبھی سعادت علی خاں کے ہاں کبھی سید عباس صاحب کے مکان پر کبھی علیہ امام کے وہاں کبھی کہیں کبھی کہیں۔ البتہ شام کی محفلیں زیادہ تر خود جوش صاحب ہی کے مکان پر ہوتی تھیں اور سب احباب جمع ہوتے رہتے تھے۔

لاہور سے ٹیلی فون

ایک دن جون کی چھبیسویں تاریخ کو صبح آٹھ بجے لاہور سے سمن کا ٹیلی فون میرے گھر آیا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ کیا جوش صاحب میرے یہاں ہیں؟ میں نے کہا ارے آپ تو سمن خاں سے بھی زیادہ سادہ نکلیں۔ وہ تو اس بڑھاپے میں بھی ترک کیے بیٹھے تھے کہ

رہنے دے سے تصور جاناں نہ کر خیال
ایسا نہ ہو کہ وہ تجھے دشمن کے گھر ملے

میں نے کہا اے خورشید صاحب خدا نہ کرے کہ میں آپ کو دشمن کے زمرے میں شمار کروں۔ میں تو آپ کو اپنا سچا ہمدرد سمجھتی ہوں اب رہی مومن خاں کی بات تو ان مومن کے بجائے غالب کے طرفدار ہیں جو کہتا ہے کہ

ہم بھی تمہیں بتائیں کہ مجھ نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

میں نے کہا اگر مجھوں کے بجائے لیلیٰ رکھ دیں تو کیسا رہے۔ فرمایا لیلیٰ بہار کیا مقابلہ کرے گی۔ میں نے کہا واقعی آپ نے کام تو وہ کیا ہے کہ جب تک اردو زبان زندہ رہے گی اور حسن و عشق کی داستانیں اپنی ایک پیدا کی فضا اردو شاعری سے حاصل کرتی رہیں گی اس وقت تک جوش ملیح آبادی کا نام بھی اردو شاعری سے وابستہ رہے گا اور دنیا لفظ آخر الزماں کے نام کو بھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ جیسے حضرت جوش

کیا فرق روشنی ہے یہ جانی تیری — دنیا نہیں بھولے گی کہانی تیری
کانٹے کے لیے خون ہو اور پھول کا دل — مجھ پر نازل ہو اور جوانی تیری

اور

تیرے ہاتھوں نے زندگانی بخشی — یا خلقت امنگوں کو روانی بخشی
یوسف نے زلیخا کو بنایا تھا جواں — تو نے یوسف کو جوانی بخشی

میں کہتا جا رہا تھا کہ مسعود نے کہا۔ ابھی حضرت یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے میں آخر کہ کیا دام۔ مجھے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ آپ یہ بتلایئے کہ کیا جوشش صاحب وہاں ہیں؟ مجھے ان سے سخت ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو وہ یہاں موجود نہیں ہیں لیکن میں آدھے گھنٹے کے اندر ان کو یہاں لا سکتا ہوں اور اگر آپ اپنا فون نمبر دے دیں تو ان سے آپ کی بات بھی کروا سکتا ہوں۔ مسعود نے مجھے اپنا نمبر دے کر کہا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک اس لان پر موجود رہیں گی۔ میں اسی وقت جوشش صاحب کے گھر گئی وہ نہا دھو کر اپنی میز پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے

گئے تھے کر آنے کا سبب دریافت کیا۔ میں نے سن کا پیغام پہنچایا تو فوراً تیار ہو گئے۔ فرمایا کہ آج عابد صاحب نے پاپیں کی دعوت کی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ آنے والے ہیں گے مگر جوشش صاحب نے گھر والوں کو کہہ دیا کہ اگر عابد آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ وہ خود ان کے گھر پہنچ جائیں گے یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ میرے گھر آ گئے۔ جب میں نے لاہور کا ٹکٹ لیا تو سن نے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا میں نے ریسیور جوش صاحب کو دے دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد جب میں اندر آیا تو جوش صاحب نے فرمایا کہ سرکار عظمت مدار کا حکم ہوا ہے کہ میں جنوں[1] سے ملوں اور سن کی سن کی نوکری کے لیے ان سے کہوں۔ میں نے کہا کیا وہ کراچی آ رہی ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ نہیں۔ بعد مجھ سے کہا ہے کہ میں کراچی سے چلوں تو لاہور ضرور قیام کروں

اس کے بعد ہم دونوں عابد صاحب کے گھر گئے۔ وہاں ہاشمی صاحب اور ان کی چھوٹی صاحبزادی فرزانہ بھی لاہور سے آئی ہوئی تھیں۔ عابد صاحب نے نہایت پرتکلف دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا پانے ست لذیذ تھے۔ ہم لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھائے اور تقریباً ایک بجے رات گھر لوٹے۔ آج گرمی ست زیادہ ہے۔ ٹمپریچر ۱۰۲ ڈگری فارن ہائٹ ہے

دوسرے دن صبح دس بجے جناب منور عباس صاحب ایڈووکیٹ کے گھر پر شعری نشست تھی۔ میں، جوش صاحب اور سلامت علی خاں وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ راز مرادآبادی، راجہ مرادآبادی، پروفیسر شور علیگ، صبا اکبرآبادی کے علاوہ اور شعرا حضرات بھی موجود تھے۔ راز مرحوم جوش صاحب کے ست محبوب دوستوں میں سے تھے۔ انھوں نے ایک غزل سنائی۔ ایک شعر یہ تھا،

یہ اہتمام کہ اک اک نظر ہے افسانہ ۔۔۔ یہ احترام کہ ان کو سنا نہیں سکتا

صبا اکبرآبادی کے چند شعر یہ ہیں،

نہیں ہوتے ہیں ریاکاری کے مجھ سے ۔۔۔ میں اگر سر نہ جھکاؤں تو عداوت مجھ
رفتہ رفتہ مری خودداری سے واقف ہوں گے ۔۔۔ ابھی کچھ دن مرا انداز محبت مجھ

---

[1] مراد مصطفیٰ جنوں اس وقت سندھ کے وزیر مال تھے۔

قبر میں آؤ تو دیکھوں کہ باہر کیا ہے تمہارا ذکر سنا میں نے ہر دہاں سے الگ

آخر میں جوشؔ صاحب نے بھی رباعیات سنائیں اور دوپہر کو یہ محفل برخاست ہوئی۔

۳۰ ویں جولائی کو جوشؔ صاحب تقریباً ایک بجے میرے گھر تشریف لائے۔ میں اس وقت باہر گیا ہوا تھا ایک کاغذ پر یہ لکھ کر پرچہ چھوڑ گئے۔

"جتوئی کے وہاں سے آپ کے پاس سیدھا چلا آ رہا ہوں کل ۹ بجے تک پہنچ جائیے ایک نہایت ضروری درخواست لکھنا ہے"۔

جوشؔ

۳۰.۹.۶۹

دوسرے دن میں نو بجے جوشؔ صاحب کے گھر پہنچ گیا وہاں انھوں نے جتوئی صاحب کے نام ایک درخواست لکھوائی جس میں کسی کی ملازمت کے لیے درخواست کی گئی تھی پھر یہ درخواست لے کر جوشؔ صاحب تو جتوئی صاحب کے پاس چلے گئے اور میں اپنے گھر آ گیا۔

۱۰ ویں جولائی کو جوشؔ صاحب تیز گام سے لاہور روانہ ہو گئے اور وہاں چند دن قیام کے بعد اسلام آباد تشریف لے گئے۔

اس کے بعد چوبیسویں ستمبر جمعہ کے دن جوشؔ صاحب کا نئے دن آیا کہ وہ تیسویں ستمبر جمعرات کے دن تیز گام سے کراچی پہنچ رہے ہیں۔ چنانچہ میں جمیل اور دلبت مظہر کو کینٹ اسٹیشن پہنچا اور جوشؔ صاحب کو لینے کے بعد ان کے گھر پہنچا کر شام کو آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر آ گیا۔ شام کو پھر وہی جوشؔ صاحب کے گھر کی رونقیں لوٹ آئیں۔ رضا صاحب، سلامت علی خاں، ڈاکٹر عالیہ امام اور دوسرے احباب بھی تشریف لے آئے۔ دوسری اکتوبر کو حکومت پاکستان کی طرف سے ٹی وی پر مشاعرہ تھا جس میں شرکت کے لیے جوشؔ صاحب تشریف لائے تھے۔ دراصل حکومت یکم اکتوبر سے ہفتہ محنت کشاں یا ہفتہ مزدور منا رہی تھی۔ اسی سلسلہ میں ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا جا رہا تھا اور اس میں شرکت کے لیے تمام پاکستان سے شعرا حضرات کو کراچی مدعو کیا گیا تھا جوشؔ صاحب سے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد

ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر جب محفل برخاست ہوئی تو جوش صاحب نے فرمایا کہ دوسری تاریخ کو میں نو بجے ان کے گھر پہنچ جاؤں تاکہ ٹی وی اسٹیشن ساتھ چلیں۔ میں نے وعدہ کر لیا اور گھر آ گیا اور دوسری اکتوبر کو حسب وعدہ میں ٹھیک نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں جناب رام مرد آبادی اور فراست رضوی پہلے سے موجود تھے۔ ہم سب احباب ٹھیک دس بجے ٹی وی اسٹیشن پہنچ گئے۔ مشاعرے سے فارغ ہو کر ہم لوگ دو بجے گھر لوٹے۔

اس کے دوسرے دن جوش صاحب اور ہم سب احباب کی دعوت سلامت علی خاں صاحب کے گھر تھی۔ خاں صاحب کے گھر ہمیشہ بے تکلف دوستوں کا اجتماع ہوتا ہے جس میں جوش صاحب بہت خوش رہتے ہیں۔ اس روز بھی جوش صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے اور بہت دیر تک کلام سناتے رہے اور اس طرح تقریباً ساڑھے گیارہ بجے یہ محفل برخاست ہوئی۔ اس کے بعد دوبارہ ۹ اکتوبر کو خاں صاحب نے جوش صاحب کی دعوت کی اور میرے علاوہ راغب صاحب، راز صاحب، سرور صاحب بارہ بنکوی، فراست رضوی بھی شریک محفل تھے۔ کھانا بہت لذیذ تھا اور جوش صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے اور بہت سی تازہ رباعیات اور نظمیں سنائیں۔ جب محفل ختم ہوئی اور مہمان رخصت ہونے لگے تو راغب صاحب نے جوش صاحب کی تعریف میں یہ رباعی سنائی:

یہ حسن بیان جوش اللہ اللہ — یہ لطف بیان جوش اللہ اللہ
صف بستہ ہیں الفاظ و معانی راغب — یہ شوکت و شان جوش اللہ اللہ

جوش صاحب کے ساتھ لاہور کا سفر:

دوسرے دن جب میں جوش صاحب کے گھر پہنچا تو جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ وہ گیارہویں اکتوبر بھی دوسرے دن تیز گام سے لاہور جا رہے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ چلوں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں میں بیوی سے مشورہ کر کے جواب دوں گا۔ چنانچہ جب میں نے بیوی سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ اگر جوش صاحب تمھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو چلے جاؤ۔ چنانچہ میں نے جلدی جلدی تیاری شروع کر دی اور

جوش صاحب کو مطلع بھی کر دیا۔ دوسرے دن ہم دونوں تیز گام سے لاہور روانہ ہو گئے۔ راستے میں میرے زیادہ تر وقت جوش صاحب کی دیانت سے ان کا کلام نقل کرنے میں گزرا۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر جوش صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔

پاکستان کی سیاسی قیادت کے متعلق جوش صاحب کے خیالات:

پاکستان کے مستقبل کے تعلق سے جوش صاحب کی یہ رائے تھی کہ جب تک سیاسی قیادت جاگیردار طبقہ اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے نکل کر تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے نوجوانوں کے قبضے میں نہیں آئے گی پاکستان بیرونی سرمایہ دار طاقتوں کے ہیں، اقتصادی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنتا رہے گا اور ملک داخلی، فرقہ وارانہ اور صوبہ پرستی کا شکار ہو کر کمزور، مقروض اور غیر ترقی یافتہ رہے گا۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ ہندوستان سے خوشگوار تعلقات قائم کرے مگر مجھے اس بات کا امکان کم نظر آتا ہے کیونکہ پاکستان کی تخلیق ہندو سے نفرت کی بنا پر ہوئی ہے اور جب تک ہندوستان اور پاکستان کے دانشور، ادیب، شعرا اور بھوجنا اہل قلم ہی مجلسیں بنا کر انہیں میں محبت کے جذبات کی آبیاری نہیں کریں گے انہیں کے بیچ تعلقات کا قیام دشوار دکھائی دیتا ہے۔ غرض اسی قسم کی باتوں میں سفر ختم ہوا۔ جب ہم لوگ لاہور پہنچے تو اسٹیشن پر ہاشمی صاحب کی صاحبزادیوں کے ساتھ ساتھ امراؤ جان بھی جوش صاحب کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ بھی تھی جلد سامان ڈبے سے اتار کر اپنے سروں پر رکھ رہے تھے اور ہم لوگ روانہ ہونے والے تھے کہ سامنے سے نشان صاحب آ گئے۔ جوش صاحب کے چونکہ گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے ان کے لیے پلیٹ فارم پر چلنا مشکل ہو رہا تھا تو نشان نے لڑکیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ نشان صاحب نے جوش صاحب کو اس حالت میں دیکھ کر یہ شعر پڑھا،

دستے بہ دوش غیر نہاد از رہ کرم ۔۔۔ بار چو دید لغزش پا رہ سلامت[1]

لاہور میں جوش صاحب تو ہاشمی صاحب کے گھر چلے گئے اور میں اپنے بھائی اختر میاں

---

[1] وہ از رہ کرم اپنے ہاتھ غیروں کے کاندھوں پر رکھے چل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی لغزش کا سبب کر گیا

کے گھر ٹھہر گیا۔ اس مرتبہ جوش صاحب نے لاہور میں صرف چار دن قیام کیا اور ۱۱ ویں اکتوبر کو میں اور جوش صاحب ساڑھے پانچ بجے ریل گاڑی سے پنڈی روانہ ہو گئے۔ لاہور کے قیام کے دوران میں جوش صاحب کی کیفیت کچھ ان کی اس رباعی کے مطابق رہی ہے

وہ شیخ و برہمن نہ کبھی آ جائیں حکمت کے نکتہ داں نہ کبھی آ جائیں
لیکن میں کہ پہلو میں ہے وہ بت کمسن شیر حسن خاں نہ کبھی آ جائیں

اسلام آباد میں جوش صاحب نے اصرار کر کے مجھے اپنے ہی مکان میں ٹھہرایا۔ وہاں بھی شام کی محفلیں دلچسپ ہوتی ہیں مگر کراچی کی بات کہاں۔

محترمہ عصمت چغتائی کی ملاقات

آج کل محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ اسلام آباد آئی ہوئی ہیں۔ انیسویں اکتوبر کو منگل کی رات تقریباً دس بجے جب جوش صاحب سونے کی تیاری کر رہے تھے عصمت آپا اپنی بھتیجی رحمت سعید صاحبہ جو عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی صاحبزادی ہیں اور ان کی بیٹی اور چند دیگر خواتین کے ساتھ جوش صاحب سے ملنے کے لیے تشریف لے آئیں۔ جوش صاحب نے انہیں دیکھ کر فرمایا ارے آپ لوگ اس وقت تشریف لائے جب میں انتقال فرمانے والے ہیں۔

عصمت آپا نے دیر سے آنے کی معافی چاہی اور کہا کہ جن صاحب کو جوش صاحب کا گھر معلوم ہے ان کو اس وقت فرصت نہ ملی۔ خیر پھر محفل نے تمام خواتین کا تعارف کروایا۔ عظیم بیگ چغتائی کی صاحبزادی رحمت سعید کراچی میں ڈیفنس سوسائٹی میں رہتی ہیں۔ جوش صاحب باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ عصمت آپا کی نظر جوش صاحب کی غیر مطبوعہ بیاض "محراب و مضراب" پر پڑی تو انہوں نے اسے اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ان کی نگاہ ایک شعر پر ایک دم رک گئی اور انہوں نے وہ شعر بہ آواز بلند پڑھا۔

دانتوں میں دبائے ہوئے چکنا سا گریبند
اور ہاتھ نہاں خانۂ تطہیر میں ڈالے

اس کے بعد بیاض جوش صاحب کے حوالے کرتے ہوئے فرمائش کی کہ جوش صاحب وہ نظم جس کا عنوان "نیرنگیاں" ہے سنائیں۔ جوش صاحب نے بیاض لے کر نظم سنانا شروع

کر دی۔ یہ نظم اب محراب و مضراب میں چھپ چکی ہے مگر ہمارے شرمیلے شاعر حضرات نے یہ دو اشعار قابل اشاعت نہیں سمجھے:

دانتوں میں دبائے ہوئے چکنا سا کمر بند
اور ہاتھ میں خانۂ تطہیر میں ڈالے
اتنے میں جو وہ لڑکۂ دوراں نظر آئی
ڈھیلے کو کیا تڑ سے دو ہے کے حوالے

عصمت آپا نے دل کھول کر ان اشعار کی داد دی اور کہا جوش صاحب تمام اردو ادب میں اس کمرہ فعل کو اس قدر شریفانہ الفاظ کا لباس پہنا کر آج تک کسی شاعر یا ادیب نے بیان نہیں کیا اور آپ کا کھینچا ہوا نقشہ اس قدر مکمل ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فلم دیکھ رہے ہیں دلی آپ کاموں سے منظر دکھا سکتے ہیں۔ عصمت چغتائی اس ملاقات کے متعلق اپنے رپورتاژ میں جو انھوں نے ۱۹۸۰ء میں پاکستان کے سفر کے متعلق تحریر کیا ہے، لکھتی ہیں "جوش صاحب سے ملنے گئی، انھیں تندرست اور چاق چوبند دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ماشاء اللہ بیاسی سال کے ہیں مگر چہرے کی جلد تر و تازہ اور گلابی ہے۔ بالکل نہیں بدلے۔ چاروں طرف لشکرے کی طرح نظر گھمائی۔ نگاہیں ایک حسین پھول جیسی لڑکی پر گئیں۔ "یہ بچی کس کی ہے"۔ انھوں نے لشکرے کی سی وسعت دار نظریں گھمائیں "میری نواسی ہے جوش صاحب"۔ میں نے پھسلایا ہے "خوب"۔ میں نے ان کی بیاض نکال ایک شوخ سی نظم کا صفحہ کھول کر پڑھنے کی درخواست کی۔ بس چنگاریاں سی چھٹنے لگیں۔ شعلے لپکنے لگے ایسا معلوم ہوتا تھا اپنی دبنگ آواز کے ریوالور پر بیٹھے والوں کو گولیاں دے رہے ہیں"۔ (ماخوذ از عصمت چغتائی فن اور شخصیت مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش) میں نے کہا عصمت آپا آپ کی عقاب نگاہی کی بھی داد دینی پڑتی ہے میں نے دلی سے جوش صاحب کی اس بیاض سے دو نظمیں نقل کر رہا ہوں مگر میری نظر بھی تک ان اشعار پر نہیں پڑی تھی جن کو آپ نے بیاض کھولتے ہی دیکھ لیا۔ عصمت آپا ہنسنے لگیں فرمایا "بندہ یا بندہ"۔ رات دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دوبارہ دلی میں آنے کا وعدہ کیا اور وہ سب لوگ رخصت ہو گئے۔

جوش صاحب کے گھر میں میری مشغولیت زیادہ تر یہ رہتی تھی کہ میں ان کی بیاض سے ان کا

جی کام نکل کر بھر رہا تھا۔ جوش صاحب اپنی پوری نظمیں بھی دوبارہ تحریر کیا کرتے تھے مگر ایسا کرتے وقت وہ کمر بند کے بند بدل دیا کرتے تھے۔ اس لیے میں نے وہ نظمیں بھی اپنی ڈائری میں نقل کر لی تھیں۔ ایک دور میں صبح سے بیٹھا ان کی نظمیں نقل کر رہا تھا اور میں نے "جوانی یاد آتی ہے" کے بند "یادش بخیر" کے بند "ہائے جوانی ہائے زمانے" کے بند "مستر حسن لرشتنی کی یاد دہانی" کے بند نقل کر لیے تو جوش صاحب آ گئے۔ پوچھا کیا کر رہے ہو۔ میں نے بتایا کہ نقل کر رہا ہوں۔ انھوں نے میری تحریر کی رفتار دیکھ کر ڈائری پر لکھ دیا۔ "اے یہ روانی دلبر حالی ۔۔۔ سس کے بعد میں نے مفرد شکال ۔۔۔ گی بدلی۔ نقل کیں پھر میری نگ ۔۔۔ نیز ہ نگاہی ۔۔۔ پڑ گئی۔ میں نے وہ بھی نقل کر لی۔ یہ نظم چونکہ نئی ہے اس لیے یہاں مکمل نقل کر رہا ہوں۔

نیزہ نگاہی

کل روئی دھنکے کے تماشے میں دم صبح
جنبیدہ تھے اک مہ وش نوخیز کے بالے

دھن دھون تنادم تنادم دھنا دھن
لہراتی ہوئی دھن پہ تھرکتے ہوئے گالے

دوشیزگی محو تماشا کے پس پشت
انداز کے لشکر تو اداؤں کے رسالے

پاشستہ خدوخال پہ ہلکا سا دھندلکا
کھڑے پر لڑی نیند کے بے چین کسالے

اک ہاتھ کی پھکی سی مسلق ہوئی بالے
اک ہاتھ سے اڑتے ہوئے آنچل کو سنبھالے

نظروں میں سمیٹے ہوئے انوار کی جھلمل
گردن میں لپیٹے ہوئے جھنکار کے ہالے

پلکوں میں نمستیں کی پروئی ہوئی نیندیں
انداز میں چوتھی کی ادا بنتر میں پالے

اڑتے ہوئے دھنکی سے سفید ابر کے ٹکڑے
مچلے ہوئے ماتھے پہ سیاہ جب کھالے

بوجھل سے بالوں پہ جھجکتی ہوئی دھنکار
زلفوں کی گھٹاؤں پہ برستے ہوئے گالے

جارحی پہ وہ دلنواز خیالات کے جیسے
بڑھتے ہیں دبے پاؤں دم صبح اجالے

پلکوں کی گھنی چھاؤں میں وہ نیند کے جھلپن
جس طرح خرابات پہ برسات کے حالے

وہ حسن کہ چشم سے جو بڑھے بھاؤ بتانے
تو مغرب آفاق کلیجے سے لگالے

اعضا کے خم و پیچ میں گمنام کی ہنسی
چپ کے گھنے کنج میں کاشی کے شوالے

رقصندگی پنبہ سر آتش رخسار
حیرت میں کھڑے تھے یہ سماں دیکھنے والے

رنگ میں اک افسردہ جبیں، زاہد ہدہد
ہونٹوں پہ مچلتے ہوئے مجذوں کی دعائیں
وہ ریش کہ جو پھیر دے آفاق پہ جھاڑو
تو تمن کا وہ سنگار کہ پل بھر میں کچھ تو
ہاتھوں میں دبائے ہوئے چکنا سا کریند
رنگ میں جو وہ فتنہ دوراں نظر آئی
منہ ڈال دیا حسن پہ قائم نے ہنک کر
دیکھیں کہ کوئی چھید کے بر بھی کی اس سے

کچھ پہ نمودار ہوا دانت نکالے
شوہر میں ٹوٹے ہوئے جنت کے قبالے
وہ رخ کہ نکل جائیں نگاہوں کے دوالے
کی شعر کے لفظوں میں یہ حضرت میں جیالے
اور ہاتھ خیال خام تعمیر میں ڈالے
ڈھیلے کو کیا تر سے دوراہے کے حوالے
بکھری ہوئی پلکوں کے اٹھائے ہوئے بھالے
شبنم سے دھلے بالوں کو چہرے پہ اٹھالے

اسی دوران میں مجھے یہ بھی موقع ملا کہ میں جوش صاحب کی غیر مطبوعہ کتاب "حرف آخر" سے بھی مست سا کلام نکل کر لوں۔ ایک دن جوش صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے ڈر ہے میرے بعد میرا تمام کلام کیڑے کھا جائیں گے اور کوئی اس کو چھپانے کی زحمت نہیں کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تمام بیاضیں تم لے جاؤ اور اپنی نگرانی میں اس کو چھپوا دو۔ میں نے کہا جوش صاحب یہ کام کسی ایک آدمی کے بس کا ہرگز نہیں ہے اس کو تو کوئی کمیٹی یا حکومت کا کوئی ادارہ ہی کام دے سکتا ہے۔ جوش صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا افسوس میری اولاد میں مجھے کوئی ایسا ذمہ دار شخص دکھائی نہیں دیتا جو یہ کام انجام دے سکے۔

جمعہ کے دن حسن ابدال سے اختر صاحب اور واہ کینٹ سے اظہر حسین زیدی جوش صاحب سے ملاقات کے لیے آگئے۔ باتوں باتوں میں یہ طے پایا کہ ہم سب ایک دن کے لیے واہ کینٹ جائیں اور رات وہاں گزار کر دوسرے دن لوٹ آئیں چنانچہ ہم لوگ تین بجے واہ روانہ ہو گئے۔ شام کو زیدی صاحب کے گھر سب سے احباب جمع ہو گئے۔ ان میں کرنل ریٹائرڈ رمضان بھی تھے۔ کرنل صاحب اس قدر دلچسپ آدمی ہیں کہ ان کی صحبت میں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ان کو اتنے لطیفے یاد ہیں کہ اگر وہ تمام رات بھی لطیفے سناتے رہیں تو ان کے لطیفوں کا سٹاک کم نہیں ہوتا۔ اختر صاحب اور ان کے ساتھ منظور صاحب بھی زیدی صاحب کے گھر آگئے۔ رات دیر گئے تک لطیفے اور شاعری ہوتی رہی اور خوب لطف آیا۔

رسالپور اکیڈمی:

دوسرے دن صبح میں نے جوشش صاحب سے کہا کہ رسالپور کی یہ فورس اکیڈمی میں میرا بیٹا پرویز علی خان زیر تربیت ہے۔ میں اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں وہاں دو ایک دن رہ کر آجاؤں گا۔ جوش صاحب نے دریافت کیا کب واپس آؤ گے۔ میں نے کہا پیر تک لوٹ آؤں گا پھر میں وہاں سے بس کے ذریعے سے رسالپور روانہ ہو گیا اور جوشش صاحب اپنی کار میں اسلام آباد چلے گئے۔ مجھے میرے متوقع طور پر اپنی اکیڈمی میں دیکھ کر پرویز علی خان حیران ہو گئے پھر جب میں نے بتایا کہ میں اسلام آباد جوش صاحب کے ساتھ آ گیا تھا تو سوچا کہ رسالپور میں تم سے بھی مل لوں۔ وہاں دو دن سخت پر لطف گزرے۔ یہ فورس اکیڈمی کا ماحول نہایت شاندار تھا۔ اساتذہ کا برتاؤ اپنے شاگردوں سے بالکل اپنے چھوٹے بھائیوں کا سا تھا۔ جب ان کے اساتذہ صاحبان کو معلوم ہوا کہ پرویز کے والد آئے ہوئے ہیں تو انہوں نے میری دعوتیں کرنی شروع کر دیں۔ ان لوگوں کی گفتگو کا انداز بے حد عالمانہ تھا یہاں تک کہ ان کی بیگمات سے گفتگو کر کے محسوس ہوتا تھا کہ ہم علمی ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ دو دن سخت پر لطف گزرے اور میں پیر کی صبح کو نوشہرہ سے بس میں سوار ہو کر اسلام آباد جوش صاحب کے مکان پر بلا دیے پہنچ گیا۔ جوش صاحب مجھے دیکھ کر سخت خوش ہو گئے اور کہا میں تو شام تک آپ کے آنے کی توقع کر رہا تھا۔ شام کو جوش صاحب نے ڈاکٹر آلی ذی حسن صاحب سے بے حد اصرار کے ساتھ وقت لے رکھا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں آپ کا بھی ڈاکٹر صاحب سے معائنہ کروا کے دوائیں لے لی جائیں۔ مجھے تقریباً دو سال قبل دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں میری ایک چچا زاد حسن افسر عالم بھی پنڈی آئی ہوئی تھیں اور ان کو بھی لاہور میں چند ماہ قبل شدید دل کی تکلیف ہو چکی تھی۔ میں نے جوش صاحب سے مشورہ کیا کہ رستے سے افسر عالم کو بھی لے لیں اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے متعلق بھی رائے حاصل کریں۔ جوش صاحب نے فرمایا ضرور ضرور۔ چنانچہ ہم لوگ اسی شام افسر عالم کو بھی ان کی قیام گاہ سے لے کر ڈاکٹر صاحب کے مطب پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے یکے بعد دیگرے ہم تینوں کا تفصیل سے معائنہ فرمایا۔ مجھ سے تو کہا کہ آپ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ جوش صاحب سے کہا کہ ان کا بلڈ پریشر زیادہ ہے اور جب تک یہ وارفرین ترک نہیں کریں گے ان کو یہ تکلیف

رہے گی۔ جوش صاحب نے فرمایا۔

تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ زہر پی جا
یہ کیوں نہیں کہتے کہ خبردار نہ جیا

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کا مسئلہ ہے۔ آپ کو آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اختر خانم کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے تشویش کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ان کے دل کی حالت ٹھیک نہیں ہے ان کو دوا اور غذا میں سخت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے مرض کی پیچیدگی یہ تھی کہ ان کو دریائی طلس کا مرض بھی لاحق تھا اور اختر خانم ان اہل دل انسانوں میں سے تھیں جن کے دل میں سارے جہان کا درد رہتا تھا۔ جب مجھے دل کا دورہ پڑا تھا تو میں لندن میں تھا اور اختر لاہور میں۔ انھوں نے مجھے نئے دل لندن پر تاکید کرنا شروع کر دی کہ دوا میں پابندی سے کھاؤں اور ڈاکٹر کی ہدایات پر سختی سے عمل کروں۔ اب میں نے اختر خانم سے کہا کہ اب آپ کی باری ہے۔ دوائیں پابندی سے استعمال کریں اور کھانے میں سخت احتیاط ضروری ہے مگر افسوس اختر بیگم کا مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور بالآخر اس بیماری نے ان کا کام تمام کیا۔ اختر اب ہم میں نہیں ہیں مگر جانے والے مجھے ہمیشہ یاد رہیں۔

خیر یہ تو بہت بعد کی بات ہے اس وقت تو ہم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے مشورے کے بعد نسخے لیے اور گھر آ گئے۔ اختر خانم کو ان کے مکان پہنچا کر راستے میں جوش صاحب نے مجھ سے کہا خورشید علی خاں مجھے آپ کی بہن کی طرف سے سخت فکر لاحق ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے ان کے متعلق کچھ خبر نہیں دی۔ میں نے کہا نہیں جوش صاحب وہ کچھ اور حالات میں ضرور ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کریں گی۔ غرض اسی ذہنی کیفیت میں ہم لوگ گھر آ گئے اور جوش صاحب نے ہر قسم کی فکر اور ڈاکٹر کے مشورے کو طرق سے غائب فرما کر اپنا جام صحت نوش کیا۔ میں دو تین دن کے بعد تیئیسویں اکتوبر کو شام کی پرواز سے کراچی آ گیا اور اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ جوش صاحب مجھے پہنچانے کے لیے ایئرپورٹ تشریف لائے اور فرمایا کہ اگر میں ایک ہفتہ اور ٹھہر جاؤں تو آگے ہفتے وہ بھی میرے ساتھ کراچی چل سکتے ہیں کیونکہ آگے ہفتے کمن بھی کراچی جانے والی ہیں۔ میں نے کہا اس دفعہ جب آپ تشریف لائیں تو میرے گھر

قیام کیجیے گا۔ اس لیے اب میں جا کر آپ کا انتظار کروں گا۔ جوش صاحب نے فرمایا جی ہاں آپ ہی کو میرے قیام و طعام کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ اتنے میں پرواز کا وقت ہو گیا اور میں جہاز پر چلا گیا۔

دوپہر کے چلے ہوئے ہی جوش صاحب کراچی تشریف لائے۔ پہلے تو آپ ہی گھر میں قیام کیا مگر جب سمن بھی کراچی آ گئیں تو وہ میرے گھر اٹھ آئے مگر یہ واقعہ دوپہر کے دوسرے ہفتے کا ہے کہ ایک شام سمن کا ٹیلی فون آیا وہ کراچی سے بول رہی تھیں۔ میں نے ٹیلی فون جوش صاحب کو دے دیا۔ راغب صاحب بھی موجود تھے۔ جب جوش صاحب بات ختم کر چکے تو راغب صاحب نے جوش صاحب سے کہا "مبارک ہو جن کا انتظار تھا وہ تشریف لے آئیں" پھر یہ رباعی فی البدیہہ ارشاد فرمائی۔

جلوہ ہے سرچشمۂ انوار ہے کنج — پہلو میں لیے دولتِ بیدار ہے کنج
کس کے قدموں کا ہے یہ راغب اعجاز — صحرائے کراچی بھی سمن زار ہے کنج

جوش صاحب نے تیسرے مصرع میں اس طرح ترمیم فرمائی۔

کس کے دامن کو چھو کر آئی ہے نسیم

میں نے کہا واہ جوش صاحب محبوب کے قدموں کے بجائے نسیم کا اس کے دامن کو چھو کر آنے میں جو نزاکت جذبات کا اظہار ہے اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف آپ ہی کہہ سکتے ہیں۔ غرض وہ شام بھی بہت دلچسپ رہی۔ رات دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور ظاہر ہے موضوع گفتگو صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔

صائمہ قریشی ـــــ تلبیس شخصی

۲۰ دسمبر کو میں اور جوش صاحب صبح دس بجے راغب صاحب کے دفتر جا رہے تھے کہ راستے میں سمن بھی آ گئیں۔ جوش صاحب نے ان سے کہا کہ ہم لوگ راغب صاحب کے دفتر جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو مگر وہاں کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم کون ہو۔ میں نے کہا آپ اپنا نام صائمہ قریشی بتائیں۔ میں کہہ دوں گا کہ یہ کراچی یونیورسٹی میں ایم اے اردو ادب کی طالبہ ہیں اور جوش صاحب پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔ جوش صاحب کہنے لگے اسے

بھائی یہ تو نفسیات کی طالبہ ہیں، یہ اردو ادب کی طالبہ تو نہیں ہیں۔ میں نے کہا جوش صاحب یہ ہیں آپ کی شاعری کا موضوع ہو وہ تو خود اردو ادب کا موضوع ہے اس کو ادب کی طالبہ ہونے کی کیا ضرورت ہے اس پر تو ادب کے طالب علم ہی بحث کریں گے۔

غرض اسی باتوں میں ہم لوگ راغب صاحب کے دفتر بزنس ریکارڈر روڈ پر واقع لیبر ویلفیئر ڈپارٹمنٹ پہنچے۔ وہاں میاں فراست رضوی بھی راغب صاحب کے کمرے میں موجود تھے۔ ان دونوں نے جب ایک لڑکی کو ہمارے ساتھ دیکھا تو تجسس نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے تعارف کروایا "یہ صابرہ قریشی ہیں کراچی یونیورسٹی میں ایم اے اردو ادب کی طالبہ ہیں جوش صاحب پر مقالہ لکھ رہی ہیں آج جب ہم گھر سے چل رہے تھے تو یہ آگئیں تو میں نے کہا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائیے اور راستے میں جوش صاحب سے سوالات کرتی رہیے ہم لوگ راغب صاحب مراد آبادی کے دفتر جا رہے ہیں آپ کی ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ یہ راضی ہو گئیں اب آپ کے سامنے ہیں"۔

راغب صاحب نے گو آج تک صابرہ کو نہیں دیکھا تھا مگر فوراً سمجھ گئے کہ صابرہ قریشی کے پردے میں کون شخصیت ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جب ہم لوگ بیٹھ گئے تو راغب صاحب نے چائے منگوائی اور چائے کے دوران فراست رضوی اور راغب صاحب میں شاعری کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ موضوع تو سامنے بیٹھا ہوا تھا "صابرہ قریشی"۔ آپ بھی سنیے۔

فراست رضوی نے فرمایا۔

رہا ہوتے ہیں مسائل کی سنج کیشی سے
ملے ہیں آج ہم صابرہ قریشی سے

راغب صاحب نے ارشاد فرمایا

یہ لال ٹیک ہے میری نظر میں اے راغب
ادب کا ذوق بھی ہے صابرہ قریشی کو

جوش صاحب جو بے تکلفانہ پیار بھری نظروں سے صابرہ کو دیکھ رہے تھے بے ساختہ بول اٹھے۔

زباں گردد کہ جلوہ کند شعلہ فکر سے
صدا چراغ کعبہ و بتخانہ موقیم

میاں فراست کب خاموش رہنے والے تھے فوراً ایک قطعہ موزوں کر دیا۔

صابر سے ملے تو ہم پہ کھلا — ان کا دل ہے وفاؤں کا معبد
الفت جوش حاصل شب و روز — کوئی دیکھا نہ ایسا جوش مقصد
پلکی نگر اور خوشبوئے سحر — یہ سخن ہو ہے صابر بے حد

راغب صاحب تو کہہ چکے تھے کہ صابر دراصل کون ہیں، کہنے لگے:

آسمان جمال کا راغب — ماہ کیوں نہ قامر کہے
معترض ہیں نہیں خدا کی قسم — خوش سے آپ صابر کہے

پھر فرمایا:

خوش بجود و جلوہ بدن صابر ہیں — شمع سر اہل بزم فن صابر ہیں
ہر شخص ہے درج جمال اے راغب — قدر بیک جان انجمن صابر ہیں

فراست رضوی فرمانے لگے:

مسکان میں شاخ نسترن صابر ہیں — اخلاص کا سرسبز چمن صابر ہیں
سرتاپہ قدم بیاض اشعار جمال — ناز غزل و رشک سخن صابر ہیں

جوش صاحب نے دوسرے مصرع میں اس طرح اصلاح فرمائی:

مسکان میں شاخ نسترن صابر ہیں — رشک گل و نسرین و سمن صابر ہیں

راغب صاحب نے کہا:

فریب حسن کر صابر قریشی ہیں — متاع اہل نظر صابر قریشی ہیں
ہر اک نگاہ ہے صد رشک جلوہ خورشید — یہ حدا ہے طبر صابر قریشی ہیں

آخر یہ دلچسپ محفل دو بجے فراست رضوی کے اس قطعہ پر ختم ہوئی جو انھوں نے صابر صاحب کی نعت میں کہا ہے۔

صورت ہے کھلا گلاب جیسے — پیشانی ہے ماہتاب جیسے
آنکھیں ہیں کہ دو چراغ روشن — زلفیں ہیں شب حساب جیسے
ہے خامہ صفت ہے جو نظر ہے — تاشیر کہ ہو شراب جیسے
ہے ایک گلوز گفتگو میں — جو میرا دل خراب جیسے

جب کسی لڑکی کے منہ پر اتنی قریبیں کی جائیں اور وہ بھی اردو ادب کے اس قدر بلند شعرا کی طرف سے تو اس لڑکی کے چہرے کے تاثرات نفسیات کے ماہرین کے لیے مطالعہ کا سب دلچسپ موضوع بن سکتے ہیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سمن کا چہرہ کبھی سرخ ہو جاتا تھا اور کبھی فاتحانہ عظمت کا آئینہ دار۔ غرض یہ محفل بھی سب دلچسپ رہی گو بعد کو اسکے نتائج اچھے نہیں نکلے کیونکہ اس کے بعد سمن ڈاکٹر راحت صاحب کے دفتر جانے لگیں گو ان کا کہنا یہی تھا کہ وہ وہاں جوش صاحب ہی سے ملنے جاتی ہیں مگر جب جوش صاحب کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو ان کو بہت تکلیف ہوئی اور انھوں نے اپنی ایک تحریر میں اس کا ذکر بھی کیا ہے مگر جب راحت صاحب کو جوش صاحب کے جذبات کا علم ہوا تو انھوں نے فوراً ایک رباعی لکھ کر جوش صاحب کو دے دی۔ رباعی یہ تھی۔

ہے وہم بھی اک دشمنِ جانی سچ ہے
مفروضہ بھی ہے دشمنِ جانی سچ ہے
راحت کے خلوص پر ہے شک حضرت جوش
عشق است و ہزار بدگمانی سچ ہے

جوش صاحب نے یہ رباعی پڑھ کر فرمایا "آپ نے غلط نہیں کہا۔ یہی ہم اور عاشقی بالائے غم ہائے دگر" یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہوا کہ بعض ناگزیر مصروفیت کی بنا پر سمن کراچی میں رہنے کے باوجود تین دن تک جوش صاحب سے نہ مل سکیں اور نہ ہی کوئی نئی غزل کہا۔

تیسرے دن میں نے دیکھا کہ جوش صاحب صبح ہی صبح کچھ لکھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں جب وہ لکھنے سے فارغ ہوئے تو میں نے دریافت کیا کہ آج کیا کوئی نئی غزل کا نزول ہوا ہے۔ فرمانے لگے آپ دیکھ لیجیے یہ کہہ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ یہ ایک رباعی تھی اور ایک نظم اس کا عنوان تھا۔

دیوی میری نظر کی جھولی بھر دے
مرا اب نزع کا ہنگام ہے۔ اب تو چلی آ
سسکتی زندگی کی شام ہے۔ اب تو چلی آ

فضا کی سوگواری بھینچنے کی کاوشوں سے
ہوا سینے میں اک کہرام ہے۔ اب تو چلی آؤ
تمہاری دید کو کھلی ہوئی ہے جان آنکھوں میں
تمہارا ہر نفس میں نام ہے۔ اب تو چلی آؤ
کبھی تم نے لگایا تھا جسے لب ہائے نازک سے
چھلکنے ہی پر اب وہ جام ہے۔ اب تو چلی آؤ
مرے اور قبر کے مابین اے میری سمن بیکر
بس اب تو رحمت یک گام ہے۔ اب تو چلی آؤ
کبھی پروان جس آغاز کو تم نے چڑھایا تھا
اب اس آغاز کا انجام ہے۔ اب تو چلی آؤ

بلبلم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
بیاں قرار کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی کرد

میری صبحیں رہیں حیراں گزریں　　میری شامیں تمام گریاں گزریں
دیکھا جو نہ تین روز تیرا مکھڑا　　تو دن کے نگر سے تین صدیاں گزریں

مگر سمن کی کوئی خبر نہ ملی یہاں تک کہ یکم دسمبر ۱۹۷۱ء کو عید الاضحیٰ واقع ہو گئی مگر جوش صاحب کی عید کا چاند دکھائی نہیں دیا۔ اس دوران جوش صاحب نے سمن کو ایک خط لکھا یہ خط بعد میں سمن نے میرے حوالے کر دیا تھا۔ جوش صاحب نے لکھا تھا۔

۱۰۔ ۱۲۔ ۷۱ء کراچی دس بجے دن

دامن عید پر خون کے آنسو

آج عید کا دن ہے۔ حسن اتفاق سے آج ہم اور تم ایک ہی شہر میں سانس لے رہے ہیں مگر خوش قسمتی سے تمہارے ماں باپ بھی یہاں موجود نہیں ہیں۔ تم بڑی آسانی سے مجھے چاند کا مکھڑا دکھا اور مجھ سے عید مل سکتی تھیں لیکن تم اوجھل کر روپوش ہو گئیں اور مجھ کو سخت بے آرام

پر عمل کرتے ہوئے ذبح فرما دیا۔ کس قدر عبرتناک تضاد ہے تمہارے قول و فعل میں۔ تم کو اللہ میری اس قربانی کی جزائے خیر دے اور مجھ غریب خودنما محبت کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ کاش میرے مر جانے کے بعد تم پیدا ہوتیں۔ دوسروں سے عید کی رنگ رلیاں منانے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔ سے دانے بد بختی کہ

بائے دل پر وہ بارش غم ہے عید بھی عشرہ محرم ہے"

پھر ایک دن عید کا کرنا کیا ہوا کہ جوشش صاحب رعب صاحب کے دفتر میں بیٹھے نئے ملی لون پر کسی خاتون سے گفتگو فرما رہے تھے اور ان کے اس اطمینان پر کہ جوش صاحب کراچی میں کب تک قیام کریں گے تو جوش صاحب نے فرمایا "جب تک تم ٹھہرا گی اور اس وقت تم مجھ سے ملنے بھی نہیں آئیں"۔ جیسی اس موقع پر سمن آ گئیں اور انھوں نے یہ گفتگو بھی سن لی۔ بس پھر کیا تھا وہ اس قدر برہم ہوئیں کہ

رہی زلف چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی رہی دیکھی تھی ایسی رہی دیکھی نہ تھی

اور لئے پاؤں لوٹ کر جانے لگیں تو جوشش صاحب نے لپک کر پکڑ لیا۔ سمن کہہ رہی تھیں "آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے ہر شہر میں آپ کی ایک ڈپٹی کیٹ رہتی ہے"۔ جوش صاحب نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر جب ان کا غصہ فرو ہوتا نظر نہ آیا تو جوش صاحب نے رعب صاحب کے بھی دفتر کی کنجی لی اور ایک ٹیکسی میں سمن کو لے کر رخصت ہو گئے۔ شام کو جب جوش صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ "جب میں نے اس کے دوپٹے سے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرنے کی دھمکی دی تو وہ ڈر گئی اور پھر دوستی ہو گئی"۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر

اس کے بعد حالات معمول کے مطابق چلتے رہے۔ شب و روز کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں اور کاش صاحب فکر میں رہنے لگے۔

خوشا طالع کہ پھر آیا وہ میرا خفتہ دوراں
بلائے عاشقت و آشوب دین و دشمن ایماں
خرابات طرب و خیابان سمن بیکر
سرور حلقہ رنداں زبد دین فن کاہل

یہاں تک کہ بالآخر ۲۲ ویں دسمبر کو سمن کی رخصت کی گھڑی سمن پہنچی۔ جوش صاحب نے اپنے جذبات ایک پرچے پر لکھ دیے۔ آپ بھی پڑھ لیجیے۔

۲۲۔ ۱۲۔ ۶۶ء کراچی۔

بیداری ۲:۳۰ بجے پچھلا پہر

یوم رخصت

اے دلربا ستارو آج میری شاہزادی لاہور چلی جائے گی۔ ہائے کیسی ویرانی برسنے لگے گی در و دیوار پر۔

اے پچھلے پہر کے اندھیرے، آسمان سے کسی کی ہچکیوں کی آواز آ رہی ہے۔ یہ کون رو رہا ہے میری بیچارگی پر؟

اے جان ابھی ہونٹوں پر نہ آ کر وہ دوامی ملاقات کے لیے آنے والی ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ وہ اپنی چچازاد سمن کو ساتھ لے کر آئے گی۔ کیا چچازاد بہن کی موجودگی میں گلگ جائیں گا؟ اے جرأت رندانہ میری دست گیری کر تا اس فاتح خوبان عالم کو خوب بھینچ بھینچ کر گلے لگانا اور اس کے بوسہ طلب ہونٹوں سے جی بھر کے آب حیات پینا۔ ابھی تمنی چچازاد بہن کی۔

اے میری شاہزادی آج تو چلی جائے گی۔ اس خیال سے میری جان نکلی جا رہی ہے بتا اب خیر سے کب لکھنا بھیجو گی میری جان؟ جس نامراد کو تم نے دیوانہ بنا دیا ہے۔ اسے لاہور بلاؤ گی یا بالکل ہی ٹال جاؤ گی۔ دیکھو یہ ظلم نہ ڈھانا اور ماں باپ کو حیلہ نہ بنانا۔"

اور اس کے بعد سمن لاہور روانہ ہو گئیں اور ادھر جوش صاحب کی جو حالت ہوئی اس کا اظہار انھوں نے اس طرح فرمایا۔

"تمھارے جاتے ہی کراچی کے دل سے دھواں اٹھنے لگا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ گلیاں ویران ہو گئیں اور گوشے گوشے سے رونے کی صدائیں بلند ہو گئیں۔

تم کیا گئیں کہ روٹھ گئے دن بہار کے

—— یادش بخیر کبھی میں نعرہ لگایا کرتا تھا،

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اور اب یہ عالم ہے کہ تم نے اپنی کافر زلفوں میں اس بری طرح جکڑ لیا ہے کہ جنبش کرنا تو درکنار کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ میں جس رہرو جنبیوں کے دام توڑ کر باہر نکل چکا ہوں ان سب کا انتقام لینے کے لیے تم کو مجھ پر مسلط کر دیا گیا ہے اور ہر طرف سے آوازیں آ رہی ہیں بڑے سادہ ہو تو اب نکلو دام توڑ کر۔ پیاری سمن اب اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں رہا کہ تم کو پیدا کیا گیا ہے صرف اس مقصد کے واسطے کہ تم مجھ کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ "سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی"۔

حسن اور شاعر:

یہ ایک طویل خط کا مختصر سا اقتباس ہے جس کو جوش صاحب کی جوشیلی شاعرانہ حسیت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے ورنہ ان کے انفاقی تخلیق کا تماشہ بنتا ہوا سمندر کبھی ایک ساحل سے دوسرے آشنائی کے جبر کو برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کے اندر کا شاعر "حسن" کو کسی ایک پیکر میں محدود کر ہی نہیں سکتا تھا۔ جوش صاحب کی شخصیت کا توازن جن اجزاء سے گوندھا گیا تھا ان کے لیے حسن ہر شکل میں مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔ وہ اپنی سوانح "یادوں کی برات" میں اعتراف فرماتے ہیں کہ "میں نے بھوسے کی رنگی کو اپنایا ہر گل تو دسیا پر منڈلایا اس کا گن گایا اس کی خوشبو پی اس کا رنگ چکھا اس پر کالی گھٹاؤں کے سامنے میں گایا گوایا اور پھر یہ کہتا ہوا اڑ گیا۔

در چمن مثل نسیم گزرم بدند گے از بوئے بہ بوئے بردا از رنگ بہ رنگے

دراصل شاعری اور حسن پرستی لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی شخص اس وقت تک اچھا شاعر ہو ہی نہیں سکتا جب تک حسن پرستی اس کے لیے عبادت کا درجہ نہ رکھے۔ بقول صاحب ارمغان

مجھ کو قسم ہے حسن کی سوگند حسن کو دیکھنا عبادت ہے

اور جوش صاحب تو اس صدی کے حافظ و خیام تھے ان کے لیے حسن ہر شکل میں شدید

کشش رکھتا تھا۔ حسن خواہ چاندنی رات کا ہو یا طلوع سحر کا۔ برکھا کی آتی بہار کا ہو یا کسی دوشیزہ کی آتی مانگ کا۔ ساون کی برستی رت کا ہو یا آبشار سے برستی بہار کا۔ تتلی کے رنگین پروں کا ہو یا گل کی پنکھڑیوں کا۔ وہ کسی کی سنگلاخ چٹانوں میں پرورش پانے والے برشتہ رنگ سنگین شباب کا ہو یا کسی مہ دل کو چٹکانے دل گل پیرہن ماہن کا۔ کسی ماہ وش کے رخ سیاہ کے خم ہوں یا خم آب رواں۔ حسن پھولوں ہوئی شفق کا ہو یا نکھری ہوئی دھنک کا۔ حسن کسی نغمۂ ماتاہ کا ہو یا کسی گلبدن کا یا کسی روتی دھنکے والی کا۔ مطرب جوئے بار کا ہو یا سکوت کوہسار کا۔ حسن تاروں بھری رات کا ہو یا مخمل ماہ پاراں کا۔ حسن کسی گل کا ہو یا گلزار کا۔ کوئل کی کوکو ہو یا پپیہے کی پی ہو۔ حسن کسی صورت میں ہو شاعر کے جذبات میں طوفان برپا کر دیتا ہے اور جوش صاحب تو خود فرماتے ہیں:

اب نکل جاتی ہے خطرے ہی کا سوقع کیوں نہ ہو
حسن سے بے تاب ہو جانا مری فطرت میں ہے

شاعر دراصل اس کائنات کی صنعت حسن کا جوہر ناطقہ ہے۔ اس لیے اگر کوئی شاعر یہ دعویٰ کرے کہ وہ شاعر ہے اور اس کے ساتھ یہ باور کرنے کی بھی کوشش کرے کہ اس کو کسی ایک شخصیت سے اس طرح محبت ہے کہ وہ کسی دوسرے کے دام حسن میں گرفتار ہو ہی نہیں سکتا تو سمجھ لیجیے کہ وہ کسی بھولی بھالی معصوم شخصیت کو دام ہوس میں گرفتار کرنے کے لیے شاعرانہ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ بہرحال یہ ایک خیال ہے جس سے کوئی شاعر متفق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بقول حضرت جوش:

کھڑوں پہ تکرد نظر نامحمود
اور جم کے جو دیکھ لیں تو ٹھہریں مردود
یا حسن سے اس کرہ کو خالی کر دے
یا بھاڑ میں جھونک دے یہ آنکھیں معبود

من ہی دل جوش صاحب نے ایک نظم کہی تھی آپ بھی سن لیجیے۔

کبھی پہلے نہ تھی

زندگی کی یہ شرر باری کبھی پہلے نہ تھی
آج کل ہے جو دل افگاری کبھی پہلے نہ تھی

یوں تو جھیلیں ہیں دل بیمار نے راتیں بہت
آج جیسی رات ہے بھاری کبھی پہلے نہ تھی

چکھ چکا ہوں یوں تو میں کتنے ہی بوسوں کی مٹھاس
لیکن اب ہے جو شکر باری کبھی پہلے نہ تھی

مدعا کہنے یوں تو اکثر ہوش بازاروں میں ہے
پر جو اب ہے بے خودی طاری کبھی پہلے نہ تھی

ہو چکا ہوں یوں تو اکثر بند زلف یار میں
اس قیامت کی گرفتاری کبھی پہلے نہ تھی

پڑ چکا ہوں بارہا بیمار اس سے قبل بھی
لیکن اس شدت کی بیماری کبھی پہلے نہ تھی

جوش نے جب تک نہ دیکھا تھا تجھے بت سن
ایسی کھڑے کی پرستاری کبھی پہلے نہ تھی

۱۹۶۹ء

اس مرحلہ جوش صاحب دسمبر کے ختم تک کراچی میں رہے پھر اسلام آباد روانہ ہو گئے۔

۱۹۷۷ء کے واقعات

دوسرے سال یعنی جنوری ۱۹۷۷ء میں ہندوستان چلا گیا وہاں سے تین مہینے کے بعد لوٹا۔ اس کے بعد پانچ جولائی کو بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہو گئی اور جنرل ضیاء الحق صاحب نے اقتدار سنبھال لیا مگر اس انقلاب سے جوشش صاحب کی ملازمت متاثر نہیں ہوئی۔ البتہ ان کا کراچی آنا جانا بہت کم ہو گیا۔ اس مدت میں میری ملازمت کی ذمہ داریاں بھی اس قدر بڑھ گئیں کہ کئی کئی ہفتے جوشش صاحب سے فون پر بھی بات نہ ہوتی تھی مگر ان سب باتوں کے باوجود جوشش صاحب جب بھی کراچی آتے کراچی کی تمام دوستیں لوٹ آتیں اور اس مدت کے دوران میں جوشش صاحب غم جاناں اور غم دوراں بھلا کر تمام دوستوں اور احباب سے ملتے رہتے۔

مسعود علی خاں کا انتقال

ایک مرتبہ جب جوشش صاحب نومبر ۱۹۷۷ء میں کراچی تشریف لائے تو سیدھے میرے گھر آئے ان دنوں میں اپنی زندگی کے انتہائی المناک سانحہ سے دوچار تھا۔ میرا نوجوان بیٹا مسعود علی خاں جو پاکستان کے جہاز پر چیف آفیسر تھا کولمبو میں جہاز پر حادثے کا شکار ہو کر اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ اس وقت ان کی بیگم اور دو معصوم چھوٹے چھوٹے بچے (ایک بچہ دو سال کا اور ایک بچی ایک سال کی) ان کے ساتھ جہاز ہی پر تھے۔ وہ تو اتفاق سے میرے چچا زاد بھائی عنایت علی خاں ان دنوں کولمبو میں حبیب بینک کے وائس پریذیڈنٹ تھے وہ مسعود علی خاں کی

بیوی اور بچوں کو حادثے سے نکال کر اپنے گھر لے گئے اور ان سب کو کراچی پہنچایا۔ یہ تیسری اکتوبر کا واقعہ ہے۔ جوش صاحب جب میرے گھر آتے تو بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہتے۔ پھر مجھے گلے لگا کر رونے لگتے۔ میں نے اس سے پہلے ان کو اس طرح روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل بھی بھر آتا تھا۔ میں بھی رونے لگتا۔

جوش صاحب مسعود کو بہت چاہتے تھے۔ جوش صاحب جب بھی ہمارے گھر قیام کرتے مسعود علی خاں ہی کے کمرے میں ٹھہرتے تھے اور مسعود ہمیشہ ان کے آنے پر دوسرے کمرے میں منتقل ہو جاتے تھے۔ طرفین بہت دیر تک ہم دونوں اسی حالت میں بیٹھے روتے رہے پھر جوش صاحب نے فرمایا شام کو میرے گھر ضرور آنا۔ اور یہ کہہ کر رخصت ہو گئے۔

ایک دن جب میں جوش صاحب کے گھر گیا تو اپنے ساتھ ایک سوالنامہ لے گیا اور ہر سوال کے جواب میں جوش صاحب کے ارشادات لکھتا رہا۔

سوالنامہ:

آپ کا پسندیدہ وصف؟

جوش صاحب نے فرمایا انسان دوستی۔

۲۔ آپ کی نظر میں امتیازی خصوصیت؟

فکر

۳۔ آپ کا مسرت کا تصور؟

دوسرے زیبا۔

۴۔ وہ برائی جس سے آپ سب سے زیادہ نفرت کرتے ہیں؟

مردم آزاری اور ظلم۔

۵۔ آپ کا ذلت و پستی کا تصور؟

جو شخص وقتی آسائش پر اپنے اصول کو قربان کر دے۔

۶۔ آپ کا پسندیدہ مشغلہ؟

شعر، شراب، شباب۔

۷۔ آپ کے محبوب شاعر؟

اردو میں نظیر اکبر آبادی۔ فارسی میں حافظ۔ ہندی میں کبیر۔

۸۔ آپ کے محبوب نثر نگار؟

محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد۔

۹۔ آپ کے ہیرو؟

یہ بہت مشکل سوال ہے۔

۱۰۔ آپ کا پسندیدہ رنگ؟

سانولا سلونا۔

۱۱۔ آپ کی پسندیدہ غذا؟

کباب

۱۲۔ آپ کے پسندیدہ نام؟

بچے۔ پن کا سوال ہے۔

اختر حسن صاحب کی کراچی آمد:

چوتھی دسمبر ۱۹۸۸ء کی بات ہے کہ میری بڑی بہن ریاست خانم اور صوفی جناب اختر حسن صاحب حیدر آباد دکن سے کراچی تشریف لائے۔ اس زمانے میں جوش صاحب بھی کراچی میں مقیم تھے جب اختر بھائی کو معلوم ہوا کہ جوش صاحب کراچی میں ہیں تو انھوں نے جوش صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں اپنی بہن اور اختر بھائی کو لے کر چھٹی دسمبر کو شام کے وقت جوش صاحب کے مکان پر گیا۔ جوش صاحب اختر حسن صاحب سے خوب واقف تھے ان کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ قارئین کی واقفیت کے لیے مناسب ہوگا کہ میں تھوڑا سا اختر حسن صاحب کا تعارف کروا دوں۔

اختر حسن صاحب پاکستان کے ادبی حلقوں میں زیادہ معروف نہیں ہیں مگر ہندوستان میں بالخصوص حیدر آباد دکن اور بمبئی میں ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ مولانا حسرت موہانی کے بھائی اکبر حسن کی صاحبزادے ہیں۔ حیدر آباد دکن میں انھوں نے

عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا پھر کلکتہ میں اردو کے استاد ہو گئے۔ جب قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد کی سکونت ترک کر کے دہلی چلے گئے تو اختر حسن صاحب کو اپنا اخبار روزنامہ "پیام" دے گئے۔

قاضی عبدالغفار صاحب کے زمانے میں اخبار کے سرورق پر یہ شعر لکھا جاتا تھا۔

یہ اس گروہ کی خاطر وفا مستعد

یہ "پیام" رسانیدہ ہر کجا ہستند

اختر حسن صاحب نے جب ادارت کے فرائض سنبھالے تو یہ شعر بدل کر دوسرا شعر لکھ دیا۔

عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے

ان کا پیام اور تھا میرا پیام اور ہے

پھر وہ آندھرا پردیش کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہو گئے۔ بعد میں ایک زمانے تک بھی میں اردو بلٹز کے ایڈیٹر رہے۔ آج کل آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے سیکرٹری ہیں حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ہیں اور مخدوم محی الدین کے ساتھی رہے ہیں۔

اختر حسن صاحب کے متعلق حیدرآباد دکن کی ادبی خاتون اور معروف ادبی شخصیت محترمہ احمد دیوی دھن راج گیر لکھتی ہیں۔

"اختر حسن کا شمار ان دانشور ترقی پسند دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہمارے ملک میں ترقی پسندی کی داغ بیل ڈالی اور اسے پروان چڑھایا۔ اپنے اصول اور نظریوں کی خاطر محل سے دیوی جاہ و مرتبت کو ٹھکرا دیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی بڑی خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کیں۔ ترقی پسند نظریہ حیات پر آج بھی ان کا ایمان کل سے اور اس صدی کے چوتھے دہے کے اوائل سے آج تک ان کی تمام نگارشات میں اس کا عکس جھلکتا ہے۔ فیض، احمد فیض، مخدوم محی الدین، سردار جعفری اور کرشن چندر، اختر حسن کے ساتھی اور ہم عصر ہیں۔ روزنامہ پیام اور اردو بلٹز (ہفت روزہ) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اختر حسن نے اردو زبان اور صحافت کی جو خدمات انجام دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔"

اختر حسن صاحب شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ انھوں نے غالب کی مشہور فارسی مثنوی "چراغ دیر" کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔

اس روز جب ہم لوگ جوش صاحب سے ملنے گئے تو اختر حسن صاحب نے "چراغ دیر" کے منظوم ترجمے کا ایک نسخہ جوش صاحب کو دیا اور یہ درخواست کی کہ وہ اس پر اپنی رائے بھی تحریر فرما دیں۔ جوش صاحب نے وعدہ کر لیا اور کتاب رکھ لی۔ اس رات ہم لوگ دیر تک جوش صاحب کے ساتھ بیٹھے رہے اور مختلف ادبی اور علمی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ جوش صاحب حیدرآباد کے متعلق پوچھتے رہے اس طرح تقریباً رات کے گیارہ بجے ہم لوگ اپنے گھر آئے۔ دوسرے دن بھی ہم لوگ جوش صاحب کے گھر گئے جوش صاحب نے چراغ دیر کے ترجمے کی بہت تعریف کی اور اس کتاب پر اپنی رائے لکھ کر اختر صاحب کو دے دی۔ انھوں نے لکھا کہ "اختر حسن صاحب نے اس قدر مہارت سے غالب کی مثنوی "چراغ دیر" کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے"۔

دسویں دسمبر ۱۹۷۰ء کو جناب شبر نقوی صاحب نے جوش صاحب کی دعوت ایرپورٹ پر ہوٹل مڈوے ہاؤس (Midway House) میں کی تھی مجھے اور اختر بھائی کو بھی مدعو کر لیا۔ اس روز ہم لوگ غروب آفتاب سے پہلے "مڈوے ہاؤس" پہنچ گئے۔ وہاں کے جنرل منیجر کرم صاحب نے ناؤ نوش کا بہت اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ رات دیر تک بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ جوش صاحب چونکہ صبح ساڑھے آٹھ بجے کی پرواز سے لاہور جانے والے تھے اس لیے وہ تو ہوٹل ہی میں سو گئے مگر میں اور اختر بھائی اپنے گھر آ گئے۔ جوش صاحب نے چلتے وقت تاکید کر دی تھی کہ صبح چھ بجے ضرور آ جانا اس لیے میں اور اختر بھائی صبح چھ بجے دوبارہ مڈوے ہاؤس پہنچ گئے۔ جوش صاحب باہر لان میں ٹہل رہے تھے۔ ہم سب نے ساتھ ہی ناشتہ کیا پھر جوش صاحب کو جہاز پر پہنچا کر ہم لوگ اپنے گھر آ گئے۔

۱۹۷۸ء کے واقعات

اس کے بعد مجھے مارچ ۱۹۷۸ء کو جوش صاحب کا ٹیلی فون اسلام آباد سے آیا کہ وہ آٹھویں مارچ کو بدھ کے دن ہوائی جہاز سے کراچی آ رہے ہیں۔ میں وقت مقررہ پر ایئرپورٹ پہنچ گیا مگر جہاز کی آمد کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ میں وہاں ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا پھر مجھے معلوم ہوا کہ ابھی جہاز اسلام آباد ہی سے روانہ نہیں ہوا ہے۔ میں مجبور ہو کر گھر چلا آیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ جوش صاحب ایئرپورٹ سے سیدھے میرے گھر چلے آئے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ بھئی خوب۔ مجھ سے وعدہ کر لیا مجھے ایئرپورٹ پر لینے آئیں گے اور گھر میں پڑے سو رہے ہو۔ میں نے کہا آپ کا جہاز صبح آٹھ بجے کراچی پہنچنے والا تھا میں ساڑھے سات بجے پہنچ گیا اور جب دس بجے مجھے معلوم ہوا کہ ابھی جہاز اسلام آباد ہی سے روانہ نہیں ہوا تو میں کیا کرتا؟

جوش صاحب نے فرمایا۔ تو پھر بھاگ کھڑے ہوئے؟"

میں نے کہا۔ جی ہاں۔ پھر میں گھر آ گیا۔"

کہنے لگے۔ بہت خوب۔ ڈرنک کا کیا بندوبست کرو گے؟"

میں نے کہا۔ اس دفعہ آپ یوسف جمال صاحب کے مہمان ہیں۔"

فرمایا۔ شام کو کب آؤ گے۔"

میں نے کہا۔ ساڑھے پانچ بجے۔"

موٹر سے اترے نہیں، یہ کہہ کر کہ۔ شام کو ضرور آنا۔ رخصت ہو گئے۔

اسی شام کو میں وقت مقررہ پر جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب غسل خانے میں تھے اور تخت پر ان کی ڈائری والا رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اتفاق سے میری نظر ایک ورق پر پڑی لکھا تھا۔ ۲۔ ۱۰۔ ۱۹۸۰ء بیداری ۴ بجے صبح سلام آباد۔

"رات کو ایک نہایت مہمل اور بادلوں کا خوش کرنے والا خواب دیکھا کہ مجھ کو ہندوستان کا پرائم منسٹر بنا دیا گیا ہے۔ اگر میرے دماغ کے کسی گوشہ پست میں چھٹ بھیا پن دبکا نہ بیٹھا ہوتا تو میں یہ ذلیل خواب کبھی نہ دیکھتا۔ حیرت اور شرم کی بات ہے کہ جو نوع بشر کو منصب الوہیت حاصل ہونے کا خواب دکھا رہا ہو اسے پرائم منسٹری کے فارمیں جھونک دیا جائے"۔

"قنوطر تو اسے چرخ گردیں تنو"

اسی رجسٹر میں یہ تحریر بھی لکھی ہوئی ہے۔

"دشمنی" دماغ کا سرطان ہے۔

"دشنام گوئی" اخلاق کا استفراغ (قے کرنا)

"حسد" آدمی "اعصاب کا اسہال۔

"غیبت" عقل کے صدمے کی کھلی ڈکاریں۔

"اس لیے پیغمبران عقل نے بدترین دشمن سے بھی عداوت پالنے کو مطلق حرام ٹھہرایا ہے"۔

اتنے میں جوش صاحب تشریف لے آئے کہنے لگے یہ کیا لکھ رہے ہو؟ میں نے کہا آپ کے مقالات دریں نقل کر رہا ہوں۔

جوش صاحب کی خواہش کہ میں ان پر کتاب لکھوں:

جوش صاحب نے فرمایا "خورشید علی خاں مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ آپ میری فکر کے ہر گوشے سے واقفیت حاصل کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا جوش صاحب یہ بتائیے کہ کیا مجھے آپ کی شخصیت اور فکر کے متعلق کوئی کتاب لکھنے کا حق حاصل ہے؟ جوش صاحب نے فرمایا۔ میرے خیال میں اس وقت میرے چاہنے والوں میں صرف آپ ہی مجھ پر کچھ لکھنے کا حق رکھتے ہیں اور اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو سخت ظلم ہو گا

اس کے بعد راغب صاحب اور سلامت علی خاں صاحب بھی آ گئے اور موضوع بدل گیا۔ رات میں جب میں رخصت ہونے لگا تو جوش صاحب نے فرمایا اگر وقت کو فرصت ہو تو صبح نو بجے تک آ جائیے یوسفی صاحب سے ملنے جائیں گے

مشتاق احمد یوسفی صاحب سے ملاقات:

میں ۱۱ مارچ ہفتے کے دن نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا جوش صاحب دیر بیٹھے تھے ہم دونوں مشتاق احمد یوسفی صاحب سے ملنے ان کے دفتر روانہ ہو گئے۔ یوسفی صاحب ان دنوں بینکنگ کونسل کے چیرمین تھے۔ (Chairman Banking Council) اور ان کا آفس جیب پلازہ میں آٹھویں منزل پر تھا۔ یوسفی صاحب بہت محبت اور احترام سے ہم لوگوں سے ملے جوش صاحب نے کسی کے لیے بینک کی ملازمت کے واسطے سفارش کی۔ یوسفی صاحب خاص ادا سے دیر تک مسکراتے رہے اور جوش صاحب سے اس شخصیت کے متعلق معلومات بھی حاصل کرتے رہے پھر فرمایا بینک کی نوکری کے لیے ایک امتحان ہوتا ہے اگر وہ اس میں پاس ہو گئیں تو پھر ان کے لیے تقرر آسان ہو گا۔ اس کے بعد چائے آ گئی ہم لوگ چائے پیتے رہے۔ یوسفی صاحب ان دنوں غالباً "آب گم" لکھ رہے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے دریافت فرمایا کہ اردو میں Scare crow کے لیے کیا لفظ ہے جوش صاحب نے فرمایا ہم تو اسے "بجوکا" کہتے ہیں۔ اس دن یوسفی صاحب سے مختلف موضوعات پر بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے میرا پتا لکھ لیا اور فرمایا کہ "آپ کو کسی وقت اپنے گھر پر دعوت دوں گا" لیکن اس کے بعد پاکستان میں سیاسی ہنگاموں کے باعث وہ لندن چلے گئے اور وہاں آغا حسن عابدی صاحب نے ان کو اپنے ساتھ بی سی سی آئی میں شریک کار کر لیا۔

یوسفی صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ روشن علی بھیم جی صاحب کے گھر گئے۔ وہاں بھیم جی صاحب کی بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ بھیم جی کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر آ گئے۔

حکیم سید بندگی شاہ صاحب

دوسرے دن جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ان کے گھٹنوں میں سخت درد رہتا ہے اگر کوئی اچھے ڈاکٹر یا حکیم ہوں تو ان سے مشورہ کیا جائے۔ میں نے کہا ڈاکٹر قاضی سے بڑھ کر اس وقت کون اچھا ڈاکٹر ہوگا ان سے مشورہ کر لیتے ہیں وہ سجاد صاحب کی بیگم کے قریبی عزیز بھی ہیں۔ خاندانی ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا کہ ان سے مشورہ ہو چکا ہے مگر ڈاکٹر لوگ اس مرض کے متعلق پیچیدہ طریقہ علاج سے کچھ زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ میں نے کہا تو پھر یہاں سے قریب ہی گلبرگ کی چورنگی پر ایک اچھے طبیب کا مطب ہے وہ میرے دوست بھی ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں گو ان کا رجحان زیادہ تر حمد اور نعت گوئی کی طرف ہے۔ ہم لوگ تو ان کو حکیم بندگی شاہ صاحب کہتے ہیں مگر ان کا پورا نام سید بندگی شاہ محمد برہان الدین جانفشانی ہے۔ ہر سال دھوم دھام سے ربیع الاول کا جشن مناتے ہیں اور سیکڑوں لوگوں میں لنگر تقسیم کرتے ہیں۔ میں بھی ایک مرتبہ اپنے محلے کے دوستوں کے ساتھ ان کی محفل نعت میں شریک ہو چکا ہوں۔ جوش صاحب نے یہ تفصیل تعارف سن کر فرمایا۔ تو پھر آج آپ کے ساتھ یہ تفریح بھی سہی۔ چنانچہ میں اور جوش صاحب صبح دس بجے حکیم صاحب کے مطب پہنچے۔ حکیم صاحب نے جب دیکھا کہ جوش صاحب ان کے مطب میں آئے ہیں تو ایک مریض کو جلدی سے فارغ کر کے جوش صاحب کا بڑے تپاک سے استقبال کیا اور اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا اور خیریت دریافت فرمانے میں آنے کا مدعا بیان کیا۔ حکیم صاحب نے پہلے تو نبض دیکھی پھر گھٹنوں کا معائنہ فرمایا پھر جوش صاحب سے کچھ سوالات کیے۔ آخر میں فرمایا کہ میں دوا تو دے دوں گا جس سے انشاء اللہ تعالیٰ درد میں تو ضرور افاقہ ہو جائے گا مگر گٹھیا کے مرض کا مکمل علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے کچھ سفوف اور ایک شیشی میں مکسچر دے کر فرمایا کہ یہ ایک مہینے کی دوائیں ہیں اگر ان سے افاقہ ہو گیا تو پھر اور دوائیں دوں گا۔ جوش صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جب ہم لوگوں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی تو حکیم صاحب نے چائے اور پان پیش فرمایا۔ پھر وہ جوش صاحب کی شاعری کی تعریف کرنے لگے تو میں نے جوش صاحب سے کہا کہ حکیم صاحب بھی شعر کہتے ہیں تو جوش صاحب نے ازراہ تکلف دل داری حکیم صاحب سے شعر سنانے کی فرمائش کر دی اور جب حکیم

صاحب نے اپنا عارفانہ کلام پیش کیا تو جوش صاحب نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد نہایت
اخلاق سے فرمایا کہ حکیم صاحب آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی مگر آپ اس وقت مطلب میں
ہیں اور یہ وقت آپ کی مشغولیت کا ہے۔ ہم کسی وقت آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو کر
آپ کے کلام سے مستفید ہوں گے۔ پھر جب ہم لوگ چلنے لگے تو حکیم صاحب نے اپنی مختصر
اور حد کا مجموعہ جوش صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ان کی رائے پہ کلام کے متعلق
چاہی۔ جوش صاحب نے فرمایا۔ میں اس کلام کا مطالعہ کر کے صرف اپنی رائے سے آپ کو مطلع
کروں گا۔ اس کے بعد دوائیں لے کر ہم لوگ گھر آ گئے۔ اس کے دوسرے دن جوش صاحب
نے حکیم صاحب کے مجموعہ کلام کے متعلق اپنی رائے لکھ کر مجھے دے دی۔ میں نے اس خط کی
فوٹو کاپی خود رکھ لی اور اصل خط حکیم صاحب کو دے آیا۔ جوش صاحب نے لکھا تھا۔

جوش ملیح آبادی فون نمبر ۲۲۲۲۲

حضرت سید بندگی شاہ محمد برہان الدین صاحب نقشبندی کا "مجموعہ کلام" پڑھ کر مجھے
بے حد خوشی ہوئی۔

حضرت ایسے مقدس بزرگ ہیں کہ ان کے حسن خلق کو دیکھ کر اس بات کا یقین ہو جاتا
ہے کہ وہ اس دور میں حضرت باقی اسلام کے "خلق عظیم" کا جیتا جاگتا مجسمہ ہیں۔ اب رہی
ان کی شاعری، سو اس کے باب میں اگر میں کچھ عرض کروں تو مجھ کو معذور ہی سمجھا جائے گا۔ بلکہ
مناسب ہے کہ ان کی خدمت کس پائے کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو ان ہستیوں کا
کلام رسالت و الوہیت کے بارے پر گائیں گی اور اصحاب فردوس کو وجد میں لائیں گے۔

جوش

۱۹۶۰-۳-۱۱

کراچی

میں نے وہ خط جا کر حکیم صاحب کو دے دیا۔ وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اب یہ میں نہیں کہہ
سکتا کہ حکیم صاحب اس مکتوب کا بین السطور مفہوم بھی پڑھ سکے یا نہیں۔ مگر خیر بقول غالب

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی فراغت نے نیرنگ صورت سلامت

یہ خط دے کر میں تو گھر آ گیا مگر اس کے بعد پھر کبھی حکیم صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی اور نہ

جوش صاحب ان سے ملے کیونکہ ان کی دوا سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

کراچی میں مزید چند روز کے قیام کے بعد جوش صاحب واپس اسلام آباد تشریف لے گئے۔

لاہور میں نفسیات پر سیمینار:

مئی ۱۹۷۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے "نفسیات" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا جس میں پاکستان کی تمام جامعات کے شعبہ نفسیات نے اپنے نمائندے بھیجے۔ جن میں اساتذہ، طلبہ اور طالبات شامل تھیں۔ کراچی یونیورسٹی کے جس گروپ نے حصہ لیا اس میں میرا نام بھی تھا۔ چنانچہ ہم لوگ تیسری مئی کو کراچی ایکسپریس سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارے گروپ کے اساتذہ میں جناب افضل امام، جناب غلام رسول کے علاوہ چند خواتین بھی تھیں۔ طلبہ میں میرے علاوہ جناب سید ساجد علی ساجد اور ریاست علی خان تھے۔ ہم لوگ دوسرے دن یعنی چوتھی مئی کو بارہ بجے لاہور کے سٹیشن پر اترے۔ وہاں جناب یونیورسٹی کے نمائندے جناب میاں آفتاب احمد صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم لوگ جامعہ کے اقامت خانے نمبر ۱ میں ٹھہرائے گئے۔

یونیورسٹی اور اس کے اقامت خانوں کی عمارات لاہور شہر سے دور شہر کے قریب بہت خوبصورت اور سرسبز و شاداب مقام پر واقع ہیں۔

جمعہ ۵ مئی کو کانفرنس شروع ہوئی جس کا افتتاح اس وقت کے قائم مقام صدر جناب جسٹس انوار الحق نے کیا۔

جب میں اور ساجد علی ساجد صاحب کانفرنس ہال میں داخل ہو رہے تھے تو ایک نسوانی آواز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ "خورشید صاحب! آداب" میں نے پلٹ کر دیکھا تو سمن مجھ سے مخاطب تھیں۔ میں نے حیرت انگیز مسرت سے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا "اس وقت آپ یہاں کہاں؟" سمن نے کہا جناب آپ ہمارے شہر بلکہ ہماری جامعہ میں آئیں اور ہم آپ کے استقبال کے لیے حاضر نہ ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے ساجد صاحب سے ان کا تعارف کروایا۔ "یہ سمن ہیں جن کی شاعرانہ صلاحیت اور عظمت کے حضرت جوش بھی مداح ہیں۔ اسی جامعہ سے نفسیات میں ایم اے کیا ہے۔ پھر ہم تینوں ایک

ہی جگہ بیٹھ گئے۔

جسٹس اوردالق صاحب نے خطبہ صدارت میں علم نفسیات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کے نفسیات دانوں کو اسلامی نفسیات پر بھی تحقیق کرنا چاہیے۔ خطبہ صدارت کے اختتام پر جب تمام شرکائے کانفرنس چائے پینے کے لیے ایک ہال میں جمع ہوئے تو وہاں بحث چھڑ گئی کہ کیا نفسیات کا بھی کوئی مذہب ہو سکتا ہے؟ یہ جناب صدر نے اسلامی نفسیات پر تحقیق کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ سائنسی علوم کب سے کسی مذہب کے تابع ہونے لگے۔ سائنٹفک فکر کی تو خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ حقیقت کی تلاش میں پہلے سے قائم شدہ عقائد کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ مذاہب نے اپنی تبلیغ و اشاعت کے لیے نفسیاتی عوامل سے استفادہ کیا ہو لیکن یہ کہنا کہ نفسیات کا کوئی مذہب ہو کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ علم نفسیات دراصل ان تمام عوامل اور محرکات سے بحث کرتا ہے جو انسانی رویوں کا تعین کرتے ہیں۔ اس میں مذہبی عقائد بھی سب اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے عرض کیا کہ شاید صدر صاحب کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظریات اور اقدار حیات کو انسانی عمل کی قوت محرکہ بنانے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں۔ ان پر تحقیق نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔ یہ کانفرنس تین دن جاری رہی اور نفسیات کے مختلف موضوعات پر بہت سے تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔ اس کے علاوہ مشاعرہ بھی ہوا اور موسیقی کی محفل بھی منعقد ہوئی۔ دعوتیں بھی ہوئیں اور پنجاب کے لوگوں نے اپنی روایتی مہمان نوازی سے ہر شخص کا دل موہ لیا۔ آخر میں پکنک بھی ہوئی جہانگیر اور نور جہاں کے مقبروں کی سیر بھی۔ اس تمام مدت کے دوران سمن سے مختلف موضوعات پر دلچسپ گفتگو بھی رہی۔ ان میں ایک بہت اہم موضوع خود سمن اور جوش صاحب کی محبت کا بھی تھا۔ جس پر ہم دونوں نے معروضی انداز میں گفتگو کی۔ سمن کا کہنا یہ تھا کہ اس کو جوش صاحب کی شخصیت کا فکری اور ادبی پہلو بہت پسند ہے اور ان کی اور جوش صاحب کی عمروں میں جو فرق ہے اس میں کسی جنسی جذبے کے پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے سمن دیکھیے جناب آپ نفسیات کی طالبہ ہیں اور میں بھی اس وقت ایک

نفسیات کے طالب علم کی حیثیت سے گفتگو کر رہا ہوں۔ یہ بتائیے کہ جوش صاحب سے آپ کی دلچسپی میں خود آپ کو اپنی ذات سے دلچسپی کا کتنا حصہ ہے؟ آپ جانتی ہیں کہ جوش صاحب اس وقت اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور اس اعتبار سے تمام برصغیر میں مشہور بھی ہیں۔ اب اگر آپ ان کی شاعری کا موضوع بن جائیں تو آپ کو جو شہرت ملے گی یا مل رہی ہے اور ان کی شاعری میں جو آپ کی تعریفوں کے گیت گائے جا رہے ہیں کیا وہ آپ کی انا کے لیے بے پناہ مسرت کا باعث نہیں ہیں؟

میں نے کہا کہ یہ آپ بالکل درست فرما رہے ہیں دراصل انا کی پرستش تو ہر انسان میں بقدر بیماد تخیل ضرور ہوتی ہے اور اس لیے ایک عظیم شاعر سے اپنی تعریفیں سن کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے اس کا ضرور ناقابل بیان ہے اور غالباً قدرت نے یہ جذبہ عورت میں کچھ زیادہ ہی ودیعت کیا ہے کہ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے۔ عورت چاہتی ہے کہ وہ مرد کی توجہ کا مرکز بنی رہے۔ اس کے بنا وہ سنگھار کی نفسیات میں بھی یہی جذبہ قوت محرکہ کے طور پر کام کرتا دکھائی دیتا ہے اور اکثر موافق حالات میں یہ جذبہ پسندیدگی محبت میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اس میں جنسی خواہش بھی شریک ہو۔ حالانکہ تحت الشعور میں جنسی جذبے کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے کہا کہ جن جذبات کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے یہی پسندیدگی کے وہ جذبات جو کسی کی تعریف سے پیدا ہوتے ہیں ان میں جنس کی یہ نسبت دراصل ہماری مشرقی سوسائٹی میں عورت کی محرومیوں کا زیادہ دخل ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کسی مرد کی نسبت زیادہ محرومیوں کا شکار ہے اور اس کا معاشرتی درجہ بھی مرد کے مقابلے میں کم ہے جس کی وجہ سے اس میں احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے اور اس لیے جب کوئی شخص اس کی تعریف کرتا ہے تو اس میں ایک برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور جو شخص اس میں یہ احساس پیدا کر دے وہ اس کو پسند کرنے لگتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے بہت صحیح بات کہی ہے۔ میں نے میری جوش صاحب کے ساتھ دلچسپی میں چونکہ کوئی جنسی جذبات کی رنگینی شریک نہیں ہے اس لیے ہماری محبت کو عشق نہیں کہا جا سکتا مگر اس کو آپ بالکلیہ خود غرضی اور انا پرستی بھی نہیں کہہ سکتے گو اس کی ابتدا انا پرستی ہی سے ہو سکتی ہے۔

میں نے کہا کہ پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آپ کو کوئی لڑکا پسند آ جائے گا تو آپ اس سے شادی کر لیں گی۔ سمن نے کہا کہ جب وہ وقت آئے گا اور کوئی لڑکا میرے معیار پر پورا اترے گا تو شادی بھی کر لوں گی۔ میں نے کہا کہ آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ آپ کی شادی سے جوش صاحب پر کیا اثر ہو گا؟ کہنے لگیں کہ میں نے جب اس مسئلہ پر جذبات سے ہٹ کر سوچا تو میری عقل نے مجھ سے کہا کہ کیا تم کو حضرت جوش کا یہ قول معلوم نہیں کہ:

وہ پیچ سلام نہ گزرو یہ دھنگے از بوسے بوسے بردار رنگ دے گے

جب تم نہ ہو گی تو کوئی دوسری لڑکی شاعر جوشش کی شاعری کا موضوع بن جائے گی۔ جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں جہاں انہیں معاشقوں کا ذکر کیا ہے ایک جیوان خلق اور شاعر ہو جائے گا اور جہاں تک میرا تعلق ہے یہ تو آپ جانتے ہیں کہ شادی ہر شخص کی ایک حیاتیاتی ضرورت بھی ہے اور جیون ساتھی کے انتخاب میں بہت سی باتوں کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے جس میں عمر کی ہم آہنگی بھی ایک اہم پہلو ہے اس کے علاوہ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جوش صاحب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سعادت مند اور انصاف پسند انسان بھی ہیں جو انسانی جذبات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جب ان کو میری شادی کے متعلق معلوم ہو گا تو چند دن بے چین رہنے کے بعد وہ خود کو اس بات پر قائل کر لیں گے کہ میں نے کوئی نامعقول حرکت نہیں کی اور اگر ان کو مجھ سے سچی محبت ہے تو انہیں میری خوشی سے خوش ہونا چاہیے مگر یہ تمام باتیں بھی قبل از وقت ہیں کیونکہ ابھی مجھے کوئی ایسا لڑکا نظر نہیں آتا جو میرا جیون ساتھی بن سکے۔ میں نے کہا آپ نے جوش صاحب کی نظم "شادی مرگ" سنی ہے؟

سمن نے جواب دیا ہی نہیں۔ اس میں کیا ہے؟

میں نے کہا جوش صاحب انتہائی حساس انسان ہیں وہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ آپ کا اور ان کا کوئی جوڑ نہیں ہو سکتا آپ عمر کی جس منزل میں ہیں اس میں ایک نہ ایک دن آپ کی شادی بھی ہو جائے گی اور اگر وہ واقعہ جوش صاحب کی زندگی میں ظہور پذیر ہوا تو شاعر جوش پر کیا بیتے گی وہ انہوں نے اس نظم میں بیان کر دیا ہے۔ سمن نے دریافت کیا کہ کیا وہ نظم آپ کو یاد ہے تو میں نے کہا اتفاق سے وہ نظم میں نے اپنی ڈائری میں لکھ لی ہے۔ اگر آپ کہیں تو

آپ کو سناؤں؟ سن کہنے لگیں ضرور سنائیے بلکہ مجھے لکھ کر دے دیجیے۔ میں نے ایک کاغذ پر لکھ کر وہ نظم سن کو دے دی۔ نظم یہ ہے:

"شادی مرگ"

رہ نامعلوم سے اک اجنبی کل آئے گا
اور تجھے اے جان مجھ سے چھین کر لے جائے گا
جب تری مخملاں میں پازیب جھنکائے گی تو
ہائے کیا کیا پے سنائے پہ رونا آئے گا
جب ترے چہرے پہ رنگ جنبیت پائیں گا
تیرا دور التفات آنکھوں تلے پھر جائے گا
رس کی بوندیں تجھ پہ ٹپکائے گا جب ابر حیات
اس جبیں پر موت کا ٹھنڈا پسینہ آئے گا
جب کسی ناآشنا گوشے میں چھپ جائے گی تو
میری متوار زندگی کا دل مسلسل گھبرائے گا
جب نسیم صبح تو تجھ کو جگانے آئے گی
تیرا دکھیا جوش زندگی قبر میں سو جائے گا

سن یہ نظم سن کر خاموش ہو گئیں۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو گئے اور پلکوں کا ابر موتی برسانے لگا۔ میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب میں نے محسوس کیا کہ اب ان کی حالت سنبھل گئی ہے تو میں نے کہا اس کانفرنس کے اختتام پر میں اسلام آباد جاؤں گا اور جوش صاحب کے گھر قیام کروں گا۔ اگر آپ کا کوئی پیغام ہو تو ان کو پہنچا دوں۔ سن بولیں کہ اگر وہ میرے متعلق دریافت فرمائیں تو کہہ دیجیے گا کہ خیریت سے ہے اور اس۔

اس واقعہ کے چند سال بعد ہی سن کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی ہیں۔ اب تو ہاشمی صاحب کی سب بچیوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں اور

اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ مگر افسوس کہ جوش صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ (خیر، یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔)

اسلام آباد کا سفر:

لاہور میں نفسیات پر یہ دلچسپ کانفرنس آٹھویں سنہ ۱۹۸۰ء کو ختم ہو گئی اور میں اسی کوریل کار سے پنڈی روانہ ہو گیا۔ پہلے سے پہلے چونکہ میں نے جوش صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی اس لیے وہ اسٹیشن پر تشریف لے آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔

گھر پہنچ کر جب ہم لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو جوش صاحب نے لاہور کانفرنس کی تفصیل دریافت فرمائی۔ میں نے وہ تمام واقعات جو اس کانفرنس میں پیش آئے ان کو بتائے اور جس قدر مجھ سے ممکن ہو سکا ان مختلف مضامین کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔ جن کے متعلق کانفرنس میں مقالے پڑھے گئے تھے۔ جوش صاحب نے فرمایا کہ علم نفسیات پر جس قدر تحقیق ہوگی اور نفس انسانی کی گتھیاں سلجھتی جائیں گی اسی قدر باطل توہمات مٹتے جائیں گے اور انسان جس قدر خود آگاہ ہوتا جائے گا خالق کائنات پر اس کا تصرف بڑھتا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اس کانفرنس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ تمام مقررین کا نقطہ نظر معروضی اور سائنٹفک تھا۔ جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو جوش صاحب نے دریافت فرمایا کہ لاہور میں کن کن لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ جوش صاحب کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ بقول غالب:

دل و جانم بہ تو مشغول و فکر در چپ و راست
تا نہ دانند رقیباں کہ تو منظور منی

میں نے عرض کیا کہ جناب یوسف سلیم کی خدمت میں سن بھی تھیں ان سے بھی ملاقات ہوئی اور بہت سے نفسیاتی مسائل پر دلچسپ گفتگو بھی ہوئی مگر جوش صاحب سن کا نام سن کر خاموش ہو گئے اور بات کو وہیں ختم کر دیا پھر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اسلام آباد آنے کی کوئی خاص وجہ تو نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میرے ایک عزیز کا کچھ کام ہے۔ ان کی درخواست سیکرٹری داخلہ جناب روئیداد خان صاحب کے پاس ہے اگر آپ ان سے سفارش فرما دیں تو شاید کام بن جائے۔ جوش صاحب نے فرمایا کہ کل چل کر ان سے مل لیں گے۔

دوسرے دن جوش صاحب کے ساتھ رئیس امروہوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بہت اخلاق اور احترام سے جوش صاحب کا استقبال کیا۔ چائے پیش کی۔ پھر آنے کا سبب دریافت فرمایا۔ جوش صاحب نے مدعا بیان کیا۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں جوش صاحب کے ایک تعارفی خط کے ساتھ ایک اور درخواست ان کے دفتر میں دے دوں۔ وہ کوشش کریں گے کہ کام بن جائے۔ میں کا شکریہ ادا کر کے ہم لوگ ان کے جوائنٹ سیکرٹری ضیاء حسین صاحب کے کمرے میں گئے وہاں ایک درخواست لکھ کر جوش صاحب کے خط کے ساتھ ان کو دے دی اور گھر آ گئے۔ میں اسی دن لوٹ جانا چاہتا تھا مگر جوش صاحب نے اصرار سے ایک دن اور روک لیا چنانچہ میں دوسرے دن کے ہوائی جہاز سے واپس ہوا۔

اس کے بعد سن ۷۰ء میں کو میں ایک ضروری کام سے دوبارہ اسلام آباد گیا۔ اس مرتبہ میں نے پی سی کے گھر قیام کیا۔ وہاں سے میں نے جوش صاحب کو ٹیلی فون کیا تو ان کی بیوی نے بتایا کہ سو رہے ہیں۔ میں نے اپنی قیام گاہ کا ٹیلی فون نمبر اور پتا لکھوایا۔ شام پانچ بجے جوش صاحب اپنی گاڑی میں خود ہی تشریف لے آئے اور میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا۔ اسلام آباد میں دیسے بھی شام کو بہت کم لوگ جوش صاحب کے گھر آتے تھے اور جب سے بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہوئی تھی جوش صاحب کی تنہائیاں زیادہ ہونے لگی تھیں مگر اس شام جوش صاحب کے بھتیجے کلام حیدر صاحب آئے تو اپنے ساتھ اپنے دو اور دوستوں کو بھی لے آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی کالج میں اردو کے استاد ہیں اور جوش صاحب کو بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ صاحبان اپنے ساتھ اردو کے الفاظ اور جملوں کی ایک فہرست لائے تھے تاکہ جوش صاحب سے اصلاح لے سکیں۔ انھوں نے جوش صاحب کی اجازت سے دریافت کرنا شروع کر دیا۔

جوش صاحب یہ بتائیے کہ زبان کی درستی پر رہے یا پیشی؟

جوش صاحب۔ تصحیح زبان ہے ہم زبان سمجھیں گے

اب مہربانی فرما کر ان الفاظ کا صحیح تلفظ بتائیے۔ ان صاحب نے کہا۔ امر۔ ترس۔ رقم۔ پری۔ فلسفہ۔ شرفا۔ عرق۔ فرض۔ دفع۔

جوش صاحب۔ ان تمام الفاظ میں پہلا اور دوسرا حرف متحرک ہے۔ شائع۔ شائع۔ طلاق۔ طلاق۔ ان الفاظ میں تیسرے حرف کے نیچے زیر ہے۔ اعراض۔ اعراض۔ اقدام۔ مکالمہ۔

الفاظ میں پہلے حرف کے نیچے زیر ہے۔ الیہ۔ طریہ۔ قلیہ۔ پہلے تینوں حروف متحرک ہیں مگر غلطی سے دوسرا حرف ساکن کر دیا جاتا ہے۔ محبت میں "م" پر زبر ہے غلطی سے پیش بولتے ہیں۔ مروت، چہرہ دیکھ کر رعایت کرنا۔ "م" پر پیش ہے۔ سارا دن، سارا مہینہ، سارا سال خوش رہا۔ یہ جملہ غلط ہے۔ اس کے بجائے سارے دن، سارے مہینے، سارے سال خوش رہا، درست ہے۔ جس حرف کے آخر میں "الف" یا "ہ" ہو اسے جب جملے میں استعمال کریں تو "الف" یا "ہ" کو "ے" سے بدل دیں گے۔ اس طرح ڈھاکہ کو ڈھاکے کہا گیا تھا۔ کلکتہ کو کلکتے کہا گیا تھا اور پونا جملے میں پونے ہو جائے گا۔ "جہاں تک ممکن ہو سکا یا ہو سکے" غلط ہے۔ اس کے بجائے "جہاں تک ممکن ہو یا ممکن ہو" درست ہے۔ "کارخانے کے مالک کو گرفتار کر لیا گیا" کے بجائے "کارخانے کا مالک گرفتار کر لیا گیا" درست ہے۔ "گھی کی صحت کو قومیانے کے باوجود" غلط ہے۔ اس کے بجائے "گھی کی صنعت کے قومی ملکیت میں لے جانے کے باوجود" درست ہے۔

تھوڑی دیر تک تو جوش صاحب یہ درس و تدریس برداشت کرتے رہے پھر بے کیف ہو کر بولے۔ میاں اب کوئی اور موضوع چھیڑو۔ میں نے کہا جوش صاحب اب آپ ہی کچھ کلام سنائیے۔ سب نے میری تائید کی تو جوش صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اچھا اب کچھ اشعار سنیے۔ یہ اساتذہ کے لیے ہیں۔

مبارک باد ہاں اے ذوقِ تحقیق — کہ ہر مطلع ہے طشتِ بدایں
درخشاں ہے الوہیت کا دیہیم — بہ فرقِ خاندانِ نوعِ انساں
رواقِ عصر کا طاقِ نگاریں — مبارک اے چراغِ لاکساں
تعالی اللہ کہ جامِ زندگی میں — صفات و ذات کا پرتو ہے شامل
کوئی شبنم بنا آہستگی سے — گلوں کی دھڑکنوں پر ہے خراماں
مری تخیل میں غلطاں ہے اے جوش — شکن ہائے قبائے نو عروساں

اساتذہ میں سے ایک صاحب نے کہا جوش صاحب ان میں سے بعض اشعار میری سمجھ میں نہیں آئے، مہربانی فرما کر ان کا مفہوم بھی بتا دیجیے۔

دوسرے شعر میں دیہیم کے معنی کیا ہے؟

جوش صاحب۔ وسیم کے معنی ہیں تاج شاہی اور الوہیت کا وسیم کے معنی ہیں عظمت الٰہی کا تاج ان لوگوں کے سروں کی زینت ہوتا ہے جو انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔

استاد تیسرے شعر میں رواق کے کیا معنی ہیں؟

جوش صاحب رواق کے معنی تو مکان کا کمرہ اور خود مکان یا محل کے ہیں مگر یہاں مراد ہے کائنات سے اور طاق نگہ یں سے مراد کائنات کا حسن ہے اور چراغ راہ کہاں سے مراد "انسان" ہے۔ اسی طرح چوتھے شعر میں "جام درخشاں" سے انسان کی عقل کی طرف اشارہ ہے جو صفات ذات خداوندی کی آئینہ دار ہے۔

ان دونوں حضرات نے جوش صاحب کا بے حد شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم لوگ اپنی قسمت پر جس قدر ناز کریں کم ہے کہ آپ کے عہد میں زندہ ہیں۔ جوش صاحب تاج زبان و بیان کے یہ باریک نکات ہمیں کوئی بتانے والا نہیں ہے اور اگر کوئی کہیں ہے بھی تو ہماری پہنچ اس تک نہیں ہے۔ جوش صاحب اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم دونوں کبھی کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہیں؟

جوش صاحب نے فرمایا ضرور آتے رہیے مگر پہلے ٹیلی فون سے وقت ضرور متعین کر لیا کیجیے تاکہ آپ بھی دور آئیں اور میں بھی مل سکوں تو آپ کو پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ میں نے کہا جناب آپ حضرات خوش قسمت ہیں کہ جوش صاحب اسلام آباد میں موجود ہیں۔ آپ لوگوں کو تو چاہیے کہ بقول فیض احمد فیض:

حلقہ کیے بیٹھے رہو اس شمع کو یارو — کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

اور بقول خود جوش صاحب

جوش قرنوں کے اندھیروں سے اماں پانے کو
قرب یک لمحہ صاحب نظراں کافی ہے

اس کے بعد سب لوگ رخصت ہو گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ اپنی بہن کے گھر آ گیا۔

دوسرے دن اپنے کام سے فارغ ہو کر شام کو جوش صاحب کے گھر چلا گیا۔ وہاں اس شام ظہیر صدیقی صاحب جنھوں نے نقش ہائے رنگ رنگ مرتب کی ہے، جو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ ایک اور

صاحب بھی تھے۔ پھر کراچی سے مجیب خیر آبادی بھی آ گئے تھے۔ اس شام بہت دیر تک شاعری اور ادبی گفتگو ہوتی رہی اور بہت لطف آیا۔

جوش صاحب نے ہم لوگوں کو اپنے ساتھ کھانے میں بھی شریک کر لیا۔ اس رات میں اور مجیب صاحب خیر آبادی جوش صاحب ہی کے گھر ٹھہر گئے۔

دوسری صبح کا آغاز ایک ہنگامے سے ہوا۔ جناب صاحب اپنے بیٹے اور بیٹیوں سے تلخ کلامی کر رہے تھے۔ جوش صاحب بھی بیدار ہو گئے اور جب ان کو اس ہنگامے کا سبب معلوم ہوا تو بے حد افسردہ ہوئے۔ بات یہ تھی کہ بچوں نے جناب صاحب کی شراب کی بوتل چھپا دی تھی کیونکہ جوش صاحب نے تھیں دن میں شراب پینے سے منع کر رکھا تھا مگر جو شخص نشے کا عادی ہو جائے وہ باپ کی نصیحت کی کہاں پروا کرتا ہے۔ وہ ہنگامہ اس وقت ختم ہوا جب جناب صاحب کو بوتل مل گئی جسے لے کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر شام تک ان کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اس دن چونکہ اسلام آباد میں میرا کام مکمل ہو چکا تھا اس لیے میں شام کی پرواز سے کراچی واپس آ گیا۔

جوش صاحب اور ریڈیو پاکستان کا انٹرویو

۱۹۷۱ء میں جب کہ بھٹو صاحب کی حکومت تھی۔ ریڈیو پاکستان والوں نے جوش صاحب کا ایک انٹرویو اس معاہدے کے تحت ریکارڈ کیا تھا کہ اس کو ان کی زندگی میں نشر نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس انٹرویو کا موضوع ایسے حساس مسائل پر مشتمل تھا کہ ان پر کوئی دنیادار شخص مصلحت بینی کا پردہ اوڑھے بغیر گفتگو کر ہی نہیں سکتا تھا مگر جوش صاحب کی حق گوئی اور دل کی بات بلا کسی مصلحت یا خوف کے صاف صاف بیان کرنے کی عادت نے ان سے اختصار کے ساتھ ایسے جوابات دلوائے جو دراصل تشریح کے بغیر سخت قسم کی غلط فہمی پیدا کر سکتے تھے اور ان کے مخالفین کے ہاتھ میں ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک مہلک ہتھیار ثابت ہو سکتے تھے۔ ویسے بھی جوش صاحب نے کبھی اپنے خیالات کو راز میں نہیں رکھا۔ انھوں نے نقاد حساس مسائل کے متعلق جو کچھ سوچا اس کو برملا بیان کیا کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ:

اے ہمت مردانہ حسن ہائے دقیق کیوں وحشت اہل دل سے ناگفتہ رہیں

مگر اس سے پہلے کہ ہم جوش صاحب کی فکر کے جزائے ترکیبی پر تفصیل سے روشنی ڈالیں ہمیں بدنام نامہ انٹرویو کا ذکر کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کن حالات میں اور کن شرائط کے تحت یہ انٹرویو ریکارڈ کیا گیا تھا۔

انٹرویو کرنے والی جماعت حسب ذیل تین اصحاب پر مشتمل تھی۔

۱۔ شاہ حسن عطا صاحب۔ جو اس وقت ریڈیو پاکستان کی سابقہ سروس کے سربراہ تھے مگر خاص طور سے اس جماعت میں اس لیے شریک کیے گئے تھے کہ وہ جوش صاحب سے مخاطب کریں۔

۲۔ عبدالحمید صاحب عظمی۔ کنٹرولر پروگرام پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن راولپنڈی۔

۳۔ سعید صاحب شمسی پروگرام منیجر راولپنڈی۔

سب سے پہلے شاہ حسن عطا صاحب نے گفتگو کا آغاز بات کو اس طور گھما پھرا کر کیا کہ

بقول غالب:

در خورد گفتگو از آگہی دماندہ ایم پیچ و تاب رہ بکاوش دوری سر منزل است[1]

چنانچہ جب انھوں نے جوش صاحب کی تعریفیں کرنے کے بعد، پتا طویل اور گنجلک سوال ختم کیا تو جوش صاحب نے انتہائی معصومیت سے فرمایا کہ وہ اپنا سوال دہرائیں۔

میں چاہتا ہوں کہ شاہ حسن عطا صاحب کے الفاظ بھی قارئین تک پہنچا دوں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس انٹرویو کے لیے کس قسم کی نفسیاتی فضا پیدا کر دی گئی تھی اور کس قسم کے تحفظات کا وعدہ کیا گیا تھا تاکہ جوش صاحب انتہائی بے تکلفی کے ماحول میں گفتگو کر سکیں۔

شاہ حسن عطا صاحب۔ میں حسن عطا آپ سے ہم کلام ہوں۔ ایک بات مجھے اس وقت محسوس ہوتی ہے کہ آپ سے بات کرنا بڑا مشکل ہے۔ یہی مشکل ان معنوں میں کہ آپ زبان و بیان کے ست بڑے پارکھ ہیں اور شاعر کی حیثیت سے آپ اس مقام پر ہیں کہ خود آپ کو تصرف کا حق ہے تو مجھے ڈر محسوس ہوتا ہے کہ خبر نہیں کہ میری زبان سے کون سا ایسا

---

[1] ہم گفتگو کی پیچیدگیوں میں حقیقت کی آگہی سے بعد ہو گئے ہیں
جیسے اگر راستہ پیچیدہ اختیار کیا جائے تو منزل بعد ہو جاتی ہے۔

لفظ نکل جائے جو زبان و بیان کے آداب کے منافی ہو لیکن ہر صورت وہ جو غالب کا ایک شعر ہے کہ،

در دل ز تمنائے قدم بوسش تو خونیست[1]
خوقست چہ نگ داد ہ ذوق ادبم را

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی شخصیت ایک ایسی جامع شخصیت اور جاندار شخصیت ہے اور اس میں میں نے کوئی لفظ زائد استعمال نہیں کیا۔ حمید نظامی صاحب تشریف رکھتے ہیں فضلی صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ یہ تمام حضرات ہم سبھی آپ سے واقف ہیں اور ہمیں واقف ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں جو آپ سے واقف نہیں ہے تو ہمارے آنے کا مدعا یہ تھا کہ ویسے تو رسمی انداز سے بہت سی گفتگوئیں ہوتی ہیں لیکن ایک ایسی گفتگو آپ سے ہو جائے اور آپ کا ذہن اس کے لیے آمادہ ہو جائے تو یہ ہماری بڑی خوش بختی ہوگی کہ جس میں آپ اپنی شخصیت کو کھول دیں وہ جیسے کشور کشائی ہوتی ہے یعنی یہ کہ کشور کشائی اقلیموں کو کھولتا ہے تو شخصیت کے ایسے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ شخصیت ایسی پیچیدہ چیز ہے اور ایک انسان کے لیے کچھ اپنے بارے میں کہنا بڑا دشوار بھی ہوتا ہے تو میں سب سے پہلی بات تو آپ سے یہ گزارش کروں گا یعنی ابتدا یہاں سے کروں گا کہ چونکہ آپ بہت ہی یکسر گیر شخصیت کے مالک ہیں اور آپ نے زمانے کے بڑے نشیب و فراز بھی دیکھے ہیں اور بہت سی آپ نے گزری ہیں مختلف شہروں میں تو یہ جو انقلابی تصورات ہیں پاکستانی تحریک سے متعلق اس کے بارے میں خود آپ کی رائے کیا ہے؟

حسن عطا صاحب نے گفتگو کی بھول بھلیوں میں سوال کو اس قدر گم کر دیا تھا کہ جوش صاحب نے طویل تمہید سننے کے بعد نہایت معصومیت سے فرمایا۔

جوش صاحب۔ سوال دہرا دیں۔

حسن عطا صاحب۔ میرا سوال یہ ہے وہ یہ ہے کہ جو تصورات منتخب ہوئے تھے سیاسی جس کے نتیجے میں پاکستان معرض ظہور میں آیا اس سلسلے میں آپ کا ذاتی ردعمل کیا ہے؟

---

1. میرے دل میں تیری قدم بوسی کی تمنا جوش پر ہے
تیرے خیال نے ذوق ادب کو کس قدر وقت بخشی۔

آپ نے اس کو ایک مستحسن نگاہ سے دیکھا اور آپ کے نزدیک یہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کام ہوا یا نہیں ہوا یا اس کے کیا اثرات ہونے چاہئیں تھے جو نہیں ہوئے اور خود آپ کا ردعمل اس سلسلے میں کیا ہے؟

جوش صاحب۔ مگر آپ میری بات کو نشر نہ فرمائیں کیونکہ یہ وہ بات ہے کہ "فاش گر گیم جہاں برہم زدم"۔ میں قلیل الاصحاب اور کثیر الاعداء ہوں۔ میں گر کھل کر کھل گیا اور آپ نے اس کو نشر کر دیا تو میرے دشمن اور بڑھ جائیں گے۔ آپ اس کا وعدہ فرمائیں کہ میرے انتقال کے بعد میری اس آواز کو سنائیں گے تو میں حرفِ حرفِ کروں۔

حسن عطا صاحب۔ ٹھیک ہے جوش صاحب آپ عرصے تک اس دنیا میں تشریف رکھیں آپ کا وجود بڑی غنیمت ہے۔ آپ مختلفات میں سے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی پوری شاعری میں مجھے جو ایک چیز نظر آئی وہ ہے صداقت۔ آپ کے جذبات میں صداقت ہے۔ آپ میں اس چیز جس کو نفاق یا ریا یا دورنگی کہتے ہیں یا تضمیر کا میں نے دور دور تک کوئی نشان نہیں دیکھا ہے۔ میں آپ کا ایک مت ہی گہرا طالب علم ہوں۔ آپ کی تمام تصانیف میری نظر میں ہیں اور اسی لیے شاید مجھے منتخب بھی کیا گیا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو آپ بلاتکلف فرمائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک سچی بات کہنے میں آپ جیسے ایک بڑے شاعر کو کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ کہلوایا جا رہا ہے اس کا قطعاً کوئی غلط استعمال نہیں ہوگا۔ یہ قطعاً اس لیے نہیں ہے کہ آپ کی پوزیشن نازک ہو کسی مرحلہ پر بھی لیکن اب یہ کہ ایک واقعہ ہوا ہے۔ پاکستان بنا ہے۔ اتنی بڑی تحریک سامنے آئی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک واقعہ ہوا ہے تو آپ کا ردعمل تو جاننا تاریخ کا ایک بڑا ہی اہم ضروری اور ناگزیر مسئلہ ہے۔ اس لیے آپ بلاتکلف فرمائیں۔

جوش صاحب۔ میرے نزدیک پاکستان جو بنا ہے اس سے نقصان پہنچا ہے۔ ہندو کو بھی نقصان پہنچا ہے مسلمان کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ ہم نے جو ایک گنگا جمنی تہذیب بنائی تھی ایک ہزار برس میں وہ پاش پاش ہو گئی۔ ہم نے جو اقدار بنائے تھے شرافت اور تہذیب کے، وضع داری کے وہ سب ختم ہو گئے۔ مذہب کی بنا پر اقوام نہیں بنتی ہیں گر میں جیسی ہو جائیں تو کیا پاکستان نہیں رہیں گا؟

غرض یہ ایک طویل انٹرویو ہے جس میں خود جوش صاحب کی باتیں کم اور حسن عطا صاحب کی پیچیدہ گفتگو ہے زیادہ ہے۔

جوش صاحب کے انٹرویو کا پس منظر:

اس مقام پر بڑا سخت اہم سوال ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طویل انٹرویو کے پیچھے خود حکومت وقت کے کیا مقاصد تھے؟ یہ زمانہ وہ تھا جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا بھی مذہب کی بنا پر دو قومی نظریہ جس کی بنیاد پر پاکستان عالم وجود میں آیا تھا صوبائی عصبیت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا۔ خود مغربی پاکستان میں جو اب کل پاکستان تھا سندھ پنجاب، سرحد اور خاص طور سے بلوچستان میں صوبائی علاقائی کلچر کے نام پر علیحدہ علیحدہ تشخص کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ بھٹو صاحب نے جب بلوچستان میں عطاء اللہ صاحب مینگل کی حکومت کو جو اکثریت کے ووٹوں سے منتخب ہو کر برسر اقتدار آئی تھی برطرف کر دیا تو بلوچوں نے پہاڑوں پر مرکزی حکومت کے خلاف مورچے سنبھال لیے اور مرکز کو اپنے ہی ملک کے صوبے پر دوسری بار فوج کشی کرنا پڑی۔ سرحد میں جناب ولی خان نے جمہوریت کے تحفظ کے لیے بلوچستان پر فوج کشی کے خلاف وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا اس طرح کل پاکستان کا اسلامی تشخص جو بنگلہ دیش کے قیام کی وجہ سے پہلے ہی مجروح ہو چکا تھا اب مزید صوبائی عصبیتوں کا شکار ہونے لگا۔

ایسے موقع پر حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات، کا جوش جیسے عظیم مفکر اور مشہور شاعر کے ذریعے سے جو اس وزارت سے ملازمت کے ذریعے سے منسلک بھی تھے ایسے خیالات کو ریڈیو پاکستان کے محلے کے ذریعے سے ریکارڈ کروانا، جن سے حکومت وقت کے ان تمام اعمال کی تائید ہوتی ہو جو تشکیل پاکستان اور دو قومی نظریہ کی ضد ہیں کسی گہری سازش سے کم نہیں معلوم ہوتا اور جس کا شکار جوش صاحب اپنی معصومیت اور راست گفتاری کی عادت کی وجہ سے بن گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انٹرویو کے پیچھے حکومت وقت کی بدنیتی کارفرما تھی۔

جوش صاحب کی سیاسی بصیرت :

مگر جہاں تک خود جوش صاحب کی فکر کا تعلق ہے ان کی فکر کے جزائے ترکیبی کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے تاکہ جوش صاحب کے تعلق سے کسی قسم کی غلط فہمی کو دور کیا جا سکے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ انسانیت کے تعلق سے جوش صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ تمام نوع انسانی ایک اکائی ہے اس سلسلہ میں ان کی چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

انسان کو قوموں میں نہ بانٹو یارو — تفریق کا للہ نہ کاجل پارو
جس پر ہے رواں کشتی توحید بشر — اس خون کے دھارے پہ نہ لاٹھی مارو

اقوام کے لفظ میں کوئی جان نہیں — اک نوع میں ہو دوئی یہ امکان نہیں
جو مشرک یزداں ہے وہ ناداں ہے فقط — جو مشرک انساں ہے وہ انسان نہیں

حب نوع بشر ہے میرا ایمان — ہر چہرہ زشت و خوب میرا قرآن
اللہ کو آغوش میں پایا میں نے — جیسے ہی مری گود میں آیا انسان

جوش صاحب کے ہاں یہ وحدت کی لے اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اس نے اس تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

سیارہ و ثوابت و مہ و مہر و سما — حیوان و طیور و دیو و جن و انساں
غار و گل و ریگ زار و دشت و دریا — سب ایک ہی کوکھ سے ہوئے ہیں پیدا

مگر چونکہ انسان مختلف جغرافیائی علاقوں میں تقسیم ہے اس لیے اس کی نسل، تہذیبی اقدار، ثقافت، زبان، جسمانی ساخت، رنگ اور فکری و جسمانی صلاحیتیں ان علاقے کی آب و ہوا اور زمینی پیداوار کی نسبت سے فرق ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہر جغرافیائی اکائی کو اپنے سرزمین حالات کے پیش نظر اپنا معاشی سماجی اور سیاسی نظام وضع کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس لیے یہ اصول کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے اکثریتی علاقوں میں اپنی آزاد و خود مختار مملکت قائم کرنا چاہتے تھے جس کا نام پاکستان رکھ دیا گیا۔ بذات خود مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ ہر اس آبادی کا جس میں سماجی اعتبار سے احساس

یگانگی ہو بنیادی حق ہے کہ وہ اپنا سیاسی نظام اپنی مرضی کے مطابق وضع کرے۔

مگر بدقسمتی سے ہوتا یہ ہے کہ طاقتور قومیں اپنے مفادات کے حصول کے لیے کمزور قوموں پر طاقت کے ذریعے سے سیاسی اقتدار حاصل کر لیتی ہیں اور ان کے معاشی اور انسانی وسائل کا استحصال شروع کر دیتی ہیں اور اپنے مفادات کے تحفظ میں محکوم قوموں کو کمزور سے کمزور تر کرنے کے لیے ایسے حربے استعمال کرتی ہیں کہ وہ اپنے ہی خون اور اہل وطن سے برسر پیکار ہو جاتے ہیں اس طرح ان کی طاقت آپس کے تصادم میں صرف ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اصلی دشمن کو شناخت کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس طرح یہ انسانی اکائی معاشی مفادات کے حصول کے خاطر طاقتور اقوام کے ہاتھوں چھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اس کی متحدہ طاقت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر بڑی قومیں تقسیم ہو کر چھوٹی اکائیوں میں بٹ جائیں تو وہ کمزور ہونے کی وجہ سے دوسری بڑی حریف طاقتوں کی استحصالی حکمت عملیوں کا آسانی سے شکار ہو سکتی ہیں۔ اس تجزیے کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے ہم کو عالمی سیاست کی حکمت عملی کا گہری نظر سے جائزہ لینا پڑے گا۔

اس نقطہ نظر سے اگر ہم عالمی سیاست پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اس کرۂ ارض پر سیاست کی تین تہیں اوپر تلے یا سطحیں Layers ہوتی ہیں۔

پہلی سطح۔ بین الاقوامی سیاست یا Global Politics ہے۔ اس سیاست کے تحت سپر طاقتیں یا اعلیٰ ترین طاقتور قومیں تمام کرۂ ارض کو اپنے کلی مفادات کے تحت مختلف علاقوں یا Regions میں تقسیم کر لیتی ہیں جیسے تیل کی دولت سے مالا مال مشرق وسطیٰ یا عام مال کی دولت سے لبریز جنوبی ایشیا یا مشرق بعید وغیرہ۔ اس طرح

دوسری سطح علاقائی سیاست Regional Politics ہے۔ ان علاقوں یا Regions میں اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے بڑی طاقتیں

تیسری سطح مقامی سیاست یا Local Politics اختیار کرتی ہیں۔ جیسے مشرق وسطیٰ میں عراق، کویت، سعودی عرب، شام، فلسطین، اردن اور متحدہ عرب امارات کے علاقوں میں اپنی مرضی کی حکومتوں کا قیام۔ اسی طرح جنوبی ایشیا میں ہندوستان، پاکستان، سری لنکا، کشمیر، افغانستان، ایران وغیرہ

سوپر طاقتوں کی سیاست کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ ہر سوپر طاقت دوسری سوپر طاقت کے حلقہ اثر کو محدود سے محدود تر کرنے کی کوشش اور اس کے برعکس اپنے حلقہ اثر کو وسیع سے وسیع تر کرنا۔ ان کی سیاسی حکمت عملی کا ترجیحی مقصد ہوتا ہے۔

دوسرے اپنے زیر اثر ممالک کے ذہنی اور افرادی وسائل کو اپنی قومی مصلحتوں اور مفادات کے مطابق استعمال کرنے کی آزادی۔

اگر مقصد نمبر ایک دوسری سوپر طاقت کو ختم کرنے یا نقصان پہنچانے کے لیے اس سے متصل کسی علاقے کو مختلف جغرافیائی اکائیوں میں تقسیم کرنا ضروری ہو تو پھر وہاں پہلے بھٹوں اور زرخرید مقامی باشندوں کے ذریعہ لسانی، مذہبی، علاقائی، تمدنی فرقہ واریت کے مختلف جذبات بھڑکا کر ایسے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ اس آبادی کے باشندے خود آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں کو ان کا جذباتی مسئلہ بنا دیا جاتا ہے اور اس طرح ایک بستی کھیلتی آبادی خاک و خون میں سلا دی جاتی ہے اور اس طرح یہ لوگوں کے سوداگر نہ صرف اپنے خون آشام ہتھیاروں کے لیے منڈیاں پیدا کرتے ہیں بلکہ دوسری طرف ان کے جغرافیائی وسائل کا استعمال کرتے ہیں اور اس ایک بڑی جغرافیائی کالی کو تقسیم در تقسیم کر کے کمزور ملک بنا دیتے ہیں اور پھر ان ممالک میں اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کر کے ان کو اپنی کرداری سیاست (Global Politics) کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ خود جوش صاحب کا شعر ہے:

بچا رہا ہے تمدن کو قتل گاہوں میں
کرشمہ وہ امریکہ و دیار فرنگ

بدقسمتی سے ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہندوستان جو جنت نشان کہلاتا تھا جو امن و آشتی کا گہوارہ تھا اور جہاں کی گنگا جمنی تہذیب صرف محبت، حسن، تہوار، شاعری، رقص و موسیقی سے عبارت تھی، انگریزوں کے آنے کے بعد ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، شیعہ، سنی اور سینکڑوں جماعتوں میں تقسیم در تقسیم کر دیا گیا اور ان فرقوں کو فرقہ وارانہ فسادات کا خون پلا پلا کر خوب طاقتور بنایا گیا اور اپنے زرخرید افراد کے ذریعے سے ان اختلافات کو کبھی مذہبی

رنگ دیا گیا، کہیں لسانی، کہیں علاقائی تو کہیں علاقائی تعصبات کے ذریعے سے سادہ لوح اور جاہل عوام کی طاقت کو پارہ پارہ کیا گیا اور اس طرح انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سیاسی طاقت کو مستحکم کیا اور لڑاؤ اور حکومت کرو کے اصول پر Divide & rule تقریباً دو سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے بعد جب روس میں کمیونسٹ انقلاب روسی ہوا اور زار روس کا تختہ الٹ کر کمیونسٹ حکومت عالم وجود میں آگئی تو سامراجی طاقتوں نے یک طویل المدت حکمت عملی کے ذریعے سے روس کے علاقہ اثر کو محدود سے محدود تر رکھنے کی تدبیر اختیار کرنا شروع کر دیں اور اس کے اطراف ایک لوحی دفاعی حصار تشکیل دینا شروع کر دیا۔

کمیونسٹ فلسفے اور ان کی جماعتوں کے پروپیگنڈے نے کمیونزم کو محروم عوام کا جہادی مسئلہ بنا دیا تھا۔ اس لیے اگر اس کے الحادی نظریات کے خلاف کوئی موثر تحریک چلائی جا سکتی تھی تو وہ صرف مذہبی تحریک ہی ہو سکتی تھی اس لیے کہ مذہب بھی عام انسانوں کا جہادی مسئلہ ہوتا ہے۔ سامراجی طاقتوں کی خوش قسمتی سے روسی مملکت کا جنوبی اور جنوب مغربی علاقہ مسلمان ریاستوں سے گھرا ہوا ہے۔ ترکی، ایران، عراق، افغانستان یہ سب مسلمانوں کی ریاستیں ہیں اور ان علاقوں میں اشتراکیت کے الحادی نظریات کے خلاف مذہب پرست عوام کو بہت آسانی سے بھڑکایا جا سکتا تھا۔

اس تناظر میں جب ہندوستان کا جائزہ لیا گیا تو انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ کانگریسی لیڈر جیسے جواہر لال نہرو وغیرہ جن کے اثرات کانگریس پارٹی پر بہت گہرے تھے جو ہندوستان کے مستقبل میں حکومت بنانے والی جماعت سمجھی جاتی تھی سوشلسٹ نظریات رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں جو ترقی پسند تحریک چل رہی تھی وہ بھی عوام کو جاگیرداری اور سرمایہ دار نظام کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لیے تیار کر رہی تھی تو اس بات کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا کہ جب ہندوستان کو آزادی مل جائے گی تو وہ برطانیہ اور امریکہ کے بجائے روس سے تعلقات استوار کرے گا۔

سامراجی طاقتوں کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ہندوستان کے شمال اور شمال مغربی صوبے جیسے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد تمام مسلم آبادی پر مشتمل ہیں اور ان علاقوں کا سماجی ڈھانچہ انگریزوں کے پیدا کردہ جاگیرداروں، وڈیروں، سرداروں اور چودھریوں پر مشتمل ہے اس

کے ساتھ ساتھ ان جاگیرداروں کا اقتدار بھی ان علاقوں کے عوام پر سخت تھا ہے اور تعلیم کی کمی کی وجہ سے ان علاقوں پر وہاں کے سرداروں اور روحانی پیشواؤں کا اقتدار مستحکم رکھا جا سکتا تھا اور ایسے علاقوں میں کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈہ آسان بھی تھا اور موثر بھی۔ اس لیے سامراجی طاقتوں نے یہ سوچا کہ اگر ان علاقوں کو ہندوستان سے کاٹ کر ایک الگ ریاست بنا دی جائے تو روس کے خلاف حصار میں سخت طاقتور دیوار کھڑی کی جا سکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے سامراجی طاقتوں کے یہ ارادے بھانپ لیے تھے اسی لیے انھوں نے بہت پہلے ہندوستانیوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس لیے پاکستان بننے سے یہ قوی احتمال تھا کہ مسلمان جس مقصد کے لیے پاکستان بنانا چاہتے ہیں وہ بین الاقوامی سامراجی سیاست اور پاکستان پر مشتمل علاقوں کے سماجی معاشی Socio Economic حالات کی وجہ سے اسلامی نظام قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ گو پاکستان کی تشکیل گو واقعی اسلامی نظام کے قیام کے لیے ہوتی تو اس سے بہتر بات ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ممکن ہی نہیں تھی مگر بین الاقوامی سیاست اور پاکستان پر مشتمل علاقوں کے معروضی حالات کی روشنی میں ہندوستان کے سب سے دانشور جو بین الاقوامی طاقتوں کے سیاسی عزائم کا شعور رکھتے تھے، یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ طاقتیں پاکستان کو ایک طاقتور اسلامی فلاحی مملکت بننے نہیں دیں گی بلکہ یہاں سیاست کے مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو صوبائی، لسانی اور فرقہ وارانہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر کے ان کی طاقت کو منتشر کر دیا جائے گا اور یہاں کا جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ اختیاری طاقتوں کی سرپرستی میں سیاسی اقتدار پر قبضہ کر کے پاکستان کی معیشت کا اس طرح استحصال کرے گا کہ یہ ملک کبھی پنپ نہ سکے گا اور مفلس و کمزور ہو کر سامراجی طاقتوں کی دوامی غلامی میں رہنے پر مجبور اور ان کے مالی مفادات کے حصول کا ذریعہ بنا رہے گا۔ اسی لیے جب وہ لوگ یہ کہتے ہیں

کہ پاکستان بننے سے مسلمانوں کو نقصان ہوا تو ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ پاکستان بنا ہی
نہ تھا بلکہ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لیے پاکستان بنا تھا وہ
حاصل نہ ہو سکا۔ وہ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم کے وقت چونکہ ہندو
مسلم فسادات کروائے گئے تھے اور آپس میں شدید نفرتیں پیدا کر کے برصغیر کو تقسیم کیا گیا اور
اسی نفرت کو تقسیم کا جواز بنایا گیا۔ اس لیے ہندوستان اور پاکستان میں کبھی دوستی قائم نہ ہو
سکے گی اور جنوبی ایشیا کے یہ عظیم ممالک اپنے مشترکہ مفادات کے حصول کے لیے کبھی متحد
طور پر اپنے عوام کی فلاح کے لیے کوئی لائحہ عمل تشکیل نہ دے سکیں گے اور اس طرح اپنے
اپنے بجٹ کا بیشتر حصہ دفاعی ضرورتوں کی فراہمی میں خرچ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔
چنانچہ اسی دشمنی کو قائم رکھنے اور اپنے مستقبل کے امکانی فاصلوں کی تکمیل کے لیے کشمیر کے
مسئلہ کو متنازع رکھا گیا تاکہ یہ دونوں ملک ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں اور
پاکستان اپنی بقا کے لیے سوپر طاقت کا دست نگر رہے اور وہ طاقت یہاں کے وسائل کا اپنی
قومی ضرورتوں کے مطابق استحصال کرتی رہے۔ یہ لوگ یہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ پاکستان پر
مشتمل علاقوں کے افراد میں احساس یگانگی پیدا کرنے والا عامل اسلام ہے زیادہ صوبائی عصبیت
ہے۔ اس لیے جب ان علاقوں کے لوگوں کو اقتدار مل جائے گا تو پھر ان میں قبائلی اور صوبائی
مفادات ابھر کر سامنے آئیں گے اور یہ آپس میں ہی باہم دست و گریباں ہو جائیں گے۔ اس
وقت یہ تصور کہ سب مسلمان ہیں، ان کو تصادم سے نہیں بچا سکے گا اور تجربات نے ثابت کر
دیا کہ ان کا یہ خوف غلط نہ تھا کیونکہ پاکستان بننے کے بیس سال بعد ہی مشرقی اور مغربی
پاکستان کے مفادات کا ٹکراؤ شروع ہو گیا اور مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کی سیاسی اور
معاشی حکمت عملیوں کے خلاف جذبات بیدار ہونے شروع ہو گئے تو یہ تصور کہ یہ دونوں
علاقے اسلام کے رشتے میں ایک ہیں، ان کو آپس میں متحد نہ رکھ سکا اور بالآخر یہ دونوں الگ
الگ ریاستیں بن گئیں اور اس تبدیلی میں لاکھوں مسلمان قتل ہوئے عورتوں کی عصمتیں
لٹیں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں نے قید و بند کی تکلیفیں برداشت کیں اور سب سے بڑی
بات پاکستان کی عسکری طاقت کو خود اپنی سرزمین پر رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ تمام تاریخی
حقائق ہیں جن سے کوئی شخص انکار کر ہی نہیں سکتا اور پھر کراچی سندھ کے شہری اور دیہی علاقوں

کے لوگوں کے دلوں میں آپس میں بے اعتمادی، کراچی جیسے شہر میں امن و امان کی بربادی، کشمیر کے مسلمانوں کا کشت و خون۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو جاری کر دیا گیا ہے۔ بقول داغ آتی:

ہم خون کی تسلیں تو کسی دے چکے لیکن
دے خاک وطن قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

یہ وہ امکانی معروضی حالات تھے جن کے تحت جب مولانا ابوالکلام آزاد اور جوش ملیح آبادی جیسے دانشوروں نے یہ کہا کہ پاکستان بننے سے مسلمانوں کو نقصان ہوا تو وہ دراصل سامراجی طاقتوں اور ہندوستان کے جاگیرداروں سے غالب کی زبان میں یہ کہہ رہے تھے کہ:

تو اور آرائش خم کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

انٹرویو کا ردعمل، سیاسی حلقوں میں:

مگر مفاد یافتہ طبقات نے جن کے اسمس انٹرویو کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بنایا اور وزارت اطلاعات و نشریات نے جس پر اس زمانے میں ایک اسلام باز جماعت کا اقتدار تھا جو جوش صاحب کے خیالات سے مختلف رکھتی تھی، ان کو سرکاری ذرائع ابلاغ سے بلیک لسٹ کر دیا۔ اسمس کے علاوہ اس جماعت نے ان کی شاعری یا نثر کو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سرکاری مطبوعات میں اشاعت کے لیے ممنوع قرار دے دیا اور اس عظیم انسان کو پاکستان دشمن قرار دینے کی کوشش کی گئی جو پاکستان کی سرزمین پر جینے اور مرنے کے لیے اپنی کشتیاں جلا کر اترا تھا۔ جس نے ۲۰ جون ۱۹۷۰ء کو ایک تقریب میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ "میں یہ خواب سجا کر یہاں آیا تھا کہ ارباب پاکستان میری آزادخیالی اور حق پرستی کو ہرگز پسند نہیں کریں گے لیکن اسمس تیقن کے باوجود میں پاکستان میں جینے اور مرنے کے لیے آگیا اور یہیں کی مٹی میں دفن ہو جانا بھی چاہتا ہوں"۔

(اور آج ہم سب جانتے ہیں، انہوں نے یہ کر دکھایا کہ وہ پاکستان کی مٹی میں دفن ہیں)۔

صحافتی حلقے کا ردعمل

اس انٹرویو کے نتیجے میں اس وقت کی وزارت اطلاعات کی جوش صاحب کارروائیوں کے خلاف پاکستان کے صحافیوں، ادیبوں، دانشوروں نے ڈٹ کر جوش صاحب کی مدافعت کی۔ ان کے حق میں مضامین لکھے۔

معاصر روزنامہ ڈان نے اپنے اداریے میں لکھا کہ

"۱۹۷۸ء کے آخری لمحات میں ایک ایسے شاعر کے خلاف یہ الزام کہ وہ بیان پیشتر جس کی آواز تاج برطانیہ کو للکارتی رہی تھی ایک جرمانی جرم قرار دیا جائے گا"۔ آگے چل کر ڈان لکھتا ہے "ہم ان حالات سے بھی ناواقف ہیں جن کے تحت یہ انٹرویو لیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ انٹرویو بعد از رحلت نشر ہونے کے لیے تھا اور جوش صاحب کی زندگی میں اسے منظر عام پر نہیں لایا جانا چاہیے تھا مگر یہ درست ہے تو پھر اس کی اشاعت ایک غیر اخلاقی حرکت ہے"۔ آخر میں روزنامہ ڈان لکھتا ہے "تمام عظیم ادب عدم تقلید کی بنیاد پر تخلیق ہوا ہے۔ ادب یا فن سے یہ توقع کرنا کہ وہ کسی سرکاری اصول کا پابند ہو، جمہوری تقاضوں کے منافی ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی ایک شاعر ہیں۔ عظیم شاعر اور ان کا مرتبہ سرکاری ضوابط سے انھیں خارج کر کے کم نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ الزام تیجتاً ان کے لیے ایک اعزاز بن جانے کا کیونکہ انسانی تہذیب کی تاریخ ایسے شاعروں، ادیبوں، صوفیوں اور فلسفیوں سے بھری پڑی ہے جو انقلاب کے ہاتھوں پستے رہے مگر جن کے نام پر الزام دینے والوں کی نسبت آج بھی زندہ تابندہ ہیں۔

اس معاملے میں جنرل ضیاء الحق پاکستان کے مطلق العنان فوجی حکمران تھے مگر وہ بھی جوش صاحب کی فکری عظمت کے معترف تھے۔ اس لیے انھوں نے خود اپنی وزارت اطلاعات کی پالیسی کے خلاف الزام جوش صاحب کو لے ڈالی مراعات میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونے دی اور وہ تمام سہولتیں جو ان کو پہلے سے حاصل تھیں وہ جاری رہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ جناب علی احمد تالپور جو اس زمانے میں وزیر داخلہ تھے۔ جوش صاحب کے معتقدین میں سے تھے اور ضیاء الحق صاحب تالپور برادران کی رائے کا بہت احترام کرتے تھے۔

۱۹۷۹ء کے واقعات

کراچی پریس کلب کی رکنیت

مگر جوشی صاحب کے خلاف ایک جماعت کا پروپیگنڈہ جب زیادہ شدت اختیار کرنے لگا تو کراچی پریس کلب کے منتظمین نے اپنی حریت فکر کے ثبوت میں یہ طے کیا کہ حضرت جوش کو کراچی پریس کلب کی دوامی رکنیت دی جائے۔ چنانچہ پریس کلب والوں نے دس جون ۱۹۷۹ء میں جوش صاحب کو کراچی میں مدعو کیا۔ ان کو ہوٹل جنیس میں مہمان رکھا اور تین دن تک ان کا جشن منایا۔ ۱۰ ویں جون ۱۹۷۹ء کو پریس کلب کے صدر جناب حضور حیدر شاہ نے اپنے سپاس نامے میں جوش صاحب کی خدمت میں کراچی پریس کلب کی رکنیت پیش کی۔ یہ خطبہ صدارت ایک ایسی دستاویز ہے جس سے اس دور کے حریت فکر کے علمبرداروں کا ذہن آشکار ہوتا ہے اس لیے اس کے کچھ حصے یہاں نقل کرنا چاہوں گا۔ جناب صدر نے جوش صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

"کراچی پریس کلب آپ کا ممنون ہے کہ اسے آپ نے میزبانی کا شرف عطا کیا۔ کراچی پریس کلب وطن عزیز پاکستان میں صحافیوں کا سب سے بڑا ثقافتی مرکز اور ان کا سب سے زیادہ فعال تمدنی ادارہ ہے اور لہٰذا یہ اسی کا منصب ہے کہ آپ کی مستقل رکنیت کی سعادت سے بہرہ مند ہو۔ شاعر انقلاب، شعر و ادب کی فکر میں آپ نے نصف صدی سے زائد عرصے تک حکومت کی ہے۔ آزادی افکار اور بے باکی اظہار کے باب میں آپ کی شخصیت بالاتر قبلہ و زندان جاں ہے لیکن روایتی شاعری سے بغاوت اور روایتی طرز فکر و بیان سے یکسر انکار، جناب جوش آپ ہی کی جرأت اور دیانت کا کرشمہ تھا اور ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ

فکر و فن میں اور شعر و ادب میں جس طرح حریت کا پرچم آپ نے سربلند کیا تھا اس پر سالوں کے باوصف وہ پرچم آپ کے ہاتھوں آج بھی سربلند ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اردو شاعری میں آپ نے ایک عہد کا آغاز کیا اور جو رنگ آپ نے اختیار کیا جدید شاعری اور ترقی پسند شاعری نے بالآخر اس کے اثرات قبول کیے اور آنے والے دور میں ایسے متعدد شاعر پیدا ہوئے جن کا شمار صف اول کے نظم گویوں میں ہوتا ہے لیکن ان کا کلام آپ کے افکار کی روشنی سے اس طرح منور ہے جس طرح سورج کی روشنی سے چاند کی تابانی۔ آپ نے جاگیردارانہ تہذیب کے ناپسندیدہ اثرات کے خلاف مسلسل کاوش کی۔ فکری محکومی، مصلحت، یاسیت، حساس شکست، بزدلی، منافقت اور فریب کے سارے پردے چاک کیے۔ اپنے آباء کی روایت سے انسان دوستی، احترام انسانی مظلوموں کی پشت پناہی اور ظلم و جبر کی قوتوں کے خلاف بغاوت کے جذبات اخذ کیے۔ حریت فکر اور جدید افکار و خیالات کو پناہ دی راہ بنایا اور فن کی ان پرخار وادیوں کی طرف چل نکلے جن کی جانب دوسرے شعرا نے دیکھا بھی نہ تھا۔ آپ نے سب سے پہلے تو پیر و رسول آباء معاشرے کے جھوٹے پندار، ریاکارانہ عبادت اور منافقانہ مذہب پرستی کا پردہ چاک کیا۔ پھر برطانوی سامراج کو آگے بڑھ کر للکارا۔ آپ نے تکبیر فکر میں کو جس سختی کے ساتھ جکڑا تھا وہ آپ ہی جیسے جری شخص سے ممکن تھا اور برطانوی حکمرانوں سے مخاطب ہو کر پوچھا تھا

ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے؟
گونج ناچیں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے آپ کی کیا شامیانے میں ہے؟

اور آخر میں یہ اعلان

وقت لکھے گا کہانی کب سے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

جب برصغیر میں آزادی کی جدوجہد تیز ہوئی کل انڈیا کانگریس اور کل ہند مسلم لیگ کے جداجدا مؤقف کی بنا پر آزادی کا مسئلہ الجھ گیا اور تقسیم کے سوا مسئلے کا کوئی حل باقی

نہیں رہا تو آپ نے وہ معرکہ آرا نظم کہی جس میں اور وطن، کانگریس یعنی ہندی بھی سے مخاطب ہوتی ہے اور اسے چھوٹی سن یعنی مسلم لیگ کا حق ادا کرنے کی تاکید کرتی ہے۔

کہتی ہیں کہ مل دگھر اس کو بخش دے
جو گھر وہ مانگتی ہے وہ گھر اس کو بخش دے

جناب جوش! آپ نے قیام پاکستان کی اگر حمایت کی تو کسی دباؤ یا مصلحت کے تحت نہیں بلکہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر کی۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے سیاسی عقائد پر جنھیں آپ اپنی ذات تک رکھنے کے قائل ہیں اور روش عام کے برعکس دوسروں کے سر تھوپنے پر مصر ہیں کہ حریت فکر اسی کا نام ہے۔ ایسے لوگ مستحق ہیں جو قیام پاکستان کے بعد تک اس کے مخالف تھے لیکن آج اپنی پرانی تحریروں اور تقریروں کو چھپانے اور خود کو پاکستان کا بانی ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ یہی وہ منافقت ہے جس کے خلاف آپ نے ہمیشہ جنگ کی اور دل کی بات کو زباں پر لانے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ حریت فکر اور آزادی اظہار انسان کے بنیادی حقوق ہیں جن کے لیے وہ صدیوں سے جنگ کرتا آیا ہے اور بڑے بڑے حکماء، فلسفی اور دانشور اس کے لیے ایک مرحلہ آزما رہے ہیں۔ جو لوگ ان حقوق کو سلب کرنے کے درپے رہے ہیں شاعروں اور فنکاروں نے ہمیشہ ان کا پردہ چاک کیا ہے۔ محتسبوں، واعظوں اور ریاکار زاہدوں کی سخت گیری کے خلاف جہاد اور احتجاج کی صدیوں تک فارسی اور اردو شاعری کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ ہم صحافی جو آزادی اظہار کو پورے معاشرے کا بنیادی حق سمجھتے ہیں اور اس بارے میں آپ کی صداقت سے بخوبی واقف ہیں، پریس کلب کی جانب سے آپ کو مستقل رکنیت قبول کرنے کی درخواست کیوں نہ پیش کریں کہ کسی زمانہ میں آپ سے زیادہ اس کا مستحق کوئی اور نظر نہیں آتا۔ ہم آپ کے اس بے پایاں جذبہ انسان دوستی کو سلام پیش کرتے ہیں۔ آپ نے محکوم، مظلوم اور ستم زدہ انسانیت کے لیے آواز بلند کی اور مساوات انسانی کی صدا لگائی جو جو کو سربلند کی پیدا کی ہوئی تمام حسین اور لطیف چیزوں سے آپ کا یہ پیار اور آپ کی یہ فطری رجائیت بھی ہمیں مرغوب ہے۔ پھر آپ نے کہا تھا۔

مٹھیوں میں بھر کے افلاس چل چکا ہے آفتاب
آج اگر روح قیامت قلت افلاس ہے تو کیا

انقلاب کا یہ تصور بھی آپ ہی نے ہمیں دیا۔ یہ انقلاب خوں ریزی اور دہشت گردی سے عبارت نہیں۔ اس میں انسان کی سربلندی، حسن و رعنائی، روح کی بالیدگی اور زندگی کی لطافتیں شامل ہیں۔ ہمیں انقلاب کا یہ تصور بھی عزیز ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ، میں آپ کی خدمت میں کراچی پریس کلب کی جانب سے اس کی رکنیت پیش کرتا ہوں۔

حضور احمد شاہ

صدر

کراچی پریس کلب

۱۸۔۹۔۱۹۶۹ء

پریس کلب والوں نے اس تقریب کو بہت شاندار پیمانے پر منایا۔ تین دن تک بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے جن میں پروفیسر کرار حسین صاحب، رئیس صاحب امروہوی، سبط حسن صاحب، جن کے نام مجھے اس وقت یاد ہیں، کے علاوہ اور بہت سے مفکرین نے جوش صاحب کی شاعری، نثر نگاری اور انقلابی فکر پر تقریریں کیں اور بہت سے شاعروں نے نظمیں منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے علاوہ جوش صاحب کے دوستوں نے اپنے اپنے گھروں میں شعری نشستیں منعقد کیں۔

منور عباس صاحب کے گھر:

۲۲ دسمبر کو منور عباس صاحب کے مکان پر پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں پروفیسر شور علیگ، راغب صاحب مراد آبادی، صبا اکبر آبادی کے علاوہ چند اور شعراء موجود تھے۔ سب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ جناب صبا اکبر آبادی کی غزل کی چند اشعار حافظے میں محفوظ ہیں۔ آپ بھی سماعت فرمائیے۔

ہم تو مدت کے مر گئے ہوتے — موت نے زندگی بڑھا دی ہے
دیکھ فطرت کی انجم آرائی — خاک پر چاندنی بچھا دی ہے
قلب ہی تصورات جمال — یہ عقیدہ بھی انفرادی ہے

آخر میں جوش صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ چند رباعیات ملاحظہ فرمائیے۔

بارش ہوتی ہے جب اندھیروں کی شدید — رہتی نہیں جب رات گئے طاقت دید
میرے افلاس کے افق سے اے جوش — ہوتا ہے بصد شکوہ طالع خورشید

زانو پہ جو میں سر کو جھکا لیتا ہوں — افکار کے شعلوں کو ہوا دیتا ہوں
افلاس پہ تولتا ہوں میں عرش و کرسی — کونین کو چٹکی میں اٹھا لیتا ہوں

اس درجہ ہمیں ذلیل و ناچیز نہ جان — اے دوست ذرا ممکن ہو تو ہم کو پہچان
جب بیٹھنے لگتی ہیں کروڑوں صدیاں — جنتی ہے زمین تب کہیں یک انسان

اس کے بعد جوش صاحب نے ایک تازہ نظم سنائی جس کا عنوان تھا "الا اللہ"۔ اس نظم کا ایک شعر بار بار پڑھوایا گیا اور لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ شعر یہ تھا:

جلال ربوبیتِ وجہ رب ذوالاکرام — کوئی جمال نہیں ہے بقدر ذوق نگاہ

اور مقطع پر تو جیسے ہر شخص چونک گیا اور اسی دفعہ پڑھوایا گیا کہ آخر جوش صاحب خود بھی خاموش ہو گئے۔ نظم یہ تھی:

تمام فتنہ و دولت تمام حشمت و جاہ — متاع پوچ ہے الا وجاہ حق آگاہ
جلال ربوبیتِ وجہ رب ذوالاکرام — کوئی جمال نہیں ہے بقدر ذوق نگاہ
حیات اہل ہوس ہے سواد و بے مصرف — بس اک مکان سفر ہے بس اک تسلسل راہ
اے نجوم خیالات کو کدھر لے جاؤں — بساط ارض و سماوات ہے بہت کوتاہ
رہے فقر کہ مری بارگاہ معنی میں — چہ خشت پارہ چہ در دامن چہ کوہ چہ کاہ
رہے تمول تخیل و دولت افلاس — نہ شوق چتر و علم ہے نہ فکر تاج و کلاہ
یہ میرے فقر کی سب سے بڑی بلا ہے — مرے قدم کو نہ چوم اے لب جلالت شاہ
میرا عمل ہے اعمال ہے فلک مرحوم — ہزار شکر کہ میں ہوں وہ رند نامہ سیاہ
ادھر وہاں ہیں طلب میں کہ جس کو دیدہ میں — نہ صرف مہر نہ زماں و مکاں نہ شام و پگاہ
میرے طواف میں ہے روح عصمت آفاق — یہ کس مقام پہ لایا ہے مے ذاتی گناہ

اے یہ بارگہِ الاالٰہ پر اے جوشش
کوک دی ہے کہ مرے کان الاالٰہ

جوشش صاحب نے نظم ختم کی تو ایک بزرگ جو میرے قریب بیٹھے تھے مجھے لگے کہ جوش صاحب کا یہ رنگ ان کے ماضی سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہی نہیں۔ ان کا رنگ ہمیشہ سے ایک ہی ہے مگر لوگوں نے انھیں غلط سمجھا۔ اس جگہ البتہ وہ کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ اس کے بعد شاعری ختم ہوئی تو پرتکلف لذت کام و دہن کا اہتمام شروع ہوا۔ طرحی تقریب تو بچے دعوت سے فارغ ہوئے تو میں نے جوش صاحب کو ہوٹل جہیں پہنچایا۔ شام کو پھر تمام احباب جمع ہوگئے۔ ہوٹل جہیں کا کمرہ سبھا تمام دانشوروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جناب شوکت حسین رضوی اور ان کی بیگم یاسمین صاحبہ یورپ کے سفر پر روانہ ہونے والے تھے وہ بھی اپنے بچوں کے جوش صاحب سے الوداعی ملاقات کے لیے تشریف لے آئے اور شام تک بیٹھے رہے۔

خاتون بادہ نوش:

ان ملاقاتوں میں ایک خاتون بھی جوش صاحب سے ملنے اور کلام شاعر بزبان شاعر سننے کے لیے وہاں آگئیں اور جب دور قدح شروع ہوا تو انھوں نے اپنا پیمانہ بھر اور بغیر پانی سوڈا ملائے غٹ غٹ پی گئیں۔ جوش صاحب نے پہلے تو حیرت کا اظہار کیا پھر مسکراتے ہوئے فرمایا "Oh, she is a gentle lady" یا تو وہ خاتون بڑی لیے دیے بیٹھی ہوئی تھیں اور شعر کی داد بھی صرف زیرِ لب مسکراہٹ سے دے رہی تھیں یا جیسے ہی بات میں کھلا پھر تو جان حیا ایسا کھلا ـــ ایسا کھلا ـــ ایسا کھلا۔

شوکت حسین رضوی جب رخصت ہونے لگے تو جوش صاحب نے ان کو گلے لگا کر رخصت کیا اور یہ رباعی پڑھی۔

کیا جانیے اب بات ہو یا بات نہ ہو — اس رات کے بعد پھر کوئی رات نہ ہو
ٹھہرو کہ گلے تو مل لیں جانے والو — ممکن ہے کہ اب کبھی ملاقات نہ ہو

میں نے دیکھا کہ شوکت صاحب رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے رخصت ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد خاتون ماہ نوشش حضرت جوشش سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں کہ "جوش صاحب کیا آپ ہر شخص کو رخصت کرتے وقت اسی طرح سینے سے بھینچ کر رخصت فرماتے ہیں"۔ جوش صاحب سے بڑھ کر اس حسن طلب کا ادا شناس اور کون ہو سکتا تھا مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "جی ہاں قدیم سے یہ میری سنت جاریہ ہے"۔ تو وہ خاتون جوش صاحب کے قریب جا کر فرمانے لگیں "تو پھر ہمیں بھی رخصت فرمائیے"۔ اس کے بعد یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ کون کس کو رخصت کر رہا ہے۔ اجی رخصتی کیسی، وہاں تو دائمی پیوستگی معلوم ہو رہی تھی اور آغوش وداع آغوش وصل بنتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا جوش صاحب مجھے اس وقت جان صاحب کا ایک شعر یاد آ گیا۔

سے جان ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر
نکلیا کا اسس کی سارا مسالا مسل گیا

غرض وہ خاتون رخصت ہوئیں تو ہم سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔ چلتے وقت جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ صبح ذرا جلدی آ جانا میں صبح کی پرواز سے اسلام آباد جاؤں گا۔ چنانچہ دوسرے دن صبح ہی صبح میں اور رجب صاحب جوش صاحب کے ہاں پہنچ گئے اور جوش صاحب کو ریپورٹ پہنچا کر اپنے گھر آ گئے۔

۱۹۸۱ء کے واقعات

جوش صاحب کے آخری ایام:

اس کے بعد جوش صاحب کا آنا کراچی میں سست کم ہوا کیونکہ جب اہل اقتدار کے تیور بدلے تو موسموں کے رخ تبدیل ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ مرحلہ رعایت کی تلخیوں کی دوا بالکل بند ہو گئی اور جوش صاحب کے آخری ایام بے حد بے کیف ہو گئے اور وہ جس نے غاصب انگریز حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ دیا کہ۔

تو نے شاعر سے یہ اے غاصب حکومت کیا کہا
تو نہ مانے گا مجھے تو قتل کر دوں گی تجھے؟
قتل سے ڈر جاؤں گا اتنا سمجھتی ہے ذلیل
جا اور ابھی سونیا قسم کی دھمکی نہ دے

اب جب کہ ان کے دوست احباب بھی ان سے کنارہ کش ہونے لگے اور محفل والی آئی۔

مل بھی جاتے ہیں تو کترا کے نکل جاتے ہیں
ہائے موسم کی طرح دوست بدل جاتے ہیں

تو دل سے موت کی آرزو کرنے لگے۔ ان کی شاموں کی ویرانی اور تنہائی دیکھ کر مجھے میر انیس کا یہ مصرع یاد آتا تھا۔

"صبح شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے"

میں کراچی میں رہتا تھا جوش صاحب سے دوسرے تیسرے دن ٹیلی فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ مجھ سے کہتے "اے خورشید علی خاں نوکری چھوڑ کر یہاں آجاؤ میں تنہائی میں

مرجا رہا ہوں"۔ میں کہتا جوش صاحب آپ کراچی آجائیے، ہم سب ہر وقت آپ کے ساتھ رہیں گے۔ یہاں تمام احباب آپ کو بے حد یاد کرتے ہیں۔ فرمایا۔ میاں اب تو مجھے اللہ میاں یاد کر رہے ہیں اور یہ رباعی پڑھی۔

یاں نظر فی دھوپ ہے گھنا سایہ — رہتا ہے سحاب ابدیت چھایا
جوش آؤ کہ منتظر ہے بزم ارواح — آیا یاران رفتہ۔ آیا۔ آیا

آخری سانسوں میں بھی یہ غزل اکثر پڑھتے رہتے تھے۔

کس کو آتی ہے مسیحائی کسے آواز دوں
چل اسے خونخوار تنہائی کسے آواز دوں
پڑھتے پڑھتے آخر شب تھک گئی ہیں بتیاں
بجھ رہی ہے شمع بینائی کسے آواز دوں
چپ رہوں تو ہر نفس ڈستا ہے ناگن کی طرح
آہ بھرنے میں ہے رسوائی کسے آواز دوں
ہائے اس غربت کے جنگل میں پکاروں تو کسے
کس سے ہے میری شناسائی کسے آواز دوں
یہ تباہی یہ جہاں بالخصوص و الاماں
الف یہ انگڑائی یہ انگڑائی کسے آواز دوں
الف خموشی کی یہ آہیں دل کو برماتی ہوئی
الف یہ سناٹے کی تنہائی کسے آواز دوں
چل رہے ہیں دن پہ دن کھلتی چاندنی کے نیشتر
ڈس رہی ہے دن کو پرچھائی کسے آواز دوں

آخرت کا سفر

ایک دن معلوم ہوا کہ جوش صاحب کو خون کے قے ہوئی ہے اور ان کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ صدمے کا اثر پھٹ گیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ ہسپتال میں رہے۔ خون دیا

گیا۔ مجھ کو اس پڑھایا گیا۔ ایک ماہ بعد حالت کچھ سنبھل گئی تو گھر آ گئے مگر زبان پر کیا اثر تھا کہ نے ہی لوگ پر بات مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔

جب گھر آ گئے تو میں نے نئی لوگ پر خیریت دریافت کی۔ بڑی مشکل سے یہ شعر سمجھ میں آیا۔

پوچھتے کیا ہو جوش کی حالت　　اب کے پہنچے قفس نہیں آتے

میں نے کہا جوش صاحب اگر آپ جیسا سامعہ انسان ایسی بیہودہ باتیں کرے گا تو ہم لوگوں کو کون حوصلہ دے گا۔ فرمایا۔ ایک تم ہو جو میرے حصے کی آرزو کر رہے ہو۔

تا اہل قفس قبر پہ موتی برسائیں　　خوبان چمن دامن گل پھول چڑھائیں
کہتا ہے مرا دل کہ تو راہ کرم　　حسرت ہے اب انتقال فرما جائیں

۱۹۸۲ء سنِ رحلت

۲۰ فروری ۱۹۸۲ء کو خون کے قے ہوئی۔ ہسپتال میں داخل کر دیے گئے مگر ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ خون کا دباؤ بے حد کم ہو گیا تھا اور پھر ۲۲ فروری بروز پیر ۱۹۸۲ء صبح پانچ بجے میرے نے ان کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف جوش صاحب کے پوتے کی آواز تھی۔

"چچا ابا کا انتقال ہو گیا"

رات تین بجے یہ آفتاب ادب شاعر آخر الزماں ابدی نیند کی آغوش میں غروب ہو گیا۔

تمہیں آہیں سننے کا شوق تھا مگر اب بتاؤ کرو گے کیا
جو کہتا تھا تمام شب وہ غریب جوشش تو مر گیا

اور یوں راغب صاحب مرد آبادی کا خوف سچ ہو گیا۔

رہ جائیں گے ہم لوگ ملول و غمگیں کیا پیر کو سرکار چلے جائیں گے

اور پیر کو سرکار ہم لوگوں کو ملول و غمگیں چھوڑ کر چلے گئے اور اس طرح وہ جوش جو گوشت پوست کا بنا ہوا تھا اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا

جوش لافانی ہے:

مگر وہ جوش جو عظمت انسانی کا نقیب تھا جو خلوص و محبت کا پیکر تھا۔ جو انسانیت کو مقام الوہیت پر فائز دیکھنا چاہتا تھا، جس کے سینے میں جنبش دل پیغمبراں تھی۔ وہی جو ظلم کو ختم کرنے والا عظیم ترین انقلابی شاعر، ادیب، فلسفی، حیات، شباب، حسن اور مسرتوں کا دیوانہ۔ بڑے سے بڑے جابر حاکم کے سامنے سربلند رکھنے والا، معمولی سے معمولی آدمی کے

سامنے انکسار سے جھکنے والا۔ اردو زبان کی صحت و ناموس کے تحفظ کا سپاہی، شرافت اور تہذیب کی اقدار کا محافظ۔ قافلہ حریت انسانی کا یہ بطل جلیل فن عظیم راہ نما میں سے ہے۔ جس نے ہمیشہ انسانیت آدم کے خواب دیکھے، جو ہمیشہ کہتا رہا

جو مقتضائے ہے یہ منصب انسانیت
اب آؤ جوش کی اس آرزو کی بات کریں

تو جب تک انسانیت کو راہ نمائی کی ضرورت باقی رہے گی یہ زندہ و تابندہ رہے گا اور نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ اپنے تخلیقی عمل کی تمام تر توانائی کے ساتھ نوجوان بھی رہے گا۔ بقول خود،

ہر دور میں جوان ہی تھیں نوجوان ہوں میں
شکر خدا کہ بندہ پیر مغاں ہوں میں
صدیوں کے بعد بھی جو پڑھے گا مرا کلام
کہہ دوں گا میں کہ بھی تک جوان ہوں میں

جوش صاحب! انسانیت کو اس کی منزل اور آپ کو اپنے خوابوں کی تعبیر ضرور ملے گی۔ آپ نے کہا تھا کہ "مستقبل انسانی بے حد روشن ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ یہ دوزخ زمین ایک دن جنت بن جائے گی۔ یہ درندہ آدمی انسان کے مرتبے پر فائز ہو کر دم لے گا۔ نہ عدالتیں ہی رہیں گی نہ جیلیں۔ نہ پولیس نہ اسلحہ سازی کے کارخانے۔ پوری مستقل جوانی بن جائے گی اور موت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ زندگی کی پیشانی پر حیات ابدی کا تاج رکھ دیا جائے گا۔ شمس و قمر ہمارے پاؤں چومیں گے۔ ہم مشتری میں اگر بلاشبہ کریں گے تو زہرہ میں رات کا کھانا کھائیں گے اور قوانین کائنات خدمت گاروں کے مانند ہمارے رکابوں میں کھڑے رہا کریں گے۔" اور جوش صاحب! آپ کی یہ دعا بھی انشاء اللہ ضرور پوری ہوگی۔

اک فرد بھی رہے نہ تہ چرخ دردمند
اے جوش وہ زمانہ بھی آئے خدا کرے

تو جب تک انسانیت اپنی منزل پر نہیں پہنچ جاتی، آپ مینارۂ نور بن کر اس کی راہ نمائی فرماتے رہیں گے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ تو صرف ظاہر بیں نگاہوں کے لیے آپ اسلام آباد کی زمین میں آسودۂ خواب ہیں مگر آپ کے وجود کے بطن اور اس کی ہیبت کا یہ اثر ہے کہ وہاں کی فضائیں ہمیشہ ہمیشہ یہ اعلان کرتی رہیں گی کہ:

اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ عظمت
اس گور میں دفن ہے چمن کی دولت
وہ دیدۂ بینا کہ ہے یہ مرقد پاک
تو ہم کہ ہوش طبعہ الرحمت

جناب نصیر ترابی نے جوش صاحب کی تاریخ وفات انھیں کے ایک مصرع سے نکالی۔

"میں شاعر آخر الزماں ہوں اے جوش"

۱۹۸۲ء

مرثیۂ جوش

از

کنور مہندر سنگھ بیدی

کلک الم طراز ذرا دیکھ بھال کر کس سانحہ کا ذکر ہے اتنا خیال کر
سن تو سہی ہم نفسیں یہ ذرا دل سنبھال کر کاغذ پہ رکھ رہا ہوں کلیجہ نکال کر
پرواز کون کر گیا پر توڑتا ہوا
خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

روندا ہوا یہ صحن گلستاں ہے ان دنوں ہر برگ و بار دیدۂ گریاں ہے ان دنوں
دامن ہے چاک۔ چاک گریباں ہے ان دنوں ماتم زدہ یہ روح بہاراں ہے ان دنوں
تاریکیوں نے باغ کو گھیرا ہے کیا کریں
سورج ہے سر پہ اور اندھیرا ہے کیا کریں

وہ کج کلاہ گلشن یاراں نہیں رہا جان چمن وہ روح بہاراں نہیں رہا
پیر مغاں بادہ گساراں نہیں رہا وہ شعر یار شعر نگاراں نہیں رہا
یوں اٹھ گیا کہ بزم میں اب زندگی نہیں
ہم دل جلا رہے ہیں مگر روشنی نہیں

سر میں رہا وہ جام کا سودا لیے ہوئے دل میں خلوص دل کا تقاضا لیے ہوئے
ہونٹوں پہ اک طلسم مسیحا لیے ہوئے دنیا سے اٹھ گیا ہے وہ دنیا لیے ہوئے
حسرت، ملال، رنج، الم، غم میں چھوڑ کر
وہ چل دیا ہے قوم کو ماتم میں چھوڑ کر

میٹھے وہ بول بولنے والا چلا گیا موتی نثر کے رولنے والا چلا گیا
راہوں کے بیچ کھولنے والا چلا گیا وہ بوئے گل کو تولنے والا چلا گیا
اس کا وہ طور، اس کا طریقہ کہاں سے لائیں
اس کا شعور، اس کا سلیقہ کہاں سے لائیں

وہ رزم میں تھا جوہر شمشیر بے نیام — وہ بزم میں تھا بادۂ حب وطن کا جام
خلوت میں خوش خیال تھا جلوت میں خوش کلام — آتا تھا سرکشوں کا غریبوں کا وہ امام
محبوب خاص و عام تھا جان وطن تھا وہ
اپنے جلو میں فرد نہیں انجمن تھا وہ

شبنم، شمیم، پھول کی پتی، رباب و چنگ — فولاد، موم، جذبۂ ایثار، کوہ سنگ
اخلاص علم، سادگی، قوس قزح کا رنگ — کاشی کی صبح، شام اودھ، موج آب گنگ
ان سب کے امتزاج سے پیدا ہوا تھا جوش
کتنے حسین افق سے ہویدا ہوا تھا جوش

وہ جاہ وہ جلال وہ چہرہ وہ خال و خد — نا خالف خلیج و انجام نیک و بد
علم و ہنر کا کوئی نہیں ہے کوئی حد — لوگوں کے درمیان وہ مرد دراز قد
لاکھوں میں ایک فرد مجیب و غریب تھا
اس نے نشیں کو اوج ثریا نصیب تھا

اب کس زباں سے شکوۂ جور خدا کریں — آہ و بکا و نالہ و شیون بپا کریں
کس در پہ جا کے چارۂ اہل وفا کریں — دل کو جو اس کی یاد ستائے تو کیا کریں
صد حیف ناگہاں اجل آئے وطن سے دور
بلبل کی موت اور ہو وہ بھی چمن سے دور

صد حیف طعنہ زن ہیں فلاں خانہ زاد — جن کے قصیدے اب بھی ہیں ارزانیوں کو
احساس کمتری نے عنایت کیا عناد — دیکھے ستم ظریفی اہل حسد کی دا
راج و زمن بھی لاشیں اب بولنے لگے
شیشے جو اڑ گیا تو یہ منہ کھولنے لگے

اے رب ذوالجلال، اے داور، اے کردگار — میری عقیدتوں کا نہیں ہے کچھ شمار
جب تک ترا کرم ہو یاور ہے ساز گار — جز میری ذات کس کو گلاموں سے ہے فرار
باب قبول کی اسے خدمت نصیب کر
یارب ہمارے جوش کو جنت نصیب کر

جوش کی وفات پر

از

پروفیسر منظور حسین شور

خون رو اے سر زمیں اے آسماں کر سینہ چاک
ہو گیا ہے اک خدائے فکر و فن پیوند خاک

دوش جبریل امیں پر صبحدم کعبہ گیا
اک فلک کو آج پھر زیر زمیں دبا گیا

دانش و حکمت کو دنیائے کہن پھڑا گیا
خاک میں تاریخ کے اک دور کو گاڑا گیا

عقل کا ماتم ہے ، مرگ شاعر بے صبر
یا ترازو ہے دل فطرت میں خود فطرت کا میر

ہے یہ کشتوں اجل میں کس خدائے فن کی بھیک
آج کتنے انبیا ہیں اک جنازے میں شریک

اے سواد ذکر و بحث و دانش و درس و کتاب
آج ڈوبا ہے ترے آغوش میں وہ آفتاب

جس کے اعجاز نفس سے عقل انساں ہے دنگ
عرصۂ کون و مکاں پرواز پر جس کی ہے تنگ

تو نے کس صحرا میں دبایا عقل سینہ چاک کو
دفن کس مٹی میں تو نے کر دیا ادراک کو

جسکے چھو لینے سے اوڑھے ہیں حرف و لفظ و صوت
جسکی اک موج نفس کیجیے کہ جہلوں کی موت

اے خدائے آگہی ، اے خلق کے پروردگار
اب جنون و ہوش دونوں ہیں ترے ماتم گسار

جب ترے اظہار کا اعجاز بن جاتے ہیں لفظ
رنگ و خشت و سنگ کی آواز بن جاتے ہیں لفظ

تجھ کو کیا معلوم ، اے جہل و تعصب کے جنوں
پی گئی صبحوں کی عظمت کو کس سورج کا خوں

کون پتھر کی چٹانوں سے کرے گا اب کلام
کون اب لکھے گا پیکر برف پر آتش کا نام

کون گونگوں کے تکلم کا کرے گا اعتبار
کون اب بہروں کی محفل میں جگائے گا ستار

کون اب رکھے گا نبض مکتب و ملا پہ ہاتھ
جہل بے پایاں کو دے گا کون حکمت کی ڈگا

کفر و ایماں پر جبیں جد و اب کچھ گا کون
وحدت قوم کی کثرت کا سبب کچھ گا کون

کون سکھائے گا حفاظ و سعال کا سب
کون کھولے گا لب و لہجے کا طوار حسب

درس گاہوں میں کرے گا جہل کی تعظیم کون
رشتے اور حصوں میں کرے گا ایسے تقسیم کون

کون اب دے گا نوائیں جا کے گورستان میں
کون تولے گا ہوا کو جس کی میزان میں

اب بنے گا کون ایسا حکمت و دانش کا جال
جس سے بچ کر نسل آدم کا نکلا ہے نکال

کارگاہ فکر و فن میں تو اب کون آئے گا
جو ادب کو وسعت طرف زباں دکھلائے گا

کافر و دیندار سب ہوں جس کی زلفوں کے اسیر
کون اردو کو کرے گا اس قدر آفاق گیر

پاک کی آنکھوں میں نم ہو یہ بھی جذبہ جذبہ کوش
حشر تک اس قوم میں پیدا نہ ہوگا کوئی جوش

منکرانِ جوشؔ سے

از

[illegible]

یہ حادثہ بھی نہیں حُسنِ حادثات سے کم
ہزار سال میں لیتا ہے ایک جوشؔ جنم

وہ جوشؔ، نوحِ قلم چومتے ہوں جس کے قدم
وہ قبلہ گاہِ بصیرت، وہ کعبۂ ادراک

وہ جوشؔ، پاؤں پہ جس کے سرِ خیال ہو خم
ہو جس کی گردِ سفر خطِ کہکشاں، وہ جوشؔ

ہوائیں کھاتی ہیں جس کے نقوشِ پا کی قسم
نفس سے جس کے در و بام ہوش بننے لگیں!

ہو جس کی جنبشِ پر سے فرشتہ سوختہ دم
وہ جوشؔ دیکھ کے ماتھے پہ جس کے ایک شکن

ہزار نطق و جسارت میں مشورے ہوں بہم
وہ جوشؔ، آہ! وہ پروردگارِ فکر و نگاہ

کہ جس کی موت ہے عقلِ سلیم کا ماتم
کسے خبر ہے کہ کفر و یقیں کے زخموں پر

رکھا ہے کس کے ضمیر و شعور نے مرہم
یہ فرقِ شیخ و برہمن سے رازفاش ہوا

کسی کے گھر میں صنم ہیں، کسی کے سر میں صنم
نگاہ و فکر کو تو نے کیا ہے یوں زنجیر

ادب بھی جیسے ہو تیرا ہی ورثۂ جد و جم
تحرکے نور کو جغرافیہ میں قید نہ کر

کہ حد و خطہ سے بالا ہے تیرا عالم
محیطِ کعبہ و کاشی ہے ابر کا سیلاب

ہوا کی قید ہمارا، نہ لالہ زار ہم
وہ جوشؔ، آہ! وہ دم ساز حافظ و خیام

امامِ آدمِ جم، جرمِ حضرتِ آدم
وہ جوشؔ، آہ! وہ ماتم گسارِ ماہ و شہان

وہ جوشؔ، آہ! وہ صہبا و آبِ جوانِ شرم
وہ جوشؔ، آہ وہ نبضِ حیاتِ زماں

وہ آندھیوں کا شناسا چراغ کا محرم
وہ جوشؔ ڈوب گیا رات کے سمندر میں

کہ جس کا نام خدا نما ہے پہ آسماں کے رقم
خدا کے واسطے اے آسماں زمیں پہ ٹوٹ

کہ جنسِ جنس سے گھٹنے لگا ہے عقل کا دم

اُمیدِ صبحِ قیامت و صورِ اسرافیل
عجب قتیل ہے شمشیرِ فکر و فن کا قتیل

ہو فن بھی جیسے مرکب کا شاہکار تو کیا
غزل سرا بھی ہوئے بولتے مزار تو کیا

ہوا کی موج سے کیا بحر بے کراں کو گزند
ہمالیہ سے ہو تسلی ستیزہ کار تو کیا

کرن کا لمس ہو جس قطرۂ نحیف کی موت
وہ اتفاق سے ہو بحر در کنار تو کیا

ہوا کے ساز پہ اک گیت بھی جو گا نہ سکے
بساط برف پہ رقصاں ہو وہ شرار تو کیا

نگاہ و فکر و فراست کے چلتے پھرتے مزار
پیمبرانِ ادب میں ہوں گر شمار تو کیا

نہ کوئی عشق کا مذہب، نہ آگہی کا حصار
بنا ہو گنگ و جمن بو ترا دیار تو کیا

ہوا تو جنس کی زنجیر میں ہے آپ اسیر
ہوا کے دوش پہ تنکا ہوا سوار تو کیا

ہوائے تند سے کچھ اور جس کی لو ہو بلند
گر اس چراغ پہ صرصر کا ہو نثار تو کیا

جنوں تو صرف، ہے چاک دل و جگر کا سہاگ
ہزار جیب و گریباں ہوں تار تار تو کیا

لکھا ہو جن کی جبینوں پہ شجرۂ نسبی
امیرِ شہر ہوئے وہ گناہ دار تو کیا

پیمبری کے لیے شرط ہے نزولِ کتاب
ابو لہب ہوں نبوت کے دعویدار تو کیا

سیاہ فام ہو چہرہ تو کب کرے ضائع؟
دھلا بھی چہرۂ زنگی ہزار بار تو کیا

رسول و کعبہ و قرآں کی اس میں کیا تقصیر
اگر خدا پہ نہ ہو تجھ کو اعتبار تو کیا

وضو سے کام نہ مردے کو بندگی سے غرض
ہزار بار اذاں ہو سرِ مزار تو کیا

حسب نسب کو بھی تہذیب و فکر و فن میں ہے دخل
مگر یہ راز نہ ہو تجھ پہ آشکار تو کیا

جو قبرِ غالب و اقبال پہ کل تھے صرفِ خرام
اگر وہ جوشش پہ پھنکارتے ہوں کار تو کیا

وہ آفتاب جو ہو قبر کے اُفق سے طلوع
غروب بھی ہو وہ سورج تو شرمسار تو کیا

ہری ثرا پہ ہزاروں سماعتوں کا ہے قرض
ہری ثرا ہو اگر تجھ کو ناگوار تو کیا

خدائے فکر و نظر سے ہو جس کو بغض و عناد
نمک حرام ادب ہے وہ کور مادر زاد

[illegible] خاں

[illegible]